مقالات جامعی

غامدیت جدیدیت و مغربیت پر مشتمل جدید افکار کا محاسبہ
علمی کرتی سید خالد جامعی کی محققانہ تحریروں کا مجموعہ

جلد :اول

مرتب کردہ

ڈاکٹر محمد علی جنید

Karachi University Research Forum

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

مقالاتِ جامعی

جلد اول: غامدیت

3.9.2016

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

مرتب کردہ ،تہذیب کردہ،سرورق و پیشکش

محمد علی جنید

www.facebook.com/kurf.ku
www.kurfku.blogspot.com

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش
Karachi University Research Forum

تعارف

سید خالد جامعی صا حب اردو زبان میں جدیدیت اور پس جدیدیت کے تناظر میں ایک بڑا نام ہیں عصر حاضر میں جدید فلسفہ ،مغربیت ،جدیدیت ،مسلم جدت پسند شخصیات و کُتب پر انکا تحریری سرمایہ،نقد و جرح محققین کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے ۔

خالد جامعی صاحب ۱۹۵۸ کو پیدا ہوئے،اور ۱۹۸۵ میں انھونے جامعہ کراچی،شعبہ ابلاغ عامہ سے اپنا ماسٹر کیا ۔انکا تعلق کچھ عرصہ طلبہ سیاست سے بھی ر ہاہے ،سمجھیں جس جدت پسندی ،جمہوریت و مغربیت پر انکا قلم نقدی سخاوتوں کا مظاہرہ کرتا ہے وہ ان سب عملی مباحث سے نا صرف واقف حال ہیں بلکہ ان سے انکا تعلق کسی نہ کسی بنیاد پر رہا ہے ۔

لہذا اس کوچہ اور فکری بحث کی مبادیات سے انھیں عملی واقفیت بھی طلبہ سیاست کے دوران بخوبی رہی ،انھونے لبرلسٹس،لیفٹسٹوں،لبرل جمہوریوں کو قریب سے دیکھا،خالد جامعی صاحب ،بعد ازاں ایک طالب علمانہ دور سے گزر کر جامعہ کراچی سے انتظامی طور پر بہ سلسلہ روزگار وابستہ ہوگئے ،انھونے اس دوران نظمیہ جاتی گوناگوں ذمہ داریاں سرانجام دیں جن میں ہماری معلوما ت کی رو سے اسٹنٹ رجسٹرار ،ڈپٹی رجسٹرار سے لیکر ناظم شعبہ تصنیف و تالیف تک کی ذمہ داریاں خاص الخاص ہیں اور تاحال ممدوح ثالث الذکر ذمہ داری کو سر انجام دے رہے ہیں ۔

ایک قولِ جامعی کے مطابق جب انھونے شعبہ تصنیف و تالیف[1] کی ذمہ داریاں ۲۰۰۱ء میں سنبھالیں تو جو خدمات انھونے سرانجام دیں اور اس پیشہ ورانہ سفر میں جو کامیابیاں بٹوری اسکا حال ذیل میں خود انکی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔

---

[1] Karachi university press

شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ میں اہم ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے راقم الحروف کو تین برس گزر چکے ہیں۔ ۲۵ جنوری ۲۰۰۱ء کو راقم نے اس شعبے کی نظامت سنبھالی، تب شعبے کے سالانہ اخراجات ۲۷ لاکھ روپے تھے، اب الحمدللہ شعبے کے اخراجات صرف ۲۳ لاکھ روپے سالانہ ہیں۔ میری نظامت سے قبل ۲۰۰۰ء میں شعبہ تین لاکھ روپے کے خسارے میں تھا، الحمدللہ اب اس کا خسارہ ختم ہوگیا ہے اور ۲۰۰۳ء میں ہمیں تیس لاکھ روپے کا خالص نفع حاصل ہوا ہے اور کارکردگی کا معیار پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ سالانہ اخراجات کی مد میں پچاس لاکھ روپے سالانہ بچت کسی تبصرے کی محتاج نہیں، اخراجات میں پچاس لاکھ روپے کی بچت شعبے کے رفقائے کار کے بے لوث تعاون، دیانتداری اور انتھک محنت کے بغیر ممکن نہ تھی۔

طویل عرصے کے بعد شعبے کے زیر اہتمام نئی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے عہد نظامت میں اس طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ عبدالمجید سالک کے کالموں کا انتخاب ''افکار وحوادث'' کے نام سے دو جلدوں میں، مہدی علی صدیقی کی خودنوشت سوانح ''بلاکم وکاست'' اور بروشسکی زبان کی قواعد

''شمول بوق'' اور ڈاکٹر عاقل برنی کی کتاب "Risk Theory and Insurance" شائع ہوئی۔

''جریدہ'' جو شعبے کا علمی وتحقیقی رسالہ ہے، اس کا آخری شمارہ نمبر سترہ، ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد جریدہ بند ہوگیا۔ الحمدللہ سترہ سالہ تعطل کے بعد جریدہ باقاعدگی سے دوبارہ شائع ہونے لگا، شمارہ نمبر اٹھارہ اصطلاحات ابلاغیات، شمارہ نمبر انیس اصطلاحاتِ جمالیات، شمارہ نمبر بیس اصطلاحاتِ ماحولیات اور شمارہ نمبر اکیس لسانیات نمبر تھا۔ شمارہ نمبر بائیس وادی سندھ کے رسم الخط پر دنیا بھر میں ہونے والے تحقیقی کام کا احاطہ کر رہا ہے۔ اس شمارے میں موئن جو دڑو کی دو ہزار مہریں پڑھنے والے پاکستانی محقق مولانا ابوالجلال ندویؒ کے نو تحقیقی مضامین شامل ہیں جو وادی سندھ کے رسم الخط کے بارے میں نئے انکشافات پر مشتمل ہیں۔

ابو جلال کی یہ شاہکار اتکشافاتی تحقیق رب العالمین کے فضل و کرم سے ہم أن لاین پیش کرچکے ہیں ،اسکے علاوہ لغتِ متروکاتِ اردو، جیسی اہم أن لاین اشاعت کی برقی اشاعت خالد جامعی کے سبب ممکن ہوئی ہے ،ہماری ساری ذاتی أن لاین برقی اشاعتیں کسی نہ کسی صورت میں انکے تعاون کی مرہونِ منت ہیں ۔

خالد جامعی نے مرحوم ڈاکٹر خالد حسن صاحب کی لغت متروکات اردو کو قابلِ اشاعت بنانے میں جس علمی جانفشانی کا مظاہرہ کیا اسکو جتنا سراہا جائے کم ہے۔

جناب خالد جامعی صاحب کا تعلق جامعہ کراچی کے دبستان فکر سے ہے[2]

اور اس علم کلام کے بانی و مبتدی جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ہیں ،اور ان سے جو نام پھوٹے ان میں جناب پروفیسر ڈاکٹر علی محمد رضوی،جناب ُپروفیسر زاھد صدیق مغل،جناب امین اشعر ،مولانا محمد احمد ،جناب ڈاکٹر محبوب الحسن رضوی ،سید خالد جامعی اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری خاص الخاص ہیں ۔

خالد جامعی اگر ایک رسمی سے ناظم الشعبہ ہوتے تو کوئی انھونی بات نہ ہوتی کہانی میں نیا موڑ یہ أیا کہ جب اِن لوگوں نے پاکستانی معاشرے پر نگاہ ڈا لی تو انداذہ ہوا کہ جدیدیت ،پس جدیدیت اور سائنس نے پوری اُمت مسلمہ کے نئے عصری مذہب کا درجہ حاصل کر لیا ہے ،اس پر مستزاد مغربی علم سیاسیات کے سبب اب تمام علمی و مذہبی جواز ،عدم جواز ،حق وباطل،صحیح و غلط کا فیصلہ مغرب سے اخذ کردہ سیاسی فلسفیانہ قدروں اور ان سے اخذ کردہ نیم پختہ افکار کی روشنی میں کیا جا رہا ہے ۔

اور اسے سے کیا عامی کیا خاصی ،کیا امیر کیا غریب،کیا مسٹر اور کیا مولوی کون ہے جو اس مرعوبیت کی فضا میں تر بتر نہ ہوا ہو۔چناچہ ان حضرات نے اول مغربی علوم و کتب کو کنگھا لنا شروع کیا ،دن رات دنیا بھر میں سیاسیات،فلسفہ،قانون ،سائنس و ٹیکنالوجی،معاشیات اور دیگر علوم میں ہونے والی تحقیقات سے نا صرف خود واقفیت حاصل کی بلکہ ساتھ ساتھ جامعات اور مدارس کے طالبان علم کی بھی تربیت کا أغاز کیا ۔

میری کبھی ڈاکٹر جاوید صاحب سے ملاقات تو ہو نہ سکی ہے کیونکہ میں بھی جامعہ کراچی و دیگر جامعات کے طلبا کی علمی تربیت سے ہٹ کر میل ملاپ ،أنے جانے گھومنے سے پرہیز کرتا ہوں ۔

ایک ہمارے أزاد خیال جدت الفکر جامعاتی ساتھی نے میری توجہ جریدوں کی طرف اس دوران کروائی جب خاکسار جامعہ میں پی۔ایچ ۔ڈی کی تحصیل میں مگن تھا ۔لہذٰا خالد جامعی صاحب کی تحریروں سے أشناہ ہوا اور خالد جامعی صاحب سے ملاقات،تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع ہوا جو اب قریباً چھ ،سات سال سے جاری ہے ۔

[2] Karachi University School of thought.

اور مجھے معلوم ہوا کہ جامعی صاحب عرصے سے نہ صرف ہر ہفتہ ایک دن خاص کسی اہم کتاب پر تبصرہ کی نشست اپنے شعبہ میں رکھتے ہیں بلکہ ،توسیعی لیکچروں کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے ،جن طلب علموں کی تربیت کی جاتی ہے ان سے بھی لیکچر دلوائے جاتے ہیں ۔

خالد جامعی صاحب کی لو گوں کی علمی خدمت و رہنمائی کی یہ کیفیت ہے کے وہ رات گئے تک لوگوں کی رہنمائے فر ماتے رہتے ہیں ،خاکسار ویسے تو انکا کوئی شاگرد نہیں نہ اس قسم کی نشست کا حصہ ہے مگر ان سر گرمیوں سے نہ صرف واقف ہے بکہ خود بھی متلاشیان علم کو وہاں جا نے کا مشورہ دیتا رہتا ہے۔

خالد جامعی کی مشہور فلسفی وہاب سوری صاحب ،صدر شعبہ فلسفہ ،جامعہ کراچی سے خاص علمی یاری و دوستی ہے اور اس ضمن میں خالد صاحب کا کھل کر ساتھ دیتے ہیں سوری کے أن لائن لیکچر أرام سے گوگل کرکے أن لائن ڈھونڈھے جا سکتے ہیں ۔

ایک اندازہ کے مطابق خالد جامعی کے ذاتی کتب خانے میں مختلف علوم پر ۲۰۰۰۰ کتب موجود ہیں ،انکے دفتر کی میزوں کرسیوں پر بھی جا بجا کتابیں،کتب کی فوٹو اسٹیٹیں براجمان دیکھی جاسکتی ہیں ،مطلب کا غذ اور خالد جامعی کی باہم خاص شناسائی و دوستی اور یہ خاکسار کا بھی حال ہے جبھی میں ان سے اکثر علمی امر سے زیادہ تحریروں کی ہی بات کرتا ہوں کہاں ،چھپی،کب چھپی،مطبع کونسا ہے اور لکھاری یا محقق کون ہے ؟۔

جدیدیت پر تو خیر خاکسار نے بھی مطالعہ جاتی کافی نگاہ ڈالی ہے مگر مسلم جدیدیت کو جس ذاویے فکر سے خالد جامعی نے دیکھا اور بیان کیا مگر جو انکا طرز اندازہے وہ نرالا و منفرد ہے جو ان ہی کا ہی طرہ امتیاز ہے۔

میں ایک سیاسی سائنسدان و عالم کے طور پر رواجی پاکستانی جامعات کی علمی بوسیدگی کا شکار تھا ،اور مجھے اس کے اعتراف میں کوئی خوف و شرم نہیں کے جریدوں نے اور ان میں چھپنے والی تحریروں نے ہی خاکسارکو جان رالز ،ہیبر ماس ،فوکالٹ اور کارل پوپر سے واقف کروایا مطلب ہم جس جدیدیت کا راگ علمی بنیادوں پر ألاپ رہے تھے وہ بھی سمجھیں کارل مارکس پر أکر دم توڑ دیتا ہے ۔ پس جدیدیت اور ما بعد حریت سے تو ہمارے اکثر اساتذہ بھی واقفِ حال نظر نہیں أتے ہیں تو وہ ہمیں کیا واقف کرواتے اور نا نصاب میں یہ مباحث ذیر بحث لائے جاتے ہیں ۔

میرے علم کے مطابق پاکستان میں جامعہ کراچی کا شعبہ فلسفہ ،واحد شعبہ ہے جہاں یہ مباحث اور فلسفہ سائینس پڑھائے جا تے ہیں اور جامعہ کراچی مکتبہ فکر اس ضمن میں قابل تعریف ہے کے اس نے اُس وقت جب جامعات میں اساتذہ و طالب علموں میں ایک مخاصمانہ بعد ،دوری پائی جاتی ہے ،اساتذہ پڑھاتے کم ہیں اور دفتروں میں خواتین سے نیناں زیادہ لڑاتے ہیں ،پسند نا پسند پر طالب علموں کامیاب اور ناکام قرار دیا جاتا ،ہے انھیں عرصہ تک لٹکایا جاتا ہے ،اس دبستانِ فکر نے نہ صرف طلبہ و طالبات کو بتایا کہ

ؔ کہتے ہیں جسکو مغرب وہ یہ ہے   وہ نہیں جسے پڑھا تھا تم نے داستان پوٹر میں

سادگی نہیں ایسی اس میں کہ تم صدقے جاو واری جاو   -اپنی تہذیب سے نا واقف پکارے جاو

ڈس لیا اس تہذیب کی دُم کو خود اجگرِ ذات نے ،نسل گھٹتی جاتی ہے اور مقلد بڑھتے جاتے ہیں۔

أج مکتبہ جامعہ کراچی نے مسٹر اور مولوی کو ساتھ بٹھا دیا اور دونوں کا اتفاق ہے ،اور دونوں باہم شیر و شکر ہوکر صرف ایک تہذیب ،ایک حکومت ایک،روایت اور ایک ہی اصول کے رائج کرنے کے لئے بے قرار ہیں اور وہ ہے دین اسلام ،کلمہ شہادت ، قران و سنت اور أثارِ سلف و صالحین کی تعلیمات سے اخذ کردہ تہزیب و تمدن،حکومت و روایت،اور اُصولی ظابطہ حیات۔

مکتبہ غامدیت ویسے تو پاکستان میں پیدا ہوا مگر اس کے پیش رو ارتقائی طور پر معتزلہ،سرسید،چکڑالوی،پرویزی ماکتب فکر ہیں ۔مگر دین کو جتنا مختصر و محدود اس مکتبہ فکر نے کیا اور جس طرح انونے مردہ ہوتی پرویزیت کو نیا جنم دیا ،اس پر مستقبل کے معتزلہ جناب جاوید غامدی صاحب کو امام قرار دینگے۔

غامدیت نے ایک طرح سے مسلمانوں کی مذہبی اقدار کے طرف رجعت کے عمل کو معاشرے میں قران و حدیث کی طرف نئی نسل کے جھکاو کو بند باندھ کر روکنے کی کوشش کی ہے اور اس عمل میں ۲۰۰۰ء سے پاکستان میں پروان چڑھتے بے لگام ذرائع ابلاغ نے اہم کردار ادا کیا ہے،اوپر سے ایک ماننے والی بات یہ ہے جناب غامدی نے جو لوگ تیار کئے ہیں وہ تزویراتی لب و لہجہ،متانت اور هلم کے حامل نرم و ٹھنڈے لہجہ کے ذرئعے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

قران کو ماخذ تسلیم کرکے وہ ہی پرانی پرویزی مکھی کے پروں کو نئی چینی ساختہ غامدی مکھی کی پشت پر مار دیا گیا ہے ،جس کے ذریعے دینی علمیاتی نراجیت کا مظاہری کیا گیا ہے حدیث کو ماخذ دین سے درجہ تنزلی سے روشناس کراکے قران کی من چاہی ،سیاق سباق سے ہٹ کر تشریح ،توضیح و تاویل سے اپنانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے،

روز سو کر اُٹھتے ہیں نئی سنت کی فہرست جاری کردی جاتی ہے ،اگر مسواک کرکے قلم اُٹھاتے ہیں تو سنت گھتادیتے ہیں ورنا مسواک کو قلم بنا کر بڑھا دیتے ہیں ۔

غلام احمد قادیانی،چکڑوالوی،پرویزی طاغوطیت سے پولیٹیکل سائنس اور پالیٹیکل اکانومی کے اصولٌ ضوابط نکالے جاتے ہیں ۔علمیاتی بنیادوں کی ایسی نراجیت سوائے ملحدوں و تشکیکیوں کے اور کہیں نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔

غامدیت پر ویسے تو بہت کچھ لکھا گیا ،سنا گیا ،مولانا صلاح الدین یوسف ،مولانا رفیق چوہدری ،حافظ زبیر نے اس پر خوب لکھا ۔مگر یہ بھی مانے کی بات ہے کے غامدی حدیث اور اس سے اخذ کردہ فقہی دلایل کو خاص اہمیت ہی نہیں دیتے جو اثر ہوتا اس میدان میں ایک نیا شہسوار پیدا ہوا جس نے نا صرف مغرب کو خوب پڑھا بلکہ وہ مسلم جدیدیت کے دلا یل ،وسایل اور علمیت کا بھی واقفِ حال ہے ،ہیرے سے ہیرا ،لوہے سے لوہا کاٹنے کی مثل کو اپناتے ہوئے جگہ جگہ یہ علمی تعاقب کیا کہ اگر جدیدیت و مغربیت ہی تمہاری بنیاد ہے تو لو جناب تم نے تو مغرب کو بھی صحیح نہی سمجھا

،جانا اور پہچانا جو اس کے دم پر ایسی بڑی بڑی خود ساختہ دلیلیں قایم کی جایں اسلام کے دائرے میں رہنا توچاہیں مگر اسلام ایک ترمیم شدہ ،مغرب ذدہ خالصتاً اصطلاحاتی لبرلائزڈ اسلام ہو نا کہ محمد ﷺ پر تنزیل شدہ اسلام ہو ۔

نا تم مغربی کلاسیکیت سے واقف اور نہ تمہیں روحِ روشن خُیالی ،حریت فکر ،نشاۃ ثانیہ کے نفس مضمون سے لینا دینا تمہارا طریقہ کار سوفسطایوں اور تھیو سوفیوں کی مانند نرم ،گرم حلم سے لبریز شریں زبانی ٹھری مگر بھایوں یہ علمی سے ذیادہ شاعروں کا خاصہ ہے اور تم اپنی حلاوت کے نیچے کیسے مذہب شکن نشتروں سے مزین بیٹھے ہو۔

خالد جامعی نے اشراق کے مضامین اور المیزان کو بار بار پڑھا اور بار بار نئے تناظر میں غامدیت کا علمی تعاقب کیا،میں نے جب خالد جامعی کی جریدہ ،الواقعہ،البرھان اور ساحل میں غامدیت پر چھپنے والی تحریروں کو جمع کیا اور انھیں مقالاتِ خالد جامعی کی اولین برقی جلدوں کی صورت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا اُسی کے ضمن میں یہ اول برقی جلد پیشِ خدمت ہے اس میں صاحب مضمون سے اختلافِ علمی کی گنجایش موجود ہے جسکے ضمن میں ان سے خط و کتابت ممکن ہے۔

کئی جگہوں پر انھونے روانی قلم میں کچھ ایسی باتیں کردیں جو یک رخی اور محسوس ہوتا ہے شاملہ سے بس ضمنی اشارہ دیکر کام چلانے کی کوشش کی گئی ہے ۔انھونے غامدی صاحب کی امام ابن تیمیہ ؒ اور امام ابن قیم ؒ سے عقیدت کے ضمن میں تلخی دکھا کر دونوں اماموں کی بابت غلط زبان اختیار کرلی جس سے انکی واضح صوفیانہ غلویت اور حنفی نسبت عیاں ہوگئی۔ ۱

امام ابن تیمیہ کو عبدالقادر جیلانی کا مرید بتانا اور ان تک خرقہ پہنچنا قابل تحقیق امر ہیں بلخصوص جبکے انکے مناظرے دورہ مصر میں صوفیوں ،وحدۃ الوجودیوں سے مشہور معروف ہیں۔ یہ ایسا امر ہے جسکا انکے تمام شارحین،تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے ابو زہرہ،یوسف کوکن عمری ،غلام جیلانی برق ،ابن کثیر،ذہبی،ابن الھادی سب نے کیا ہے ابو الحسن الندوی صاحب نے با وجود اپنی صوفیانہ غلو پسندی کے امام ابن تیمیہ کے تصوف پر بحث کے دوران ایسا ذکر نہیں کیا،مطلب یہ حوالہ شاذ ہے۔ ۲

پھر ابن تیمیہ کا ایک طریقہ بحث تقابلی ہے وہ بات سے بات نکالتے ،دلایل ذیل دلایل موافق ،مخالف لا کر بحث کرتے ہیں ۔بعض دفعہ بحث کلی مشروط النقد و تعارض ہوتی ہے ۔بعض دفعہ صرف رفع اشکال کا معاملہ ہوتا ہے ۔باقی اگر کوئی کثرت سے نوافل اور روزہ رکھنے یا کثرت سے مشروع اذکار کو صوفیت جانتا ہے تو وہ صوفیت کو نا جا نتا ہے اور نا پہچانتا ہے ۔

محدثین و سلف اور اہل حدیث اور منکرِ تصوف کیا بے نمازی،روزے کے منکر شرابی کبابی ،حرامی ہوتے ہیں چونکہ وہ نظری طور پر ان امور کو نہیں مانتے؟،باقی امام صاحب نے اگر خرقہ کہیں سے خود تک پہنچنے کا ذکر کردیا ،یا عبدالقادر جیلانی کا ذکر عقیدت سے ذکر کردیا تو یہ اسکی دلیل نہی کہ وہ متصوف تھے متصوف ہونا اور احسان و زھد کا حامل ہونا مماثلث کے باوجود الگ الگ امر ہیں،باقی نفس زھد و اتقا ،الامر بلمعروف نہی المنکر کا کون مخالف ہے؟

۱۔انکے مکتبہ فکر کی تحریروں کی علمی عمدگی کے باوجود انکی فکر سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکتبہ فکر تصوف کی منزل مقصود کی طرف کل قوم کا لانا چاہتا ہے ،اور اس ضمن میں اکثر انکی فکر محدثانہ نہج کے حامل مماتی حنفی و محدثین و فقہا سے مختلیف ہے۔

۲۔المنتقی منہاج السنتہ النبویہ لاذھبی میں منہاج السنتہ لابن تیمیہؒ سے اختصاراً تحریر کیا گیا ہے کہ خرقہ کی پیش کردہ روایت جابرؓ منقطع ہے اور اسکی اسناد اور عملاً صحابہ کرام سے ثابت نہیں،جبھی یہ امر خود امام صاحب کی مختار رائے کے خلاف ہے:ترجمہ:غلام احمد حریری :اردو:الفرقان:صہ:۷۲۷۔

اگر ہمارے علما زہد ،احسان کے الفاظ رایج کرکے قران و احادیث سے اخذِ، اخلاق و أداب کریں تو عمدہ ہوگا ایک اور اہم امر یہ ہے کہ جناب عبدالقادر جیلانی صاحب ایک حنبلی ،اہل حدیث تھے فقہی دبستانوں کے راسخ ہونے سےقبل انکے دور تک مالکی،شوافع اور حنبلی اہل حدیث گردانے جا تے تھے جیسے غنیتہ الظالبین میں عبدالقادرؒ نے اہل حدیث کی تعریف کی ہے اور انکے مخالفین کا طعن کیا ہے۔

امام صاحب کی خاص کتابیں جو تصوف سے بحث کرتی ہیں ان میں الفرق بین الاولیا الرحمن و الشیطان،رسالہ تصوف ،اصحاب صفہ خاص الخاص ہیں ،باقی جناب عبدالقادر جیلانی،جناب جنید بغدادی کو انکے متبع شریعت ہونے کے سبب احترام سے یاد کرتے ہیں ،اب جو لوگ اما م صاحب کو حنبلی مانتے ہیں اور عبدالقادر صاحب کو بھی تو امام صاحب نے اپنے فقہ کے ایک مقدم کی بات مان لی،سراہ لی تو اسے بیعت کرنا اور انکے آگے ارادہ سرنگوں کرنا مراد نہیں لیا جاسکتا ہے۔

باقی بیعت صاحب علم ،محدث کی ہو تو بات بنے امام صاحب نے جن سے مناظرہ کیا وہ علم کے پہاڑ تھے مگر ان سے بیعت کرکے خرقہ لیکر مفاہمت نہیں کی اگر جامعی صاحب فتاوئ کے سوال اور مفروض کلیہ کے جواب کی جگہ واضح کتب اور عین حیات کے واقعات کو بھی دکھا دیتے تو علمی دیانت ہوتی ۔

انکا غامدی صاحب کی اماموں کی پیروی نہ کرنے کا بیان بھی قابل تنقید ہے کیونکہ امام ابن تیمیہ امت محمدیہ کے عالم ترین فرد ہوکر بھی کسی صورت میں نبی اکرمﷺ سے با لاتر نہیں جب غامدی کو نبی کریم , کے قول فعل کا پاس نہیں جیسا کے علما اور جامعی صاحب کا اس بابت نقد ہے تو ابن تیمیہ اور ابن قیم کو وہ کہاں خاطر میں لایں گے ،جس نے افضل کی اطاعت چھوڑ دی وہ مفضول کی کیا اطاعت و پیروی کریگا ۔

پھر امام صاحب کے اس بیان کو الحاقی نہ بھی مانا جائے تو اسکی لا تعداد تاویلات ممکن ہیں ،ناسخ و منسوخ ،محکم و مفصل بیان ممکن ہے ۔مذید غامدی صاحب کا کئی تاریخی بیان کے ضمن میں تعاقب بھی ہضم نہیں ہوتا باقی جدیدیت سے متعلقہ جامعی صاحب کے بیان و تحقیق میں کثیر بحث سے ہم متفق و مطمین ہیں۔

انشاللہ دوسری جلد بھی غامدیت سے متعلقہ ہوگی ،انکے بعد والی جلدیں دیگر جدید مباحث پر نقد سے مزین ہونگی خالد جامعی کی دیگر تحریروں کو پسند کرنے والے حضرات کو یہ سلسلہ امکان ہے کہ پسند أئے،اسکے ساتھ میں یہ بھی واضح کردوں ،خالد جامعی سے جب میں اس بابت ملنے گیا ور مقالات پر کام سے أگاہ کیا اور ان سے انکی زندگی کی بابت معلومات دریافت کرنا چاہی تو انھونے مجھے فرمایا میرا خیال ہے اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے أپ اگر صرف مقالہ جمع کرکے پیش کرنا چاہیں تو اجازت ہے جبھی میں ان کی حیات کے پہلووں کو اتنی وضاحت و صراحت سے عیاں نہیں کرسکا جیسا اسکا حق تھا۔

ڈاکٹر محمد علی جنید

غامدیت کا علمی، تاریخی وجسمانی ارتقا

غامدی صاحب کی کتاب "مقامات" کے دو مختلف نسخوں کا ناقدانہ علمی جائزہ

غامدی صاحب کی عمر اور علم کا تعین ان کی تحریروں کی روشنی میں

جاوید احمد غامدی	مقامات	طبع دوم ۲۰۰۶ء	المورد ادارہ علم و تحقیق، ۵۱۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
جاوید احمد غامدی	مقامات	طبع اول ۲۰۰۸ء	المورد ادارہ علم و تحقیق، ۵۱۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

جناب غامدی صاحب کی کتاب مقامات کے دو مختلف نسخے ہمارے مطالعے میں آئے جن پر درج تاریخ اشاعت کے سال نے ہمیں حیران کر دیا ایک نسخے پر سال اشاعت ۲۰۰۸ء درج ہے اور اسے پہلی اشاعت بتایا گیا ہے جبکہ دوسرے نسخے پر طبع دوم کا سن اشاعت ۲۰۰۶ تحریر کیا گیا ہے اس التباس کی تحقیق کی گئی تو غامدی صاحب کی عمر، علم اور ان کی نیرنگی طبع، پرُکاری و کاری گری کے کئی نئے مظاہر سامنے آئے اہل علم کے لیے اس مطالعے کے چند اہم گوشے پیش خدمت ہیں۔

محترم غامدی صاحب مقامات ۲۰۰۶ء کے دیباچے میں لکھتے ہیں: یہ اردو، انگریزی، اور عربی زبان میں چند نا تمام تصنیفات اور چند متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے۔ علم و فکر اور قلم و قرطاس کی دنیا میں کم و بیش ربع صدی کا سفر ہے جس کے کچھ اہم منازل اس کتاب میں نمایاں ہو گئے ہیں۔ اس کے لیے مقامات کا نام اسی لحاظ سے تجویز کیا گیا ہے یہی شاید اس کی اشاعت کے لیے وجہ جواز بھی ہے المورد لاہور جاوید جنوری ۱۹۹۹ء [تالیف جاوید غامدی، مقامات، دیباچہ ص نمبر ندارد، طبع دوم، ۲۰۰۶ء المورد لاہور] AOO

غامدی صاحب نے اپنی کتاب "مقامات" کے پہلے مضمون "میرے بعد" میں اپنی عمر کے بارے میں چند اشارات لکھے ہیں یہ تحریر غامدی صاحب کے بیان کے مطابق ۱۹۸۶ء کی ہے اس تحریر کے مطابق کم و بیش بیس سال پہلے وہ پاک پتن کے ایک مدرسے میں چھٹی یا ساتویں جماعت کے طالب علم تھے یعنی بیس سال پہلے وہ یقیناً دس سال کے ہوں گے گویا ۱۹۸۶ء میں ان کی عمر تیس برس تھی اگر غامدی صاحب کی عمر کے بارے میں ان کا بیان مصدقہ تسلیم کر لیا جائے تو ۱۹۹۰ء میں ان کی عمر صرف ۳۴ سال ہوگی لیکن اسی کتاب مقامات میں وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۹۰ء میں ان کی عمر ۴۰ سال تھی [مقامات، ص ۲۷، طبع اول، ۲۰۰۸ء] ــــ دس سال کی عمر میں یعنی ۱۹۶۶ء میں وہ سیکولر اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ درس نظامی کی عربی کی کتابیں بھی پڑھ رہے تھے ان کی ذہانت، فطانت کا یہ عالم تھا کہ دس سال کی عمر میں وہ عربی بول چال پر بھی قادر تھے۔ صرف یہی نہیں ان کے کمالات علم کا فیض یہ تھا کہ پاک پتن کی مرکزی لائبریری کے قریب ایک بنک کا سنتری بھی ان کے نور سے منور ہو گیا تھا اس نے عربی میں سوال کیا، انہوں نے جواب بھی یقیناً عربی میں ہی دیا ہوگا واقعے کی تفصیلات ان کے خامۂ خانہ معجز رقم سے پہلے مضمون میں خود پڑھیے۔

غامدی صاحب کی اپنی شہادت کے مطابق وہ [۱۹۶۶ء میں] پاک پتن میں چھٹی یا ساتویں جماعت کے طالب علم تھے [جاوید غامدی، مقامات، ص ۱۱، طبع دوم ۲۰۰۶ء مقامات طبع اول، ص ۴۵، ۲۰۰۸ء] یعنی اندازاً ۱۰ سال کے تھے اس لحاظ سے محترم غامدی صاحب کی عمر ۱۹۷۰ء میں صرف ۱۴ سال ہوگی اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ وہ ۱۹۶۶ء میں بارہ سال کے تھے تب بھی ۱۹۷۰ء میں ان کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ سال ہوگی اگر ہم تصور کریں کہ وہ چودہ سال کی عمر میں چھٹی جماعت کے طالب علم تھے تو ۱۹۷۰ء میں ان کی عمر ۱۸ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی لیکن اس عمر میں ان کا کمال دیکھیے کہ 'نومبر ۱۹۷۰ء میں وہ اکیڈمی وجود میں آئی جو دارالاشراق کے نام سے لاہور کے قریب چھبیس کلو میٹر دور مرید کے کی بستی میں اپریل ۱۹۷۸ء تک باقاعدگی سے کام کرتی رہی اور اب کئی ماہ سے معطل ہے۔

[قافلہ دو قافلہ ص ۱۴۳ اشراق اکتوبر ۲۰۰۷، خیال و خامہ: ص ۷، در ماہنامہ اشراق جنوری ۱۹۷۹ پہلا شمارہ جس میں اس اکیڈمی کی بندش کی تفصیلی روداد موجود ہے۔ مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء ص ۳۶]

غامدی صاحب کی روایت کے مطابق انہوں نے مرید کے میں ۱۹۷۰ء میں یہ ادارہ قائم کر لیا تو رفتہ رفتہ افراد کار بھی آتے گئے ۱۹۷۵ء تک ان کی تعداد سات تک پہنچ گئی [مقامات ۳۸، طبع اول، ۲۰۰۸ء] ــــ پانچ سال تک یہ ادارہ ایک چودہ یا سولہ سالہ یا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سالہ یا بیس سالہ نوجوان تن تنہا وسائل کے بغیر کیسے چلاتا رہا۔ ہم اشراق کے پہلے شمارے جنوری ۱۹۷۹ کا اداریہ پڑھتے ہیں تو صورت حال پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہے اس کے مطابق یہ ادارہ ۱۹۷۸ء تک چلتا رہا یہ ادارہ ۱۹۷۸ء تک بے سر و سامانی کے ساتھ کیسے چلتا رہا یہ بھی معمہ ہے۔ یہ سب کچھ افسانہ لگتا ہے کاش ایسا نہ ہو لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے ــــ یہ بات ناقابل یقین ہے کہ ایک چودہ سالہ نو عمر لڑکا پاک پتن سے طویل فاصلے پر منڈی مرید کے میں زمین کا ٹکڑا بھی لے لے اور وہاں علمی درسگاہ بھی قائم کرے ــــ اس کے اخراجات بھی برداشت کرلے ــ بہر حال حقیقت کیا ہے وہ خود و انکشاف ہو کر رہے گی ہمارا کام تو صرف غامدی صاحب کی تحریروں میں موجود مختلف کڑیوں کو ملا کر وہ تصویر پیش کرنا ہے جو تکلم کی محتاج نہ ہو۔ غامدی صاحب کی عمر کا تعین کرنے کے لیے ہم مقامات کی آخری جعلی اشاعت سن ۲۰۰۸ء اور مقامات کی اصلی اشاعت طبع چہارم سن ۲۰۰۶ء اور دانش سرا کے زیر اہتمام ۱۰۔ الذین کا نیجو ڈیفنس لاہور سے شائع ہونے والے کتابچے "اسلامی علوم کے اساسی مسائل" میں غامدی صاحب کی عمر سے متعلق درج بیانات، شہادتوں اور معلومات کا ناقدانہ تقابلی جائزہ لیتے ہیں: [۱] اسلامی علوم کے اساسی مسائل کی پشت پر غامدی صاحب کے بارے میں درج ہے "جاوید غامدی کی پیدائش ۱۸/ اپریل ۱۹۵۱ء کو ضلع ساہیوال کے ایک گاؤں جیون شاہ کے نواح میں ہوئی، اس عبارت سے یہ طے ہو گیا کہ ۱۹۶۶ء میں ان کی عمر پندرہ سال تھی یعنی دارالاشراق اکیڈمی غامدی صاحب نے انیس سال کی عمر میں بنائی تھی اور ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ پندرہ سال کی عمر میں چھٹی جماعت کے طالب علم تھے حالانکہ اوسط طلباء اس عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیتے ہیں مقامات میں قافلہ بے خود اں کے تحت ص ۳۷ پر ۱۹۸۸ء کی ایک تحریر ہے جس سے ان کی عمر کے تعین میں سہولت ہو سکتی ہے۔ بیس پچیس سال پہلے جب وہ مجھے بہلانے کے لیے میرے ساتھ بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ [ص ۳۷ مقامات ۲۰۰۶ء] .... اس عبارت کے مطابق جو ۱۹۸۸ء کی ہے یقیناً ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۳ء میں وہ اپنے بہنوئی سے آنکھ مچولی کھیلتے تھے ایک بچہ جو ۱۹۶۸ء میں اپنے بیان کے مطابق اپنے بہنوئی سے آنکھ مچولی کھیلتا تھا وہ اچانک دو سال بعد ۱۹۷۰ء میں منڈی مرید کے میں ایک اکیڈمی کا بانی کیسے بن گیا؟ کیا یہ اہم سوال نہیں ہے؟ ممکن ہے غامدی صاحب اپنے دفاع میں کہیں کہ میں نے آنکھ مچولی کا واقعہ میں بیس پچیس سال کا ذکر کیا ہے آپ نے میری عمر کا تعین صرف بیس سال کے حساب سے کیا ہے جو درست نہیں وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے لیکن اگر پچیس سال کے حساب سے عمر نکالی جائے تو غامدی صاحب ۱۹۶۳ء میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوں گے ــــــ ۱۹۶۳ء میں آنکھ مچولی کھیلنے والا اچانک سات سال بعد ۱۹۷۰ء میں اتنا زیرک، دانا، عقلمند، فہیم کیسے ہو گیا کہ اس نے اکیڈمی کھول لی اور وہاں لوگوں کو جمع بھی کر لیا۔ یہ ہے مسئلے کی اصل گتھی اور اس الجھن اور گرہ کو سلجھانے اور کھولنے کا اصل طریقہ۔ مقامات طبع اول ۲۰۰۸ء کے ص ۲۷ کے مطابق ۱۹۹۰ء میں ان کی عمر چالیس تھی [مقامات، ص ۲۷، طبع اول ۲۰۰۸ء] لہٰذا

بھی قادر تھے۔صرف یہی نہیں ان کے کمالات علم کا فیض یہ تھا کہ پاک پتن کی مرکزی لائبریری کے قریب ایک بنک کا سنتری بھی ان کے نور سے منور ہو گیا تھا اس نے عربی میں سوال کیا، انہوں نے جواب بھی یقیناً عربی میں ہی دیا ہوگا واقعے کی تفصیلات ان کے خامۂ خانۂ معجز رقم سے پہلے مضمون میں خود پڑھیئے۔

غامدی صاحب کی اپنی شہادت کے مطابق وہ [۱۹۶۶ء میں] پاک پتن میں چھٹی یا ساتویں جماعت کے طالب علم تھے [جاوید غامدی، مقامات، ص ۱۱، طبع دوم ۲۰۰۶ء، مقامات طبع اول، ص ۴۵، ۲۰۰۸ء] یعنی اندازاً ۱۰ سال کے تھے اس لحاظ سے محترم غامدی صاحب کی عمر ۱۹۷۰ء میں صرف ۱۴ سال ہوگی اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ وہ ۱۹۶۶ء میں بارہ سال کے تھے تب بھی ۱۹۷۰ء میں ان کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ سال ہوگی اگر ہم تصور کریں کہ وہ چودہ سال کی عمر میں چھٹی جماعت کے طالب علم تھے تو ۱۹۷۰ء میں ان کی عمر ۱۸ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی لیکن اس عمر میں ان کا کمال دیکھیے کہ ''نومبر ۱۹۷۰ء میں وہ اکیڈمی وجود میں آئی جو دارالاشراق کے نام سے لاہور کے قریب چھبیس کلومیٹر دور مرید کے کی بستی میں اپریل ۱۹۷۸ء تک باقاعدگی سے کام کرتی رہی اور اب کئی ماہ سے معطل ہے۔

[قافلہ در قافلہ ص ۱۴۳ اشراق اکتوبر ۲۰۰۷، خیال و خامہ: ص ۷، در ماہنامہ اشراق جنوری ۱۹۷۹ پہلا شمارہ جس میں اس اکیڈیمی کی بندش کی تفصیلی روداد موجود ہے۔مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء، ص ۳۶]

غامدی صاحب کی روایت کے مطابق انہوں نے مرید کے میں ۱۹۷۰ء میں یہ ادارہ قائم کر لیا تو رفتہ رفتہ افراد کار بھی آتے گئے ۱۹۷۵ء تک ان کی تعداد سات تک پہنچ گئی [مقامات ۳۸، طبع اول، ۲۰۰۸ء]— پانچ سال تک یہ ادارہ ایک چودہ یا سولہ سالہ یا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سالہ یا بیس سالہ نوجوان تنِ تنہا وسائل کے بغیر کیسے چلاتا رہا۔ہم اشراق کے پہلے شمارے جنوری ۱۹۷۹ء کا اداریہ پڑھتے ہیں تو صورتِ حال پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہے اس کے مطابق یہ ادارہ ۱۹۷۸ء تک چلتا رہا۔ یہ ادارہ ۱۹۷۸ء تک بے سرو سامانی کے ساتھ کیسے چلتا رہا یہ بھی معمہ ہے۔ یہ سب کچھ افسانہ لگتا ہے کاش ایسا نہ ہو لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے— یہ بات ناقابلِ یقین ہے کہ ایک چودہ سالہ نوعمر لڑکا پاک پتن سے طویل فاصلے پر منڈی مرید کے میں زمین کا ٹکڑا بھی لے لے اور وہاں علمی درسگاہ بھی قائم کرے— اس کے اخراجات بھی برداشت کر لے۔ بہرِ حال حقیقت کیا ہے وہ خود واشگاف ہو کر رہے گی ہمارا کام تو صرف غامدی صاحب کی تحریروں میں موجود مخفی کڑیوں کو ملا کر وہ تصویر پیش کرنا ہے جو تکلم کی محتاج نہ ہو۔غامدی صاحب کی عمر کا تعین

کرنے کے لیے ہم مقامات کی آخری جعلی اشاعت سن ۲۰۰۸ء اور مقامات کی اصلی اشاعت طبع چہارم، سن ۲۰۰۶ء اور دانش سرا کے زیر اہتمام ۱۰۷ اے ڈن کاٹیجز ڈیفنس لاہور سے شائع ہونے والے کتابچے ''اسلامی علوم کے اساسی مسائل'' میں غامدی صاحب کی عمر سے متعلق درج بیانات، شہادتوں اور معلومات کا ناقدانہ تقابلی جائزہ لیتے ہیں: [۱] اسلامی علوم کے اساسی مسائل کی پشت پر غامدی صاحب کے بارے میں درج ہے ''جاوید غامدی کی پیدائش ۱۸/اپریل ۱۹۵۱ء کو ضلع ساہیوال کے ایک گاؤں جیون شاہ کے نواح میں ہوئی، اس عبارت سے یہ طے ہوگیا کہ ۱۹۶۶ء میں ان کی عمر پندرہ سال تھی یعنی دارالاشراق اکیڈمی غامدی صاحب نے انیس سال کی عمر میں بنالی تھی اور ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ پندرہ سال کی عمر میں چھٹی جماعت کے طالب علم تھے حالانکہ اوسط طلباء اس عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیتے ہیں مقامات میں قافلہ بے خوداں کے تحت ص ۳۷ پر ۱۹۸۸ء کی ایک تحریر ہے جس سے ان کی عمر کے تعین میں سہولت ہوسکتی ہے۔ بیس پچیس سال پہلے جب وہ مجھے بہلانے کے لیے میرے ساتھ بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ [ص ۳۷ مقامات ۲۰۰۶ء] .... اس عبارت کے مطابق جو ۱۹۸۸ء کی ہے یقیناً ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۳ء میں وہ اپنے بہنوئی سے آنکھ مچولی کھیلتے تھے ایک بچہ جو ۱۹۶۸ء میں اپنے بیان کے مطابق اپنے بہنوئی سے آنکھ مچولی کھیلتا تھا وہ اچانک دو سال بعد ۱۹۷۰ میں منڈی مرید کے میں ایک اکیڈیمی کا بانی کیسے بن گیا؟ کیا یہ اہم سوال نہیں ہے؟ ممکن ہے غامدی صاحب اپنے دفاع میں کہیں کہ میں نے آنکھ مچولی کا واقعہ میں بیس پچیس سال کا ذکر کیا ہے آپ نے میری عمر کا تعین صرف بیس سال کے حساب سے کیا ہے جو درست نہیں وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے لیکن اگر پچیس سال کے حساب سے عمر نکالی جائے تو غامدی صاحب ۱۹۶۳ء میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوں گے ـــــــــ ۱۹۶۳ء میں آنکھ مچولی کھیلنے والا اچانک سات سال بعد ۱۹۷۰ء میں اتنا زیرک، دانا، عقلمند، فہیم کیسے ہوگیا کہ اس نے اکیڈیمی کھول لی اور وہاں لوگوں کو جمع بھی کرلیا۔ یہ ہے مسئلے کی اصل کنجی اور اس الجھن اور گرہ کو سلجھانے اور کھولنے کا اصل طریقہ۔ مقامات طبع اول ۲۰۰۸ء کے ص ۲۷ کے مطابق ۱۹۹۰ء میں ان کی عمر چالیس تھی [مقامات، ص ۲۷، طبع اول ۲۰۰۸ء] لہٰذا ان کا سن پیدائش ۱۹۵۰ء قرار پاتا ہے۔ اگر وہ ۱۹۹۰ء میں چالیس سال کے تھے تو یقیناً وہ ۱۹۷۰ء میں ۲۰ سال کے ہوں گے ۱۹۶۶ء میں وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے اور ۱۹۷۰ء میں یقیناً وہ میٹرک یا فرسٹ ایر کے طالب علم ہوں گے لیکن اسی نوعمری میں

انھوں نے نومبر ۱۹۷۰ء میں دارالاشراق اکیڈیمی کا آغاز کر دیا تھا جہاں کئی لوگ ان کی زیرنگرانی دینی علوم سیکھ رہے تھے اگر وہ ۱۹۹۰ء میں چالیس سال کے تھے تو ان کا یہ بیان بھی سرے سے غلط ہے کہ وہ ۱۸ اپریل ۱۹۵۱ء کو ساہیول کے قریب گاؤں میں پیدا ہوئے کیونکہ ان کا سن پیدائش ''مقامات'' ۲۰۰۸ء کے مطابق ۱۹۵۰ء قرار پائے گا۔ ۱۹۷۰ء میں وہ بیس سال کے ہوں گے یا دیگر بیانات کی روشنی میں ان کی عمر ۱۴ سال یا سولہ سال یا اٹھارہ سال بنے گی اس عمر میں کیا وہ اکیڈمی بنانے کے اہل تھے۔ وہ ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے بیس سال کی عمر میں وہ منڈی مرید کے میں اکیڈیمی نہیں بنا سکتے مگر یہ دعویٰ اشراق جنوری ۱۹۷۹ء میں پھر مقامات ۲۰۰۶ء اور مقامات ۲۰۰۸ء میں موجود ہے ہماری خامہ فرسائی کا مقصد ان کے داخلی تضادات کو نمایاں کرنا ہے جو ان کی شخصیت کا جز و غیر منفک ہیں ان کی علمیت، شخصیت، انفرادیت ایسے ہی تضادات کی کہکشاں سے جگمگا رہی ہے۔ غامدی صاحب صرف اپنی عمر کے معاملے میں ہی نہیں دیگر تمام علمی معاملات میں سیماب صفت ہی نظر آتے ہیں ان کی سیمابیت میں دن بہ دن مستقل اضافہ ہو رہا ہے۔

AOO یہ دیباچہ ''مقامات''، طبع دوم جولائی ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا، ناشر المورد ۵۱۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور تھے اور تقسیم کنندہ جہانگیر بک ڈپو لاہور، کتاب کی قیمت ۱۸۰ روپے مقرر کی گئی اور حجم ۴×۷ ہے ـــــــ کتاب کا رنگ گہرا سبز ہے اور سرورق پر غامدی صاحب کی تصویر نہیں دی گئی سرِ ورق کی عبارتیں سنہرے حروف سے نمایاں کی گئی ہیں ـــــــ دیباچے کے مطابق یہ تحریریں ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۹ء تک غامدی صاحب کے علمی سفر کے مختلف منازل کا آئینہ ہیں ـــــــ دیباچے میں بڑے فخر سے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب اردو، انگریزی، عربی تین زبانوں میں لکھی گئی ہے مولف نے تین زبانوں پر دسترس کا دعویٰ کیا تھا ـــــــ لیکن کراچی کے ماہنامہ ساحل نے مئی ۲۰۰۶ء میں اس کتاب کے عربی اور انگریزی حصے پر ڈاکٹر رضوان ندوی اور ڈاکٹر افتخار شفیع اور خالد جامعی کا نقد شائع کیا تو کتاب بازار سے اٹھالی گئی ـــــــ عربی حصے میں شرح شواہد الفراہی کے عنوان سے ص ۱۶۱ تا ۱۷۳ کل بارہ صفحات میں غامدی صاحب کی ۲۵ سال پرانی واحد عربی تحریر شائع کی گئی تھی جس میں زبان بیان تذکیر تانیث کی کئی سو غلطیاں تھیں ڈاکٹر رضوان ندوی نے اپنے معرکہ آراء مضمون میں ان اغلاط کا محاکمہ کیا ـــــــ کتاب کے آخری

انگریزی حصے میں غامدی صاحب نے شاعرانہ تیور کے ساتھ انگریزی زبان میں چار نظموں کے جوہر دکھائے تھے لیکن ان نظموں کے کئی مصرعے انگریزی کے بڑے شعراء شیکسپیئر، کیٹس وغیرہ کا ہو بہو چربہ تھے ماہنامہ ساحل کے مضامین نے غامدی صاحب کی عربی انگریزی دانی کی حقیقت کھول کر رکھ دی لہٰذا کتاب کو غائب کرانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا—— دو سال بعد یہی کتاب ''مقامات'' کے نام سے غامدی صاحب کے ادارے المورد ۵۱۔ کے، ماڈل ٹاؤن نے دوبارہ شائع کی اس مرتبہ دھوکہ دینے کے لیے کتاب کا حجم تبدیل کر کے چھوٹا کر دیا گیا تاکہ انگریزی عربی حصے نکالنے کے باوجود کتاب کی ضخامت بڑھ جائے—— ۲۰۰۶ء میں شائع ہونے والی مقامات ۱۸۲ صفحات پر مشتمل تھی نئی مقامات ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے انگریزی عربی حصے اس اشاعت سے غائب کر دیے گئے ہیں کتاب کے اندرونی سرِ ورق پر قارئین کو دھوکہ دینے کے لیے طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء کا اندراج کیا گیا ہے جبکہ کتاب مقامات کے نام سے جولائی ۲۰۰۶ء میں دوسری مرتبہ شائع ہو چکی ہے—— کتاب کے سرِ ورق پر غامدی صاحب کا تصویری خاکہ بھی دیا گیا ہے نومبر ۲۰۰۸ء والی اشاعت اول کے ''دیباچ'' میں غامدی صاحب نے عربی انگریزی دانی کا دعویٰ کرنے کے بجائے صاف صاف لکھا ''یہ منفرد تحریروں کا مجموعہ ہے میں نے اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے پہلا حصہ میرے جذبات احساسات حالات وقائع کا مرقع ہے دوسرے حصے میں بعض توضیحات اور دین کے اجتہادی مسائل سے متعلق میری آراء بیان ہوئی ہیں تیسرا حصہ تنقیدی مضامین کے لیے خاص ہے جاوید المورد لاہور اکتوبر ۲۰۰۸ء [تصنیف جاوید غامدی مقامات دیباچہ ص نمبر ندارد، المورد، لاہور، نومبر ۲۰۰۸ء] مقامات کی اشاعت دوئم پر غامدی صاحب نے تالیف کا دعویٰ کیا تھا مقامات کی نئی اشاعت کے سرورق پر تصنیف کا دعویٰ کیا گیا ۲۰۰۶ء میں غامدی صاحب ''مقامات'' کے مولف تھے ۲۰۰۸ء میں اب کتاب کے مصنف ہو گئے—— کتاب کے سر ورق یا اندرونی سرورق پر کہیں یہ درج نہیں ہے کہ یہ نظر ثانی شدہ، ترمیم وتصحیح شدہ اشاعت ہے یا یہ کہ یہ کتاب پہلے کبھی شائع ہوئی ہے مقامات طبع دوم ۲۰۰۶ء کے دیباچے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ گزشتہ ربع صدی کی تحریروں کا انتخاب ہے اور دعویٰ کا سن ۱۹۹۹ء درج ہے یعنی ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۹ء تک کی تحریریں مقامات میں شامل کی گئی تھیں مقامات کی جعلی اشاعت ۲۰۰۸ء کے دیباچہ میں یہی دعویٰ دہرایا گیا ہے کہ

گزشتہ ربع صدی کے علم وفکر کا سفر ان تحریروں میں سمیٹا گیا ہے اور دعویٰ کا سن اکتوبر ۲۰۰۸ء درج کیا گیا ہے یعنی مقامات میں ۱۹۸۳ء تا ۲۰۰۸ء تک کی تحریریں شامل ہیں یہ دونوں دعوے اپنے تضاد کی چغلی خود کھا رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۲ء تک کی تحریریں کہاں چلی گئیں وہ کیوں شامل نہیں کی گئیں؟ تحریری سفر جو مقامات ۲۰۰۶ء کے دیباچے کے مطابق ۱۹۷۴ء میں شروع ہوا تھا اب مقامات ۲۰۰۸ء کے مطابق ۱۹۸۳ء سے شروع ہو رہا ہے اس تضاد کا کیا علاج ہے؟ —— مقامات جب ۲۰۰۶ء میں دوسری مرتبہ طبع ہو چکی تو اسے چھپانے، جھوٹ بولنے، دھوکہ دے کر مقامات اشاعت اول ۲۰۰۸ء شائع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ —— اس اخفاء کا سبب بیان کرنے کی ضرورت نہیں —— محاورہ ہے کہ 'جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے' لہٰذا اس محاورہ کا ثبوت مصنف غامدی صاحب نے خود مقامات اشاعت ۲۰۰۸ء کے صفحہ ۲۸ پر ذوق وشوق کے زیر عنوان بیان کر دیا ہے اپنی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''۴۔ مقامات پہلی دو کتابوں [میزان، برہان] کے علاوہ جو کچھ لکھا ہے یا لکھنے کا ارادہ ہے اس کے منتخبات اسی کتاب میں جمع کرنا پیش نظر ہے [غامدی، مقامات، ص ۲۸، طبع اول ۲۰۰۸ء، المورد لاہور] اپنی نو کتابوں کا تعارف کرانے کے بعد غامدی صاحب اسی صفحے کے آخر میں لکھتے ہیں:

''برہان''، ''مقامات'' اور ''خیال وخامہ'' شائع ہو چکی ہیں میزان امید ہے کہ اس سال کے آخر تک شائع ہو جائے گی [۲۰۰۷ء]۔ [غامدی مقامات، ص ۲۸، ۲۹، المورد، لاہور ۲۰۰۸ء، طبع اول]

غامدی صاحب کی یہ تحریر —— کتاب کے صفحہ ۲۹ کے مطابق ۲۰۰۷ء کی ہے ۲۰۰۷ء کی یہ تحریر اشراق میں شائع ہوئی ہے اس تحریر میں غامدی صاحب نے خود اعتراف فرما لیا کہ مقامات ۲۰۰۷ء سے پہلے شائع ہو چکی تھی —— لیکن یہ تحریر مقامات طبع ۲۰۰۸ء میں شامل ہے اور مقامات پر درج ہے کہ اشاعت اول ۲۰۰۸ء —— دعویٰ ہے کہ کتاب پہلی مرتبہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہو رہی ہے لیکن خود مصنف بتا رہے ہیں کہ مقامات ۲۰۰۷ء سے پہلے شائع ہو چکی ہے جب کتاب ۲۰۰۷ء سے پہلے شائع ہو چکی تو جھوٹ تصنیف کرنے اور تحقیق کے نام پر کذب تخلیق کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ کتاب پہلی مرتبہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہو رہی ہے —— ایک جھوٹ کو ثابت کرنے کے لیے غامدی صاحب نے جتنے نئے کذب تخلیق کیے وہ خود ان کے خلاف شاہد بن گئے ۲۰۰۷ء کی اس تحریر میں غامدی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ ''میزان'' امید ہے کہ اس سال کے آخر تک شائع ہو جائے گی [غامدی مقامات ص ۲۸، المورد،

لاہور، طبع اول ۲۰۰۸ء] اس تحریر کے ذریعے یہ جھوٹا تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ''میزان'' پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہے حالانکہ میزان کے نام سے غامدی صاحب کی دو کتابیں ۱۹۸۵ء اور ۲۰۰۲ء میں غامدی صاحب کے قائم کردہ ادارے دارالاشراق لاہور سے شائع ہو چکی تھیں ۱۹۸۵ء والی کتاب پر درج ہے میزان حصہ اول، جاوید احمد الغامدی —— اندرونی سرِ ورق پر درج ہے دارالاشراق ۷۹ ابی ابوبکر بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور مئی ۱۹۸۵ء ناشر ڈاکٹر منیر احمد، کتاب کل دو سو بتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۲ء والی کتاب پر درج ہے ''میزان'' ، تالیف جاوید احمد غامدی —— ۱۹۸۵ء میں مولف جاوید الغامدی تھے اب صرف غامدی رہ گئے —— کتاب کا ناشر دارالاشراق ۱۲۳ بی ماڈل ٹاون اندرونی سرورق پر لکھا ہے ناشر جاوید احمد غامدی طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء دیباچے کے مطابق یہ کتاب ۲۰/ جون ۲۰۰۱ء کو مکمل ہوئی کتاب کے کل صفحات ۳۳۷ ہیں —— واضح رہے کہ میزان ۲۰۰۸ء کے کل صفحات ۶۵۸ ہیں سوال یہ ہے کہ اگر میزان کی تصنیف کا کام ۱۹۹۰ء میں کسی وقت شروع ہوا [جاوید غامدی میزان ص ۶۵۴ طبع سوم ۲۰۰۸ء] تو یہ کتاب ۱۹۸۵ء میں کیسے شائع ہو گئی ۱۹۸۵ء کی میزان کے بہت سے مباحث حرف بہ حرف میزان ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۸ء میں شامل ہیں اگر کتاب کی تصنیف کا کام ہی ۱۹۹۰ء میں شروع ہوا تو کتاب کا مسودہ تحریر ہونے سے پہلے ہی خود بخود ۱۹۸۵ء اور ۲۰۰۲ء میں کتاب کی طباعت کیسے ممکن ہو گئی اور کتاب کے ناشر ۱۹۸۵ء میں غامدی صاحب کا ادارہ دارالاشراق تھا اور نگران ان کے شاگرد ڈاکٹر منیر اور ۲۰۰۲ء میں کتاب کے ناشر خود غامدی صاحب تھے اور ادارہ دارالاشراق۔ یہ وہی ادارہ ہے جو ۱۹۷۰ء میں منڈی مرید کے میں قائم ہوا تھا۔

غامدی صاحب نے اپنی تصانیف سے دو شائع شدہ تصانیف کو کیوں خارج کر دیا ان کا ذکر کیوں ضروری نہ سمجھا؟ —— اس کا فلسفہ سمجھنے کے لیے میزان ۲۰۰۸ء کے اختتام پر غامدی صاحب کی تحریر کا تجزیہ کرتے ہیں ''خاتمہ'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں ''کتاب کی تصنیف کا کام جو میں نے ۱۹۹۰ء میں کسی وقت شروع کیا تھا وہ آج سترہ سال بعد پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے قرآن وسنت کی جو تعبیر اس کتاب میں پیش کی گئی ہے اسے سلف وخلف کے علماء اور امام فراہی و اصلاحی کے رشحاتِ فکر کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف دلائل کی صحت وعدمِ صحت کے تحت قبول کر کے پیش کیا گیا ہے چنانچہ کئی مقامات ہیں جہاں میرا نقطۂ نظر جس طرح دوسرے علماء محققین کی آراء کے مطابق نہیں رہا اسی طرح اپنے ان بزرگوں [فراہی و اصلاحی]

سے بھی بڑی حد تک مختلف ہو گیا ہے تاہم یہ ایک انسان کا کام ہے جو غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا ہے میں بار بار اسے دیکھتا اور اس میں ترمیم و اضافہ کرتا رہا ہوں اس کے جو ابواب وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں ان کے اگلے ایڈیشن میں بغیر کسی تردد کے میں نے خود پر واضح ہونے والی غلطی کی اصلاح کر دی ہے [غامدی، میزان، ص ۶۵۳، المورد، لاہور، طبع سوم، مئی ۲۰۰۸ء] ''خاتمے'' کی عبارت کے ذریعے یہ مغالطہ یا التباس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ''میزان'' کی تالیف، تصنیف، تسوید، تحریر کا کام ہی اصلاً ۱۹۹۰ء میں شروع ہوا اور سترہ سال تک مسلسل جاری و ساری رہا لہٰذا میزان کے نام سے کسی کتاب کی اشاعت کا سوال ۲۰۰۸ء سے پہلے پیدا ہی نہیں ہوتا ——— کیونکہ میزان تو سترہ سالہ محنت شاقہ کے بعد ۲۰۰۷ء میں مکمل ہوئی جس کا اعلان اشراق میں کیا گیا اور ۲۰۰۸ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ———

حالانکہ غامدی صاحب کا یہ بیان سراسر جھوٹ در جھوٹ پر مبنی ہے ——— میزان کی تالیف و تصنیف کا کام غامدی صاحب ۱۹۷۳ء سے پہلے شروع کر چکے تھے اس کا ثبوت میزان حصہ اول ہے جو ۱۹۸۵ء میں دارالاشراق نے شائع کی اس کے ناشر ڈاکٹر منیر احمد تھے [میزان ۱۹۸۵ء کے کئی مباحث میزان ۲۰۰۸ء میں شامل ہیں] ——— غامدی صاحب سے ہمارا تعارف الحمراء سوسائٹی امیر خسرو روڈ کے ایک گھر میں ڈاکٹر منیر احمد کے ذریعے ہوا اور یہ کتاب خود ڈاکٹر منیر احمد نے ہمیں تحفتاً پیش کی تھی اس کتاب کا ایک اور نسخہ راولپنڈی کے جناب شکیل عثمانی صاحب [سابق کنٹرولر نیوز ریڈیو پاکستان] کی وساطت سے ہمیں ملا جوان کی خدمت میں غامدی صاحب کے شاگرد رشید خورشید احمد ندیم نے پیش کیا تھا واضح رہے کہ شکیل عثمانی صاحب نے غامدی صاحب کی تقریر پر مبنی کتابچہ ''پرویز صاحب کا فہم قرآن'' کے نام سے مرتب کیا تھا اس کتابچے کا مقدمہ خورشید احمد ندیم صاحب کے قلم سے ہے اسے دارالتذکیر لاہور نے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا تھا۔ ——— سن ۲۰۰۲ء میں میزان کے نام سے مکمل کتاب غامدی صاحب کی زیر نگرانی دارالاشراق لاہور نے شائع کی ——— ان دونوں کتابوں کا ذکر اسی لیے نہیں کیا گیا تاکہ اس دعوے کو تقویت پہنچائی جا سکے کہ میزان تو پہلی مرتبہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہو رہی ہے ———

''خاتمے'' میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ میزان کے مختلف ابواب جو کتابچوں کی صورت میں شائع ہوتے رہے ان میں موجود اغلاط، تسامحات، التباسات، کی تصحیح و ترمیم کا کام غامدی صاحب احباب کے توجہ دلانے پر نہایت تن دہی سے کرتے رہے [میزان ص ۶۵۳ طبع سوم ۲۰۰۸ء] لیکن غامدی صاحب نے

جب بھی ان کتابچوں کے متن کی تصحیح کی اگلی اشاعت میں کسی کتابچے پر کبھی یہ درج کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ یہ اشاعت تصحیح شدہ ترمیم شدہ تنسیخ شدہ اشاعت ہے ——— اس طریقے سے ان کے علمی ارتقاء کا سفر سامنے آسکتا تھا ——— اور ارتقاء جو غامدی صاحب کے بنیادی علمی اصولوں میں سے ایک اصول ہے اس کی توثیق ہوسکتی تھی ——— لیکن یہ سوال بھی اٹھنے کا اندیشہ تھا کہ کیا قرآن وسنت جو دو ماخذات دین ہیں ان میں ارتقاء کے کیا معنیٰ؟ ماخذ تو کبھی تبدیل نہیں ہوتا نہ کبھی تغیر وتبدل کے مرحلے سے گزرتا ہے وہ تو متعین متحجر، معین اور نا قابل تغیر وترمیم ہوتا ہے ——— اس کو بیان کرنے والے کی دلیل، فہم، عقل تو تبدیل ہوسکتی ہے لیکن ماخذ تو ہر حال میں جامد، معین، محفوظ رہتا ہے ——— اگر ماخذ خود تبدیل ہو رہا ہے تغیر کے مرحلے میں ہے ہر آن نئی تجلی ظاہر ہو رہی ہے تو وہ ماخذ کیسے ہوا؟ ———
مولانا اشرف علی تھانوی نے بارہ سو سے زیادہ مسائل میں اپنی سابقہ رائے سے رجوع کیا اور ''ترجیح الراجح'' کے نام سے کتاب مرتب کرکے اپنے رجوع کو اہل علم پر واضح کردیا غامدی صاحب اپنی کسی کتاب پر یہ نہیں لکھتے کہ یہ اشاعت ——— ترمیم شدہ یا اضافہ شدہ ہے حالانکہ علمی دنیا میں ہر وہ کتاب جس پر مصنف نظر ثانی کرتا ہے ترمیم تنسیخ اضافہ کرتا ہے اس کا اظہار کتاب کی ہر نئی اشاعت کے سرورق پر کیا جاتا ہے دیباچے میں اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے لیکن غامدی صاحب ان مروجہ طریقوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے ——— قرآن وسنت کی بحیثیت ماخذات تعریف کا تعین کرتے ہوئے غامدی صاحب نے اپنے علمی سفر کے آغاز سے لے کر اب تک کئی نقطۂ ہائے نظر تبدیل کیے ہیں اور اب بھی ان کا دعویٰ یہی ہے کہ ''ان کا کام غلطی سے مبرا نہیں ہے اس کتاب کی جو غلطی بھی مجھ پر واضح ہو جائے گی یا کردی جائے گی میں انشاءاللہ اس کی اصلاح کردوں گا یہ ایک طالب علم کا نتیجہ فکر وتحقیق ہے اور اسی حیثیت سے پیش کیا جارہا ہے [ص ۶۵۳، ۶۵۴، میزان، طبع سوم ۲۰۰۸ء، المورد لاہور] قرآن وسنت کی جو تعریف خلف وسلف نے اجماع سے پیش کی غامدی صاحب نے اسے بھی تسلیم نہیں کیا قرآن وسنت کی جو تعریف غامدی صاحب کے بزرگوں امام فراہی اور امام اصلاحی نے پیش کی غامدی صاحب نے اسے بھی قبول نہیں کیا ——— امت کے اجماع اور اپنے دو بزرگوں فراہی واصلاحی [غامدی صاحب ان دو کے سوا کسی کو بزرگ ہی نہیں سمجھتے اس کا اعلان ان کی تحریر کے بین السطور میں مخفی ہے] کے موقف سے اختلاف کرکے قرآن وسنت کی نئی تعریف متعین کرنے کے بعد یہ دعویٰ کہ اس میں اب بھی غلطی کا امکان ہے اور میں

اصلاح کروں گا تو سوال یہ ہے کہ امت ماخذات کے تعین کے بغیر دین پر عمل کیسے کرے گی؟ اسی لیے اہل سنت کے یہاں اجماع حجت ہے کیونکہ عقل متغیر ہے اور عقل جب بھی استعمال ہوگی تو لازماً اہل دین میں اختلاف پیدا ہوگا اس اختلاف کا حل امت نے ''اجماع'' کی صورت میں دریافت کیا ہے تعامل صحابہ اور تعامل امت اسی لیے امت کے لیے حجت ہے اگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسا صحابی بھی یہ کہہ دے کہ معوذتین قرآن کا حصہ نہیں ہے تو ان کا یہ تفرد تعامل صحابہ اور اجماع امت کے مقابلے پر کوئی حیثیت نہیں رکھتا — اس سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے مقام و مرتبے میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن عبداللہ ابن مسعودؓ کے مقام مرتبے عظمت وجلال کے باوجود ان کی تنہا رائے امت قبول نہیں کرے گی —

عہد حاضر کے سب سے بڑے محدث علامہ ناصر الدین البانی نے ثابت کیا کہ سونے اور چاندی کے زیورات عورت کے لیے بھی حرام ہیں اسناد کے ذریعے انھوں نے ان احادیث پر نقد و جرح کیا جو عورت کو سونا چاندی پہننے کی اجازت دیتے ہیں لیکن ان کے علمی مباحث دلائل اور اسناد کے باوجود امت کے کسی مکتب فکر نے ان کی اس تحقیق کو قبول نہیں کیا کیونکہ یہ اجماع امت، تاریخ امت، تعامل امت اور تعامل صحابہ کے منافی تحقیق ہے خود غامدی صاحب بھی تعامل صحابہ کو حجت تصور کرتے ہیں لہٰذا مقامات طبع دوم ۲۰۰۶ء میں تراویح کی نماز کے زیر عنوان لکھتے ہیں ''تراویح: نبیؐ نے یہ نماز کبھی گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھی [ص ۱۱۲ محولہ بالا] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نماز میں رسالت مآبؐ سراً و جہراً دونوں طریقوں سے قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے بعد میں اللہ نے حکم دیا کہ ان دونوں کے بین بین لہجہ اختیار کیا جائے یہ حکم بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ میں دیا گیا لہٰذا رسول اللہ نے اس کے بعد اپنے صحابہ کو بھی اسی کا پابند کیا [ص ۱۱۲ محولہ بالا] [تراویح جو اصلاً نماز تہجد ہے] اس نماز کا اصل وقت تو سو کر اٹھنے کے بعد کا ہے لیکن یہ نماز سونے سے پہلے بھی پڑھ سکتا ہے [ص ۱۱۴، محولہ بالا] نبیؐ یہ نماز [تراویح] ہمیشہ تنہا پڑھتے تھے لیکن بخاری کی حدیث کے مطابق صحابہ نے یہ نماز آپ کی اقتدا میں بھی ادا کی [ص ۱۱۴، ۱۱۵] لوگ گھروں اور مسجدوں میں اسے بالعموم اپنے ہی طور پر پڑھتے تھے یہاں تک حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں عجیب بے نظمی دیکھی تو قرآن مجید کے آداب تلاوت کے لحاظ سے اسے پسند نہیں فرمایا ابی ابن کعبؓ کو اس نماز کے لیے لوگوں کا امام مقرر کیا [ص ۱۱۶، محولہ بالا] حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ نئی چیز ہے لیکن اچھی ہے آپ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اس نماز کی جماعت اور اسے عشاء کے ساتھ پڑھنے کی اجازت چونکہ رسولؐ سے

ثابت ہے اور ہم نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اس کے لیے ایک امام مقرر کر دیا ہے اس وجہ سے اسے بدعت قرار نہیں دیا جاسکتا جسے رسول اللہؐ نے ضلالت قرار دیا ہے۔[ص ۱۱۶، محولہ بالا] رسول اللہ نے یہ نماز کبھی گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھی لیکن صحابہ کے عمل سے اس کی اس سے زیادہ رکعتیں بھی ثابت ہیں ان کا یہ عمل دلیل ہے کہ نبیؐ کی طرف سے اس کی اجازت یقیناً ان کے علم میں تھی اس لیے کہ ہم ان کے بارے میں یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی بدعت اختیار کر سکتے تھے[ص ۱۱۶، محولہ بالا] آخری جملہ یہی بتاتا ہے کہ غامدی صاحب کے اصول کے تحت ـــــ تعامل صحابہ بھی حجت ہے غامدی صاحب اسے حجت تسلیم کرتے ہیں عدالت صحابہ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ صحابہ کا تعامل بدعت نہیں دین ہی ہے کیونکہ صحابہ نے دین رسالت مآبؐ سے اخذ کیا ہے اس لیے امت کی تاریخ، اجماع سب دین کے فہم وادراک کے لیے لازمی ذرائع ہیں واضح رہے کہ غامدی صاحب نے یہ عبارت ۱۹۸۹ء میں لکھی جو مقامات ۲۰۰۶ء میں شامل ہے مقامات ۲۰۰۸ء میں یہ عبارت حذف کردی گئی لیکن میزان طبع سوم ۲۰۰۸ء کے ص ۳۴۴ تا ۳۴۱ پر یہ عبارت نظر ثانی کے ساتھ موجود ہے ـــــ میزان ۲۰۰۸ء میں ـــــ غامدی صاحب نے تعبیر وتشریح دین کے لیے تعامل صحابہ، اجماع امت، اصول اہل السنّت والجماعت اور فراہی واصلاحی کسی کو تسلیم نہیں کیا لہٰذا ان کی تعبیرات وتشریحات دین بدلتی رہتی ہیں حتیٰ کہ سنت جیسا ماخذ بھی مسلسل تغیر و تبدل کی زد میں رہتا ہے کیونکہ غامدی صاحب کے یہاں علم کا ذریعہ باہر نہیں انسان کے اندر ہے وہ پیغمبر باطن عقل کی صورت میں ہر فرد کو میسر ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پیغمبر باطن ہر لحہ تغیر پذیر ہے چونکہ غامدی صاحب دین کی تعبیر وتشریح اپنی عقل کے اعتماد پر کرتے ہیں یہ عقل تغیر پذیر ہے لہٰذا دین کی تعریف، تشریح، توجیہہ بدلتی رہتی ہے ۱۹۸۵ء سے ۲۰۱۲ء تک غامدی صاحب نے قرآن، سنت متواترہ، سنت، سنت وحدیث، سنت ثابتہ، حدیث، اجماع وغیرہ پر بے شمار موقف بدلے ہیں ـــــ اسی کا نام ارتقاء ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا یہی غامدی صاحب کا اصول ہے اور یہ ارتقاء کبھی ختم نہیں ہوگا اور اگر ختم ہوگا تو صرف اس لیے کہ غامدی صاحب اور اہل دنیا کے درمیان موت کا پردہ حائل ہو جائے گا ـــــ وہ علم جو مسلسل ارتقاء پذیر ہے اور علم کے حامل فرد کو دعویٰ ہے کہ اس کا علم ترمیم، تصحیح، نظر ثانی کا محتاج ہے تو اس اعتراف کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم ناقص ہے قابل اعتبار نہیں تو ایسے ناقص ادھورے علم کی بنیاد پر عمل کی دنیا کیسے آباد کی جائے ـــــ ایک جانب غامدی صاحب یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ قرآن وسنت کی جو تعبیر

اس کتاب میں پیش کی گئی ہے کئی مقامات پر میرا نقطۂ نظر دوسرے علماء محققین حتیٰ کہ بزرگوں فراہی واصلاحی کی آراء سے بھی بڑی حد تک مختلف ہوگیا ہے تاہم یہ ایک انسان کا کام ہے جو کسی طرح غلطیوں سے مبرا نہیں ہوسکتا میں بار بار اسے دیکھتا اور اس میں ترمیم واضافہ کرتا رہا ہوں آئندہ بھی مجھ پر غلطی واضح کی جائے گی تو میں اس کی اصلاح کروں گا[خاتمہ میزان ص ۶۵۳، ۲۰۰۸ء] لیکن اپنی خامیوں کمزوریوں کو تاہیوں کے اعتراف اور اپنے موقف کے کامل ہونے سے انکار کے باوجود اسی کتاب کے ص ۱۴ پر سنت کی تعریف بیان کرنے کے بعد پیغمبرانہ ادغان کے ساتھ کاملیت ،قطعیت کا دعویٰ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے قرآن ہی کی طرح سنت ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لیے کوئی گنجائش[میزان ص ۱۴ ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کے دونوں دعوے متضاد ہیں اگر سنت پر ان کا موقف قطعی ہے اور بحث ونزاع کی گنجائش نہیں تو اپنی کوتاہیوں کا اعتراف لایعنی بات اور پیش کش تھی بالکل غیر عقلی ہے کہ جب بھی غلطی واضح کی جائے گی میں اصلاح کرلوں گا واضح رہے کہ سنت پر غامدی صاحب کے موقف مسلسل بدلتے رہے ہیں پہلے سنت کی تعریف میں ان کے کئی موقف رہے پھر سنتوں کی تعداد کے مسئلے پر ان کے کئی موقف رہے لیکن ہر مرتبہ دعویٰ ان کا یہی تھا —— ''سنت یہی ہے اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں لہٰذا سنت کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے'' ماخذ مستقل ہوتا ہے غیر متغیر ہوتا ہے متعین ہوتا ہے جو مستقل تبدیلی وتغیر کی زد میں ہو وہ ماخذ کیسے ہوسکتا ہے لیکن غامدی صاحب سنت کی تعریف اور پھر سنتوں کی تعداد بدلتے رہے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ غامدی صاحب کا مطالعہ ناقص تھا انھوں نے علوم اسلامی اور احادیث کے ذخیرے کا مکمل مطالعہ نہیں کیا لہٰذا سنتوں کی تعداد کے بارے میں بار بار مختلف موقف اختیار کرنے کے باوجود وہ دعویٰ قطعیت کا کرتے رہے ناقص علم کے ساتھ کاملیت کے دعویٰ ابرام کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں غامدی صاحب کی سنتوں کی بدلتی ہوئی تعریفیں اور بدلتی ہوئی فہرست ان کی مطبوعات اور ان کے اداروں دانش سرا دارالاشراق اور المورد کے زیر اہتمام شائع ہونے والی مطبوعات کی رشنی میں دیکھتے ہیں جس سے ان کی سیمابی اور سیلابی علمی سرگرمیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ——

۱۹۸۵ء میں سنت پر غامدی کا موقف

[ا] نسخ وترمیم کے اس اختیار کی تردید کے بعد جو سوال خود بخود سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن سے متعلق سنت کو کوئی اختیار کیا حاصل بھی ہے؟ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔قرآن مجید نے سنت کی یہ حیثیت نہایت واضح الفاظ میں بیان کی ہے کہ اس میں تبیین کرسکتی ہے۔قرآن مجید سے متعلق یہی ایک اختیار ہے جو خود قرآن سے سنت کے لیے ثابت ہے۔قرآن کا ارشاد ہے:

بِالْبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ[النحل ۱۶:۴۴] ''اور ہم نے تم پر بھی یہ ذکر اتارا ہے تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو واضح کردو جوان کی طرف نازل کی گئی ہے''۔اس آیت میں یہ بات صاف الفاظ میں فرمائی گرئی ہے کہ خالق کائنات نے اپنا یہ فرمان محض اس لیے پیغمبر کی وساطت سے نازل کیا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے اس کی تبیین کرے، گویا تبیین یا بیان پیغمبر کی منصبی ذمہ داری بھی ہے اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر اس کا حق بھی جو اسے خود پروردگار عالم نے دیا ہے۔دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر مامور من اللہ مبین کتاب ہے۔پیغمبر اور قرآن کا یہی وہ تعلق ہے جسے فن اصول کی شہرۂ آفاق کتاب ''الموافقات'' کے مصنف امام شاطبی نے اس طرح بیان کیا ہے: ''سنت یا تو قرآن کا بیان ہوگی یا اس پر زیادت پس اگر وہ بیان ہے تو اس کا مرتبہ اس چیز کے مقابلے میں ثانوی ہے جس کا وہ بیان ہے اور اگر بیان نہیں ہے تو اس کا اعتبار صرف اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ چیز جو اس میں مذکور ہے قرآن مجید میں نہ پائی جائے''۔[الموافقات للشاطبی، ج۴،ص ۵] ———— شاطبی کے اس بیان سے واضح ہے کہ سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآنِ مجید خاموش ہے، بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے،لیکن اگر کوئی چیز قرآن مجید میں مذکور ہے تو سنت صرف اس کی تبیین کرسکتی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اس سے زیادہ کوئی اختیار سنت کو حاصل نہیں ہے۔[جاوید غامدی، میزان، حصہ اول،ص۸۲،۸۳، ۱۹۸۵ء، دارالاشراق، لاہور]

اس کتاب کے مقدمہ میں غامدی صاحب لکھتے ہیں: نبی ﷺ نے معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو فرمایا: ''تم کس طرح فیصلہ کرو گے''۔معاذ بن جبل نے عرض کیا: ''اس ہدایت کے مطابق جو اللہ کی کتاب میں ہے''۔فرمایا: ''اگر اللہ کی کتاب میں کوئی ہدایت نہ ملے''۔عرض کیا: ''پھر اللہ کے رسولؐ کی سنت کے مطابق''۔فرمایا: ''اگر اس میں بھی نہ ملے''۔عرض کیا: ''پھر میں اپنی رائے سے صحیح

بات تک پہنچنے کی پوری کوشش کروں گا''۔ نبی ﷺ نے اس پر فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے جس نے تمہیں وہ بات کہنے کی توفیق دی جو اللہ کے رسول ؐ کو پسند ہے''۔ میں نے اس کتاب کے مباحث میں اسی طریقے کی پیروی کی ہے [جاوید، المورد، لاہور، شعبان ۱۴۰۵ھ، ۱۹۸۵ء] المورد اور غامدی صاحب ۱۹۸۵ء میں سنت کا وہی مفہوم قبول کرتے تھے جو اہل السنّت والجماعت کا موقف ہے غامدی صاحب کے لیے سنت ماخذ قانون اسلامی تھی۔

سنت قرآن مجید کے بعد دین کا دوسرا قطعی ماخذ ہے ہمارے نزدیک یہ اصول ایک نا قابل انکار علمی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ سنت قرآن مجید کے بعد دین کا دوسرا قطعی ماخذ ہے ہمارے نزدیک یہ اصول ایک نا قابل انکار علمی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمدؐ کے احکامات و ہدایات قیامت کے لیے اسی طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح قرآن واجب الاطاعت ہے رسول کی حیثیت سے آپ کا ہر فعل قول بجائے خود قانونی سند و حجت کی حیثیت رکھتا ہے خود قرآن نے آپ کا یہی مقام بیان کیا ہے کوئی شخص جب تک صاف صاف قرآن کا انکار نہ کردے اس کے لیے سنت کی اس قانونی حیثیت کو چیلنج کرنا ممکن نہیں زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے امر و نہی کی بہرحال بے چون و چراء اطاعت کا حکم قرآن نے دیا ہے مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَہْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ؐ [۵۹:۷][ص ۷۹، ۸۰، محولہ بالا] سنت کو قرآن مجید نے شارح کا منصب دیا ہے سنت قرآن کے مضمرات کو کھولتی ہے یہی وہ کام ہے جس کے نتیجے میں دین کی تشکیل ہوتی ہے سنت کی پیروی ہمارے لیے لازم ہے اور وہ بھی قیامت تک کے لیے قرآن کی طرح واجب الاطاعت [۸۸، ۸۹ محولہ بالا]

نبیؐ نے فرمایا مسلمان کسی کافر کا وارث ہوسکتا ہے نہ کافر کسی مسلمان کا۔ وارث و مورث میں دین کا تعلق باقی نہ رہے اور وارث اپنے مورث کو قتل کر ڈالے ان صورتوں میں قطع منصف کا حکم اسی لیے ہے نخلع ونترک من یفجرک [۶۰:۱] حدیث ہے قاتل مقتول کی میراث نہیں پائے گا [ص ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵] اب میزان میں اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ جزیرہ عرب کے مشرکین کفار کے لیے تھی

اب کافر مسلم ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں ——— وحی خفی کے ذریعے سے اگر کوئی چیز پیغمبر کو ملتی ہے تو وہ قرآن کا حصہ نہیں بن جاتی پیغمبر کی حدیث اور پیغمبر کی سنت ہی کہلاتی ہے۔[ص ۱۳۹]

بیعت سمع و طاعت صرف ارباب اقتدار کے لیے ثابت ہے عہد اطاعت لینے کا یہ طریقہ رسول کی سنت ہے [جاوید غامدی، برہان، ص ۲۰،۲۲] دارالاشراق ۱۴۲، علامہ اقبال روڈ، لاہور، ناشر جاوید غامدی ۱۹۹۲ء] اہل ایمان کی کوئی جماعت کسی خطہ ارض میں اقتدار حاصل کرے اس کے امیر کو اس جماعت کے افراد سے سمع و طاعت کی بیعت لینی چاہیے اس مرحلے سے پہلے اس طرح کی بیعت بدعت ہے جس کا کوئی نبوت نبی کی سنت ثابتہ اور سیرت طیبہ سے پیش نہیں کیا جا سکتا [برہان، ص ۲۸، محولہ بالا] سیدنا حسین کی بیعت مرحلہ دعوت و ترتیب میں نہیں قیام حکومت کے مرحلے میں ہوئی معاملے کی نوعیت کے لحاظ سے ان کی بیعت کو کسی طرح بدعت قرار نہیں دیا جا سکتا [ص ۲۹، محولہ بالا] [ص ۴۵۔۴۶ قرآن کی آیت کا ایک مطلب] رمی جمرات رسم نہیں سنت ہے سنت صرف اس طریقے ہی کو نہیں کہتے جس کی ابتداء کوئی نبی کرے بلکہ نبی کی تصویب و تقریر کے نتیجے میں بھی سنت قائم ہوتی ہے اور اسلام نے اس طرح کے دوسرے طریقوں کو بھی اس حیثیت سے باقی رکھا [ص ۵۶۔۵۷ محولہ بالا] قرآن مجید کے بعد دوسرا ماخذ حدیث و سنت ہے اس کا بیش تر حصہ تواتر عملی کے ذریعے سے ہمیں ملا ہے دین میں یہی دو چیزیں اصلی حجت ہیں اور یہ دونوں اس زمانے میں اسی طرح ہمارے پاس موجود ہیں جس طرح اگلوں کے پاس تھیں [ص ۴۷ محولہ بالا] مخلوط تعلیم کا سلسلہ بالکل بند کر دیا جائے اور طالب علموں کو ہمہ وقت مشغول تن رہنے کے مواقع فراہم کرنے کے بجائے جہاد و قتال کے لیے ضروری تربیت دی جائے۔[ص ۸۳، محولہ بالا] مساجد کے بارے میں ہمیں نبی نے یہ سنت قائم کی کہ نماز جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت امیر ریاست اور اس کے عمال ہی کریں گے نبیؐ کے بعد جو خلافت آپ کے صحابہ نے قائم کی اس میں یہ سنت پوری شان کے ساتھ قائم رہی مسجدوں کے بگاڑ کی اصلاح یقیناً اس سنت کو زندہ کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ نماز جمعہ کا خطاب اس کی امامت سربراہ حکومت گورنر اور عمال کریں ان کے علاوہ تمام مساجد میں جمعہ کی اقامت ممنوع قرار دی جائے مساجد کا اہتمام حکومت خود کرے [ص ۸۴، محولہ بالا]

[تصوف] وہ عالمگیر ضلالت ہے جس نے دنیا کے ذہن ترین لوگوں کو متاثر کیا ہے [ص ۸۶] لطف کی بات یہ ہے کہ غامدی صاحب نے اپنا علمی سلسلہ نسب ۲۰۱۱ء میں تمام ابن تیمیہ اور امام ابن

القیم سے جوڑا ہے اور خود کو اسی سلسلہ الذہب کا تسلسل قرار دیا ہے اتفاق سے یہ دونوں بزرگ بھی تصوف کی عالمگیر ضلالت میں مبتلا تھے امام ابن تیمیہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے مرید تھے ان کے پاس شیخ جیلانی کا خرقہ تھا فتاوی ابن تیمیہ کی جلد دس گیارہ سلوک وتصوف جیسی عالمگیر ضلالت کی تشریحات و تفصیلات پر مشتمل ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ غامدی صاحب کا مکتب فکر بھی جہالت وضلالت پر ہی مشتمل ہے۔

اخبارات رسائل ویڈیو فلم ٹی وی زمانہ قدیم کے ذرائع کی طرح حقائق دعوت علم خبر ایک دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ ہے قرآن وسنت نے بھی ان میں سے کسی چیز کو علی الاطلاق ناجائز قرار نہیں دیا قرآن وسنت نے اس معاملے میں مرد وعورت میں کوئی تفریق نہیں رکھی [ص۹۲] ذرائع ابلاغ میں عورت قرآن مجید کی صریح ہدایت کے مطابق ——— لہٰذا دین کی وہ تعبیر جو صرف ایک فرد کے فہم، عقل پر منحصر ہو اور یہ تعبیر بھی ۲۷ سال کے عرصے میں مسلسل تغیر پذیر رہی ہو اس پر اعتماد کیسے کیا جاسکتا ہے جس تعبیر وتشریح وتوضیح دین پر خود غامدی صاحب کو اعتماد نہیں ہے اور جس میں غلطی کا امکان وہ آج بھی تسلیم کررہے ہیں ایسے دین پر عمل کب کیا جائے ——— یہ ہے اصل سوال؟ دین کا فہم اگر قرآن سنت اجماع کے سوا محض عربیت، لغت، عقلی دلیل سے متعین کیا جائے گا تو وہ کبھی بھی مستقل اور مکمل نہیں ہوگا اس کی مثال یہ ہے کہ میراث میں وصیت کے حکم کی آیت کا ایک مطلب غامدی صاحب نے عربیت، لغت، زبان کی ابانت، کلام عرب، قرآن وسنت کی روشنی میں ۱۹۸۵ء میں میزان حصہ اول میں بتایا تھا کہ وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی ——— میزان حصہ اول میں قانون میراث کے تحت لکھتے ہیں مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ‌ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا‌ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا [۴:۱۱] اس آیت میں اللہ نے ان نادانوں کو جو علم کے غرے یا ذاتی میلان کی بنیاد پر اس خدائی قانون میں ترمیم کرنا چاہیں تنبیہہ فرمائی ہے کہ یہ تقسیم اللہ کے علم وحکمت پر مبنی ہے [ص۵۸] وارث بنانے کا عمل کسی حق دار کے لیے ضرر کا موجب نہیں ہونا چاہیے اللہ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرمادیے ہیں [ص۶۵، ۶۶] ——— مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ‌ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا‌ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا

[۴:۱۱] اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ان وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا عقل کے غرے یا ذاتی میلان کی بنا پر جو اس الٰہی قانون میں تغیر کرنا چاہیں اللہ نے ان کو تنبیہہ فرمائی ہے رسول اللہ کی حدیث لا وصیہ لوارث قرآن مجید کے اسی مدعا پر مبنی ہے [جاوید غامدی قانون معیشت ص ۵۶ ، طبع اول ۱۹۹۷ء المورد لاہور] مِنْ م بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا [۴:۱۱] اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو عام حالات میں اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ان وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا چنانچہ وارثوں کے لیے اگر کوئی وصیت وہ اب کرے گا تو اس صورت میں کہ جب اس کی کوئی ضروریات یا خدمت یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز اس کا تقاضہ کرتی ہو [جاوید غامدی، قانون معیشت [میزان] ص ۴۴، ۴۵، المورد لاہور ۲۰۰۵ء] دوسرے لفظوں میں رسالت مآب کو بھی قرآن کے الفاظ کا صحیح ادراک نہیں ہو سکا انہوں نے خواہ مخواہ یہ حدیث بیان کی لا وصیہ لوارث ترمذی کتاب الوصایا کی یہ حدیث غلط ہے پیغمبر کو عربیت کا صحیح فہم حاصل نہیں تھا حالانکہ غامدی صاحب ۱۹۸۵ء میں اس حدیث سے قرآن کی آیت میراث کی تشریح کر رہے تھے ——— رسالت مآبؐ تعامل صحابہ اور اجماع امت کو رد کر کے صرف الفاظ سے فہم قرآن کو متعین کرنے کی کوشش ظنی قیاس ہوگی اور غامدی صاحب کی طرح ہر عہد میں قوس وقزح کی طرح رنگ برنگ رہے گی۔

میزان ۲۰۰۲ء میں لکھتے ہیں ترکے میں سے پہلے قرض ادا کیا جائے گا وصیت اگر کی ہے تو پوری کی جائے گی پھر وراثت تقسیم ہوگی وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی [ص ۱۳۵، میزان طبع دوم ۲۰۰۲ء] ——— میزان ۲۰۰۸ء طبع سوم میں ارتقاء ہوا تو فرمایا وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی الا یہ کہ اس کے حالات یا اس کی کوئی خدمت یا ضرورت کسی خاص وصورت حال میں اس کا تقاضہ کرے [ص ۴۹۹، ۵۰۰ میزان طبع سوم مئی ۲۰۰۸ء] مئی ۲۰۰۸ء تک حضرت کا یہی موقف تھا مگر نومبر ۲۰۰۸ء میں مقامات طبع اول شائع ہوئی تو اس میں عربیت، لغت، زبان و بیان، محاورہ عرب کی رو سے اس آیت کا مفہوم بالکل ہی بدل گیا ''وصیت کے لیے کوئی حد مقرر کی گئی ہے یا آدمی جس کے لیے جتنی چاہے وصیت کر سکتا ہے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں کسی تحدید کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اللہ

تعالیٰ نے علی الاطلاق فرمایا ہے کہ یہ تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی زبان و بیان کے کسی قاعدے کی رو سے اس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی [ص۱۴۲ مقامات طبع اول ۲۰۰۸ء] اگر قرآن کی اس آیت میراث کا مفہوم صحابہ کرام، صلحائے امت حتیٰ کہ حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی نظم قرآن کے فلسفے کے بانی اور عہد حاضر کے دوسب سے بڑے عالم اور غامدی صاحب کے دو بزرگ بھی نہیں سمجھ سکے تو غامدی صاحب کو اس آیت کا درست مطلب اب کون سمجھا سکتا ہے ——

غامدی صاحب کا کمال یہی ہے کہ وہ ایک ہی آیت کے بیک وقت تین بلکہ تین سے زیادہ مطالب بھی بتاتے ہیں اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ قرآن کی ایک آیت کا مطلب ایک ہی ہوسکتا ہے ایک سے زیادہ نہیں ورنہ قرآن چیستان بن جائے گا —— ان کے متعین اصول کے تحت قرآن کی ایک آیت کا صرف ایک مطلب ہوسکتا ہے وہ لکھتے ہیں [قرآن کی آیت اور سورہ] اپنے وجود پر اس طرح آپ ہی دلیل بن جاتی ہے کہ ان کے لیے پھر کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی [ص۲۲، میزان] مخاطب کی رعایت ملحوظ نہ رہے تو قرآن کی شرح و وضاحت میں متکلم کا منشاء بالکل باطل ہو کر رہ جاتا ہے اور بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے [ص۲۴ میزان] یہ میزان عدل ہے ہر شخص اس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق ہے کیا باطل [ص۲۴ میزان] یہ الفرقان بھی ہے ہر معاملے میں یہی کتاب قول فیصل اور یہی صحیفہ معیار ہے تمام اختلافات میں یہی مرجع ہے اس پر کوئی چیز حاکم نہیں ہوسکتی ہر شخص پابند ہے کہ اس پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے [ص۲۴ میزان] دوم یہ کہ سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے [ص ۴۷ میزان] خدا کا پیغمبر بھی اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کرسکتا [ص ۲۵ میزان] اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے جو کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت کے ساتھ کہتا ہے اور کسی معاملے میں اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا وہ اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتا ہے [ص ۲۵ میزان] اگر قرآن کے الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو ان میں سے ہر چیز جائے گی [ص۳۳ میزان] دستاویز فیصلے احکام اطلاعات علوم کے ابلاغ کے بارے میں اگر ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ان کے الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو ان میں سے ہر چیز بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گی انسان کا اجتماعی شعور زمان کے معاملے میں کبھی ......نہیں ہوتا لفظ و معنی کا سفر کبھی الگ الگ نہیں ہوتا دنیا کی سب زبانوں میں یہ انسان کا مشترک سرمایہ ہے زبان

سے متعلق یہی حقیقت ہے جس کی بنیاد پر ہم جو کچھ بولتے اور لکھتے ہیں اس اعتماد کے ساتھ بولتے اور لکھتے ہیں کہ دوسرے اس سے وہی کچھ سمجھیں گے جو ہم کہنا چاہتے ہیں [ص ۳۳، میزان] قرآن آپ اپنی تفسیر کرتا ہے [ص ۴۳ میزان] قرآن کا طالب علم لسان العرب صحاح جوہری کی رہنمائی کے بغیر اس لفظ کے پورے مالہ و ماعلیہ کو یقین سے سمجھ لیتا ہے کہ کوئی چیز اس کے یقین کو جھٹلا نہیں سکتی [ص ۴۳ میزان] جو چیز قرآن کو برہان قاطع بناتی ہے القرآن لایحتمل الاتاویلا واحدا قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہر گز کوئی گنجائش نہیں ہو تنہا اس کا نظم ہی ہے [ص ۵۱ میزان] چونکہ میں نے نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی ول اختیار کیا ہے اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیے کہ اس تفسیر میں مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کیونکہ نظم کا یہی تقاضہ ہے [ص ۵۲ میزان] قرآن کے موضوع اور مدعا کی تعیین میں بھی جو رہنمائی اس سے قرآن کے طالب کو حاصل ہوتی ہے وہ قرآن سے باہر کسی دوسرے ذریعے سے ہر گز نہیں حاصل ہو سکتی [ص ۵۵ میزان] اس دور کی تاریخ سے قرآن کے بعض اشارات کو سمجھنے اور غوامض کھولنے میں بڑی مدد ملتی ہے [ص ۵۵ میزان] ذخیرہ احادیث کی صحت قابل اطمینان نہیں ورنہ ان کی وہی اہمیت ہوتی جو اہمیت سنت متواترہ کی ہے [ص ۵۶] قرآن کی شرح میں احادیث و آثار حجت میں قرآن پر حاکم نہیں [ص ۵۶] اگر غامدی صاحب کے یہ تمام اصول درست ہے تو صرف اتیک آیت میراث میں غامدی صاحب نے کئی مطالب کیسے اخذ کیے جو پیغام بر، مصلح، عالم، مجتہد اپنے اصولوں اور اپنے منہاج کی خود پیروی نہیں کرتا اس کا دین اصول منہاج دوسروں کے لیے حجت ہو سکتا ہے؟ لاتقولون لما یفعلون ــــــ ان کا حال ابن شہاب زہری جیسا ہے جن کے بارے میں امام لیثؒ بن سعد نے امام مالکؒ کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

وکان یکون من ابن شہاب اختلاف کثر اذ القیناہ، واذا کاتبہ بعضنا فربما کتب فی الشیء الواحد علی فضل رأیہ وعلمہ بثلاثۃ انواع ینقض بعضھا بعضاً، ولا یشعر بالذی مضیٰ من رأیہ فی ذلک الامر، فھو الذی یدعونی الی ترک ما انکرت ترکی ایاہ [تاریخ یحییٰ بن معین، الدوری ۱۰۹/۴] ــــــ ''اور ہم لوگ جب ابن شہاب سے ملتے تھے تو بہت سے تضادات سامنے آتے اور ہم میں سے کوئی جب ان سے لکھ کر دریافت کرتا تو علم و عقل میں فضیلت کے باوجود ایک ہی چیز کے متعلق ان کا جواب تین طرح کا ہوا کرتا تھا

جن میں سے ہر ایک دوسے کا نقیض ہوتا اور انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس سے پہلے کیا کہہ چکے ہیں۔ میں نے ایسی ہی چیزوں کی وجہ سے انھیں چھوڑا تھا، جسے تم نے پسند نہیں کیا''۔[میزان، جاوید غامدی، ص۳۱،۳۲] جمع قرآن کے متعلق ابن شہاب کی روایات پر سفاکانہ نقد کرتے ہوئے غامدی صاحب OO۔۔۔

غامدی صاحب کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کے مراحل علمی بھی ان کے متضاد بیانات کی روشنی میں ناقابل فہم ہوگئے ہیں یا تو ان کا حافظہ نہایت کمزور ہے یا ان کی طبیعت میں کچھ نیا پیش کرنے کا جذبہ ایک ایسی باطنی قوت میں تبدیل ہوگیا ہے جو ہمیشہ انہیں اپنے بیانات تبدیل کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے اور اس بات پر بھی آمادہ کرتی ہے کہ وہ ان بیانات میں کوئی تضاد بھی محسوس نہ کرسکیں ــــــ مقامات کے مضمون ''میرے بعد'' [ص ۴۵، طبع اول، ۲۰۰۸ء] قافلہ بے خوداں [ص ۸۲، طبع اول ۲۰۰۸ء] روداد سفر [ص ۱۸، طبع اول ۲۰۰۸ء] قافلہ در قافلہ [ص ۲۹ طبع اول ۲۰۰۸ء] کے تقابلی جائزے سے ان کی عمر کا معمہ حل نہیں ہوتا ان مضامین میں اپنی عمر کے بارے میں انھوں نے بے شمار متضاد متخالف روایات نقل کی ہیں ــــــ مگر حصول علم کے مراحل کا معمہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے ــــــ مقامات میں لکھتے ہیں نانگپال گئے تھے تو میں تیسری جماعت میں تھا پانچویں تک مولوی نور احمد صاحب سے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہا انھوں نے شرح جامی تک عربی اور پند نامہ شیخ عطار تک فارسی پڑھائی والد صاحب کسی بات پر اپنے آجر [میاں صاحب] سے ناراض ہوئے اور ملازمت چھوڑ کر واپس پاک پتن آگئے مجھے بھی آنا پڑا مولوی صاحب سے تعلیم منقطع ہوگئی [ص ۱۹ مقامات طبع اول ۲۰۰۸ء] اسی کتاب میں لکھتے ہیں کم و بیش بیس سال پہلے [یہ ۱۹۶۶ء کا ذکر ہے کیونکہ ۱۹۸۶ء کی تحریر ہے] اسی شہر [پاک پتن] کے ایک مدرسے میں چھٹی یا ساتویں جماعت کا طالب علم تھا مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ درس نظامی کی کتابیں بھی اس وقت تک میں نے غالبًا کافیہ اور شرح جامی تک پڑھ لیں تھیں [ص ۴۵، طبع اول ۲۰۰۸ء] یہ دونوں بیانات متضاد ہیں اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں بینک کے سنتری نے میرے ہاتھ میں خلافت کے موضوع پر ایک علمی کتاب دیکھی اس نے پوچھا تم یہ کتاب پڑھو گے؟ تمہارے ہاتھ میں ــــــ میں نے ایک دن عربی کی ایک کتاب دیکھی تھی تم عربی جانتے ہو؟ جانتا ہوں میں نے جواب دیا تم نے عربی کہاں پڑھی ہے؟ اس نے عربی میں مجھ سے سوال کیا تو میں حیران رہ گیا میں عوام کے لباس میں ایک عالم کو دیکھ رہا تھا

تم جو کتاب لے کر جا رہے ہو اسے پڑھ لو یہ ایک بڑے عالم کی کتاب ہے میں تمھیں ایک اور کتاب دوں گا جس میں اس کتاب پر علمی تنقید کی گئی ہے [ص ۴۷، طبع سوم ۲۰۰۸ء] اس عبارت میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ چھٹی ساتویں جماعت میں غامدی صاحب نہ صرف عربی سمجھ لیتے تھے پڑھ لیتے تھے بول بھی لیتے ہوں گے ــــــ اس تحریر کے مطابق ان کی عمر اس وقت دس سال تھی اور سن ۱۹۶۶ء تھا کیونکہ تحریر ۱۹۸۸ء کی ہے۔ اگر غامدی صاحب اتنی کم عمری میں اتنی عمدہ عربی جانتے تھے تو ۱۹۷۶ء میں انھوں نے ''شواہد الفراہی'' کے عنوان سے غلط سلط عربی میں جو تذکیر و تانیث کی غلطیوں کا بھی مجموعہ ہے ایک شاہکار کیسے تصنیف کر لیا ــــــ اس سے زیادہ المناک بات یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کی یہ غلط سلط عربی تحریر جب ۲۰۰۶ء میں دوسری مرتبہ ''مقامات'' میں طبع ہوئی اور اس کتاب کا دیباچہ غامدی صاحب نے ۱۹۹۹ء میں لکھا تو وہ اس غلط سلط تحریر کا ناقدانہ جائزہ لینے کی صلاحیت سے بھی محروم تھے ۱۹۷۶ء اور ۱۹۹۹ء میں تیئس سال کا فاصلہ ہے تیئس سال پہلے کی غلط عربی کی تصحیح کی اہلیت اگر غامدی صاحب اپنے طویل علمی سفر میں پیدا نہیں کر سکے تو ان کی عربی دانی پر کیسے اعتماد کیا جائے؟ ان کے حلقے سے وابستہ مفکرین کی بھی عربی دانی اتنی کمزور تھی کہ معز امجد، سلیم شہزاد، رفیع مفتی، ڈاکٹر فاروق خان، خورشید احمد ندیم کو بھی جاوید غامدی کی غلط سلط عربی پر کوئی تردد تک محسوس نہ ہوا اور نہ یہ کتاب شائع ہی نہ ہوتی ــــــ جو شخص امت کے ہر جلیل القدر عالم پر تنقید کرتا ہو حتیٰ کہ حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی کے فہم دین اور فہم عربیت کو بلکہ ان کے تراجم و تفاسیر قرآن اور فہم قرآن و سنت کو بھی مستند تصور نہیں کرتا اس کی عربی تو کم از کم ایسی ہونی چاہیے کہ کوئی اس پر انگلی نہ اٹھا سکے۔

جو مصنف اپنی قدیم غلط سلط تحریر کو ربع صدی بعد بھی درست کرنے سے قاصر ہو اور تصحیح کے بغیر اسے شائع کر دے ایسے مصنف کے علم، تبحر، بصارت، بصیرت، فہم دین، اصابت رائے پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے اور دین ایسے ذریعے سے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے جو اس قدر غیر معتبر ہو ــــــ ۲۰۰۶ء میں جب ماہنامہ ساحل کراچی نے غامدی صاحب کی اس عربی تحریر کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا تو کتاب سلط بازار سے غائب کر کے ایک جعلی کتاب اسی نام سے ۲۰۰۸ء میں شائع کی گئی جس پر طبع اول لکھا گیا ــــــ کیا یہ بھی دیانت دارانہ بد دیانتی ہے ــــــ دین ایک بد دیانت شخص سے کیسے اخذ کیا جائے ہماری تاریخ تو ایسے ذریعے کی نفی کرتی ہے حدیث میں آتا ہے ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم

[مشکوٰۃ] یہ علم ہی تمہارا دین ہے تو یہ دیکھ لو کہ کس سے تم دین اخذ کر رہے ہو ــــــ صرف پیغام نہیں پیغام کا ذریعہ بھی اہم ہے اللہ تعالیٰ اپنا دین ایسے اشخاص کے ذریعے امت تک پہنچا تا ہے جن کے کردار کی گواہی اس پیغمبر کے دشمن بھی دیتے ہیں صداقت کے بغیر کسی داعی کا پیغام کسی کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا ــــــ رسالت مآب ؐ نے جب دین پیش کیا تو اس کی حقانیت کی دلیل یہ دی کہ میں تمہارے درمیان رہا ہوں کیا میں نے کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولا ہے اور آپ کے دشمنوں نے شہادت دی کہ بلاشبہ آپ صادق اور امین ہیں آپ جھوٹ نہیں بول سکتے غامدی صاحب رسالت مآب کے علم دین کے وارث ہیں ــــــ ان سے اسی رویے کی امید ہے جو رسالت مآب کا تھا اہل دین عالم دین ہی اگر جھوٹ بولے ــــــ دھوکہ دے اور بد دیانتی کا ارتکاب کرے تو ایسے عالم سے دین کیوں حاصل کیا جائے؟

ــــــ غامدی صاحب نے میزان ۲۰۰۸ء میں مبادی تدبر قرآن کے تحت لکھا ہے ''قرآن مجید پر تدبر میں ان مبادی کوملحوظ رہنا چاہیے [۱] عربی معلیٰ ــــــ قرآن کا فہم اب اس زبان کے صحیح علم اور صحیح ذوق پر منحصر ہے آدمی اس زبان کا جید عالم اور اس کے اسالیب کا ذوق آشنا ہو قرآن کے مدعا تک پہنچنے میں کم سے کم اس کی زبان اس کی راہ میں حائل نہ ہوسکے [۲] زبان کی ابانت تفسیر قرآن کے لیے زبان کی ابانت خود قرآن کی نص سے ثابت ہے۔[۳] اسلوب کی ندرت، [۴] میزان فرقان اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے یہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت کے ساتھ کہتا ہے اور کسی معاملے میں بھی اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں وہ نہ اس سے مختلف ہے نہ متبائن اس کے شہرستان معانی تک پہنچے کا ایک ہی دروازہ ہے اور وہ اس کے الفاظ ہیں وہ اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتے ہیں اس میں کسی ریب وگمان کے لیے ہرگز گنجائش نہیں ہوتی یہ دونوں باتیں قرآن کے میزان وفرقان ہونے کا لازمی تقاضہ ہیں [میزان ص ۱۵ تا ۲۵ طبع سوم ۲۰۰۸ء] امام رازی کی یہ دلیل کہ ہمارا فہم قرآن زبان و بیان سے متعلق علوم لغت نحو اور بلاغت پر موقوف ہے وہ سب ظنی ہیں اور جو چیز ظن پر موقوف ہو وہ بدرجہ اولیٰ ظنی ہے المقدمات ظن محض والموقوف علی الظن اولیٰ ان یکون ظناً [التفسیر الکبیر ۱/ ۲۸] کے رد میں غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال اگر پیدا ہو جائے کہ [قرآن] ان کے الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو ان میں سے ہر چیز [دستاویزات، فیصلے، احکام، اطلاعات] بالکل

بے معنی ہو کر رہ جائے گی چنانچہ یہ نری سوفسطائیت ہے جس کے لیے علم کی دنیا میں گنجائش نہیں پیدا کی جاسکتی [ص ۳۳ محولہ بالا] ـــــ

☆☆☆☆☆ غامدی صاحب کی سوفسطائیت: غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ قرآن کے معانی تک پہنچنے کا ایک ہی دروازہ ہے اور وہ اس کے الفاظ ہیں جن کا مفہوم قطعی ہے لہٰذا امام رازی کی دلیل سوفسطائیت ہے لیکن غامدی صاحب نے صرف ایک آیت میراث کی تشریح میں صرف الفاظ کے ذریعے مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی انہوں نے تاریخ امت، تعامل امت، تعامل صحابہ اور اجماع امت کو نظر انداز کیا تو اس کا نتیجہ کیا نکلا نری سوفسطائیت غامدی صاحب کی دلیل خود ان کے خلاف حجت بن گئی غامدی صاحب کی سوفسطائیت کے نمونے سنت کی کئی متغیر تعریفوں، آیت میراث اور آیت حجاب پر ان کے کئی متضاد آراء میں دیکھے جاسکتے ہیں امام رازی پر طنز و طعن کے تیر برساتے ہوئے غامدی صاحب بھول گئے دلوں کو زخم نہ حرف ناملائم سے یہ تیر وہ ہے کہ جو لوٹ کر بھی آتا ہے ـــــ

پرویز صاحب پر تنقید کرتے ہوئے غامدی صاحب نے پرویز صاحب کے فہم قرآن پر نقد کرتے ہوئے لکھا تھا

[حوالہ ۲۰۰۴ء کی تقریر]

اب غامدی صاحب خود اپنے وضع کردہ اس اصول کو نظر انداز کر کے پرویز صاحب کی طرح سنت، مغامل صحابہ، تعامل امت، اجماع امت، تاریخ امت کو نظر انداز کر کے صرف اور صرف لغت نظم قرآن، منطق، فلسفہ، عقل ذاتی، فہم واحد، کی بنیاد پر محاورہ عرب اور کلام عرب کے ذریعے قرآن کی آیات کے مفاہیم متعین کر رہے ہیں اور ہر مرتبہ ٹھوکر کھا رہے ہیں۔

غامدی صاحب نے اپنے علم کا رعب ڈالنے کے لیے یہ بھی بتایا ہے کہ دس سال کی عمر میں ۱۹۶۲ء میں انھوں نے مولانا مودودی کی کتاب خلافت وملوکیت کا مطالعہ کرلیا تھا جب کہ ۱۹۶۲ء میں خلافت وملوکیت کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئی تھی پہلی مرتبہ خلافت وملوکیت ـــــ میں شائع ہوئی جب کتاب ہی شائع نہیں ہوئی تو اس پر تنقیدی کتاب کے شائع ہونے اور اس کے مطالعے کا دعویٰ محض افسانہ طرازی ہے ـــــ ۱۹۶۲ء میں غامدی صاحب ساتویں جماعت میں تھے پھر لاہور آ گئے لکھتے ہیں ''دسویں کے بعد میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا [مقامات ص ۲۱، طبع سوم ۲۰۰۸ء] میں

گورنمنٹ کالج میں کم وبیش پانچ برس رہا اس زمانے میں شعر کہے ان میں سے کچھ فیروز سنز کے انگریزی ماہنامہ پاکستان ریویو کے ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء کے شماروں میں شائع ہوگئے [ص ۲۳، مقامات ۲۰۰۸ء]

یہ بات ناقابل فہم ہے کہ ۱۹۶۶ء میں وہ چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھے اور ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے شعر و شاعری بھی کر رہے تھے حالانکہ اگر ۱۹۶۶ء میں وہ ساتویں میں تھے تو ۱۹۶۹ء میں وہ میٹرک میں ہوں گے —— میٹرک کے بعد اگر وہ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیتے —— تو یہ داخلہ ۱۹۷۰ء میں ممکن ہوتا اس کے بعد وہ پانچ سال گورنمنٹ کالج میں گزارتے تو کالج میں ان کی تعلیم کا عرصہ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء ہوتا لیکن وہ گورنمنٹ کالج کا دور ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء بیان کر رہے ہیں —— اگر غامدی صاحب ۷۰ سے ۷۵ تک گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم رہے تو ان کے وہ تمام بیانات خود بخود غلط ثابت ہوجاتے ہیں جس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے —— ۱۔ کہ ۱۹۷۰ میں انہوں نے منڈی مرید کے میں دارالاشراق کے نام سے اکیڈیمی قائم کی جو ۱۹۷۸ء تک کام کرتی رہی —— ۲۔ ۱۹۷۳ء میں وہ جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے اور جماعت اسلامی میں تحقیق کی ذمہ داری قبول کرلی —— ۳۔ ۱۹۷۳ء میں ہی وہ اصلاحی صاحب کے شاگرد بن گئے —— ۴۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۵ء تک وہ مختلف تنظیمیں بناتے رہے رسالے نکالتے رہے تحریک چلانے، دارالعلوم بنانے کی کوشش بھی کرتے رہے —— گورنمنٹ کالج کا طالب علم یہ تمام کام بیک وقت کیسے انجام دے سکتا ہے یہ ہے مرکزی سوال؟ وہ لکھتے ہیں آنرز حصہ اول کا امتحان پاس کرلینے کے بعد آخری سال میں تھا کہ امام حمید الدین فراہی کی بعض کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ایک حیرت انگیز دنیا تھی کسی کتاب کے دیباچے میں امین احسن اصلاحی کا ذکر تھا دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ مولانا سے ملاقات کی جائے واپڈا کالونی میں استاد امام سے پہلی ملاقات ہوئی ملاقات میرے لیے نئے قرآن کی دریافت تھی عرض کیا کہ آپ کے طریقے پر قرآن کا طالب علم بننا چاہتا ہوں۔ یہ ۱۹۷۳ء کی ایک شام تھی میری طالب علمی کا دوسرا دور اسی سے شروع ہوا اس کے بعد یہ سلسلہ کم وبیش دس سال جاری رہا ۱۹۸۳ء میں تعلیم کا یہ مرحلہ ختم ہوا [ص ۲۶، مقامات، طبع اول، ۲۰۰۸ء] میں نے امین احسن کو سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں دیکھا اور پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا میں نے ہمت کی اور اسی بند دروازے پر بیٹھ گیا [ص ۱۰۰ مقامات ۲۰۰۸ء] ایک جانب یہ دعویٰ ہے دوسری جانب اسی کتاب میں یہ

دعویٰ بھی ہے کہ ''اس زمانے میں [۱۹۷۳ء] سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا ان سے سرپرستی کی درخواست کی ادارے کے لیے میرے اور مولانا کے نام سے ایک مشترک اکاونٹ کھولا گیا جس میں مولانا ہر مہینے ایک ہزار روپے جمع کراتے انہی کی دی ہوئی عمارت ا۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ میں منتقل ہوگئے اسے ادارہ معارف اسلامی کی ایک شاخ یا نئے ادارے کی حیثیت سے منظّم کیا جائے گا اس سے پہلے ہی مولانا کے ایماء سے میں جماعت اسلامی کا رکن بن چکا تھا [ص ۳۳، ۳۴، مقامات ۲۰۰۸ء] تینوں بیانات تضادات کا شاہکار ہیں —— اگر اصلاحی صاحب کا دروازہ اور ان کا علم دیکھنے کے بعد بھی مولانا مودودی کے دروازے پر غامدی صاحب تشریف لے گئے تو اس کی کیا منطقی توجیہہ ہے آگ اور پانی کے درمیان کیا غامدی صاحب رابطے کا فریضہ انجام دے رہے تھے جماعت اسلامی پر اصلاحی صاحب کی تنقیدات کیا ان کی نظر سے نہیں گزری تھی صرف دو کشتیوں میں نہیں بلکہ بیک وقت کئی کشتیوں میں سواری —— غامدی صاحب کا ایام طالب علمی سے دلچسپ ترین مشغلہ معلوم ہوتا ہے جو کشتی ڈوب جاتی ہے کہہ دیتے ہیں یہ میری نہیں تھی جو تیرتے ہوئے پار اتر جاتی ہے اس پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں کہ یہ میری ہے —— غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۹۷۵ء میں میں مولانا مودودی کے گھر کے بالکل سامنے مقیم تھا اصلاحی صاحب میرے ہاں تشریف لائے کھانے کے بعد صحن میں نکلے تو پوچھا مولانا مودودی کا گھر یہی ہے [ص ۱۱۷ مقامات ۲۰۰۸ء] حیرت ہے کہ اصلاحی صاحب نے غامدی صاحب سے کبھی نہ پوچھا کہ تم میرے شاگرد ہو میں نے تمہیں ہدایت کی تھی ''میرے طریقے سے پڑھنا چاہتے ہو تو لیڈری کے خیالات ذہن سے نکال کر علم ونظر اور فکر و تدبر کے لیے گوشہ گیر ہونا پڑے گا ہمارے مدرسۂ علمی میں کوئی شخص اس عزم و ارادے کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا [ص ۲۵ مقامات ۲۰۰۸ء] لیکن تم گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی پڑھ رہے ہو اپنی اکیڈیمی دارالاشراق کے نام سے منڈی مریدکے میں چلا رہے ہو جماعت اسلامی کے رکن بھی ہو ادارہ معارف اسلامی میں جماعت اسلامی کے لیے کام بھی کر رہے ہو رسالہ اشراق و اعلام بھی نکال رہے ہو اور میری شاگردی بھی اختیار کر رکھی ہے —— مولانا اصلاحی کے مزاج سے جو لوگ واقف ہیں اور جماعت اسلامی کے بارے میں ان کے قلم سے جو مضامین میثاق وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں ان میں اصلاحی صاحب کا غیض و غضب دیکھا جاسکتا ہے یا تو غامدی صاحب نے انھیں جماعت اسلامی سے اپنا تعلق نہیں بتایا —— یا وہ مولانا اصلاحی کے

شاگرد ہی نہیں تھے جیسا کہ اصلاحی صاحب کے حلقہ تدبر قرآن کے اکثر لوگوں کی رائے ہے اور خالد مسعود صاحب تو انتقال سے پہلے بار بار غامدی صاحب کے افکار پر سخت نقد کرتے اور اپنے حلقہ احباب میں کہتے تھے کہ غامدی صاحب کبھی اصلاحی صاحب کے باقاعدہ شاگرد نہیں رہے کبھی کبھار ان کے درس قرآن و حدیث میں شریک ہوتے تھے شاگردی کا دعویٰ صرف امام اصلاحی کے ذریعے اپنے آپ کو نمایاں کرنے اور اپنے مجہول علمی شجرۂ نسب کو معتبر ٹھہرانے کے لیے کیا گیا ہے خالد مسعود صاحب کا یہ بیان مقامات میں درج غامدی صاحب کی متضاد روایات کے باعث قرین قیاس محسوس ہوتا ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۷۵ء میں غامدی صاحب جماعت اسلامی میں بھی تھے امین احسن اصلاحی کے سامنے زانوئے تلمذ بھی طے کر رہے تھے اور نومبر ۱۹۷۰ء میں قائم کردہ اکیڈمی ''دارالاشراق'' کے رفقاء کی تعداد میں اضافے کے لیے بھی ۱۹۷۵ء میں کوشاں تھے [ص ۳۶، مقامات، ۲۰۰۸ء] ان رفقاء کی کفالت کی ذمہ داری بھی ان کا ادارہ اٹھانا چاہتا تھا [ص ۳۷، مقامات ۲۰۰۸ء] یہاں تک کہ ۱۹۷۵ء میں ان کی تعداد سات تک پہنچ گئی ان میں ساجد علی، الیاس احمد، محمد رفیق، مستنصر میر، منصور الحمید شامل تھے [ص ۳۸ مقامات ۲۰۰۸ء] ایک جانب غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ نومبر ۱۹۷۰ء میں وہ اکیڈمی وجود میں آئی جو دارالاشراق کے نام سے لاہور سے ۲۶ کلومیٹر دور مرید کے کی بستی میں ۱۹۷۸ء تک باقاعدگی سے کام کرتی رہی [ص ۳۶، مقامات ۲۰۰۸ء] مگر اسی کتاب میں درج ہے مولانا [مودودی] سے اجازت چاہی چودھری الیاس کی دعوت پر لاہور کے قریب ہی واقع ان کے گاؤں مرید کے منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا ۱۹۷۶ء کے آخر میں ہم یہاں پہنچے [ص ۳۴، مقامات ۲۰۰۸ء] رفقاء کی کفالت کے لیے کوئی معقول بندوبست کیا جائے وہ کسی طرح میسر نہیں ہوئے لہٰذا کم و بیش دو سال تک مرید کے میں بقاء کی جدوجہد کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اب کے سوا کوئی کوئی چارہ نہیں کہ اس ادارے کی بساط لپیٹ دی جائے اور برسوں کے ساتھی بادل نخواستہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے [ص ۳۶، مقامات ۲۰۰۸ء] اسی تحریر کے نیچے یہ بھی درج ہے کہ دارالاشراق اکیڈمی ۱۹۷۰ء سے اپریل ۱۹۹۷۸ء تک باقاعدگی سے کام کرتی رہی [ص ۳۶] —— سوال یہ ہے کہ اگر ۱۹۷۰ء میں منڈی مرید کے میں غامدی صاحب کی اکیڈمی قائم ہوگئی تھی تو غامدی صاحب اپنی اکیڈمی میں رہائش اختیار کرنے کے بجائے چودھری الیاس کی دعوت پر مرید کے کیوں منتقل ہو رہے تھے؟ منڈی مرید کے میں حضرت کا ادارہ

کام کر رہا تھا اور ۱۹۷۰ء سے مسلسل کام میں مصروف تھا تو جماعت اسلامی کی رہائش گاہ سے بے دخلی کے بعد الیاس صاحب کی جانب سے منڈی مرید کے منتقل ہونے کی دعوت کی ضرورت کیوں پیش آئی اگر وہاں ان کا ادارہ دارالاشراق فی الحقیقت کام کر رہا تھا تو یہ بات تمام رفقاء کے علم میں ہونی چاہیے تھی ویسے بھی بیس سال کی عمر میں غامدی صاحب اکیڈمی چلانے کے قابل نہیں تھے وہ خود لکھتے ہیں کہ ۱۹۹۰ء میں زندگی کے چالیس سال پورے ہونے کو تھے [ص ۲۷ مقامات ۲۰۰۸ء] اس لحاظ سے ۱۹۷۰ء میں ان کی عمر صرف بیس سال تھی اگر ان کے دوسرے بیان کو سند تسلیم کیا جائے جس میں ان کا سن پیدائش 1951ء بیان ہوا ہے تو ۱۹۷۰ء میں ان کی عمر صرف انیس سال بنتی ہے انیس سال میں اکیڈمی کے کمالات دکھانا عملاً محال دعویٰ نظر آتا ہے مقامات کے ایک بیان کے مطابق ان کی عمر ۱۹۷۰ء میں ۱۴ سال بنتی ہے ــــــــ اسی کتاب میں انھوں نے اپنی مطبوعہ، غیر مطبوعہ، زیر تسوید کتابوں کی فہرست پیش کی ہے ۱۔ البیان، ۲۔ میزان، ۳۔ برہان، ۴۔ مقامات، ۵۔ الاسلام، ۶۔ علم النبی، ۷۔ فقہ النبی، ۸۔ سیرۃ النبی، ۹۔ خیال و خامہ [ص ۲۷، ۲۸، مقامات ۲۰۰۸ء] ــــــــ

لیکن اس فہرست میں غامدی صاحب نے دو مطبوعہ اور دو غیر مطبوعہ کتابوں کا دانستہ ذکر نہیں کیا ــــــــ مطبوعہ کتابوں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں [میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، میزان اپریل ۲۰۰۲ء] غیر مطبوعہ دو کتابوں کے مسودے مکمل تھے دونوں کتابیں طباعت کے لیے تیار تھیں کیونکہ ان کتابوں کے اشتہارات باقاعدگی سے اشراق اور غامدی صاحب کے کتابچوں کے آخر میں شائع کیے جا رہے تھے ــــــــ ۱۹۹۶ء میں المورد نے غامدی صاحب کی کتاب قانون دعوت شائع کی تو اس کے آخری صفحے پر درج تصانیف میں الاشراق [عربی] الفاتحہ [زیر طبع] کا اشتہار دیا گیا۔ غامدی صاحب کی کتاب قانون معیشت ۱۹۹۷ء میں المورد لاہور نے شائع کی تو اس کے آخر میں درج زیر طبع تصانیف کی فہرست میں الاشراق [عربی] الملک تا الناس [زیر طبع] کا اشتہار دیا گیا تھا ــــــــ لیکن مقامات ۲۰۰۸ء میں غامدی صاحب نے اپنی فہرست کتب میں ان دونوں عربی تصانیف کا ذکر نہیں کیا کیوں کہ ماہنامہ ساحل میں ڈاکٹر رضوان ندوی صاحب نے غامدی صاحب کی عربی دانی کی حقیقت جس طرح واضح کی تھی اس کے بعد وہ ہمت نہیں کر سکے کہ کوئی عربی تصنیف اپنے نام سے پیش کر سکیں ساحل ۲۰۰۶ء میں غامدی صاحب کی عربی دانی کی قلعی کھلتے ہی غامدی صاحب نے اپنی عربی ویب سائٹ فوراً بند کر دی

جو آج تک بند ہے اس ویب سائٹ پر موجود تمام عربی لوازمہ ہم نے کاغذ پر منتقل کر لیا تھا جو اغلاط کا دفتر ہے انشاء اللہ کسی مناسب موقع پر ان عبارتوں کو پیش کیا جائے گا نمونے کے طور پر چند عربی عبارتیں ساحل مئی جون ۲۰۰۶ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ پچھلے پندرہ برسوں میں میں نے کئی مکان بدلے [ص ۶۳] یہ تحریر ۱۹۸۶ء کی ہے یعنی وہ ۱۹۷۱ء سے لاہور میں ہیں لیکن ص ۳۶ پر لکھتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء سے مرید کے میں دارالاشراق اکیڈمی باقاعدگی سے چل رہی ہے ۱۹۷۱ء میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم بنے مقامات کے مطابق وہاں پانچ سال تک پڑھتے رہے ۱۹۷۳ء میں اصلاحی صاحب اور مودودی کی شاگردی میں تھے مودودی صاحب کے ساتھ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ تک رہے اصلاحی صاحب کے ساتھ ۱۹۷۳ء بلکہ مرتے دم تک ساتھ رہے لیکن طالب علمی کے خاتمے سے پہلے ہی منڈی مرید کے میں عالم گیری کیسے فرمارہے تھے یہ نہایت اہم سوال ہے؟ کشمش بننے سے پہلے منقیٰ بننے کی کوشش کیا اسی طرز عمل کا نام ہے ——— [تتلی، کچھوا، حوالہ]

ایک جانب ان کا دعویٰ ہے کہ الاشراق اکیڈمی ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۸ء تک منڈی مرید کے میں باقاعدگی سے کام کر رہی تھی یعنی غامدی صاحب باقاعدگی سے منڈی مرید کے میں ہی مقیم تھے بلکہ کام کی رفتار اتنی زبردست تھی کہ غامدی صاحب کو تاسف سے یہ لکھنا پڑا "میرے کچھ رفقاء برسوں کی جدوجہد کے بعد گھروں کو لوٹ چکے ہیں کچھ لوٹ جائیں گے [ص ۳۶، ۳۷، مقامات محولہ بالا] یہ بڑی صلاحیتوں کے حامل نوجوان تھے۔ ان کی عزیمت علم اکیڈمی کی تاریخ کی متاع بے بہا ہے میرا احساس ہے کہ یہ آنے والے دور کو بہت کچھ دے سکتے تھے یہاں تدریس بار بار شروع ہو کر ختم ہوئی ہے اس کے باوجود اللہ کا احسان ہے کہ کچھ کام ہو گیا اور بہت تھوڑا باقی ہے دیڑھ سال مزید کام کرنے کا موقع مل جاتا تو اس کاوش کا مرحلہ اول مکمل ہو جاتا [ص ۳۸، ۳۹ مقامات محولہ بالا] ان عظیم اصحاب نے کیا کام کیا اور زمانے کو اب تک انہوں نے کیا دیا ہے ہم اس سے ابھی تک لاعلم ہیں یہ اصحاب تو خیر کیا علمی کام پیش کرتے خود غامدی صاحب نے کیا علمی کارنامہ انجام دیا ہے میزان کی تالیف کا کام ۱۹۷۴ء میں شروع ہوا اور ۲۰۰۸ء میں تکمیل کو پہنچا ——— ۳۳ سال میں یہ کتاب تین مرتبہ شائع ہوئی پہلی مرتبہ ۱۹۸۵ء میں پھر ۲۰۰۲ء میں پھر ۲۰۰۸ء میں اس کے علاوہ ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۷ تک اس کتاب کے مختلف ابواب پر مشتمل بے شمار کتابچے

شائع ہوتے رہے اس کے باوجود یہ کتاب اغلاط، تضادات، تسامحات، تنازعات، کا دفتر ہے اس کی تفصیل ہم کتابی صورت میں جلد پیش کریں گے ——— لطف کی بات یہ ہے کہ میزان کی تینوں اشاعتوں میں غامدی صاحب مسلسل رنگ بدلتے رہے شمع کو سحر تک جلنا ہے تو وہ ہر رنگ میں جلے گی ——— یہ ایسی شمع تھی جو دونوں سروں سے جل رہی تھی لہٰذا اس کا انجام آغاز سے معلوم تھا ——— التباس، انتشار، افتراق، یبوست، گمراہی ——— پراگندہ خیالی، فکری زبوں حالی ——— غامدی صاحب اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ دینی حلقوں میں سے کسی حلقے نے ان کا مسلسل اور مستقل تعاقب کرنے پر توجہ نہ دی اگر دینی حلقے سنجیدگی سے ان کے افکار کی کہکشاں کا مطالعہ کرتے اس پر نقد کرتے تو غامدی صاحب اپنے دفاع میں کچھ کہنے سے قاصر رہتے ———

مقامات پہلی مرتبہ ۲۰۰۴ء میں طبع ہوئی دوبارہ ۲۰۰۶ء میں طبع ہوئی پھر یہ اشاعت بازار سے اٹھالی گئی اور مقامات طبع اول کے نام سے نومبر ۲۰۰۸ء میں غامدی صاحب نے اپنے ارتقاء یافتہ افکار اس کتاب میں پیش کیے دیباچے میں انہوں نے لکھا کہ دوسرے حصے میں بعض توضیحات اور دین کے اجتہادی مسائل سے متعلق میری آراء بیان ہوئی ہیں دیباچہ اکتوبر ۲۰۰۸ء میں لکھا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس تازہ اشاعت میں پیش کردہ خیالات غامدی صاحب کے ارتقاء یافتہ جدید تازہ یا تصدیق شدہ خیالات ہیں لیکن یہ خیالات بھی ان کے دیگر خیالات سے ٹکراتے ہیں اس کی تفصیلات ''میزان' پر ہمارے نقد میں ملاحظہ کیجیے جو عنقریب کتابی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش کی جائے گی اس کتاب میں ہم نے غامدی صاحب کے اصولوں کی روشنی میں غامدی صاحب کے فکر کا جائزہ لیا ہے کیونکہ غامدی صاحب اہل سنت کے ماخذات دین اور اصول دین کو تسلیم نہیں کرتے اور حاملین اہل السنّت و الجماعت ان کے اصولوں کو تسلیم نہیں کرتے لہٰذا غامدی صاحب کے تخلیق کردہ اصول جو ہماری نظر میں بے محل ہیں لیکن غامدی صاحب کے لیے تو واجب الاتباع، قابل تقلید ہیں لہٰذا ہم غامدی صاحب کے افکار کا جائزہ ان کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں لیں گے اور ثابت کریں گے کہ غامدی صاحب نہ اہل السنّت والجماعت کے اصولوں پر پورے اترتے ہیں نہ فراہی و اصلاحی کے اصولوں پر پورے اترتے ہیں نہ حضرت والا خود اپنے اصولوں پر پورے اترتے ہیں وہ محض تفردات کا دفتر ہیں ———

ادارہ برائے تعلیم | ۲۰۰۴ء | عورت اور قیادت | ترجمہ مرتبہ لبنیٰ نازلی

یہ کتابچہ ملائشیائی تنظیم سسٹر زان اسلام نے انگریزی میں شائع کیا تھا جسے غامدی صاحب کے شاگرد رشید خورشید احمد ندیم صاحب نے معاصر اسلامی فکر کے ایک اعلیٰ تحقیقی نمونے کے طور پر ترجمہ کرا کے اپنے ادارے سے ایشیا فاؤنڈیشن کی مالی امداد سے شائع کیا اس کتابچے کے پیش لفظ میں خورشید احمد ندیم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کتابچے کے مقاصد اور غامدی صاحب کے مکتب فکر کے مقاصد کی ترجمانی کے لیے کافی ہے فکر ونظر کے دریچے کشادہ کرنے کے نام پر کس کس قسم کے مباحث کو آزادی اظہار کے نام پر پیش کیا جارہا ہے اس کا نمائندہ اظہار کتاب کا پیش لفظ ہے ——— آغاز میں ہی یہ مغالطہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کے منصب دائرہ کار کے سلسلے میں علمائے دین کے مابین مباحث صدیوں سے جاری ہیں جبکہ یہ تاریخی غلط بیانی ہے عورت کے مقام یا دائرے اور حدود کے بارے میں امت کے تمام مکاتب فکر کا اجماع ہے حتیٰ کہ اسماعیلی، شیعہ مکاتب فکر بھی جو اہل سنت کے اصولوں سے مختلف اصول رکھتے ہیں ان کے عہد اقتدار یعنی فاطمی خلافت اور صفوی حکومت میں بھی عورت کا وہی دائرہ کار رہا جو اہل سنت کی خلافت کے عہد میں موجود تھا لہٰذا یہ کہنا کہ عورت کے دائرے پر اختلافات قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں امت کی تاریخ کا انکار ہے یا اس تاریخ سے عدم واقفیت ——— ایران کی انقلابی حکومت نے بھی ۲۰۱۰ء تک کسی عورت کو کابینہ میں شامل نہیں کیا امام خمینی کے زمانے میں عورت کو پارلیمنٹ میں نمائندگی نہیں دی گئی نہ عوامی عہدے دیے گئے منشور حقوق انسانی اور لبرل ازم کی اقدار سے دھوکہ کھانے کے بعد ہی عالم اسلام میں اپنی تاریخ و روایت سے انحراف کے بعد عورت کا وہ دائرہ قانونی ہوگیا جو مغرب نے پیش کیا تھا ——— مغرب کی مرعوبیت کے زیر اثر عورت کے بارے میں مسلم دنیا کے اجتہادی خیالات اپنی تاریخ سے انحراف کا آئینہ ہیں خورشید ندیم صاحب نے فاطمہ جناح کے صدارتی انتخاب کو دینی حلقوں کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کیا ہے حالانکہ یہ اصول کا مسئلہ نہیں سیاسی حاشیہ آرائی کا مسئلہ ہے جب جماعت اسلامی کے امیر مودودی صاحب نے فاطمہ جناح کے حق صدارت کی ایسی کلامی دلیل مہیا کی کہ سب ششدر رہ گئے ایوب خان میں سوائے اس کے کوئی خوبی نہیں کہ وہ مرد ہیں اور فاطمہ جناح میں سوائے اس کے کوئی خامی نہیں کہ وہ عورت ہیں ——— واضح رہے کہ اس موقع پر دیگر راسخ العقیدہ مذہبی حلقوں اور جماعتوں نے عورت کی حکمرانی کی کوئی شرعی دلیل نہیں

بیان کی اور جماعت اسلامی کا موقف ایک سیاسی جماعت کا موقف تھا علماء کے کسی گروہ یا راسخ العقیدہ ہندی مکاتب فکر میں سے کسی مکتب فکر کا موقف نہیں تھا ——— یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلامی جماعتیں جمہوری قومی سیکولر ریاست میں جب بھی بغیر تحقیق کے حصہ لیتی ہیں تو جماعت اسلامی کی طرح ایسی غلطیاں کرتی ہیں جو اسلامی علمیت کو معرض سوال بنا دیتی ہیں۔

ایک مسلمان معاشرے میں عورت کی مختلف اجتماعی حیثیتوں کے بارے میں یہ بحث قدیم سے جاری ہے کہ اسلام عورت کے لیے کس منصب کو روا رکھتا ہے اور کس سے روکتا ہے۔ ہمارے ہاں بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورت کسی ریاستی یا سیاسی منصب کی اہل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر وہ سربراہ حکومت نہیں بن سکتی، جج نہیں بن سکتی یا یہ کہ نماز کی امامت نہیں کرا سکتی۔

یہ بحث ہر ایسے دور میں زندہ ہو جاتی ہے جب حالات کے جبر کے تحت ایک مسلمان معاشرہ عورت کے لیے کوئی منصب گوارا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں دینی حلقوں کا نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی لیکن حالات نے ایک مرحلے پر ہمارے مذہبی لوگوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ انہوں نے منصب صدارت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی۔ جب بے نظیر بھٹو صاحبہ مروجہ جمہوری طریقے سے وزیر اعظم بن گئیں تو مذہبی جماعتوں کو ان کی یہ حیثیت تسلیم کرنا پڑی۔ جب خواتین نے منصف [جج] اور اس طرح کے دوسرے مناصب کے لیے اپنی اہلیت ثابت کر دی تو بھی روائتی دینی نقطۂ نظر کو ایک مشکل صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی طرح اس گروہ کے نزدیک عورت کا اصل دائرہ کار اس کا گھر ہے لیکن آج یہی لوگ خواتین کو قومی اسمبلی اور سینٹ میں لا رہے ہیں۔

اس تضاد کے سامنے آنے کے بعد، ان تمام مقدمات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، جو ہمارے اہل مذہب نے قائم کر رکھے ہیں، کیونکہ ان کا اپنا طرز عمل یہ گواہی دے رہا ہے کہ ان آراء کے ساتھ نئے عہد کے تقاضے نبھانا مشکل ہے۔ زیر نظر کتابچے میں، اس روایتی نقطہ نظر پر تنقید کی گئی ہے۔ مصنف کے نزدیک عورت نہ صرف ان تمام مناصب کے لیے اہل ہے بلکہ اس ضمن میں جو دینی دلائل دیے جاتے ہیں وہ بھی درست نہیں۔ یہ کتابچہ ملائشیا کی ایک تنظیم ''سسٹرز ان اسلام'' نے پہلی مرتبہ شائع کیا۔ چونکہ مسلمان

معاشروں کے حالات میں ایک گونہ مماثلت ہے اور انہیں کم وبیش ایک طرح کے مسائل درپیش ہیں، اس لیے ہم افادہ عام کے لیے اس کا ترجمہ شائع کررہے ہیں ''معاصر اسلامی فکر'' کے عنوان سے ہم جو کتابیں شائع کررہے ہیں، اس کا مقصد کسی خاص نقطۂ نظر کی تائید نہیں بلکہ مسلمانوں میں موجود مختلف نقطہ ہائے نظر کو سامنے لانا ہے تاکہ اس ضمن میں غور وفکر کے نئے دروازے کھلیں۔ ہم اس ضمن میں ہر طرح کی تنقید اور تبصرے کا خیر مقدم کریں گے۔

غالباً چھٹی یا ساتویں کے زمانے میں نصیر الدین صاحب ہمایوں سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے۔ یہ اس لحاظ سے بڑی اہم ملاقات تھی کہ پہلی مرتبہ اُنھی کی وساطت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے نام اور کام سے میرا تعارف ہوا۔ مولانا کی تمام کتابیں میں نے ان سے لے کر پڑھیں۔ یہ علم وعمل کی ایک نئی دنیا تھی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع اُنھی دنوں داؤد گارڈن، داروغہ والا میں منعقد ہوا۔ ہم چند دوست بھی اسلامیہ ہائی اسکول سے ہمایوں صاحب کے ساتھ اس اجتماع میں شرکت کے لیے لاہور آئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو میں نے پہلی مرتبہ اسی اجتماع کے موقع پر دیکھا۔ کیا دل نواز شخصیت تھی۔ لگتا تھا کہ اس کی صورت گری میں حسن فطرت کی ہر چیز کام آ گئی ہے۔ بعد میں ان سے ملنے اور بہت قریب رہ کر ان کو دیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ علم وعمل، حسن اخلاق، دانش وبصیرت اور جرأت وعزیمت کے لحاظ سے جن شخصیتوں کے نام ان کے ساتھ لے سکتے ہیں، وہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ یہ صرف میرا تاثر نہیں ہے۔ اُنھیں دیکھنے، ملنے ان سے ہم کلام ہونے اور ان کے ساتھ کام کرنے کی سعادت جن لوگوں کو بھی حاصل ہوئی ہے، وہ اس کی گواہی دیں گے ——— دسویں کا سال شروع ہوا تو فلسفہ، تصوف، ادب اور تاریخ کی کتابیں دیکھنے سے میری دلچسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ یہ والد اور ان سے ملنے والوں کی صحبت کا اثر تھا۔ [مقامات، طبع اول، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۔ ۲۰]

استاذ امام [امین احسن اصلاحی] کے ساتھ [۱۹۷۳ء کی] یہی ملاقاتیں ہیں جن سے پہلی مرتبہ شرح صدر ہوا کہ دین محض مان لینے کی چیز نہیں ہے، اسے سمجھا اور سمجھایا بھی جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرآن ایک قول فیصل ہے، دین وشریعت کی ہر چیز کے لیے میزان ہے، پورے عالم کے لیے خدا کی حجت ہے۔ اس کی روشنی میں ہم حدیث وفقہ، فلسفہ وتصوف اور تاریخ وسیر، ہر چیز کا محاکمہ کرسکتے

ہیں ـــــ یہ میرے لیے ایک نئے قرآن کی دریافت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کے طریقے پر قرآن کا طالب علم بننا چاہتا ہوں۔ اپنی تعلیم کا کچھ پس منظر بتا کر پوچھا کہ اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ مولانا نے مختلف علوم وفنون کی امہات کتب کی ایک لمبی فہرست بتائی جنھیں پڑھنے، سمجھنے اور دل و دماغ میں اتارنے کے لیے برسوں کی محنت چاہیے تھی۔ مولانا نے فرمایا: اس طریقے سے پڑھنا چاہتے ہو تو لیڈری کے خیالات ذہن سے نکال کر علم ونظر اور فکر وتدبر کے لیے گوشہ گیر ہونا پڑے گا۔ یہ فیصلہ کرو کہ تمہارا سایہ بھی ساتھ نہ دے تو حق پر قائم رہو گے۔ ہمارے مدرسۂ علمی میں کوئی شخص اس عزم وارادہ کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا ـــــ یہ آخری دن تھا۔ اس سے اگلے روز مولانا گاؤں واپس جارہے تھے۔ میں نے دل ودماغ کا جائزہ لیا، نتائج وعواقب کا اندازہ کیا اور اسی روز فیصلہ کرلیا کہ کالج کو الوداع کہہ کر میں کل ہی مولانا کے مدرسۂ علمی میں داخل ہو جاؤں گا اور اس کے لیے جیسا علم چاہیے، اسے حاصل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا ـــــ میری طالب علمی کا دوسرا دور اسی سے شروع ہوا۔ یہ ۱۹۷۳ء کی ایک شام تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ کم وبیش دس سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں مولانا نے خود بھی پڑھایا۔ سورۂ زخرف سے آخر تک قرآن مجید، موطا امام مالک، قرآن وحدیث پر تدبر کے اصول ومبادی اور فلسفۂ جدید کے بعض مباحث ان کے طریقے پر انھی سے پڑھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ پڑھے کم لکھے زیادہ لوگ اس زمانے میں بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔ اُن کا ارشاد تھا کہ قلم اس وقت اٹھائیے، جب کوئی نئی حقیقت سامنے آئے۔ چنانچہ طالب علمی کے اس دور میں لکھنے کی ہمت کم ہی ہوئی [مقامات، طبع اول، ۲۰۰۸ء، جاوید احمد غامدی، ص ۱۹۔۲۰، ۲۴، ۲۵، محولہ بالا]۔ [ایک جانب یہ دعویٰ ہے کہ طالب علمی کے دور میں لکھنے کی ہمت کم ہوئی اور طالب علمی کا یہ دور ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۳ء تک اور غور وفکر کے بعد اس کا اختتام ۱۹۹۰ء میں ہوا [ص ۲۶ محولہ بالا] جبکہ اسی کتاب کے ص ۳۲ پر لکھا ہے کہ اسی دور میں مجلّہ اشراق کی اشاعت شروع کی گئی ادارہ دارالفکر بنالیا گیا دارالاشراق ادارہ بھی بن گیا تعلیم و تدریس کے لیے لاہور میں مکان بھی کرائے پر لے لیا گیا [ص ۳۲] اسی کتاب کے مطابق غامدی صاحب ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۳ء تک اپنے اصلی حقیقی دوسرے دور طالب علمی کے دوران اسلامی انقلاب کے لیے ایک تحریک برپا کرنا چاہتے تھے [ص ۲۹] دائرۃ الفکر نامی ادارہ ایک علمی مرکز اور مرکز قیادت کی حیثیت سے کام کرے اس کے بعد ایک دارالعلوم قائم کرنے کا ارادہ تھا مولانا مودودی کی جماعت میں جو خامی رہ

گئی ہے وہ اسی طرح دور کی جا سکتی ہے اس دارالعلوم سے جو لوگ پڑھ کر نکلیں گے آئندہ کے لیے تحریک کی قیادت انہی میں سے منتخب کی جائے طے پایا کہ سلطان پورہ میں تحریک کا مرکز قائم کیا جائے تحریک کے لیے ماہنامہ خیال نکالنے کا ارادہ کیا گیا جو دارالعلوم قائم کرنا چاہتے تھے اس کا نام جامعہ الحمراء تجویز کیا تھا اس کی رعایت سے الحمراء کے نام سے ایک مجلّہ شائع کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا [ص ۲۹، ۳۰] سید بدر بخاری کی امارت میں تحریک کا نظم قائم کر دیا گیا چند مہینوں کے اندر ہی باہمی مشورے سے یہ تنظیم ختم کر دی گئی مارچ ۱۹۷۳ء میں ہم نے دائرۃ الفکر سے ایک مجلّہ اشراق کے نام سے چھاپا [ص ۳۲] اشراق کا ڈیکلریشن مل گیا دو شمارے نکلے [ص ۳۹] فرخ فاؤنڈیشن کے نام سے ادارہ بنایا اس کے تحت میرے ایماء سے مجلّہ الاعلام کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا [ص ۴۰] یہ تمام علمی سرگرمیاں دور طالب علمی میں ہو رہی ہیں ـــــــ ایک جانب مسند طالب علمی ہے دوسری جانب مسند عالم پر بھی حضرت فائز ہیں لاہور میں دارالعلوم کھولنے کا منصوبہ ہے تحریک چلانے کی حکمت عملی بن رہی ہے اور ۱۹۷۰ سے دارالاشراق اکیڈمی مرید کے میں چل رہی ـــــــ مقامات کے مطابق ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک غامدی صاحب لاہور میں ہی مقیم رہے اور مکانات مقامات بدلتے رہے معلوم نہیں منڈی مرید کے کی اکیڈمی کب چلاتے تھے؟ یہ تمام سرگرمیاں مقام طالب علمی کے منافی تھیں اور خصوصاً استاد امام اصلاحی کے حکم کی خلاف ورزی جنھوں نے لیڈری ترک کر کے گوشہ گیر ہونے کا حکم دیا تھا غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس دور طالب علمی میں [۱۹۷۳ تا ۱۹۸۳ء] میں لکھنے کی ہمت بہت کم ہوئی لیکن ان کی تمام سرگرمیاں اس دعوے کی مکمل نفی کرتی ہیں جماعت اسلامی کی اصلاح کے لیے دارالعلوم بن رہا تھا مگر اسی جماعت میں ۱۹۷۳ء میں شریک ہو گئے اس کی رکنیت بھی قبول کر لی مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ غامدی صاحب ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۳ء تک بیک وقت پانچ راستوں پر چلتے رہے ـــــــ ۱۔ ۱۹۷۰ء میں اپنا الگ علمی ادارہ بنایا جو ۱۹۷۸ء تک منڈی مرید کے میں چلتا رہا اس ادارے کے تحت الگ فکر پیش کرتے رہے اس فکر کے تحت مختلف کوشش، تحریک، رسالے، تقاریر، مکتبہ، جماعت سازی کا کام جاری رہا ـــــــ ۲۔ ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۶ء جماعت اسلامی میں شامل رہے یہ ایک متوازی کوشش تھی ـــــــ ۳۔ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۳ء حلقہ امین احسن اصلاحی کے شاگردوں کی فہرست میں بھی شامل ہو گئے ـــــــ ۴۔ ۷۰ء تا ۷۵ء گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم بھی جاری رہی ـــــــ ۵۔ علمی تحقیقی تحریکی سرگرمیوں کے ساتھ نشرو

اشاعت،تخریب، تخلیق وتحریر کا کام بھی جاری رہا بیک وقت فکر غامدی ،فکر مودودی اور فکر اصلاحی کا ادغام۔ اجتماع ضدین شاید اسی کا نام ہے۔ مزاج کا یہی وہ تلون ہے جس نے غامدی صاحب کو استقامت ، استقرار و استحکام سے ابھی تک محروم رکھا وہ تنوع ، رنگا رنگی اور ہما ہمی کی زندگی پسند کرتے رہے ـــــ جماعت اسلامی کی رکنیت بھی حاصل کر لی ادارہ معارف اسلامی کی نظامت بھی سنبھال لی۔[ص۴۴،۴۳،۳۳] یہ تمام کام بغیر تیاری کے طالب علمی کا دور ختم ہونے سے پہلے۱۹۷۳ء میں ہی شروع ہو گئے حضرت والا کی طالب علمی ۱۹۸۳ء میں ختم ہوئی اور اگلے سات برس ۱۹۹۰ء تک وہ غور وفکر کی طلبی میں مصروف رہے[ص ۲۶] مگر اسی غور وفکر کے دوران علمی سفر ختم ہونے سے پہلے ہی تمام کام استادانہ شان سے شروع کر دیے شاگرد تک بھرتی کر لیے بلکہ اسی کتاب کے ص ۳۶ کے مطابق حضرت والا ۱۹۷۰ء میں منڈی مرید کے میں صرف بیس سال کی عمر میں دارالاشراق کے نام سے اکیڈمی قائم کر چکے تھے جو ۱۹۷۸ء تک چلتی رہی اور لیڈری بھی ـــــ اور اصلاحی صاحب کی ہدایت کے باوجود کہ لیڈری کے خیالات ذہن سے نکال کر گوشہ گیر ہو ـــــ اس کی سنگین خلاف ورزی بھی ہو رہی ہے ص ۲۷ پر لکھ رہے ہیں کہ اس زمانے میں اگر لکھا تو ضرورت کے مطابق مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسلسل مستقل لکھتے ہی رہے جبکہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۹ء تک دین کی تعبیر کی صحت پر ہی حضرت کو شک ہو گیا تھا اس حالت شک میں بھی وہ نہایت یقین سے اپنا ناپختہ علم جس پر خود انھیں اعتماد نہ تھا امت تک منتقل کرتے رہے اور اس یقین پر شکر کرتے رہے اسے ارتقاء کہتے ہیں ایک جانب لکھ رہے ہیں کہ طالب علمی کے دور میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۳ء تک لکھنے کی ہمت بہت کم ہوئی لیکن استاد اصلاحی صاحب کے حکم کی عدم تعمیل میں تمام علمی کام بغیر تکمیل علم کے زور وشور سے جاری وساری تھا ص ۲۶ پر لکھتے ہیں کہ دین کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ اس سوال کے جتنے جوابات ابھی تک سامنے تھے وہ سب اعتراضات کی زد میں تھے ایک جانب یہ ادعا ہے دوسری جانب بغیر دین کا صحیح فہم حاصل کیے بغیر ہی حضرت والا تمام علمی کام کر رہے ہیں اشراق اعلام رسالے نکال رہے ہیں کتابچے شائع ہو رہے ہیں تقریریں ہو رہی ہیں شاگردوں کا حلقہ تک ـــــ اسی دور طالب علمی میں بیس سال کی عمر میں منڈی مرید کے میں قائم ہو گیا ہے کیا یہ سب تضادات کا دفتر نہیں ہے اس کے سوا کچھ نہیں کاش ـــــ ہمیں اس سوال پر غور کرنے کی نوبت درپیش نہ ہوتی غامدی صاحب جیسے نفیس نستعلیق فرد کے بارے میں یہ غور وفکر دکھ درد کے دریچے کھولتا اور بام در پر اداسی کی فضاء

طاری کرتا ہے۔

۱۹۸۳ء میں تعلیم کا یہ مرحلہ ختم ہوا تو میرے معتقدات کی دنیا میں ایسا اضطراب پیدا ہو چکا تھا کہ ہر چیز اپنی جگہ چھوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ فقہ، اصول فقہ، تصوف، علم کلام، سب قرآن میں اپنی بنیادیں تلاش کررہے تھے۔ دین کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ اس سوال کے جتنے جوابات ابھی تک سامنے تھے، وہ سب اعتراضات کی زد میں تھے۔ میرے تصورات کا قصر منہدم ہو چکا تھا اور نئی تعمیر اب نئے بندوبست کا تقاضا کررہی تھی۔ اگلے سات سال اسی بندوبست کی نذر ہو گئے۔ اس عرصے میں، معلوم نہیں، کتنی وادیاں قطع کیں، کتنے راستے ڈھونڈے، کتنے موڑ مڑے، کتنے پتھر الٹے، اور پاؤں کے آبلوں سے کہاں کہاں کانٹوں کی پیاس بجھائی۔ یہ عجیب سفر تھا۔ ایک کے بعد دوسری منزل گزر رہی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے کیا پیش آنے والا ہے —— یہ دور اسی طرح گزر گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء میں جا کر وہ زمین کہیں ہموار ہوئی، جہاں نئی تعمیر کے لیے نیو ڈالی جائے۔ زندگی کے چالیس سال پورے ہونے کو تھے۔ فکر وخیال میں بڑی حد تک وضوح پیدا ہو چکا تھا اور نقشہٗ کار بھی واضح تھا[مقامات ص ۲۶، ۲۷] ——

۱۹۹۰ء تک ان کا ذہن شکست وریخت کا شکار تھا لیکن اس سے پہلے ہی تقاریر وتصانیف کا انبار لگا دیا گیا آخر کیوں؟ جب تک فکر میں وضوح پیدا نہیں ہوا آپ امت کو کیوں مستفید کرنے لگے؟ وضوح علمی اور شرح صدر حاصل ہونے سے پہلے ہی ۱۹۷۳ء میں ایک تحریک کا نظم قائم کر دیا پھر وصی مظہر ندوی کی صدارت میں انصار المسلمین کے نام سے جماعت قائم کر دی پھر ڈاکٹر فاروق خان اور ڈاکٹر آغا طارق سجاد کی قیادت میں دانش سرا قائم کر دیا پھر ۱۹۹۳ء میں قاضی حسین احمد کی دعوت پر اسلامک فرنٹ کے سیاسی محاذ میں شامل ہو گئے یہ تلون ہے یا تنوع یا تغیر یا ابرام؟ ——[۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک غامدی صاحب غور وفکر کی دنیا میں رہے ۱۹۹۴ء تک وہ قرآن سنت اجماع وغیرہ کو ماخذات دین سمجھتے تھے سنت ثابتہ حدیث وسنت کے قائل تھے امت کے علمی روایت اصلاحی صاحب کے فکر سے انہیں اتفاق تھا لیکن ۱۹۹۸ء میں اچانک سنت حدیث اجماع اجتہاد ہر اصطلاح کے معانی بدل گئے اصلاحی صاحب کو بار بار امام لکھنے کے باوجود انھوں نے اپنے امام کے افکار اور اصولوں کو بھی لائق اعتناء نہ سمجھا اور سنت کی ایک ایسی تعریف پیش کی جو مسلسل تغیر کی زد میں ہے اور جس کا سراغ امام ابوالحسن اشعری سے لے کر امام امین احسن اصلاحی تک پوری تاریخ اسلام میں کہیں نظر نہیں آتا۔ غامدی صاحب کے فکر نے کس کس طرح

تنوع، تفرد، توسع کے نام پر التباس فکری کو جنم دیا اس کی کچھ تفصیل انہی کے شاگرد رشید خورشید احمد ندیم کے حوالے سے پڑھیے ــــــ خورشید احمد ندیم نے غامدی صاحب کی ایک تقریر یا تحریر کا حوالہ اپنے مقدمے میں دیا ہے جو غامدی صاحب کے کتابچے پرویز صاحب کا فہم قرآن کے نام سے ۲۰۰۴ء میں طبع ہوا تھا ندیم صاحب نے اس حوالے کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے لہٰذا غامدی صاحب کے علمی سفر کی روداد انہی کے الفاظ میں پڑھیے اس تحریر کے مطابق اس وقت تک غامدی صاحب پر چار دور گزر چکے تھے ــــــ دوسرا دور جس میں میں نے مذہب اور مذہب کے مکاتب فکر کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا کہ اب حقیقت کو تلاش کرنا ہے، یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا چیز صحیح ہے، کسی نتیجے تک پہنچنا ہے تو اس دور میں پھر پرویز صاحب کی اہم چیزوں کو اٹھایا اور میں پوری سچائی کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ بہت دیانت دارانہ مطالعہ کیا۔ میں نے یہ سعی کی کہ میں ہمدردی کے ساتھ پڑھوں، سمجھوں، جانوں یہ ہوسکتا ہے کہ حق یہی ہو۔ میرے پچھلے کم وبیش اس حیات مستعار کے اٹھارہ سال پبلک میں گزرے ہیں۔ اس میں کسی نہ کسی حوالے سے بہت سے لوگ مجھ کو جانتے ہیں بلکہ یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو مجھے برسوں سے جانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں نے اپنے اس سترہ اٹھارہ سال کے دور میں بڑے مراحل طے کیے ہیں [۱] میں جس دینی فکر کو لے کر پیدا ہوا تھا میں نے اس کو چھوڑا [۲] جس دینی فکر میں میری پرورش ہوئی تھی، میں نے اس کو چھوڑا۔ [۳] جس دینی فکر کا مجھ پر سب سے زیادہ اپنے شعوری دور میں غلبہ رہا ہے اس کو چھوڑا اور اب [۴] میں جہاں ہوں لوگ جانتے ہیں کہ بہر حال اس کا ان تعصّبات سے کوئی تعلق نہیں جو کہ اس وقت سوسائٹی کے اندر موجود ہیں۔ اس وجہ سے یہ تو ایک بالکل واقعی بات ہے کہ اگر کوئی حق ہوتا تو میں اگر رجم وارتداد پر علماء کی گالیاں کھا سکتا ہوں تو مجھے اس پر بھی [گالی] کھانے میں کوئی باک نہ ہوتا اگر یہ بات میری سمجھ میں آجاتی تو میں اس کا علمبردار ہوتا اس کو پیش کرتا پوری شان کے ساتھ پیش کرتا چاہے میرا سر کٹ جاتا۔ [شکیل عثمانی، پرویز صاحب کا فہم قرآن خطاب جاوید احمد غامدی مقدمہ ونظر ثانی خورشید احمد ندیم ص ۱۷، ۱۸، ۲۰۰۴ء دارالتذکیر لاہور غامدی صاحب کی تقریر خورشید ندیم کے مقدمے کے ساتھ ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی ہے] ــــــ ۱۹۹۰ء میں پانچواں دور گزرا جس کا ذکر مقامات سن ۲۰۰۸ء میں موجود ہے پھر ۹۰ کے بعد بھی فکری ارتقاء جاری رہا جو ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۸ء میں دو مرحلوں میں آگے بڑھا پھر ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۴ء تک یہ ارتقاء مزید دو مرحلوں میں جاری رہا اور ۲۰۰۸ء میں جب میزان کی آخری اشاعت

سامنے آئی تو یہ ارتقاء ایک خاص نہج پر پہنچ کر رک گیا لیکن مئی جون ۲۰۱۱ء کے اشراق میں توہین رسالت اور آیت محاربہ کے اطلاق کے سلسلے میں حضرت والا کا ارتقاء دوبارہ ہوگیا اور آیت محاربہ کے تحت شاتم رسول کے قتل کا فتویٰ حضرت والا نے صادر کر دیا —— قبل ازیں وہ شتم رسول اور شتم الٰہی کو محاربے کے زمرے سے خارج کر چکے تھے اسی طرح مقامات ۲۰۰۸ء طبع اول میں وصیت، سود، عورت کی تادیب و دیگر مسائل میں بھی حضرت والا کا مزید ارتقاء ہوگیا] ——

۱۹۷۱ء کے جون میں ہماری ملاقات لاہور کے ایک ایڈووکیٹ چودھری محمد انور صاحب سے ہوئی۔ان کے ایک بزرگ دوست سید بدر بخاری بھی اس ملاقات کے موقع پر موجود تھے۔ یہ دونوں ہمارے پروگرام سے بہت متاثر ہوئے۔ان کی تجویز تھی کہ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے علامہ اقبال روڈ پر ان کے محلے میں درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا جائے [ص ۳۱ محولہ بالا]۔[مقامات ۲۰۰۸ء ص ۳۶ کے مطابق ۱۹۷۰ء میں حضرت والا خود منڈی مرید کے میں دارالاشراق کے نام سے اکیڈمی قائم کر چکے تھے جو ۱۹۷۸ء تک چلتی رہی جس کا نوحہ حضرت والا نے اشراق کے پہلے باقاعدہ شمارے اشاعت جنوری ۱۹۷۹ء میں کیا ہے اور مقامات ص ۳۶، ۳۷ پر بھی تو حضرت لاہور میں کیا کر رہے تھے اکیڈمی کیسے چلا رہے تھے کیونکہ حضرت والا کے بیان کے مطابق ۱۹۹۰ء میں ان کی عمر چالیس برس ہوگئی تھی [ص ۲۷] عمر کا مسئلہ بھی چیستاں ہے اسی کتاب کے ۸۵ کے مطابق حضرت والا ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۸ء میں اپنے بہنوئی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے تھے —— میرے دینی نقطۂ نظر سے اُنھیں کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ان کے سب بچے اس راہ پر چل پڑے جو میں نے اپنے لیے اختیار کی ہے،لیکن میرے ساتھ ان کی محبت ہمیشہ اسی شان کے ساتھ قائم رہی جس طرح آج سے بیس پچیس سال پہلے جب وہ مجھے بہلانے کے لیے میرے ساتھ بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے، میں اسے محسوس کرتا تھا۔ [۱۹۸۸][ص ۸۵] —— اور اچانک آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے ۱۹۷۰ء میں مفکر اسلام کے منصب پر فائز ہو کر منڈی مرید کے میں علم کی منڈی بھی کھول لی جو وسائل کی کمی کے باعث ۱۹۷۸ء میں بند کرنا پڑی]

ڈیڑھ دو برس تک درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔اب کافی لوگ ہمارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار تھے۔لہٰذا سید بدر بخاری کی امامت میں تحریک کا باقاعدہ نظم قائم کر دیا گیا۔اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدنی ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔وہ بھی اس میں

شامل ہوگئے۔ درس کے بعض دوسرے شرکا نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ بدر بخاری صاحب عمر کے اس حصے میں تھے کہ اس طرح کے کسی نظم کی قیادت ان کے لیے آسان نہ تھی۔ لہٰذا چند مہینوں کے اندر ہی باہمی مشورے سے یہ تنظیم ختم کر دی گئی۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں ہم نے ''دائرۃ الفکر'' سے ایک مجلّہ ''اشراق'' کے نام سے چھاپا۔ ہمارا خیال تھا کہ ڈیکلریشن مل جائے گا تو اسے ایک باقاعدہ رسالے کی صورت دے دیں گے اور اس کے ذریعے سے اپنی بات لوگوں تک پہنچائیں گے۔ اس کے چند ماہ بعد ہمارے مالک مکان نے کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کر دیا اس وقت کے حالات میں ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ اس کا مطالبہ پورا کرتے، اس لیے ماڈل ٹاؤن کا یہ مکان بھی چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد کئی مہینے تک ہم لوگ منتشر رہے۔ ادارہ بھی معطل رہا۔ خدا خدا کر کے گارڈن ٹاؤن کے احمد بلاک میں ایک مکان ملا۔ دوست جمع ہوئے، ساز و سامان درست کیا گیا اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔ [ص ۳۲، محولہ بالا]

ہمارے بعض دوستوں کو 'دائرۃ الفکر'' کا نام پسند نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی جگہ ادارے کے لیے ''دارالاشراق'' کا نام اختیار کیا گیا۔ ابتداء میں جو طالب علم اس سے متعلق ہوئے تھے ان میں سے میں اور ساجد علی ہی باقی تھے۔ [ص ۳۳، مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء] اسی کتاب کے صفحے ۳۶ پر درج ہے کہ نومبر ۱۹۷۰ء میں وہ اکیڈیمی وجود میں آئی جو دارالاشراق کے نام سے لاہور سے ۲۶ کلومیٹر دور مرید کے کی بستی میں کام کر رہی تھی تو دائرۃ الفکر نام رکھنے اور اسے بدلنے کا بیان محض افسانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

اس زمانے میں [یعنی ۱۹۷۳ء میں] مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک روز ملاقات کے لیے گیا تو اس کام کا بھی ذکر ہوا۔ مولانا نے تفصیلات پوچھیں، رفقاء سے تعارف حاصل کیا، میں نے اپنی مشکلات بتائیں، وہ موانع بیان کیے جو کام میں تعطل کا باعث بن جاتے تھے اور ان سے سرپرستی کی درخواست کی۔ مولانا نے میری یہ درخواست ازراہ عنایت قبول فرمالی۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق ادارے کے لیے میرے اور مولانا کے نام سے ایک مشترک اکاؤنٹ اچھرہ کے حبیب بنک میں کھولا گیا جس میں مولانا نے اپنی جیب سے ماہانہ ایک ہزار روپے جمع کرانے شروع کر دیے۔ احمد بلاک سے ہم لوگ مولانا کے گھر کے پاس انھی کی دی ہوئی ایک عمارت ۱۔اے ذیلدار پارک اچھرہ میں منتقل ہوگئے۔ مولانا کا خیال تھا کہ اسے ''ادارہ معارف اسلامی''

کی ایک شاخ یا ایک نئے ادارے کی حیثیت سے منظّم کیا جائے گا۔[ص ۳۳، محولہ بالا]

۱۹۷۶ء کے آخر میں ہم [منڈی مرید کے] یہاں پہنچے اور ۱۱/جنوری ۱۹۷۷ء کو جماعت اسلامی پنجاب کے امیر مولانا فتح محمد صاحب کا ایک خط موصول ہوا جس میں انھوں نے مطلع کیا تھا کہ جماعت سے میری رکنیت ختم کردی گئی ہے۔ یہ ایک دو سطروں کی تحریر تھی جس میں بغیر کوئی وجہ بتائے فیصلہ سنا دیا گیا تھا کہ میں اب جماعت کا رکن نہیں رہا۔[ص ۳۴، محولہ بالا] —— [مقامات میں ۳۶، ۳۷ پر بیان کردہ داستان کے مطابق ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۸ء تک حضرت والا منڈی مرید کے میں اکیڈیمی چلا رہے تھے تو یہاں لاہور میں کیا کر رہے تھے؟] [۱۹۷۳ء میں ایک جانب غامدی صاحب اصلاحی صاحب کے تلمیذ بن گئے تھے اور ایسے شاگرد کہ پھر کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا لیکن اسی دوران وہ مولانا مودودی کی رفاقت بھی اختیار کرچکے تھے اسی کتاب کے ص ۱۰۰ پر لکھتے ہیں ''میں نے امین احسن کو سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں دیکھا اور پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا۔ میرے لیے اس وقت ان کا دروازہ 'درنکشودہ' ہی تھا، لیکن میں نے ہمت کی اور اسی بند دروازے پر بیٹھ گیا۔ بر درنکشودہ ساکن شد در دیگر نہ زد —— پھر وہ دروازہ کھلا اور اس طرح کھلا کہ گویا اپنے ہی گھر کا دروازہ بن گیا۔ اس دن سے آج تک علم و عمل کی جو دولت بھی ملی ہے، خدا کی عنایت سے اور اسی دروازے سے ملی ہے۔''[ص ۱۰۰، محولہ بالا] اگر یہ بیان سوفی صد درست ہے تو حضرت والا کی خدمت میں ہم یہ عرض پیش کر سکتے ہیں کہ جناب والا جب آپ نے اس دروازے کی طرف ۱۹۷۳ء میں دیکھنے کے بعد کسی اور دروازے کی طرف نہیں دیکھا تو آپ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء تک مولانا مودودی کے دروازے پر کیا کر رہے تھے اکاؤنٹ کھلوا کر مولانا مودودی سے ایک ہزار روپے مہینہ کیوں لے رہے تھے ادارہ معارف اسلامی میں کیا تحقیق کر رہے تھے جبکہ مولانا مودودی اور امین احسن اصلاحی کے فکر، عمل، تحقیق، نظریات، علمیت اور اہداف میں بعدالمشرقین تھا کون سی بات حقیقت ہے کون سی افسانہ؟]

مالی وسائل کی کمی نے [منڈی مرید کے کی دارالاشراق اکیڈیمی جو ۱۹۷۰ء میں قائم ہوئی اس کا ذکر ہے] اس کام کو بار بار معطل کیا ہے۔ اس کی پوری تاریخ مسلسل بحران کی تاریخ ہے۔ یہاں تدریس بار بار شروع ہوکر ختم ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اللہ کا احسان ہے کہ کچھ کام ہوگیا اور بہت تھوڑا باقی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈیڑھ دو سال مزید کام کرنے کا موقع مل جاتا تو اس کاوش کا مرحلۂ اول مکمل

ہو جاتا۔ اب یہ سب کچھ معطل ہے اور مرید کے کی اس ارض عقیم میں ہم خدائے لم یزل کے چند ناتواں بندے ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے احیاء کے لیے کوشاں ہیں ——— میری جدو جہد کا پہلا مرحلہ یہاں ختم ہوگیا۔ لاہور واپس آنے کے بعد خیال تھا کہ اب صرف رسالہ نکالوں گا۔ ''اشراق'' کا ڈیکلریشن مستنصر میر کے نام پر مل گیا تھا، لیکن ابھی دو شمارے ہی نکلے تھے کہ میر صاحب کے امریکا جانے کا پروگرام بن گیا۔ پھر میرے اور ان کے درمیان رسالے کی پالیسی کے بارے میں بھی کچھ اختلاف تھا۔ لہٰذا یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور ''اشراق'' ایک مرتبہ پھر بند کرنا پڑا [ص ۳۹، محولہ بالا]۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ ۱۹۷۰ء تک عامدی صاحب منڈی مرید کے میں اپنا علمی ادارہ دارالاشراق کے نام سے چلا رہے تھے یا نہیں؟ اگر یہ ادارہ چل رہا تھا تو وہ اسی عرصے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی پڑھ رہے تھے مولانا مودودی کی جماعت اسلامی کے رکن بن کر ادارہ معارف اسلامی میں کام بھی کر رہے تھے اور ۱۹۷۳ء میں ہی امین احسن اصلاحی کے ذریعے دین کے نئے فہم و فراست سے واقف ہو رہے تھے اور شاگردی کا یہ دور ۱۹۸۳ء تک جاری تھا یہ تینوں بیانات مقامات میں موجود ہیں ان میں سے کون سا بیان سچا ہے کون سا جھوٹا؟

....

''میزان'' کی تیسری اشاعت ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آئی اس کا دیباچہ اور خاتمہ درج ذیل ہے

دیباچہ: اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے میں نے اس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اس کی ہر محکم بات کو پروردگار کی عنایت اور میرے جلیل القدر استاذ امام امین احسن اصلاحی کے رشحات فکر سے اخذ و استفادہ کا نتیجہ سمجھیے۔ اس میں کوئی بات کمزور نظر آئے تو اسے میری کوتاہی علم پر محمول کیجیے: ملکیت عاشق و گنج طرب ہرچہ دارم زیمن ہمت اوست [جاوید، المورد، لاہور، ۱۰/اپریل ۱۹۹۰ء]

دیباچے اور خاتمے کی عبارتوں سے تین سنین کا تعین ہوگیا کہ حضرت والا نے میزان ۱۹۶۵ء میں لکھنی شروع کی جو ۱۹۹۰ء میں مکمل ہوگئی لیکن خاتمے کے مطابق حضرت نے یہ کتاب ۱۹۹۰ء میں لکھنی شروع کی ——— یعنی دیباچہ کتاب مکمل ہونے سے پہلے ہی لکھ لیا ——— خاتمہ کی عبارت کے نیچے

تحریر کی تاریخ ۲۷ اپریل ۲۰۰۷ء درج ہے یعنی کتاب خاتمے کی عبارت کے مطابق ۱۷ سترہ سال میں مکمل ہوگئی لیکن دیباچے کے مطابق ۱۹۶۵ء میں کتاب لکھنی شروع کی جو ۱۹۹۰ء میں مکمل ہوگئی؟ [جاوید غامدی، میزان، ص ندارد دیباچہ، ۲۰۰۸ء طبع سوم] اس عبارت کے مطابق غامدی نے میزان ۱۹۹۰ میں مکمل کی میزان کی ۲۵ سالہ علمی کوششوں کا حاصل ہے اگر ان کے اس بیان کو درست تسلیم کرلیا جائے تو انھوں نے میزان ۱۹۶۵ء میں لکھنا شروع کی لہٰذا وہ ۱۹۹۰ء میں مکمل ہوئی اور ۱۹۹۰ء کے دیباچے کے ساتھ ۲۰۰۸ء میں ۱۸ سال بعد شائع ہوئی ۱۸ سال تک یہ کتاب کیوں طبع نہیں ہوسکی ——— اس کی وضاحت غامدی صاحب نے اسی کتاب کے ص ۶۵۳ پر کی ہے ''خاتمے'' کے تحت لکھتے ہیں اس کتاب کی تصنیف کا جو کام میں نے ۱۹۹۰ء میں کسی وقت شروع کیا تھا وہ آج پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے [خاتمہ ص ۶۵۳، میزان طبع سوم ۲۰۰۵ء]

میزان کی دوسری اشاعت اپریل ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آئی اس کا دیباچہ درج ذیل ہے:

دیباچہ: اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے میں نے اس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اس کی ہر محکم بات کو پروردگار کی عنایت اور میرے جلیل القدر استاذ امام امین احسن اصلاحی کے فیض تربیت کا نتیجہ سمجھیے۔ اس میں کوئی بات کمزور نظر آئے تو اسے میری کوتاہی علم پر محمول کیجیے:

ملکت عاشقی و گنج طرب   ہر چہ دارم زیمن ہمت اوست   [جاوید المورد، لاہور، ۲۰/ جون ۲۰۰۱ء]

میزان ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی تو اس کے دیباچے کے مطابق جو ۲۰ جون ۲۰۰۱ء کو لکھا گیا میزان ۲۵ سال پہلے شروع کی گئی اور ۲۰ جون ۲۰۰۱ء کو مکمل ہوئی اس کا مطلب یہ ہوا کہ میزان ۱۹۷۶ء میں شروع ہوئی اور ۲۰۰۱ء میں مکمل ہو کر ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی لیکن میزان ۲۰۰۸ء کے دیباچے کے مطابق حضرت والا کی کتاب ۱۹۶۵ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۹۰ء میں مکمل ہوگئی۔

پرویز صاحب کی اصل غلطی ہے: اس عنوان کے بحث غامدی صاحب اپنے کتابچے ''پرویز صاحب کا فہم قرآن'' میں لکھتے ہیں:

کسی فکر کا جائزہ لینے کا دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اس بات کو موضوع بحث بنائیں کہ وہ

فکر جن اصولوں پر قائم ہے وہ اصول صحیح ہیں یا غلط۔ اگر وہ اصول صحیح ہیں تو پھر ہم اس بات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ نتائج میں غلطی ہوگئی ہو۔ اصول میں اگر ایک آدمی صحیح ہے، اس نے نقطۂ نظر درست قائم کیا ہے تو یہ ممکن ہے کہ جب وہ اپنے اصول کا اطلاق کرتا ہے تو اس میں غلطی کر جاتا ہے۔ کیونکہ وہ پیغمبر نہیں ہوتا۔ اس سے غلطی ہوتی ہے، غلطی ہوسکتی ہے اور ایک دو نہیں دس بیس بھی ہوسکتی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو ہر صاحب علم کے ہاں پائی جاتی ہے اس سے اگر کوئی ہستی مستثنیٰ ہوسکتی ہے تو وہ اللہ کے پیغمبر کی ہوسکتی ہے۔[ص ۲۳]

لیکن اس ساری بحث میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس کا تعلق علم لسانیات سے ہے، زبان کے فہم یا کسی کے کلام پر تدبر سے نہیں، یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ کسی کلام کا متکلم جب اپنا مدعا بیان کرتا ہے تو اس میں کوئی چیز یہ اہمیت نہیں رکھتی کہ جو لفظ اس نے استعمال کیا ہے، اس لفظ کی تاریخ کیا ہے؟ اس میں جو چیز بہت اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ اس نے یہ لفظ جب استعمال کیا اس وقت یہ کس معنی میں بولا جاتا تھا؟ جو محاورہ استعمال کیا گیا اس زمانے میں اس کا کیا مفہوم تھا؟ یہ چیز بالکل بدیہی ہے۔[ص ۲۷]

ا۔ہم اردو زبان میں ایک لفظ کثرت سے بولتے ہیں ''شوربا''۔ آج اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے شوربے کے ساتھ روٹی کھائی ہے تو اس کا ایک مفہوم جو اس زمانے میں جب ہم یہ لفظ بول رہے ہیں، ہر ایک با آسانی سمجھ سکتا ہے۔ یعنی وہ ''میں نے شوربے سے روٹی کھائی ہے''۔ کا جملہ سن کر نہ تو ''میں'' کی لسانی تاریخ سے بحث کرتا ہے، نہ ''نے'' کی تحقیق کرتا ہے نہ تو اسے ''روٹی' کا لسانی پس منظر جاننے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی اسے ''کھائی ہے'' کی لغوی تاریخ سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ اگر اردو زبان سے واقف ہے تو ہم جیسے ہی یہ جملہ بولتے ہیں وہ اپنے متعارف علم کی بنیاد پر ہمارا مفہوم سمجھ لیتا ہے۔ یہی بات زبان میں اصل اہمیت رکھتی ہے۔[ص ۲۷،۲۸]

لیکن اس کے برخلاف اگر اس نے کہیں سے لسانیات کی کوئی کتاب اٹھالی اور شوربے کی تاریخ پر تحقیق کرنا شروع کردی اور تحقیق کرنے کے بعد اس نے یہ معلومات حاصل کرلیں کہ ''شور'' اصل میں نمک کو کہتے ہیں اور ''با'' اصل میں پانی کو کہتے ہیں اور پھر اس جملے کا یہ مطلب بیان کردیا کہ مصنف نے نمکین پانی سے روٹی کھائی ہے تو اصل میں اس نے نہ صرف علم پر ظلم کیا، نہ صرف زبان پر ظلم کیا بلکہ مصنف پر بھی ظلم کیا، وہ یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا۔ یہ اس کا مدعا ہی نہیں تھا۔ اس نے نمکین پانی سے ہرگز

روٹی نہیں کھائی بلکہ ایک خاص طرح کے سالن سے روٹی کھائی۔ شارح نے چونکہ لفظ کے استعمال اور رائج مفہوم کو نظر انداز کیا، اس لیے وہ مصنف کی بات کو صحیح طور پر بیان کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔ ۲۔ ایک لفظ ہے ''ٹیلی وژن''، لیکن اگر کوئی اس جملے ''میں نے ایک ٹیلی وژن خریدا'' کی لسانی تحقیق شروع کر دے اور یہ کہے کہ لغت کے مطابق ٹیلی کا مطلب ہے انتقال اور وژن کے معنی ہیں منظر، اس لیے اس شخص نے ایک ''انتقالِ منظر'' خریدا، تو لسانیات کی یہ تحقیق صحیح ہونے کے باوجود ایک لغو بات ہے اور کلام کی غلط تفہیم ہے۔ [ص ۲۹]

لیکن کسی متکلم کی بات کا مفہوم جاننے کے لیے اس تحقیق کی پر کاہ کے برابر اہمیت نہیں۔ جو آدمی اس طرح کی حرکت کرے گا، اس کے بارے میں دو ہی باتیں کہی جا سکتی ہیں یا تو یہ کہ اس بے چارے کو زبان سے، ادب سے، اسالیب کلام سے کوئی واقفیت نہیں ہے، وہ اس معاملے میں قطعاً لاعلم ہے اور یا یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنی بات متکلم کے منہ میں ڈالنا چاہ رہا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بات لازماً کہنی پڑے گی۔ لیکن جو بات متکلم کے کلام سے نکل رہی ہے وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور اس کو وہ مفہوم دینا چاہتا ہے جو اسے پسند ہے تو پھر اس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے مخاطب کو بھول بھلیوں میں الجھا کر، لسانیات کی اس طرح کی غیر متعلق بحثیں کر کے، متکلم کے مدعا کو بدل دے یعنی یا تو وہ بے علم ہے یا وہ اپنے مدعا کو متکلم کے منہ میں ڈالنا چاہتا ہے۔ ان دو باتوں کے علاوہ کوئی تیسری صورت ممکن نہیں۔ [ص ۲۹، ۳۰]

قرآن مجید بھی ظاہر ہے کہ ایک زبان میں نازل ہوا ہے، پھر وہ ایک مربوط کلام ہے۔ اس کی تفہیم میں بھی یہ تمام امور پیش نظر رہیں گے۔ یعنی اس میں جتنے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ہم ان کے مادوں کی تحقیق بھی کر سکتے ہیں کہ وہ مختلف ادوار میں ترقی کرتے ہوئے اس مفہوم تک کیسے پہنچے ہیں۔ لیکن یہ تحقیق اگر اس مقصد کے لیے کی جائے کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ لفظ میں یہ معنی کیسے پیدا ہوئے؟ یہ تو لسانیات کی بڑی اعلیٰ بحث ہوئی اور اگر یہ تحقیق اس مقصد کے لیے کی جائے کہ لفظ کا وہ مفہوم جس میں وہ آج استعمال ہوتا ہے یا اس وقت استعمال ہوتا تھا، اس کو تبدیل کر کے ایک نیا مفہوم اس میں شامل کر دیا جائے تو اس کا وہی نتیجہ نکلے گا جو ہم مثالوں سے واضح کر چکے ہیں۔ یعنی قرآن کی آیات کا صحیح مفہوم ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ [ص ۳۳]

ہم اس بحث کو عربی کی ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ ''لفظ'' عربی زبان کا مصدر ہے۔ اس کا مطلب ہے ''پھینکی ہوئی چیز''، کسی چیز کو اگر پھینک دیں تو کہیں گے ''لفظ''۔ اب فرض کیجیے کہ اگر کوئی آدمی یہ کہے ''میں نے ایک لفظ بولا'' اور آپ یہ کہیں کہ اس نے ایک پھینکی ہوئی چیز بولی تو اس تحقیق کی کوئی کیا داد دے گا؟ یہ حرکت جیسا کہ ہم نے عرض کیا ایسا شخص کر سکتا ہے جو زبان سے اور اس کے قواعد اور اسالیب سے بالکل ناواقف ہو اور یا اس صورت میں کر سکتا ہے کہ وہ جانتے بوجھتے ایک بات کو نہیں ماننا چاہتا اور ایک دوسری بات متکلم کے منہ میں ڈالنا چاہتا ہے، اور اب اس نے زبان کے اس پہلو کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ [ص ۳۴]

عربی زبان ہی نہیں اردو زبان کا بھی ایک پہلو ہے جسے عرف کہتے ہیں۔ زبان کے علاوہ یہ عرف نہ صرف یہ کہ ایک معاشرے میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض اوقات ایک شاعر اور ایک ادیب اور ایک محقق اور ایک فلسفی کے کلام میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی لغت میں لفظ کا ایک مفہوم موجود ہے۔ لیکن معاشرے کے عرف نے اس کو بالکل دوسرے مفہوم میں مستعمل کر دیا ہے یہ وہ چند معروف باتیں ہیں جو کسی زبان اور اس میں موجود کلام کی تفہیم میں پیش نظر رہنی چاہییں۔ ان کو نظر انداز کرنے سے ہم کلام کے مفہوم سے دور سے دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ [ص ۳۵]

قرآن مجید کے ساتھ پرویز صاحب نے دراصل وہی سلوک کیا ہے جس کو ہم نے گذشتہ صفحات میں بعض مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے قرآن کی زبان کو اس کے استعمال، عرف، ہر چیز سے جدا کر کے لغت سے سمجھنے کی کوشش کی۔ یعنی قرآن مجید کے اس عرف کو جو معاشرے نے پیدا کیا، وہ عرف جو سیاق وسباق نے پیدا کیا، وہ عرف جو متکلم نے پیدا کیا اسے ملحوظ رکھے بغیر اس کے الفاظ کو وہ معانی پہنائے جیسے کوئی علامہ اقبال کے کلام میں خودی کا وہ مفہوم داخل کر دے جو لغت میں لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح سے ایک مقام پر کوئی قرینہ موجود نہیں کہ لفظ کو مجازی مفہوم میں لیا جائے لیکن وہ اس کا مجازی مفہوم ہی لینے پر مصر ہیں۔

[پرویز صاحب کا فہمِ قرآن، خطاب: جاوید احمد غامدی، تلخیص وترتیب شکیل عثمانی، دار التذکیر، لاہور]

غامدی صاحب کی اس بحث سے پرویز صاحب پر تنقید سے یہ بات واضح ہوگئی کہ منشائے کلام متکلم بتائے گا یا متکلم کے اصحاب بتائیں گے امت کی تاریخ بتائے گی تعامل صحابہ تعامل امت اور

اجماع امت بتائے گا کیونکہ یہ تسلسل اور تاریخ کے اندر ہی امت دین کے احکامات پر عمل پیرا ہے لہٰذا دینی احکامات، نصوص قرآنی اور احادیث نبویہ کی کوئی ایسی تشریح تاویل توجیہہ جو ان مصادر میں بیان کردہ اور عم کردہ طریقوں سے مختلف ہو تو یہ ناقابل قبول ہوگی افسوس کہ غامدی صاحب نے اپنے ان اصولوں کی خود ہی تردید فرمادی اب وہ پرویز صاحب کے اصولوں کے تحت آیات قرآنی کا تعین کررہے ہیں اسی لیے میراث کی آیت کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے اس آیت کے چار مختلف مفاہیم بیان فرمائے یہی غامدی صاحب کی بھی اصل غلطی ہے۔

سر کی اوڑھنی سے اپنا سینہ ڈھانپ کر اور زیب وزینت کی نمائش کیے بغیر کم ہی سامنے آتی ہے [ص ۹۳]

دینی جماعتیں اپنی دعوت کی بنیاد صرف اللہ کی کتاب اور حضورؐ کی سنت ثابتہ پر رکھیں [ص ۹۵] اسلام کا نظام سیاست و...... نظام ہے اس میں سیاسی معاملات کو چلانے کا یہی طریقہ ہے کہ [سربراہ کار لوگوں کی مرضی سے مقرر کیے جاتے ہیں] جیسے قرآن وسنت نے اہل ایمان کو اختیار کیے رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے [ص ۱۰۱، ۱۰۲] [سیاسی معاملات میں] کو سنت حضورؐ نے قرآن مجید کے ارشاد امرھم شوریٰ بینھم کی پیروی میں قائم کی [ص ۱۰۲] قرآن وسنت کے ان ضوابط سے یہ بات صاف ثابت ہوتی ہے کہ جمہوریت کا اصل جوہر اسلام میں یقیناً موجود ہے [ص ۱۰۲] [اسلام کا اصول ہے] کہ تمہارے درمیان جو نزاع بھی ہو اس میں سب سے پہلے قرآن وسنت کی طرف رجوع کرو [ص ۱۰۲] قرآن وسنت کی تعبیر کے لیے دینی علوم کے ماہرین کی مجلس قائم کی جاء جو حیات اجتماعی کے تمام معاملات میں قرآن وسنت کا منشا متعین کرے [ص ۱۰۴] دین صرف وہی ہے جس کی سند قرآن مجید یا نبیؐ کی حدیث وسنت میں موجود ہے دین کے ماخذات صرف یہ دو ہی ہیں جو شخص اس بات کو مانتا ہو وہی ان ماخذ کی تعبیر کے اس کام میں تعاون کے لیے آگے بڑھے [ص ۱۰۴] تمام ٹیکس ختم کردیے جائیں [ص ۱۰۷] زمین پر کام کرنے والوں کو صنعتی کارکنوں کی طرح تنخواہ اور دوسری تمام سہولتوں کا حق دار قرار دیا جائے [۱۰۷، ۱۰۸] رسول اللہ اور آپ کے خلفاء نے حکمرانوں کے لیے یہ سنت قائم کی کہ ا کا اوران کے عمال کے رہن سہن کا معیار کسی حال میں ایک عام شہری سے بڑھ کر نہ ہو حکمرانوں کے دروازے رات دن کھلے رہیں وہ نماز جمعہ کی امامت

کریں [ص ۱۰۹]

سیاست و معیشت [میزان]

۱۹۹۳ء میں سنت کی تعریف: اسلام کا جو قانون سیاست قرآن و سنت میں بیان ہوا ہے [جاوید احمد غامدی سیاست و معیشت، ص ۱۱، ۱۹۹۳ء ناشر جاوید غامدی دارالاشراق ۹۸ (۲) ای ماڈل ٹاؤن لاہور] اہل ایمان اپنی ریاست میں ایک ایسا ادارہ لازماً قائم کریں جس کی طرف وہ اجتماعی زندگی کے تمام معاملات کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم معلوم کرنے اور اس باب میں پیدا ہونے والی ہر نزاع کا فیصلہ کے لیے رجوع کر سکیں [ص ۱۳ محولہ بالا]

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَھَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ [۲۲:۴۱] اسلامی ریاست کا مقصد وجود در حقیقت یہی ہے اہل ایمان خود بھی دین پر قائم رہیں اور دنیا کی دوسری قوموں پر دین حق کی شہادت کا وہ فریضہ بھی کما حقہ ادا کر سکیں جسے قرآن مجید میں بحیثیت امت ان کا مقصد بعثت قرار دیا گیا ہے کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡھَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ ؕ وَ لَوۡ اٰمَنَ اَھۡلُ الۡکِتٰبِ لَکَانَ خَیۡرًا لَّھُمۡ ؕ مِنۡھُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ اَکۡثَرُھُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ [۳:۱۱۰] [ص ۱۳، ۱۴ محولہ بالا]

[۴۲:۳۸] امر شوریٰ سے نظم سیاسی کے بارے میں ہدایات ملتی ہیں سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں موقع و محل کی دلالت صاف بتا رہی ہے کہ یہ نظام کے مفہوم میں ہے اس لیے نظام کا ہر پہلو اس میں شامل سمجھا جائے گا بلدیاتی مسائل قومی صوبائی امور سیاسی و معاشرتی احکامات اجتماعی زندگی کے لیے دین کی تعبیر غرض نظام ریاست کے سارے معاملات اس آیت میں بیان کیے گئے قاعدے سے متعلق ہوں گے [ص ۱۶۱۵] وَ قَالَ لَھُمۡ نَبِیُّھُمۡ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَ نَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡہُ وَ لَمۡ یُؤۡتَ سَعَۃً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىہُ عَلَیۡکُمۡ وَ زَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَ الۡجِسۡمِ ؕ وَ اللّٰہُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَہٗ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ [۲:۲۴۷] اس سے واضح ہے کہ عورت اسلامی ریاست کی سربراہی کے لیے کسی طرح موزوں نہیں [خلاصہ] حدیث لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ اسی اصول پر مبنی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ [ص ۳۴، ۳۵] امیر المومنین اہل ایمان کی نماز حج جہاد و قتال کا بھی امام ہوتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ وہ ایک ہستی متعقل نہیں بلکہ مرد فاعل ہو جس کی ہر ادا سے نری

نزاکت اور لطافت و تاثر کے بجائے غلبہ و قوت اور تاثیر ظاہر ہوتی ہو [ص ۳۴، ۳۵] صفحہ ۳۵ پر غامدی صاحب نے مردانہ امارت کے دلائل دیتے ہوئے قلم توڑ دیا ہے ان کے دلائل اور خطابت ان کے کتابچے میں پڑھے جا سکتے ہیں امارت کا منصب سنبھالنے کے بعد جو سنت نظم سیاسی کے اعیان و اکابر کے لیے نبیؐ نے قائم کی ہے وہ تین ضوابط پر مشتمل ہے ۱۔ عمال کا معیار زندگی رہن سہن عام شہری سے بڑھ کر نہ ہوگا۔ ۲۔ دروازے شب و روز کھلے رہیں گے۔ ۳۔ نماز جمعہ کی امامت کرے گا یہ تینوں ضوابط ایک سنت ثابتہ کی حیثیت سے اس امت کو منتقل ہوتے ہیں [ص ۳۷] اسلام کا جو قانون معیشت قرآن وسنت میں بیان ہوا ہے [ص ۵۱] جوئے کے علاوہ اس باب میں جو دوسری چیزیں قرآن وسنت نے اس علت کی بناء پر ممنوع ٹھہرائی ہیں [ص ۶۳] سونے اور ریشم کے بارے میں یہ استثناء البتہ تواتر عملی سے ثابت ہے کہ عورتیں اسے بغیر تردد کے پہن سکتی ہیں بعض روایات میں قطعا عدم جواز کا حکم بھی بیان ہوا ہے [ابوداؤد کتاب الخاتم باب ۸] لیکن یہ روایتیں چونکہ اس سنت ثابتہ کے خلاف ہیں [ص ۶۵] زکوٰۃ کے لیے شرح و نصاب کے جو ضوابط سنت ثابتہ کی حیثیت سے امت کو منتقل ہوتے ہیں [ص ۸۰] جو چیزیں اصلاً محنت یا اصلاً سرمایہ سے وجود میں آئیں ان پر دس فی صدی جو سرمایہ محنت کے تعامل سے وجود میں آئیں ان پر پانچ فی صدی اور جوان دونوں کے بغیر محض عطیہ خداوندی کے طور پر زمین سے حاصل ہو جائیں ان پر تیس فی صد کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی جائے کوٹھی کے کرائے کا دس فی صدی زکوٰۃ ہوگی اگر کرائے پر نہ اٹھی ہو تو ان کی مالیت کا ڈھائی فی صدی ان پر بطور زکوٰۃ عائد ہونا چاہیے [ص ۸۱] مرنے والا اگر چاہے تو والدین اور اولاد کے سوا دور و نزدیک کے کسی رشتہ دار کو ترکے کا وارث بنا سکتا ہے۔ [ص ۸۳]

حدود وتعزیرات (میزان) ۱۹۹۵ء میں سنت کی تعریف:

اللہ کی یہی شریعت بالکل آخری اور قطعی صورت میں اس وقت اللہ کی کتاب قرآن مجید اور اس کے رسول کی سنت میں ہمارے پاس موجود ہے الجاثیہ [۴۵:۱۸] [جاوید احمد غامدی حدود وتعزیرات [میزان] ص ۹، ۱۰، اگست ۹۵، المورد، لاہور] حدود وتعزیرات کے نفاذ کے لیے دارالاسلام اور اس میں ایک باقاعدہ حکومت کا قیام شرط ہے [ص ۵۰] سزائیں جس طرح مسلمانوں پر نافذ ہوں گی اسی طرح دارالاسلام کی غیر مسلم رعایا پر بھی لازماً نافذ کی جائے گی [ص ۵۱ میزان] قحبہ عورتوں سے

اس زمین پر اب قیامت تک کے لیے یہ حق صرف محمد رسول اللہ کو حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کو

شریعت قرار دیں اور جب ان کی طرف سے کوئی خیر شریعت قرار دیا جائے تو پھر صدیق و فاروق بھی لاریب اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتے [ص ٦٧] کتاب حدود و تعزیرات کے آخری صفحے پر اشتہا رہے الاشراق [عربی] الفاتحہ زیر طبع ہے۔ [ص ٧٦]

قانون دعوت [میزان] ١٩٩٦ء میں سنت کی تعریف: [ص ١٨١٧ء امت شہادت الناس کیسے دے گی]

چنانچہ یہ ضروری ہے کہ [دعوت] کے کام کے لیے اٹھنے والے عربی زبان اور قرآن و سنت کے علوم میں گہری بصیرت پیدا کریں [جاوید غامدی قانون دعوت [میزان] ص ٢٥، جون ١٩٩٦ء، المورد لاہور] [دعوت کا مقصد یہ ہے کہ] دنیا کی قیادت صالحین کو منتقل ہو جائے دین کا غلبہ قائم ہو جائے اور اللہ کی بات ہر بات سے اونچی قرار پائے یہ بے شک ہر داعی کی تمنا ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے [ص ٢١] دعوت کے حدود و شرائط لائحہ عمل اور اس سے متوقع نتائج کے بارے میں قرآن و سنت کا نقطۂ نظر ہم پری وضاحت سے پیش کر رہے ہیں [ص ٢٢] دعوت دینے والا اپنی بات قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ پیش کرے کہ یہ اس کی تحقیق ہے اور وہ اس کی صحت پر مطمئن ہے لیکن اس میں غلطی کا امکان وہ بہر حال تسلیم کرتا ہے [ص ٢٣] حکمران [عوام] سے قرآن و سنت کی حدود میں ان سے سمع طاعت کا مطالبہ کر سکتے ہیں [ص ٢٤] کفر و شرک کی حقیقت واضح کی جائے گی اسے قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ ثابت بھی کیا جائے گا [ص ٣١] کسی کی تکفیر کے لیے اتمام حجت ضروری ہے ایک یہ کہ اللہ کا پیغمبر اس پر حجت تمام کرے اور اللہ کے اذن سے ان کی تکفیر کا اعلان کر دے دوسرے یہ کہ امت کا نظم اجتماعی اتمام حجت کے بعد اس کی تکفیر کا حکم صادر کر دے پیغمبر کی نیابت میں شہادت کا منصب امت کے کسی فرد یا جماعت کو نہیں بلکہ پوری امت کو بحیثیت امت منتقل ہوا ہے لہٰذا امت میں شامل کسی شخص یا گروہ پر دین کی حجت اگر پوری ہو سکتی ہے تو کسی عالم اور محقق کی رائے فقیہہ کے فتویٰ سے نہیں بلکہ امت کی سطح پر قائم نظم اجتماعی کے فیصلے ہی سے ہو سکتی ہے اسے یہ حق حاصل نہیں کہ امت میں شامل کسی فرد یا جماعت کو کافر و مشرک قرار دے اور اس کے...... جماعت سے الگ ہو [ص ٣١، ٣٢] الجماعۃ اور السلطٰن سیاسی اقتدار ہی ہے چنانچہ نبی کے اس حکم کا اطلاق مسلمانوں کی کسی ایسی جماعت پر ہی کیا جا سکتا ہے جو کسی خطۂ ارض میں سیاسی خود مختاری رکھتی اور جس کے اندر نظام امارت قائم ہو رسول نے ہمیں اسی کے التزام کی ہدایت فرمائی ے اور اس سے نکلنے کو

اسلام سے نکلنے کے مترادف قرار دیا ہے [ص ۲۶] داعی سچا ہو عالم باعمل ہو قول وفعل میں تضاد نہ ہو [۳۲،۳۳] کتاب کے آخر میں تصنیفات کی فہرست میں الاشراق عربی الفاتحہ زیر طبع کا اشتہار دیا گیا ہے [ص ۸۷ محولہ بالا] اصول مبادی میزان ۲۰۰۰ء میں سنت کی تعریف دین کا تنہا ماخذ اس زمین پر اب محمدؐ ہی کی ذات گرامی ہے رسول سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی وعملی تواتر سے دو صورتوں میں امت کو ملا ہے قرآن مجید سنت [جاوید غامدی اصول ومبادی [میزان کا مقدمہ ص ۷ جنوری ۲۰۰۰ء دانش سرا ۱۲۳ بی ماڈل ٹاؤن، لاہور] سنت سے مراد دین ابراہیمی کی روایت ہے جسے نبیؐ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری کیا [۱۲۳:۱۶] اس ذریعے سے جو دین ملا ہے وہ یہ ہے [ص ۹۸ پر ۴۰ سنتوں کی فہرست ہے]

سنت یہی ہے یہ بالکل قطعی ہے کہ نبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں یہ صحابہ کے اجماع اور عمل تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پاتی ہے اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں یہ دین لاریب انہی دو صورتوں میں ہے ان کے علاوہ کوئی چیز دین نہیں ہے نہ اسے دین قرار دیا جا سکتا ہے۔[ص ۹]

سن دو ہزار میں دانش سراء نے ''اسلامی علوم کے اساسی مسائل'' کے عنوان سے جاوید احمد غامدی صاحب کی ایک تقریر شائع کی جو لاہور میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین میموریل لیکچرز کے سلسلے میں کی گئی تھی اسے المورد کے یاسر مجید نے مرتب کیا تھا اس کتاب کے سرِ ورق کی پشت پر غامدی صاحب کی کتابوں کی فہرست ان کے تعارف کے ساتھ موجود ہے تعارف کی آخری سطر ہے''۔ دانش سار، المورد ماہنامہ اشراق رینی سال کے بانی اور برہان، میزان، البیان، الاشراق اور خیال وخامہ کے مصنف ہیں''۔[جاوید غامدی اسلامی علوم کے اساسی مسائل سرورق کی پشت کا صفحہ دانش سرا ۱۵۷ ایڈن کاٹیجز ڈیفنس لاہور ۲۰۰۰ء] اس فہرست میں غامدی صاحب کی عربی تفسیر ''الاشراق'' کا ذکر کیا گیا ہے لیکن غامدی صاحب نے ''مقامات'' میں اپنی کتابوں کے تعارف میں اس عربی تفسیر کا ذکر غائب کر دیا ہے اس رویے کی توجیہہ کرنا اب بہت آسان ہے۔

میزان ۲۰۰۸ء میں غامدی صاحب کا موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنم کو ختم کر دے گا لیکن ایمانیات کے نام سے اپنے ایک مضمون اکتوبر ۱۹۸۸ء میں غامدی صاحب لکھتے ہیں ''فیصلے کا دن

[قیامت] ہمارے وجود کا ناگزیر عقلی تقاضہ ہے یہی وہ دن ہے جب موت ہمیشہ کے لیے مر جائے گی۔ اس دن سے ڈرنے والے خدا کی اس ابدی بادشاہی میں داخل ہو جائیں گے جہاں قرآن کے الفاظ میں نہ ان کے لیے ماضی کا کوئی خدشہ ہوگا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ [۱۱۲:۲] عربی ولاخوف علیھم مولاھم یحزنون انسان اس دنیا میں اس طرح ہے جیسا کہ وہ مسافر ہے یا اجنبی جس کی ساری جدوجہد اس لیے ہوتی ہے کہ وہ خیر وعافیت کے ساتھ اپنے وطن میں اپنی منزل تک پہنچ جائے [جاوید غامدی ایمانیات/ص ۲۰، سن ندارد، المورد بہادر آباد چورنگی کراچی/۹۸(۲) ای ماڈل ٹاؤن اہور]

غامدی صاحب کی کتاب اخلاقیات ۲۰۰۶ء میں جہانگیر بک ڈپو لاہور نے شائع کی تو کتاب کے آخر میں غامدی صاحب کی مطبوعہ تصانیف کی فہرست دی گئی ہے ملاحظہ کیجیے (۱) البیان، (۲) میزان (۳) برہان، (۴) مقامات، (۵) خیال وخامہ۔ [جاوید احمد غامدی، اخلاقیات، ص ۹۸، فروری ۲۰۰۶ء، ناشر جہانگیر بک ڈپو، لاہور]

مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء کا آئینہ

غامدی صاحب کی عمر اور خدمات کا جائزہ

غالباً چھٹی یا ساتویں کے زمانے میں نصیر الدین صاحب ہمایوں سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے۔ یہ اس لحاظ سے بڑی اہم ملاقات تھی کہ پہلی مرتبہ اُنھی کی وساطت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے نام اور کام سے میرا تعارف ہوا۔ مولانا کی تمام کتابیں میں نے ان سے لے کر پڑھیں۔ یہ علم و عمل کی ایک نئی دنیا تھی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع اُنھی دنوں داؤد گارڈن، داروغہ والا میں منعقد ہوا۔ ہم چند دوست بھی اسلامیہ ہائی اسکول سے ہمایوں صاحب کے ساتھ اس اجتماع میں شرکت کے لیے لاہور آئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو میں نے پہلی مرتبہ اسی اجتماع کے موقع پر دیکھا۔ کیا دل نواز شخصیت تھی۔ لگتا تھا کہ اس کی صورت گری میں حسن فطرت کی ہر چیز کام آ گئی ہے۔ بعد میں ان سے ملنے اور بہت قریب رہ کر ان کو دیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ علم و عمل، حسن اخلاق، دانش و بصیرت اور جرأت و عزیمت کے لحاظ سے جن شخصیتوں کے نام ان کے ساتھ لے سکتے ہیں، وہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ یہ صرف میرا تاثر نہیں ہے۔ اُنھیں دیکھنے، ملنے ان سے ہم کلام ہونے اور ان کے ساتھ کام کرنے کی سعادت جن لوگوں کو بھی حاصل ہوئی ہے، وہ اس کی گواہی دیں گے — دسویں کا سال شروع ہوا تو فلسفہ، تصوف، ادب اور تاریخ کی کتابیں دیکھنے سے میری دل چسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ یہ والد اور ان سے ملنے والوں کی صحبت کا اثر تھا۔ [مقامات، طبع اول، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۔ ۲۰]

استاذ امام کے ساتھ یہی ملاقاتیں ہیں جن سے پہلی مرتبہ شرح صدر ہوا کہ دین محض مان لینے کی چیز نہیں ہے، اسے سمجھا اور سمجھایا بھی جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرآن ایک قول فیصل ہے، دین و شریعت کی ہر چیز کے لیے میزان ہے، پورے عالم کے لیے خدا کی حجت ہے۔ اس کی روشنی میں ہم حدیث و فقہ، فلسفہ و تصوف اور تاریخ و سیر، ہر چیز کا محاکمہ کر سکتے ہیں — یہ میرے لیے ایک نئے قرآن کی دریافت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کے طریقے پر قرآن کا طالب علم بننا چاہتا ہوں۔ اپنی تعلیم کا کچھ پس منظر بتا کر پوچھا کہ اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ مولانا نے مختلف علوم و فنون کی امہات کتب کی ایک لمبی فہرست بتائی جنھیں پڑھنے، سمجھنے اور دل و دماغ میں اتارنے کے لیے برسوں کی محنت چاہیے

تھی۔ مولانا نے فرمایا: اس طریقے سے پڑھنا چاہتے ہو تو لیڈری کے خیالات ذہن سے نکال کر علم ونظر اور فکر و تدبر کے لیے گوشہ گیر ہونا پڑے گا۔ یہ فیصلہ کرو کہ تمہارا سایہ بھی ساتھ نہ دے تو حق پر قائم رہو گے۔ ہمارے مدرسۂ علمی میں کوئی شخص اس عزم و ارادہ کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا—— یہ آخری دن تھا۔ اس سے اگلے روز مولانا گاؤں واپس جارہے تھے۔ میں نے دل و دماغ کا جائزہ لیا، نتائج و عواقب کا اندازہ کیا اور اسی روز فیصلہ کرلیا کہ کالج کو الوداع کہہ کر میں کل ہی مولانا کے مدرسۂ علمی میں داخل ہو جاؤں گا اور اس کے لیے جیسا علم چاہیے، اسے حاصل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔

میری طالب علمی کا دوسرا دور اسی سے شروع ہوا۔ یہ ۱۹۷۳ء کی ایک شام تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ کم و بیش دس سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں مولانا نے خود بھی پڑھایا۔ سورۂ زخرف سے آخر تک قرآن مجید، موطا امام مالک، قرآن و حدیث پر تدبر کے اصول و مبادی اور فلسفۂ جدید کے بعض مباحث ان کے طریقے پر انھی سے پڑھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ پڑھے کم لکھے زیادہ لوگ اس زمانے میں بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔ اُن کا ارشاد تھا کہ قلم اس وقت اٹھایئے، جب کوئی نئی حقیقت سامنے آئے۔ چنانچہ طالب علمی کے اس دور میں لکھنے کی ہمت کم ہی ہوئی [مقامات، طبع اول، ۲۰۰۸ء، جاوید احمد غامدی، ص ۱۹۔۲۰، ۲۴، ۲۵ محولہ بالا]۔ [ایک جانب یہ دعویٰ ہے کہ طالب علمی کے دور میں لکھنے کی ہمت کم ہوئی جبکہ اسی کتاب کے ص ۳۲ پر لکھا ہے کہ مجلّہ اشراق کی اشاعت شروع کی گئی ادارہ دارالفکر بنالیا گیا دارالاشراق ادارہ بھی بن گیا تعلیم و تدریس کے لیے لاہور میں مکان بھی کرائے پر لے لیا گیا [ص ۳۲] جماعت اسلامی کی رکنیت بھی حاصل کرلی ادارہ معارف اسلامی کی نظامت بھی سنبھال لی۔ [ص ۳۴، ۳۳] یہ تمام کام بغیر تیاری کے طالب علمی کا دور ختم ہونے سے پہلے ۱۹۷۳ء میں ہی شروع ہو گئے حضرت والا کی طالب علمی ۱۹۸۳ء میں ختم ہوئی اور اگلے سات برس ۱۹۹۰ء تک وہ غور و فکر کی طلبی میں مصروف رہے [ص ۲۶] مگر اسی غور و فکر کے دوران علمی سفر ختم ہونے سے پہلے ہی تمام کام استادانہ شان سے شروع کر دیے شاگرد تک بھرتی کر لیے بلکہ اسی کتاب کے ص ۳۶ کے مطابق حضرت والا ۱۹۷۰ء میں منڈی مرید کے میں صرف بیس سال کی عمر میں دارالاشراق کے نام سے اکیڈمی قائم کر چکے تھے جو ۱۹۷۸ء تک چلتی رہی اور لیڈری بھی —— اور اصلاحی صاحب کی ہدایت کے باوجود کہ لیڈری کے خیالات ذہن سے نکال کر گوشہ گیر ہو—— اس کی سنگین خلاف ورزی بھی ہو رہی ہے ص ۲۷ پر لکھ رہے ہیں کہ اس زمانے

میں اگر لکھا تو ضرورت کے مطابق مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسلسل مستقل لکھتے ہی رہے جبکہ دین کی تعبیر کی صحت پر ہی حضرت کو شک ہو گیا تھا اس شک میں وہ یقین امت تک منتقل کرتے رہے اور اس یقین پر شکر کرتے رہے اسے ارتقاء کہتے ہیں ایک جانب لکھ رہے ہیں کہ طالب علمی کے دور میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۳ء تک لکھنے کی ہمت بہت کم ہوئی لیکن استاد اصلاحی صاحب کے حکم کی عدم تعمیل میں تمام علمی کام بغیر تکمیل علم کے زور وشور سے جاری وساری تھا ص ۲۶ پر لکھتے ہیں کہ دین کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ اس سوال کے جتنے جوابات ابھی تک سامنے تھے وہ سب اعتراضات کی زد میں تھے ایک جانب یہ ادعا ہے دوسری جانب بغیر دین کا صحیح فہم حاصل کیے بغیر ہی حضرت والا تمام علمی کام کر رہے ہیں اشراق اعلام رسالے نکال رہے ہیں کتابچے شائع ہو رہے ہیں تقریریں ہو رہی ہیں شاگردوں کا حلقہ تک —— اسی دور طالب علمی میں بیس سال کی عمر میں منڈی مرید کے میں قائم ہو گیا ہے کیا یہ سب تضادات کا دفتر نہیں ہے اس کے سوا کچھ نہیں کاش ہمیں اس سوال پر غور کرنے کی نوبت درپیش نہ ہوتی غامدی صاحب جیسے نفیس نستعلیق فرد کے بارے میں یہ غور وفکر دکھ درد کے دریچے کھولتا اور بام و در پر اداسی کی فضاء طاری کرتا ہے۔

۱۹۸۳ء میں تعلیم کا یہ مرحلہ ختم ہوا تو میرے معتقدات کی دنیا میں ایسا اضطراب پیدا ہو چکا تھا کہ ہر چیز اپنی جگہ چھوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ فقہ، اصول فقہ، تصوف، علم کلام، سب قرآن میں اپنی بنیادیں تلاش کر رہے تھے۔ دین کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ اس سوال کے جتنے جوابات ابھی تک سامنے تھے، وہ سب اعتراضات کی زد میں تھے۔ میرے تصورات کا قصر منہدم ہو چکا تھا اور نئی تعمیر اب نئے بندوبست کا تقاضا کر رہی تھی۔ اگلے سات سال اسی بندوبست کی نذر ہو گئے۔ اس عرصے میں، معلوم نہیں، کتنی وادیاں قطع کیں، کتنے راستے ڈھونڈے، کتنے موڑ مڑے، کتنے پتھر الٹے، اور پاؤں کے آبلوں سے کہاں کہاں کانٹوں کی پیاس بجھائی۔ یہ عجیب سفر تھا۔ ایک کے بعد دوسری منزل گزر رہی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے کیا پیش آنے والا ہے —— یہ دور اسی طرح گزر گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء میں جا کر وہ زمین کہیں ہموار ہوئی، جہاں نئی تعمیر کے لیے نیو ڈالی جائے۔ زندگی کے چالیس سال پورے ہونے کو تھے۔ فکر وخیال میں بڑی حد تک وضوح پیدا ہو چکا تھا اور نقشۂ کار بھی واضح تھا [مقامات ص ۲۶، ۲۷] —— ۱۹۹۰ء تک ان کا ذہن شکست و ریخت کا شکار تھا لیکن اس سے پہلے ہی تقاریر و تصانیف کا انبار لگا دیا گیا آخر کیوں؟ جب تک فکر میں وضوح پیدا نہیں ہوا آپ امت کو کیوں مستفید کرنے لگے؟ —— [۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک

غامدی صاحب غور وفکر کی دنیا میں رہے ۱۹۹۴ء تک وہ قرآن سنت اجماع وغیرہ کو ماخذات دین سمجھتے تھے سنت ثابتہ حدیث وسنت کے قائل تھے امت کے علمی روایت اصلاحی صاحب کے فکر سے انہیں اتفاق تھا لیکن ۱۹۹۸ء میں اچانک سنت حدیث اجماع اجتہاد ہر اصطلاح کے معانی بدل گئے اصلاحی صاحب کو بار بار امام لکھنے کے باوجود انہوں نے اپنے امام کے افکار اور اصولوں کو بھی لائق اعتناء نہ سمجھا اور سنت کی ایک ایسی تعریف پیش کی جو مسلسل تغیر کی زد میں ہے اور جس کا سراغ امام ابوالحسن اشعری سے لے کر امام امین احسن اصلاحی تک پوری تاریخ اسلام میں کہیں نظر نہیں آتا۔ غامدی صاحب کے فکر نے کس کس طرح تنوع، تفرد، توسع کے نام پر التباس فکری کو جنم دیا اس کی کچھ تفصیل انہی کے شاگرد رشید خورشید احمد ندیم کے حوالے سے پڑھیے — خورشید احمد ندیم نے غامدی صاحب کی ایک تقریر یا تحریر کا حوالہ اپنے مقدمے میں دیا ہے جو غامدی صاحب کے کتابچے پرویز صاحب کا فہم قرآن کے نام سے ۲۰۰۴ء میں طبع ہوا تھا ندیم صاحب نے اس حوالے کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے لہٰذا غامدی صاحب کے علمی سفر کی روداد انہی کے الفاظ میں پڑھیے یہ تقریر یا تحریر ۱۹۸۸ء یا اس سے قبل کی ہے اس وقت تک غامدی صاحب پر چار دور گزر چکے تھے — دوسرا دور جس میں میں نے مذہب اور مذہب کے مکاتب فکر کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا کہ اب حقیقت کو تلاش کرنا ہے، یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا چیز صحیح ہے، کسی نتیجے تک پہنچنا ہے تو اس دور میں پھر پرویز صاحب کی اہم چیزوں کو اٹھایا اور میں پوری سچائی کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ بہت دیانت دارانہ مطالعہ کیا۔ میں نے یہ سعی کی کہ میں ہمدردی کے ساتھ پڑھوں، سمجھوں، جانوں یہ ہوسکتا ہے کہ حق یہی ہو۔ میرے پچھلے کم وبیش اس حیات مستعار کے اٹھارہ سال پبلک میں گزرے ہیں۔ اس میں کسی نہ کسی حوالے سے بہت سے لوگ مجھ کو جانتے ہیں بلکہ یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو مجھے برسوں سے جانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں نے اپنے اس سترہ اٹھارہ سال کے دور میں بڑے مراحل طے کیے ہیں [۱] میں جس دینی فکر کو لے کر پیدا ہوا تھا میں نے اس کو چھوڑا [۲] جس دینی فکر میں میری پرورش ہوئی تھی، میں نے اس کو چھوڑا۔ [۳] جس دینی فکر کا مجھ پر سب سے زیادہ اپنے شعوری دور میں غلبہ رہا ہے اس کو چھوڑا اور اب [۴] میں جہاں ہوں لوگ جانتے ہیں کہ بہر حال اس کا ان تعصّبات سے کوئی تعلق نہیں جو کہ اس وقت سوسائٹی کے اندر موجود ہیں۔ [یہ ۱۹۸۸ء کی بات ہے اس کے بعد بھی حضرت والا بدلتے ہی رہے] اس وجہ سے یہ تو ایک بالکل واقعی بات ہے کہ اگر کوئی حق ہوتا تو میں اگر رجم وارتداد پر علماء کی گالیاں کھا سکتا

ہوں تو مجھے اس پر بھی [گالی] کھانے میں کوئی باک نہ ہوتا اگر یہ بات میری سمجھ میں آ جاتی تو میں اس کا علمبردار ہوتا اس کو پیش کرتا پوری شان کے ساتھ پیش کرتا چاہے میرا سر کٹ جاتا۔ [شکیل عثمانی، پرویز صاحب کا فہم قرآن خطاب جاوید احمد غامدی مقدمہ و نظر ثانی خورشید احمد ندیم ص ۱۷، ۱۸، ۲۰۰۴ء دارالتذکیر لاہور غامدی صاحب نے یہ تقریر ۱۹۸۸ء میں کی تھی لیکن خورشید ندیم کے مقدمے کے ساتھ ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی ہے]—— ۱۹۹۰ء میں پانچواں دور گزرا جس کا ذکر مقامات سن ۲۰۰۸ء میں موجود ہے پھر ۹۰ کے بعد بھی فکری ارتقاء جاری رہا وج ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۸ء میں دو مرحلوں میں آگے بڑھانے پھر ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۴ء تک یہ ارتقاء مزید دو مرحلوں میں جاری رہا اور ۲۰۰۸ء میں جب میزان کی آخری اشاعت سامنے آئی تو یہ ارتقاء ایک حاص نہج پر پہنچ کر رک گیا لیکن مئی جون ۲۰۱۱ء کے اشراق میں آیت محاربہ کے اطلاق کے سلسلے میں حضرت والا کا ارتقاء دوبارہ ہو گیا اور آیت محاربہ کے تحت شاتم رسول کے قتل کا فتویٰ حضرت والا نے صادر کر دیا—— قبل ازیں وہ شتم رسول اور شتم الٰہی کو محاربے کے زمرے سے خارج کر چکے ہیں]——

۱۹۷۱ء کے جون میں ہماری ملاقات لاہور کے ایک ایڈووکیٹ چودھری محمد انور صاحب سے ہوئی۔ ان کے ایک بزرگ دوست سید بدر بخاری بھی اس ملاقات کے موقع پر موجود تھے۔ یہ دونوں ہمارے پروگرام سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی تجویز تھی کہ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے علامہ اقبال روڈ پر ان کے محلے میں درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا جائے [ص ۳۱ محولہ بالا]۔ [مقامات ۲۰۰۸ء ص ۳۶ کے مطابق ۱۹۷۰ء میں حضرت والا خود منڈی مرید کے میں دارالاشراق کے نام سے اکیڈمی قائم کر چکے تھے جو ۱۹۷۸ء تک چلتی رہی جس کا نوحہ حضرت والا نے اشراق کے پہلے باقاعدہ شمارے اشاعت جنوری ۱۹۷۹ء میں کیا ہے اور مقامات ص ۳۶، ۳۷ پر بھی تو حضرت لاہور میں کیا کر رہے تھے اور صرف بیس سال کی عمر میں اکیڈیمی کیسے چلا رہے تھے کیونکہ حضرت والا کے بیان کے مطابق ۱۹۹۰ء میں ان کی عمر چالیس برس ہو گئی تھی [ص ۲۷] عمر کا مسئلہ بھی چیستان ہے اسی کتاب کے ۸۵ کے مطابق حضرت والا

۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۸ء میں اپنے بھنوئی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے تھے — میرے دینی نقطۂ نظر سے اُنھیں کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ان کے سب بچے اس راہ پر چل پڑے جو میں نے اپنے لیے اختیار کی ہے،لیکن میرے ساتھ ان کی محبت ہمیشہ اسی شان کے ساتھ قائم رہی جس طرح آج سے بیس پچیس سال پہلے جب وہ مجھے بہلانے کے لیے میرے ساتھ بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے،میں اسے محسوس کرتا تھا۔[۱۹۸۸][ص۸۵] — **اور اچانک آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے ۱۹۷۰ء میں مفکر اسلام کے منصب پر فائز ہو کر منڈی مرید کے میں علم کی منڈی بھی کھول لی جو وسائل کی کمی کے باعث ۱۹۷۸ء میں بند کرنا پڑی**]

ڈیڑھ دو برس تک درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔اب کافی لوگ ہمارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار تھے۔لہٰذا سید بدر بخاری کی امامت میں تحریک کا باقاعدہ نظم قائم کر دیا گیا۔اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدنی ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔وہ بھی اس میں شامل ہوگئے۔درس کے بعض دوسرے شرکا نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔بدر بخاری صاحب عمر کے اس حصے میں تھے کہ اس طرح کے کسی نظم کی قیادت ان کے لیے آسان نہ تھی۔لہٰذا چند مہینوں کے اندر ہی باہمی مشورے سے یہ تنظیم ختم کر دی گئی۔مارچ ۱۹۷۳ء میں ہم نے ''دائرۃ الفکر'' سے ایک مجلّہ ''اشراق'' کے نام سے چھاپا۔ہمارا خیال تھا کہ ڈیکلریشن مل جائے گا تو اسے ایک باقاعدہ رسالے کی صورت دے دیں گے اور اس کے ذریعے سے اپنی بات لوگوں تک پہنچائیں گے۔اس کے چند ماہ بعد ہمارے مالک مکان نے کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کر دیا اس وقت کے حالات میں ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ اس کا مطالبہ پورا کرتے ،اس لیے ماڈل ٹاؤن کا یہ مکان بھی چھوڑنا پڑا۔اس کے بعد کئی مہینے تک ہم لوگ منتشر رہے۔ادارہ بھی معطل رہا۔خدا خدا کر کے گارڈن ٹاؤن کے احمد بلاک میں ایک مکان ملا۔دوست جمع ہوئے،ساز و سامان درست کیا گیا اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔[ص۳۲،محولہ بالا]

ہمارے بعض دوستوں کو ''دائرۃ الفکر'' کا نام پسند نہیں تھا۔چنانچہ اس کی جگہ ادارے کے لیے ''دارالاشراق'' کا نام اختیار کیا گیا۔ابتداء میں جو طالب علم اس سے متعلق ہوئے تھے ان میں سے میں

اور ساجد علی ہی باقی تھے۔

اس زمانے میں [یعنی ۱۹۷۳ء میں] مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک روز ملاقات کے لیے گیا تو اس کام کا بھی ذکر ہوا۔ مولانا نے تفصیلات پوچھیں، رفقاء سے تعارف حاصل کیا، میں نے اپنی مشکلات بتائیں، وہ موانع بیان کیے جو کام میں تعطل کا باعث بن جاتے تھے اور ان سے سرپرستی کی درخواست کی۔ مولانا نے میری یہ درخواست ازراہ عنایت قبول فرمالی۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق ادارے کے لیے میرے اور مولانا کے نام سے ایک مشترک اکاؤنٹ اچھرہ کے حبیب بنک میں کھولا گیا جس میں مولانا نے اپنی جیب سے ماہانہ ایک ہزار روپے جمع کرانے شروع کر دیے۔ احمد بلاک سے ہم لوگ مولانا کے گھر کے پاس انھی کی دی ہوئی ایک عمارت ا۔اے ذیلدار پارک اچھرہ میں منتقل ہو گئے۔ مولانا کا خیال تھا کہ اسے ''ادارہ معارف اسلامی'' کی ایک شاخ یا ایک نئے ادارے کی حیثیت سے منظّم کیا جائے گا۔[ص۳۲ محولہ بالا]

۱۹۷۶ء کے آخر میں ہم [منڈی مرید کے] یہاں پہنچے اور ۱۱رجنوری ۱۹۷۷ء کو جماعت اسلامی پنجاب کے امیر مولانا فتح محمد صاحب کا ایک خط موصول ہوا جس میں انھوں نے مطلع کیا تھا کہ جماعت سے میری رکنیت ختم کر دی گئی ہے۔ یہ ایک دو سطروں کی تحریر تھی جس میں بغیر کوئی وجہ بتائے فیصلہ سنا دیا گیا تھا کہ میں اب جماعت کا رکن نہیں رہا۔[ص۳۴ محولہ بالا]—[۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۶ء تک حضرت والا منڈی مرید کے میں اکیڈیمی چلا رہے تھے تو یہاں لاہور میں کیا کر رہے تھے؟][۱۹۷۳ء میں ایک جانب غامدی صاحب اصلاحی صاحب کے تلمیذ بن گئے تھے اور ایسے شاگرد کہ پھر کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا لیکن اسی دوران وہ مولانا مودودی کی رفاقت بھی اختیار کر چکے تھے اسی کتاب کے ص ۱۰۰ پر لکھتے ہیں ''میں نے امین احسن کو سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں دیکھا اور پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا۔ میرے لیے اس وقت ان کا دروازہ 'درنکشودہ' ہی تھا، لیکن میں نے ہمت کی اور اسی بند دروازے پر بیٹھ گیا۔ بر درنکشودہ ساکن شد در دیگر نہ زد — پھر وہ دروازہ کھلا اور اس طرح کھلا کہ گویا اپنے ہی گھر کا دروازہ بن گیا۔ اس دن سے آج تک علم و عمل کی جو دولت بھی ملی ہے، خدا کی عنایت سے اور اسی دروازے سے ملی ہے۔''[ص۱۰۰ محولہ بالا] اگر یہ بیان سو فی صد درست ہے تو حضرت والا کی خدمت میں ہم یہ عرض پیش کر سکتے ہیں کہ جناب والا جب آپ نے

اس دروازے کی طرف ۱۹۷۳ء میں دیکھنے کے بعد کسی اور دروازے کی طرف نہیں دیکھا تو آپ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء تک مولانا مودودی کے دروازے پر کیا کر رہے تھے اکاؤنٹ کھلوا کر مولانا مودودی سے ایک ہزار روپے مہینہ کیوں لے رہے تھے ادارہ معارف اسلامی میں کیا تحقیق کر رہے تھے جبکہ مولانا مودودی نے امین احسن اصلاحی کے فکر،عمل، تحقیق ،نظریات ،علمیت اور اہداف میں بعد المشرقین تھا کون سی بات حقیقت ہے کون سی افسانہ؟]

مالی وسائل کی کمی نے [منڈی مرید کے کی دار الاشراق اکیڈیمی جو ۱۹۷۰ء میں قائم ہوئی اس کا ذکر ہے] اس کام کو بار بار معطل کیا ہے۔ اس کی پوری تاریخ مسلسل بحران کی تاریخ ہے۔ یہاں تدریس بار بار شروع ہو کر ختم ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اللہ کا احسان ہے کہ کچھ کام ہو گیا اور بہت تھوڑا باقی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈیڑھ دو سال مزید کام کرنے کا موقع مل جاتا تو اس کاوش کا مرحلۂ اول مکمل ہو جاتا۔ اب یہ سب کچھ معطل ہے اور مرید کے کی اس ارض عقیم میں ہم خدائے لم یزل کے چند ناتواں بندے ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے احیاء کے لیے کوشاں ہیں — میری جدوجہد کا پہلا مرحلہ یہاں ختم ہو گیا۔ لاہور واپس آنے کے بعد خیال تھا کہ اب صرف رسالہ نکالوں گا۔ ''اشراق'' کا ڈیکلریشن مستنصر میر کے نام پر مل گیا تھا، لیکن ابھی دو شمارے ہی نکلے تھے کہ میر صاحب کے امریکا جانے کا پروگرام بن گیا۔ پھر میرے اور ان کے درمیان رسالے کی پالیسی کے بارے میں بھی کچھ اختلاف تھا۔ لہٰذا یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور ''اشراق'' ایک مرتبہ پھر بند کرنا پڑا [ص ۳۹، محولہ بالا]۔

یہ تفسیر لاہور میں بھی لکھی گئی اور برسوں لاہور سے باہر خانقاہ ڈوگراں کے پاس ایک دور افتادہ گاؤں رحمٰن آباد میں سر سے اور شیشم کے درختوں کے نیچے بھی زیر تسوید رہی، جہاں نہ بجلی تھی، نہ پنکھا اور نہ تصنیف و تالیف کے لیے کوئی دوسری سہولت۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ مسودہ پسینے سے بھیگ رہا ہے، لیکن مصنف کا قلم اُسی طرح رواں دواں ہے۔ وہ اس بات سے آگاہ تھے کہ — بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید — قرآن کی مشکلوں کو حل کرنے اور اس سے متعلق اپنے نتائج فکر کو سپرد قلم کرنے میں وہ دنیا کی ہر مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ [ص ۱۰۷، محولہ بالا] — وہ فرشتہ نہیں، انسان ہی تھے اور ان میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ لیکن معیار زندگی بڑھانے کا کوئی فتنہ کبھی ان کے قریب سے نہیں گزرا۔ اللہ تعالیٰ سے تفویض و توکل کا ایسا تعلق تھا کہ اس پر رشک آتا تھا۔ زبان اکثر ذکر الٰہی سے تر

رہتی۔[ص ۱۲۶،محولہ بالا] دبستان شبلی والوں کے لیے اصلاحی صاحب کا طرزِ زندگی ہی واجب التقلید ہونا چاہیے مگر کیا عملاً ایسا ہورہا ہے—اس کے بغیر علمی کام منظر پرنہیں آسکتے—غامدی صاحب نے سنت سے ثابت کیا ہے کہ حکمراں کا معیار زندگی عام آدمی کے برابر ہونا چاہیے۔[مقامات ۲۰۰۶ء، ۲۰۰۸ء] کیا یہ سنت صرف حکمراں کے لیے ہے پیغمبر کے علم دین کے وارث اور پیغمبر کے مثل علماء [جو اصل حکمران ہیں]—اور دبستان شبلی سے وابستہ مفکرین کے لیے کیا اس سنت پر عمل ضروری نہیں ہے —دبستان شبلی تو معیار زندگی کے فتنے کو فتنہ ہی نہیں سمجھتا ان کا فتویٰ ہے کہ اس میں کیا ہرج ہے مغرب کا منشور بنیادی حقوق فرد اور حکومت کا ایک ہی مقصد بتاتا ہے معیار زندگی میں اضافہ کرتے رہنا اور معیار کی تعریف بھی نہیں بتانا—

ایمان بالغیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جاسکتے، اُنھیں انسان محض عقلی دلائل کی بنا پر مان لے۔ ذات خداوندی کو ہم دیکھ نہیں سکتے؛ قیامت ابھی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جبریل امین کو وحی کرتے ہم نے نہیں دیکھا، لیکن اس کے باوجود ہم ان سب باتوں کو مانتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حقائق کو ماننے کے لیے انفس وآفاق میں اور خود اس کلام میں جو اللہ کے پیغمبر نے پیش کیا، ایسے قوی دلائل موجود ہیں جن کا انکار کوئی صاحب عقل نہیں کرسکتا—چنانچہ ہم انھیں بے سوچے سمجھے نہیں مانتے، بن دیکھے مانتے ہیں۔ وہ چیز جو دیکھی نہیں جاسکتی، لیکن عقل کے ذریعے سے سمجھی جاسکتی ہے، اسے دیکھنے کا تقاضا ہی سب سے بڑی بے عقلی ہے ۔[ص ۱۳۵،محولہ بالا]

قرآن نے جو حقائق پیش کیے ہیں ان پر ہمارے ایمان کی بنیاد بھی یہی ہے۔ وہ بے شک حواس سے ماورا ہیں، لیکن عقل سے ماورا نہیں ہیں۔ ہم نے انھیں عقل کی میزان میں تولا ہے اور ان میں رتی بھر کمی نہیں پائی۔ چنانچہ ہم ان پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔[ص ۱۳۶،محولہ بالا]—ایمان بالغیب کی نئی تشریح پڑھ لیجیے تبصرے کی ضرورت نہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، تطہیر اخلاق کے مقصد سے فرمایا ہے۔ داڑھی سے متعلق آپ کی نصیحت کا صحیح محل یہی تھا، مگر لوگوں نے اسے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم سمجھا اور اس طرح ایک ایسی چیز دین میں داخل کر دی جو اس سے کسی طرح متعلق نہیں ہوسکتی۔[ص ۱۳۹،محولہ بالا]—جون

۱۹۹۱ء کے اشراق میں شیر محمد صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں ''ورنہ داڑھی، ختنہ اور اس طرح کی بے شمار دوسری چیزوں میں سنت کو مستقل بالذات شارع مان کر ہی دین میں شامل قرار دیتا ہوں [جون ۱۹۹۱ء، ص ۳۲، اشراق] حضرت کا ارتقاء ہو گیا—

تقسیم وراثت کا جو قانون قرآن میں بیان ہوا ہے، اس میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ یہ تقسیم اس وصیت کے بعد ہے جو مرنے والا کسی کے لیے کرتا ہے۔ اس پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں: ایک یہ کہ وصیت کے لیے کوئی حد مقرر کی گئی ہے یا آدمی جس کے لیے جتنی چاہے وصیت کر سکتا ہے؟ دوسرا یہ کہ وصیت کیا ان لوگوں کے حق میں بھی ہو سکتی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے میت کا وارث ٹھہرایا ہے؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں کسی تحدید کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق فرمایا ہے کہ یہ تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی۔ زبان و بیان کے کسی قاعدے کی رو سے اس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ سلم کی نسبت سے جو روایت اس معاملے میں نقل ہوئی ہے اس کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ غامدی صاحب نے وصیت کی آیت کا جو نیا مفہوم عربیت، لغت، کی مدد سے اب متعین کیا ہے ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۰۲ء تک ان کا موقف اس سے یکسر مختلف تھا تفصیلات و تقابل کے لیے غامدی صاحب کی کتب میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، قانون معیشت ۱۹۹۷ء، سیاست و معیشت ۱۹۹۳ء، برہان ۲۰۰۶ء کا ملاحظہ کیجیے قرآن، عربیت، لغت، تعامل امت اجماع امت کی روشنی میں غامدی صاحب کا پہلے موقف یہ تھا کہ جو حصے اللہ نے ترکے میں متعین کر دیے ہیں ان کو تو حصہ لازماً ملے گا کوئی وصیت اس سے وارثوں کو محروم نہیں کر سکتی کلالہ اگر کسی کو تمام جائیداد کا وارث بنا دے تب بھی شریعت کے متعین وارثوں کو حصہ ملے گا اب ان کا خیال ہے کہ قرآن کی اسی آیت کا مطلب لغت عرب، زبان و بیان، آثار کی روشنی میں امت کی مسلمہ علمی روایت کے بالکل برعکس ہے اس کے بعد حضرت والا مورث کو قرآن سے ہی اجازت دیتے ہیں کہ وہ ورثاء میں سے جس کو چاہے کسی مصلحت ضرورت یا حکمت کے تحت اس کے حق میں الگ سے وصیت کر سکتا ہے [ص ۱۴۲] اس وصیت کی حد بھی حضرت والا نے مقرر نہیں فرمائی یعنی مورث کسی بھی وارث کو پوری جائیداد کی وصیت کر کے سب ورثاء کو وراثت سے محروم کر سکتا ہے غامدی صاحب نے صاف صاف لکھا ہے کہ ''یہ وصیت جس طرح دوست احباب کے لیے ہو سکتی ہے اسی طرح ان وارثوں کے حق میں بھی ہو سکتی ہے اس

میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ [ص ۱۴۱، ۱۴۲، محولہ بالا] ـــــ ۱۹۹۰ء میں حضرت کا علمی ارتقاء، اور سفر مکمل نہیں ہوا معلوم نہیں کب مکمل ہو؟

اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے سوا جسم کے کسی حصے کی زیبائش، زیورات وغیرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہیں کھولیں گی۔ قرآن نے اسے لازم ٹھہرایا ہے۔ سر پر دوپٹا یا اسکارف اوڑھ کر باہر نکلنے کی روایت اسی سے قائم ہوئی ہے اور اب اسلامی تہذیب کا حصہ بن چکی ہے۔ عورتوں نے زیورات نہ پہنے ہوں اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو وہ اس کا اہتمام کرتی رہی ہیں۔ یہ رویہ بھی قرآن ہی کے اشارات سے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دوپٹے سے سینہ اور گریبان ڈھانپ کر رکھنے کا حکم ان بوڑھیوں کے لیے نہیں ہے جو نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔ قرآن کا ارشاد ہے، وہ اپنا یہ کپڑا مردوں کے سامنے اتار سکتی ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے مگر ساتھ ہی وضاحت کر دی ہے کہ پسندیدہ بات ان کے لیے بھی یہی ہے کہ احتیاط کریں اور دوپٹا سینے سے نہ اتاریں۔ اس سے واضح ہے کہ سر کے معاملے میں بھی پسندیدہ بات یہی ہونی چاہیے اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو عورتوں کو دوپٹا سر پر اوڑھ کر رکھنا چاہیے۔ یہ اگرچہ واجب نہیں ہے، لیکن مسلمان عورتیں جب مذہبی احساس کے ساتھ جیتی اور خدا سے زیادہ قریب ہوتی ہیں تو وہ یہ احتیاط لازماً ملحوظ رکھتی ہیں اور کبھی پسند نہیں کرتیں کہ کھلے سر اور کھلے بالوں کے ساتھ اجنبی مردوں کے سامنے ہوں۔ [ص ۱۵۰، محولہ بالا]۔ [۲۰۰۸ء] میزان ۱۹۸۵ء میں حضرت والا کا موقف قرآن کی اسی آیت کے بارے میں بالکل مختلف تھا اسلام کیا ہے؟ کی پہلی اشاعت میں جاوید صاحب کے مکتب فکر کا موقف بھی اس تشریح سے بالکل مختلف ہے اس میں گھر کے اندر کا پردہ اور گھر کے باہر پردہ کا فرق بیان کیا گیا ہے بعد میں پردہ کے لفظ کو ہی احمقانہ قرار دیا گیا جبکہ حضرت والا کے استاد امام اصلاحی اپنی کتاب ''عورت کا مقام'' میں بار بار پردہ کا لفظ استعمال کر رہے ہیں انھیں امام بھی تسلیم کیا جا رہا ہے ـــــ غامدی صاحب، مغرامجد، حمید ساجد، ڈاکٹر فاروق خان، رفیع مفتی صاحب ۲۰۰۰ء تک قرآن سے گھر کے باہر عورت کا پردہ ثابت رتے تھے اس دور کی تقاریر پڑھ لیں ورنہ اسلام کیا ہے کی پہلی اشاعت ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۰ء تک کی اشاعتیں پڑھ لیں جو المورد اور دانش سرا اور اشراق سے شائع ہوئیں لیکن اچانک ۲۰۰۵ء اور اب ۲۰۰۸ء میں یہ موقف قرآن ہی کی روشنی میں بدل گیا عجیب روشنی ہے کبھی کچھ بتاتی ہے کبھی کچھ ـــــ

تیسرا یہ کہ اسے جرابوں کے مسح پر قیاس کرنا چاہیے۔ چنانچہ نیل پالش اگر وضو کر کے لگائی گئی ہے تو اتارنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے اوپر ہی وضو کر لیا جائے گا، لیکن وضو کے بغیر لگائی گئی ہے تو اسے اتار کر وضو کرنا چاہیے۔[ص ۱۵۱۔۱۵۲] —— یہ منطق بھی عجیب ہے اس تکلیف میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟

ہر وہ چیز جسے لوگوں نے اختیار کیا ہوا ہے، جو پہلے سے چلی آرہی ہے، جس سے لوگوں کے جذبات وابستہ ہیں، جو ان کی شناخت بن گئی ہے، جو ان کے لیے ایک روایت کی حیثیت رکھتی ہے، وہ اگرچہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو اور اس نے حقیقت کا چہرہ کتنا ہی مسخ کیوں نہ کر دیا ہو اور وہ اللہ کے کسی صریح حکم اور اس کے رسول کی کسی واضح سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو لوگ اس پر کوئی تنقید سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔[ص ۱۶۱] —— یعنی سنت ۲۶ سنتوں سے ہٹ کر کوئی چیز ہے مگر یہ دعویٰ ہے کہ سنتیں چھبیس ہیں —— [ص ۱۶۴]

قرآن مجید بالصراحت کہتا ہے کہ سارا دین عقل پر مبنی ہے۔ وہ اپنے تمام احکام وعقائد اسی بنیاد پر انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اس نے جو بات بھی کہی ہے، اس کے لیے ہر جگہ عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔[ص ۱۶۵ محولہ بالا] —— اس میں شبہ نہیں کہ ہماری عقل بہت سے دینی حقائق خود دریافت نہیں کر سکتی، لیکن اللہ کے نبیوں کی طرف سے ان کی وضاحت کے بعد وہ انھیں سمجھنے کی صلاحیت، بے شک رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ماننے کا تقاضا بھی اللہ تعالیٰ نے اسی سے کیا ہے۔[ص ۱۶۶، محولہ بالا] —— دین بھی انسان کی عقل ہی کو خطاب کرتا ہے۔ چنانچہ وہ عقل سے ماوراء کوئی ہدایت عقل کو نہیں دیتا۔ اس کی تمام ہدایات بالکل عقل کے مطابق ہیں۔[ص ۱۶۷، محولہ بالا]

چنانچہ انھوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ یہ چونکہ اللہ کی کتاب ہے، اس لیے دنیا کے سارے علوم وفنون اس میں لامحالہ ہونے چاہئیں، اس کے بعد وہ اپنے اس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے اس بات کے درپے ہوئے کہ کسی طرح ان علوم وفنون کے ماخذ اس کی آیات میں سے ڈھونڈ نکالے جائیں۔ چنانچہ زبان وبیان اور نظام کلام کی ہر دلالت کو نظر انداز کر کے کبھی فلسفہ یونان کے اوہام اس سے ثابت کیے گئے، کبھی ایک خاص زمانے کی سائنسی معلومات کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ وہ درحقیقت اس کی فلاں اور فلاں آیت سے اخذ کی گئی ہیں۔ کبھی علم طب اور نجوم وفلکیات کے بعض عقائد اس سے برآمد کیے

گئے اور کبھی انسان کے ایٹم بم بنانے اور چاند پر پہنچنے کا ذکر اس میں سے نکال کر دکھایا گیا۔[ص۱۶۸، ۱۶۹،محولہ بالا]—ہم اگر قرآن مجید سے فی الواقع ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ اس کی طرف صرف دین کے حقائق و معارف جاننے کے لیے رجوع کریں۔ اپنے سونے کے لیے چار پائی بنانے اور اپنی آواز زہرہ و مریخ تک پہنچانے کے لیے ہمیں اپنی عقل کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے انسان کو اپنے دائرۂ عمل میں کبھی مایوس نہیں کیا۔[ص۱۷۰،محولہ بالا]—[حضرت والا کا یہ موقف بالکل صائب ہے اس موقف سے ہمیں کامل اتفاق ہے غالباً یہی حضرت کا واحد درست موقف ہے]—پہلے غامدی صاحب کا خیال تھا کہ کوئی حدیث مسلمہ سائنسی حقائق کے خلاف نہیں ہوسکتی تفصیلات کے لیے اسلام کیا ہے کی اشاعت ۱۹۷۷ء، ۱۹۹۹ء کا مطالعہ کیجیے—

پوپ کے خلاف یہ جنگ اور نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک، دونوں انسان کا مایۂ افتخار ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ پوپ کا دعویٰ باطل تھا۔ دین حق میں کبھی کوئی پوپ اور کوئی پادری خدا اور اس کے بندوں کے درمیان حائل نہیں رہا۔ یہ دعویٰ ہر حال میں باطل قرار پانا چاہیے تھا۔ جن لوگوں نے اسے باطل قرار دیا انھوں نے بے شک ایک حق کا اثبات کیا۔ یہی معاملہ نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا ہے۔ علم انسان کی سب سے بڑی متاع ہے۔ اس کی بازیافت اور دریافت کے لیے جو سعی بھی کی جائے گی اسے یقیناً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔[ص۱۷۲،محولہ بالا]—حضرت والا کا یہ موقف نہایت کم زور ہے علم کی تعریف بھی درست نہیں ہے نشاۃ ثانیہ کی تحریک خدا کے خلاف مغرب کی بغاوت تھی اس کا خیر مقدم عجیب بات ہے تاریخ فکر مغرب اور جدیدیت و جدید فلسفے سے واقف کوئی شخص اس قدر سادہ بیان نہیں دے سکتا—حضرت کا یہ بیان مقامات ۲۰۰۶ء میں یاجوج ماجوج [ص۹۰] اور ہماری تعلیم پر دیے گئے موقف سے متصادم ہے [ص۱۳۶]

اس میں شبہ نہیں کہ ان میں ہر چیز کو وہ [اسلام] انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور انسانیت کے خلاف بدترین جرم قرار دیتا ہے لیکن قومیت کی نفی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی ان تمام بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے جو علم سیاست میں بالعموم اس کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔[**یہ بیان درست نہیں اٹھارھویں صدی سے پہلے قومی کلیسا اور قوم پرستی اور قومی سرحدوں کا وہ تصور ھی نہیں تھا جو اٹھارھویں صدی کے بعد مغرب میں قوم پرستی کے جدید فلسفے نے تخلیق کیا**

جس کے باعث قومی کلیسا وجود میں آئے دو عظیم قومی جنگیں ہوئی غامدی صاحب قوم پرستی کے خلاف افضال ریحان کو انٹرویو دیتے ہوئے مغرب پر بار بار برسے ہیں یہ ۱۹۹۸ء کی بات ہے دارالتذکیر کی کتاب میں وہ پڑھ لیجیے اب حضرت والا کا ارتقاء ہوگیا ہے] قوموں کے مابین مسابقت کے جذبے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے شائستہ اظہار پر بھی اسے کوئی اعتراض نہیں ہے [قوم پرستی میں بنیاد نفرت ہوتی ہے دوسرے کو مٹادو اور نفرت کی بنیاد ہوتی ہے قوم سے محبت اسے بلند کردو]۔مسلمانوں کے مختلف گروہ اگر اپنی قوم کے حوالے سے اپنا تعارف کرائیں، حقوق کا مطالبہ کریں یا اپنی کوئی الگ قومی ریاست قائم کرنا چاہیں تو اسے بھی وہ ناجائز نہیں کہتا [اسلام میں حقوق کی سیاست ہی نہیں ہوتی خروج کفر بواح پر ہے]۔لہٰذا یہ نقطۂ نظر کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد بھی اسلام ہی ہے، کسی طرح درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔قرآن نے کسی جگہ یہ نہیں کہا کہ مسلمان ایک قوم ہیں یا انھیں ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔مسلمانوں کے اندر اقوام وملل کا وجود وہ تسلیم کرتا ہے [وہ شعوب وقبائل گروہوں کا وجود مانتا ہے قوم کا نہیں]۔اس نے جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ۔قرآن کی رو سے مسلمانوں کا باہمی رشتہ قومیت کا نہیں، بلکہ اخوت کا ہے۔وہ دسیوں ریاستوں اور بیسیوں ممالک میں تقسیم ہونے کے باوجود ایمان کے رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔اس لیے یہ تقاضا تو ان سے کیا جاسکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ اپنے بھائیوں کے حالات کی خبر رکھیں، ان کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں ان کے کام آئیں، وہ مظلوم ہوں تو ان کی مدد کریں، معاشی اور معاشرتی روابط کے لیے انھیں ترجیح دیں اور ان پر اپنے دروازے کسی حال میں بند نہ کریں، مگر یہ تقاضا نہیں کیا جاسکتا کہ اپنی قومی ریاستوں اور قومی شناخت سے دستبردار ہوکر لازماً ایک ہی قوم اور ایک ہی ریاست بن جائیں۔وہ جس طرح اپنی الگ الگ قومی ریاستیں قائم کرسکتے ہیں، اسی طرح دین وشریعت پر عمل کی آزادی ہو تو غیر مسلم اکثریت کی ریاستوں میں شہری کی حیثیت سے اور وطن کے بنیاد پر ایک قوم بن کر رہ بھی سکتے ہیں۔ان میں سے کوئی چیز قرآن وسنت کی رو سے ناجائز نہیں ہیں۔[ص۱۷۴،۱۷۵،محولہ بالا]—— موصوف کا یہ نقطۂ نظر ان کے سابق موقف سے مختلف ہے جو افضال ریحان کو انٹرویو میں بیان کیا گیا ہے افضال ریحان کی مرتبہ کتاب اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب حریف یا حلیف ۲۰۰۴ء میں دارالتذکیر نے شائع کی اس کتاب کے ص ۶۰، ۶۱ پر

غامدی صاحب نے نیشنل ازم کی بھرپور مذمت کی ہے مغرب کو اس ازم کا خالق کہا ہے اسے باطل نظریہ قرار دیا ہے جو گلوبل انسان کی راہ میں رکاوٹ ہے جس نے پاسپورٹ ویزے کی پابندیاں لگائیں ان پابندیوں کو پیدا کیا یہ ہے حضرت والا کا ارتقاء——

ان میں سے ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ اس دین کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے۔ قرآن کے بارے میں یہ بات محتاج بیان نہیں کہ یہ جس طرح اگلوں کے پاس تھا، بالکل اسی صورت میں ہمارے پاس بھی موجود ہے۔ اس کے کسی حرف اور کسی شوشے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی زبان عربی مبین ہے۔ اس کے الفاظ و اسالیب کے معنی کی تحقیق کے لیے تمام ضروری مواد اس زمانے میں بھی اسی طرح میسر ہے جس طرح اس امت کے پہلے دور میں تھا۔ قرآن مجید کے بعد دوسرا ماخذ حدیث و سنت ہے۔ اس کا بیش تر حصہ تواتر عملی کے ذریعے سے ہمیں ملا ہے۔ باقی جو کچھ اخبار آحاد کی صورت میں تھا، اس میں جتنا کچھ ہمارے اسلاف نے قابل اعتماد پایا، وہ سب انھوں نے ہمیں منتقل کر دیا ہے۔ اس میں سے کوئی چیز بھی انھوں نے چھپا کر نہیں رکھی۔ جو کچھ انھوں نے چھوڑا اور جو کچھ اختیار کیا ہے، اس کے وجوہ بھی انھوں نے بیان کر دیے ہیں۔ دین میں یہی دو چیزیں اصل حجت ہیں اور یہ دونوں اس زمانے میں اسی طرح ہمارے پاس موجود ہیں، جس طرح اگلوں کے پاس تھیں۔ [ص ۱۷۸] مقامات ۲۰۰۸ء غامدی صاحب نے میزان ۲۰۰۹ء میں ماخذات دین کی تعریف دوسری بیان کی ہے حدیث اور اخبار احاد کو ماخذ سے خارج کر دیا ہے—— لیکن مقامات میں ماخذات کی تعریف اس سے یکسر مختلف ہے۔

ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں مسجدوں کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سنت ان کے بارے میں قائم کی وہ یہ تھی کہ ان میں نماز جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت امیر ریاست اور اس کے عمال کریں گے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اگر کسی حجت شرعی کی بنا پر ان کی معذوری کی صورت میں اس مقصد کے لیے منبر پر کھڑا ہوگا تو ان کی اجازت سے اور ان کے قائم مقام کی حیثیت سے کھڑا ہوگا۔ [ص ۱۸۷ محولہ بالا] سنتوں کی تعداد میں ایک نئی سنت کا اضافہ لیکن میزان ۲۰۰۹ء میں جو سنتوں کی فہرست ہے اس میں اس کا اندراج نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو خلافت آپ کے صحابہ نے قائم کی، اس میں یہ سنت پوری

شان کے ساتھ قائم رہی، لیکن بعد کے زمانوں میں جب حکمران اپنے اعمال کی وجہ سے لوگوں کے رو برو کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے تو مسجدوں کا منبر خود انھوں نے علماء کے سپرد کر دیا۔ یہ ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ الم انگیز حادثہ ہے۔[ص ۱۸۸]—غامدی صاحب کی سنتوں کی فہرست میں ایک نئی سنت کا اضافہ مگر میزان ۲۰۰۹ء کی فہرست سنت سے یہ سنت غائب ہے ایک سال میں ہی ارتقاء کیسے ہو جاتا ہے؟—

اُصولِ دین: قرآن و سنت سے متعلق مباحث

و فکری تنقید

دین کا فہم: جناب غامدی صاحب کے اکتالیس اصول

سید خالد جامعی

[۱] کسی فکر کی درستگی کا پیمانہ، اصول، منہاج، فرقان — دینی فکر امت کی علمی روایت سے مطابقت رکھتی ہو اور امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق ہو [مرتب شکیل عثمانی، پرویز صاحب کا فہم قرآن غامدی صاحب کی تقریر، ص ۴۸ دارالتذکیر ۲۰۰۴ء، میزان ص ۱۴، ۲۰۰۸ء اس کتاب کا مقدمہ غامدی صاحب کے شاگرد رشید خورشید احمد ندیم صاحب کے قلم سے ہے] غامدی صاحب کے اصول کی مکمل عبارت نسخ میں ملاحظہ کیجیے اور اس عبارت پر ہمارا تبصرہ نستعلیق میں ملاحظہ فرمائیے — یہ وہ بنیادی اور اصولی چیز ہے جس کی وجہ سے ہم پرویز صاحب کے سارے نقطہ نظر ہی کو ضلالت سمجھتے ہیں اور چونکہ انہوں نے بڑے زور وشور کے ساتھ ہمارے نئے تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے جو ان چیزوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہے اسے پیش کیا اس لیے اس کی حقیقت واضح کرنا پڑی۔ قرآن فہمی کے باب میں یہ اتنی بنیادی اور بڑی غلطی ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز اپنی جگہ پر باقی نہیں رہتی۔ اس لیے پرویز صاحب کی فکر کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ وہ دین کو سمجھنے کا ایک زاویہ ہے، جیسے اس سے قبل امت میں مختلف نقطہ ہائے نظر رہے ہیں۔ پرویز صاحب کی تعبیر نہ تو علمی ہے اور نہ ہی امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق ہے۔ اس لیے اسے اُس روایت سے الگ کر کے دیکھنا پڑے گا، جسے ہم امت کی علمی روایت کہتے ہیں۔ [ص ۴۸ پرویز صاحب کا فہم قرآن محولہ بالا] پرویز صاحب پر غامدی صاحب کی یہ تنقید اس اصول کی بنیاد پر کی گئی تھی کہ امت کی ایک اجتماعی علمی روایت ہے لہٰذا تفسیر پرویز اجتماعی تعامل سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ امت میں مختلف نقطہ ہائے نظر رہے ہیں مگر اصول کے معاملے میں وہ متفرق نہیں تھے۔ لہٰذا وہ امت کی علمی روایت کے توسع اور تنوع کو ظاہر کرتے ہیں لیکن غامدی صاحب نے پرویز صاحب کو اس علمی روایت سے اس بنیاد پر الگ کر دیا کہ وہ متکلم کے منہ میں اپنی زبان، اس کے ذہن میں اپنا بیان اور اس کے فکر میں اپنا ادراک وایمان داخل کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان کے اصول بھی الگ ہیں اور اخذ نتائج کا طریقہ بھی الگ ہے۔ لہٰذا یہ ایک متفرق روایت ہے جو امت کی اجتماعی علمی روایت سے یکسر مختلف، منفرد، متخالف بلکہ متصادم ہے غامدی صاحب کا یہ نقد اور تجزیہ بالکل درست ہے لیکن کیا اس نقد کا اطلاق خود حضرت والا غامدی صاحب پر نہیں ہوتا۔ اگر

امت کی علمی روایت ہر عہد میں بدلتی رہے گی ہر شخص کو امت کی مشترکہ علمی روایت پر تنقید اور اس روایت میں تبدیلی کی آزادی رہے گی ماخذات دین کے تعین میں فکر وفہم کے دروازے ہمیشہ کھلیں رہیں گے تو عمل کی نوبت کب آئے گی؟ اگر عربی معلٰی، زبان کی ابانت، نظم کلام، عربیت کے اعلیٰ ذوق کے باوجود ماخذات دین اور ان ماخذات کی تشریحات کے امور میں اگر فراہی صاحب، اصلاحی صاحب، غامدی صاحب کے فہم وادراک اور اخذ کردہ نتائج میں زمین وآسمان کا فرق واقع ہو جائے تو اس اختلاف کو رفع کرنے کا طریقہ کیا ہوگا؟ یا اختلاف کا قائم رہنا اور رفع نہ ہونا ہی غامدی صاحب یا نظمِ کلام کے مکتب فکر کے منہاجِ علم کا نقطۂ امتیاز ہے؟ یہ ہے اصل سوال مثلاً سنت کی تعریف اور حجاب کے احکامات اور ''شہادت علی الناس'' کے ضمن میں فراہی صاحب، اصلاحی صاحب اور غامدی صاحب کے خیالات اصولی طور پر بالکل مختلف ہیں تو اب پیروی کس کی ہو— کیا غامدی صاحب کو فراہی اور اصلاحی صاحبان کے فہم، ذہن، علم اور مقام پر فوقیت دی جاسکتی ہے— ہم نے قارئین کی سہولت کے لیے صرف مسائل حجاب، شہادت علی الناس، اور سنت جیسے مباحث میں فراہی اصلاحی ور غامدی صاحب کے بنیادی اختلافات کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے لیکن غامدی صاحب کی کتاب ''میزان'' امام فراہی اور امام اصلاحی کے اصول دین سے مکمل انحراف پر مبنی ہے غامدی صاحب نے اسلام کی پندرہ سو سالہ تاریخ سے صرف امام ابن تیمیہ ابن قیم امام فراہی اور اصلاحی کو مرتبۂ امامت کے قابل سمجھا ہے [اشراق ص، مئی ۲۰۱۲ء] لیکن میزان میں اکثر حوالے صرف ائمہ فراہی اور اصلاحی کے دیے گئے ہیں ابن تیمیہؒ اور ابن قیم کا کوئی حوالہ میزان میں موجود نہیں اس کے سوا اسلامی تاریخ سے کسی امام کا حوالہ میزان میں نظر نہیں آتا لیکن ان ائمہ کے اصول دین بھی کسی کے لیے تو کیا خود غامدی صاحب کے لیے بھی واجب تقلید نہیں ہیں اصلاحی صاحب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ امام حمید الدین فراہیؒ کے بعد قرآن کے سب سے بڑے عارف امین احسن اصلاحی ہیں [ص ۴۳، میزان ۲۰۰۸ء] مگر اس عارف کی معرفت علم اور فراہی صاحب کا مرتبہ علم بھی اس قابل نہیں ہے کہ ان کی عربیت، فہم قرآن اور ان کی تفسیر وتعبیر دین پر اعتماد کیا جاسکے تو کیا اعتماد صرف غامدی صاحب کے فہم دین پر ہو ظاہر ہے غامدی صاحب اس کے جواب میں کہیں گے ''یہ ایک طالب علم کا نتیجۂ فکر وتحقیق ہے اور اسی حیثیت سے پیش کیا جارہا ہے [خاتمہ ص ۶۵۴، میزان ۲۰۰۸ء] اگر ایک طالب علم امام فراہی واصلاحی سے اختلاف کے بعد اپنے نتیجہ فکر کو صرف طالب علمانہ کاوش ہی سمجھتا ہے— تو اس

میں تصحیح وترمیم ارتقاء، تبدیلی، تغیر کے امکان کو بھی رد نہیں کرتا تو امت عمل کس اصول پر کرے اور اتباع کن لوگوں کی امور دینی میں کی جائے اگر ہر شخص اختلاف ہی کرتا رہے حجاب کا مطلب فراہی صاحب کچھ بتائیں اصلاحی صاحب کچھ — غامدی صاحب کچھ اور پھر اس میں بھی اصلاح واختلاف کی ہمیشہ گنجائش رہے تو امت کی عورتیں درست احکامات حجاب پر عمل کب کریں گی یہ ہے اصل سوال؟ دین عمل کے لیے آیا ہے اختلاف ختم ہو جائیں یا کوئی نکتہ اتفاق ہو تبھی دین پر عمل ممکن ہوتا ہے — اہل السنۃ والجماعت کے یہاں اختلاف کے رفع کرنے کا طریقہ اجماع امت اور مسلک جمہور ہے۔ لیکن غامدی صاحب اس کے قائل نہیں کیونکہ قرآن وسنت کی تشریح کرتے ہوئے ہر شخص اپنے فہم علم عقل کو طے شدہ منہاج علمی کی حدود میں استعمال کرے گا تو اختلاف یقینی امر ہے اس اختلاف کا حل اجماع ہے اجماع کے سوا ہر حل انتشار، بحران، اور التباس کی طرف لے جاتا ہے جس سے بچنا چاہیے لیکن غامدی صاحب کے منہاج فکر میں اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ جو کچھ نتیجہ غامدی صاحب نے اخذ کیا ہے وہی قطعی الدلالہ ہے اس کے سوا کچھ اور نتیجہ نہیں ہوسکتا سنت کے بارے میں ان کا قطعی موقف ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۸ء تک اسی قطعیت سے بیان ہوا ہے جب ان کے اپنے حلقے میں سے ایک ہی مسئلے پر دو تین متنوع آراء سامنے آتی ہیں تو وہ فراخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اختلاف آپ کا حق ہے لیکن عمل کس رائے پر ہوگا؟ مثلاً آیت وصیت کے تحت ایک رائے یہ ہے کہ وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی ۱/۳ حصے سے زیادہ وصیت نہیں کی جاسکتی وہ بھی غیر وارث کے لیے دوسری رائے یہ ہے کہ اگر ضرورت شدید ہو تو وارث کے حق میں بھی وصیت کی جاسکتی ہے ۱/۳ سے زیادہ بھی اور پوری جائیداد کی بھی تیسری رائے یہ ہو کہ قرآن نے واضح طور پر حکم دیا ہے کہ فرض اور وصیت پورا کرنے کے بعد جائیداد تقسیم ہوگی لہٰذا وصیت میں مورث پوری جائیداد کسی کے نام وصیت کرسکتا ہے خواہ وہ ورثاء میں سے ہو یا غیر وارث قرآن نے اس معاملے میں کوئی تحدید نہیں کی ان تینوں دلائل کے حاملین عربیت نظم قرآن اور زبان وبیان کی بنیاد پر یہ دلائل دے رہے ہوں تو اختلاف کی صورت میں میزان کیا ہوگی؟ یہ ہے اصل سوال — اس کا جواب ان کے یہاں یہی ہے کہ جو رائے آپ کے قلب کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو — اگر تمام اختلافی آراء درست ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کی رائے کے مطابق عمل کرلے اس میں کوئی ہرج نہیں تو اس فکر سے لامحالہ دو نتائج نکلتے ہیں اوّل یہ — کہ صحیح اور غلط کچھ نہیں ہے ہر فہم صائب، صحیح اور صادق ہے — سب تصورات نظریات

یکساں حق ہیں دوسرے معنوں میں اصل خیر منہاج انسان کا نفس ہے جو اس کا نفس اور دل چاہے اس کے مطابق رائے کو قبول کرلے اس طریقے سے ہم دین کو نفسِ انسانی کے آلۂ کار کے طور پر پیش کرتے ہیں یہ وہی طریقۂ کار ہے جو پروٹسٹنٹ ازم اور لبرل ازم پیش کرتا ہے لبرل ازم میں تمام تصورات خیر یکساں درجے کے ہیں ایک شخص کا گھاس کی پتیاں گننے کا عمل یا ایک شخص کا کلیسا میں عبادت کرنا دونوں خیر برابر کی سطح کے ہیں پروٹسٹنٹ ازم میں ہر شخص انجیل کی شرح خود کرسکتا ہے اس کے لیے وہ علماء، علم، کلیسا، پوپ کسی کا محتاج نہیں دوسرے معنوں میں خیر اپنےِ قلب کی باطنی صدا کا نام ہے جو نفس کے تقاضے کے سوا کچھ نہیں اور آزاد انسان وہی ہے جو صرف اپنے نفس کی پیروی کرتا ہے۔ فقہاء کوئی استنباط کریں اس سے کیا فرق پڑتا ہے اصل حیثیت عوام کی ہے وہ کس استنباط کو قبول کرتے ہیں قبولیت عوام ہی علم کی صداقت کا معیار ہے — خیر کیا ہے چونکہ حتمی طور پر یہ تو معلوم کرنا ممکن ہی نہیں صرف دلیل سے رائے قائم کی جاسکتی ہے جو رائے دلیل پر مبنی ہو اس کا معیار دلیل ہی ہوتا ہے دلیل دین نہیں بن سکتا یہ غامدی صاحب کی رائے ہے لہٰذا کسی کی رائے دین نہیں بن سکتی لہٰذا کسی بھی فرد کی رائے پر عمل کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن سوال یہ ہے کہ عوام کے پاس خیر کو جاننے کا مستند ذریعہ کیا ہے؟ اجماع، تواتر، اکثریت کی رائے، لیکن غامدی صاحب کسی کو حجت نہیں سمجھتے لہٰذا حجت صرف دلیل، عقلیت، اور ذہن انسانی ہی قرار پاتا ہے یہی انسان پرستی، عقل پرستی اور آزاد پرستی کا بھی نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے عوام کے پاس علم نہیں صرف عقل اور خواہش نفس ہے لہٰذا یہی ذرائع اصل العلوم قرار پاتے ہیں۔

دوم یہ کہ اگر فراہی صاحب، اصلاحی صاحب اور غامدی صاحب کے مکتبہ فکر میں اندرونی اختلافات ہوں فراہی اور اصلاحی صاحب کے شاگرد غامدی صاحب اپنے دونوں اساتذہ یا امام یا عارفین کے نتائج فکر کی تردید کریں اور غامدی صاحب کے شاگرد اپنے استادِ محترم کے نتائج فکر سے متفق نہ ہوں اور اُن کی رائے استادِ محترم کی رائے سے بالکل مختلف ہو اس صورت میں بھی ان کے منہاج میں ہر وہ رائے صائب، ہر تحقیق درست، ہر نتیجہ الحق اور ہر نقطۂ نظر ہر اس شخص کے لیے واجب التعمیل ہے جو ان متضاد و متخالف آراء میں سے کسی ایک رائے سے بھی متفق ہو — دوسرے معنوں میں علم کا اصل ذریعہ فرد خود ہے جو فرد جس رائے کو افضل جانے اسے اختیار کرے یعنی منہاج فرد کا نفس ہے جو علم کا ماخذ ہے اس طرح غامدی صاحب کا نقطۂ نظر جدیدیت کے بہت بڑے فلسفی کانٹ کے تصور روشن خیالی کے مماثل

ہو جاتا ہے وہ اپنے مضمون what is enlightenment میں یہی لکھتا ہے کہ انسان ہدایت میں خود کفیل ہے اسے روشنی رہنمائی ہدایت کے لیے اپنے سے باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں اس کی عقل اس مطلوب اور مقصود کے لیے کافی وشافی ہے۔اس اصول کے تحت عقل انسانی جس دینی رائے کو اپنی پسند سے قبول کرے وہی دین اور دین کا حقیقی حکم تسلیم کرلیا جائے۔ [۲] سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے اس لیے وہ لازماً اس کے حاملین کے اجماع وتواتر سے ہی اخذ کی جائے گی [میز ان ص ۵۲ طبع دوم ۲۰۰۲ء]۔میزان میں وہ لکھتے ہیں کہ علم وہدایت کے قلم رو میں ہر جگہ [الفرقان قرآن] اسی کی حکومت قائم ہوگی اور ہر شخص پابند ہے کہ اس پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے [ص ۲۴ میزان ۲۰۰۸ء] لیکن اسی میزان کے ص ۴۷ پر یہ ارشاد بھی درج ہے کہ سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے اس کی تفصیلات بھی اسی اجماع وتواتر پر مبنی روایت سے متعین ہوں گی انہیں قرآن سے اخذ نہیں کیا جائے گا [میزان، ص ۴۷، ۲۰۰۸ء] سنت کی تعریف میں وہ لکھتے ہیں سنت سے مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبیؐ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا قرآن میں آپ کو ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا گیا یہ یہ روایت بھی اسی کا حصہ ہے ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ [۱۶:۱۲۳] [میزان صفحہ ۱۴، ۲۰۰۸ء] — غامدی صاحب کے ان دونوں اصولوں کی روشنی میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ سنتوں کی فہرست سے خارج ہوجاتے ہیں کیونکہ دونوں تہواروں کے لئے نمازوں کا حکم قرآن حکیم کے نزول کے بعد آیا ہے یہ حکم بھی مدینے میں آیا ہے لٰہذا یہ کہنا کہ سنت مقدم ہے اور سنت دین ابراہیمی کی روایت ہے غلط استدلال ہے خود غامدی صاحب کی شہادت ملاخطہ کیجیے ''عیدلفطر عیدالاضحیٰ دونوں تہوار رسول اللہؐ نے اللہ کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کے لیے مقرر فرمائے [ص ۶۴۸ میزان ۲۰۰۸ء] جس نماز کا حکم اللہ تعالیٰ پیغمبر کو خود دے اللہ کا یہ حکم بھی سنت ہے اس حکم کا قرآن میں سرے سے ذکر ہی نہیں ہے تو اس حکم کا ماخذ کیا ہے؟ سنت وہ ہے جو دین ہو تو کیا تہوار بھی دین ہے؟ فرض، سنت، رواج، رسوم، دین اور تہوار کیا مترادف اصطلاحات ہیں؟ ا اللہ کا حکم فرض ہوگا یا سنت؟ اگر سنت تو اس کی دلیل نص سے کیا ہے؟ اس دلیل سے ثابت ہوا کہ عیدین نہ سنت ہے نہ دین ابراہیمی کی روایت ہے نہ یہ قرآن سے پہلے ہے نہ اس

کے حاملین نے قرآن سے پہلے اس پر عمل کیا لہٰذا اس کی تصحیح یا اس میں اضافے کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی غامدی صاحب سنت کو قرآن سے مقدم قرار دیتے ہیں ۔[۳] قرآن کی دعوت جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے [۱] دین فطرت کے حقائق [۲] سنت ابراہیمی — [۳] اور قدیم صحائف ہیں [میزان ص ۴۸ طبع دوم ۲۰۰۲ء] [یعنی چوتھے نمبر پر قرآن آئے گا اور فطرت انسانی ماخذ شریعت ہے]۱۔ فطرت کے حقائق ،۲۔ دین ابراہیمی کی روایت ،۳۔ نبیوں کے صحائف [ص ۴۵ ، میزان ، ۲۰۰۸ء] قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے بحث و تنقید کی ساری بنیاد اس پر رکھی جائے گی [ص ۴۷، میزان ۲۰۰۸ء] سنت، امت، حدیث اس سے لاتعلق ہیں — (تورات، زبور اور انجیل) پھر ان کتابوں کے متن جب اپنی اصل زبان میں باقی نہیں رہے تو اللہ نے محمد کو اپنے آخری پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث کیا اور انہیں یہ قرآن دیا [ص ۴۴ میزان ۲۰۰۸ء] صحائف جب اصل زبان میں ہی میسر نہیں محرف بھی ہیں اور منسوخ شدہ بھی تو فہم قرآن کا انحصار صرف ان پر کیسے رکھا جا سکتا ہے؟

تیسری چیز وہ صحیفے ہیں جو تورات ، زبور ، انجیل کی صورت میں بائبل کے مجموعہ صحائف میں موجود ہیں ان کے بدقسمت حاملین نے ان کا ایک حصہ اگرچہ ضائع کر دیا ہے اور ان میں بہت کچھ تحریفات بھی کر دی ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ کی نازل کردہ حکمت و شریعت کا ایک بڑا خزانہ اب بھی ان میں دیکھا جا سکتا ہے قرآن کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس نے جگہ جگہ ان کے حوالے دیے ہیں ۔ نبیوں کی جو سرگزشتیں ان میں بیان ہوئی ہیں ان کی طرف بالاجمال اشارے کیے ہیں اور ان میں یہود و نصاریٰ کی تحریفات کی تردید اور ان کی پیش کردہ تاریخ پر تنقید [قرآن نے] کی ہے اہل کتاب پر قرآن کا سارا اتمام حجت انہی صحائف پر مبنی ہے [غامدی اصول و مبادی ص ۵۳ ، ۲۰۰۰ء دانش سرا لاہور، میزان ص ۴۶ طبع سوم ۲۰۰۸ء] چنانچہ دوسرے صحیفوں کے متن جب گم کر دیے گئے اور ان کے تراجم میں بھی بہت کچھ تحریفات کر دی گئیں ہیں تو ان کے حق و باطل میں امتیاز کے لیے یہی [قرآن] کسوٹی ہے [میزان، ص ۲۵، ۲۰۰۸ء] دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو ان کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب سے بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہو گئیں جن کا سراغ اب ناممکن ہے [ص ۱۵۶، میزان ۲۰۰۸ء] واضح رہے کہ تورات انجیل وغیرہ اپنی اصل زبانوں میں باقی نہیں ہیں اصل زبانوں سے یہ دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوئیں پھر تراجم بھی

بے شمار تھے تراجم بھی مختلف نسخوں کے تھے ایک مستند نسخہ تک میسر نہ تھا— کئی نسخوں کے کئی تراجم یعنی سینکڑوں تراجم میں سے چند کا انتخاب کس طرح کیا گیا یہ بھی تاریخ کا خوبصورت افسانہ ہے جس کی تفصیل انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا اور مناظر گیلانی کی کتاب النبی الخاتم میں پڑھی جاسکتی ہے لیکن ان محرف صحائف کے بارے میں غامدی صاحب کی جدید تحقیق پڑھیے ''[تورات] اسے بالکل اسی طرح ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہے جس طرح قرآن کو مرتب کیا گیا ہے اپنی موجودہ صورت میں یہ پانچویں صدی قبل مسیح میں مرتب کی گئی سیدنا مسیحؑ نے جس طرح اس کا ذکر کیا ہے اس کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تصویب بھی اس کو کسی حد تک حاصل تھی [قرآن نے] اس میں یہود کی تحریفات کا ذکر کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی [تورات] جو روایت [Version] زمانہ رسالت کے یہود و نصاریٰ کے پاس تھی قرآن فی الجملہ اس کی تصدیق کرتا ہے [ص ۱۵۲، میزان ۲۰۰۸ء] یہ— غامدی صاحب کا ارتقاء ہے جو ۲۰۰۰ء کے اصول و مبادی کے بعد ۲۰۰۸ء کے اصول مبادی میں ہوگیا ہے اسی طرح انجیل کے بارے میں فرماتے ہیں ''انجیل دعوت انداز کی ضرورت کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی کتاب کی صورت میں مرتب کر کے محفوظ کرنے سے پہلے سیدنا مسیح کو دنیا سے اٹھالیا گیا لہٰذا یہ کوئی مرتب کتاب نہیں بلکہ منتشر خطبات تھے جو زبانی روایتوں اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچے مسیحؑ کی سیرت پر ایک مدت کے بعد بعض لوگوں نے رسائل لکھنا شروع کیے تو ان میں یہ خطبات حسب موقع درج کیے گئے یہی رسائل ہیں جو اب انجیل کہلاتے ہیں یہ ابتدا ہی سے یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں جبکہ مسیحؑ کی زبان آرامی تھی اور انھوں نے اپنے مواعظ اسی زبان میں ارشاد کیے— چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن جس انجیل پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اس کا ایک بڑا حصہ سیرت کی ان کتابوں میں محفوظ ہے [ص ۱۵۳، میزان ۲۰۰۸ء] انجیل، آرامی میں نازل و بیان ہوئی یونانی میں لکھی گئی لوگوں نے حضرت مسیحؑ کے دنیا سے اٹھ جانے کے کئی سال بعد اسے مرتب کیا ۳۸۲ء میں کئی انجیلوں میں سے چار کا انتخاب کیا گیا [ص ۱۵۳، میزان ۲۰۰۸ء] تحریف کے ان مراحل سے گزر جانے کے باوجود غامدی صاحب کی روایت ہے کہ یہ انجیل تورات کی طرح محفوظ رہی سیرت کی کتابوں میں بھی یہ محفوظ ہے قرآن اس محفوظ متن پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے— لیکن غامدی صاحب رسالت مآب کی زبان سے روایت کردہ احادیث، تقاریر اقوال کو جو عربی میں بیان ہوئے عربی میں سنے گئے عربی میں محفوظ رکھے گئے اس

قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ان سے قرآن کی تشریح وتفسیر کے ان مقامات میں کام لیا جائے جو سابقہ اقوام سے متعلق ہیں بلکہ ان مقامات وموضوعات کی تشریح کا انحصار وہ صرف صحف سماوی پر رکھتے ہیں کیا احادیث اقوال صحابہ انجیل وتورات سے زیادہ محرف اور زیادہ غیر محفوظ ہیں؟ تورات انجیل جن کے بارے میں قرآن نے بار بار کہا کہ احبا ور رہبان نے اس میں تحریف کردی خدا کے نوشتے کو اپنے قلم سے بدل دیا یکتبون الکتب بایدیھم [بقرہ:۷۹] اس کے معانی تک تبدیل کر ڈالے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا بہت کچھ چھپالیا بہت کچھ ضائع کر دیا پھر یہ صحائف اصل زبان سے محروم ترجمہ در ترجمہ، نقل در نقل اور تحریف در تحریف کے عمل سے گزرنے کے باوجود غامدی صاحب کے لئے اتنے محترم ومقدس ہیں کہ ان کا نور احادیث کے نور سے بہتر ہے وہ احادیث کے بارے میں یہاں تک لکھتے ہیں کہ کسی مشتبہ روایت کو قبول نہ کیا جائے خواہ وہ امہات کتب بخاری مسلم موطا میں کیوں نہ بیان ہوئی ہو [ص ۶۲ میزان ۲۰۰۸ء] لہٰذا قرآن کی آیات، امم سابقہ کے قصص دین کی تفہیم وتشریح قرآن کے فہم کے لیے حدیث اقوال، صحابہ، تاریخ امت حجت نہیں ہے لیکن دوسری طرف اسی کتاب میں ان کے امام اصلاحی صاحب کا قول نقل کیا گیا ''جو لوگ احادیث وآثار کو سرے سے حجت ہی نہیں مانتے وہ اپنے آپ کو اس روشنی سے محروم کر لیتے ہیں جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قیمتی روشنی ہے میں احادیث کو تمام تر قرآن ہی سے ماخوذ ومستنبط سمجھتا ہوں جہاں تک صحیح احادیث کا تعلق ہے اس کی نوبت بہت کم آئی ہے کہ ان کی موافقت قرآن سے ہو ہی نہ سکے۔ [میزان ص ۵۶، محولہ بالا ۲۰۰۸ء] — امام فراہی کا حدیث کے بارے میں وہی نقطۂ نظر تھا جو محققین امت کا تھا حدیث کے بارے میں وہ اس نقطہ نظر سے کوئی مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں [فراہی مجموعہ تفاسیر ص ۱۶، ۳۰، ۱۹۷۳ء مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور] وہ بیشتر احادیث کو قرآن سے مستنبط سمجھتے تھے [ص ۱۶ حولہ بالا] امام فراہی سخت متبع سنت تھے وہ ٹخنوں سے اوپر پائنچہ کرنے اور داڑھی رکھنے کو سنت سمجھتے تھے حدود شرع سے زائد پائنچے رکھنے پر انھوں نے شاگرد امین احسن اصلاحی کے پائینچے شاگرد کی رضامندی کے بعد قینچی سے خود کاٹ دیے [ص ۷ امحولہ بالا] مجھے نہیں معلوم کہ امام فراہی نے کسی آیت کی تاویل کسی صحیح حدیث کے خلاف کی ہو [ص ۱۸ امحولہ بالا] قرآن کی اصطلاحات صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، قربانی کا تعلق ہے وہ ان کی تفسیر سو فی صدی سنت متواترہ کے مطابق کرتے تھے اور اس کی ادنیٰ خلاف ورزی کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے فقہیات اور اخبار احاد کے بارے میں وہ مالکیہ اور حنفیہ کے مسالک کو ترجیح

دیتے تھے [ص ۱۸، محولہ بالا] — امام فراہی نے مقدمہ نظام القرآن میں تفسیر کے خبری ماخذ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصل واساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے باقی فرع کی حیثیت سے تین میں نہ بڑا کام کرسکتا ہے نہ برا کام کرسکتا ہے [۱] احادیث، [۲] قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات [۳] گزشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں اگر احادیث تاریخ اور قدیم صحیفوں میں طن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجے میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی [ص ۳۹ مجموعہ تفاسیر فراہی محولہ بالا] امام فراہی لکھتے ہیں: ''پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے اس کے بعد نبی صلعم اور آپ کے صحابہ کا فہم ہے مجھے سب سے زیادہ پسند وہی تفسیر ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ سلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو [ص ۳۵، مجموعہ تفاسیر فراہی محولہ بالا] میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث میں اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں [ص ۳۵ محولہ بالا] ایسی صورتوں میں صحیح راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور جن چیزوں کے بارے میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل نبیؑ موجود نہیں ہے ان میں اپنے دوسرے بھائیوں سے جھگڑا نہ کرو جہاں تک اصطلاحات شرعیہ کا تعلق ہے قرآن کی اسی وسیع شاہراہ پر چلنا چاہیے [ص ۴۲ محولہ بالا] مولانا فراہی نے تفسیر و تاویل کرنے والوں کے باب میں بعض عجیب نکتے لکھے ہیں جو غامدی صاحب پر صد فی صد صادق آتے ہیں ''حضرت مسیحؑ نے فرمایا آدمی لفظوں سے ہلاک ہوتا ہے اور معانی سے نجات پاتا ہے یہ لوگ الفاظ پر جم گئے اس لیے ان پر ہدایت کی راہ نہ کھل سکی سقراط کا قول ہے نفس کو تمام حقائق معلوم ہیں لیکن اس پر نسیان طاری ہے مولانا روم کا قول ہے اپنے نفس کی تاویل کرو قرآن کی تاویل نہ کرو'' خواجہ حافظ کا ارشاد ہے کہ سب سے بڑا حجاب تمہارا نفس ہے اس کو دور کرو [ص ۴۶، ص ۴۸، محولہ بالا] — امام فراہی اور امام اصلاحی کی متفقہ رائے ہے کہ صحف سماوی ظنی اور شبہات کے دائرے میں ہیں اور تفسیر کے لیے پہلا ماخذ احادیث ہے لیکن غامدی صاحب نے صحف سماوی کو محفوظ بھی قرار دے دیا اور تفسیر کے لیے اصل واحد ماخذ صحف سماوی کو قرار دیا احادیث کی نفی فرما دی لیکن مشتبہ تورات و انجیل کو حجت مان لیا جائے اور قرآن کے وہ مقامات جو سابقہ اقوام سے متعلق ہیں ان کی تشریح کے لیے تورات اور انجیل پر کامل اعتماد کیا جائے اگر وہ حمید الدین فراہی کی غیر مطبوعہ کتاب الاکلیل فی شرح الانجیل کا مطالعہ کر لیتے تو یہ دعویٰ نہ کرتے — غامدی صاحب نے تورات اور انجیل کے

بارے میں جو نیا نقطہٗ نظر ۲۰۰۸ء میں اختیار کیا ہے اس کا سبب ان کی یہ تحریر ہے ''یہود و نصاریٰ کی تاریخ اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے اس باب میں جو روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں انہیں ہرگز قابل التفات نہ سمجھا جائے گا [میزان ۴۷، ۲۰۰۸ء] یہ روش امام فراہی اور امام اصلاحی کے مکتب فکر کے اصولوں سے انحراف ہے۔ قرآن کی تشریح کو احادیث، امت کی علمی روایت اور ہماری تاریخ سے منقطع کرنے کے لیے یہ روش اختیار کی گئی ہے ایمان کا حفاظت سے کیا تعلق؟ قرآن صرف تورات و انجیل کے محفوظ متن پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیتا بلکہ وہ تمام صحف سماوی پر بھی ایمان لانے کا حکم دیتا ہے جو تمام انبیاء پر اتارے گئے جن کا متن تک محفوظ نہیں ہے وہ تمام صحف کتاب وحکمت کا مجموعہ تھے حضرت ابراہیم پر اترنے والے صحائف کے بارے میں کچھ معلوم نہیں مگر ان پر بھی ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے حضرت نوحؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، اولاد یعقوبؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کے صحائف پر بھی ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا، وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ،رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا [۴:۱۶۳ تا ۱۶۵]

۔لہٰذا یہ بحث کہ قرآن نے جس انجیل پر ایمان لانے کا حکم دیا تھا وہ محفوظ حالت میں عہد رسالت میں موجود تھی اور اس کے حصے سیرت کی کتابوں میں آج بھی محفوظ حالت میں ہیں لوگوں کو انتشار ذہنی میں مبتلا کرنے کی کوشش ہے قرآن تو ان صحائف پر بھی ایمان لانے کا حکم دے رہا ہے جو وجود ہی نہیں رکھتے تمام انبیاء پر ایمان لانا لازم ہے اور ان پر نازل ہونے والے تمام صحائف پر بھی جو بالکل درست حالت میں نازل ہوئے تھے۔

انجیل حکمت ہے اور تورات شریعت: غامدی صاحب لکھتے ہیں الہامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات میں زیادہ تر شریعت اور انجیل میں حکمت بیان ہوئی ہے زبور اسی حکمت کی تمہید میں خداوند عالم کی تمہید کا مزمور ہے اور قرآن ان دونوں کا جامع [ص ۶۹ میزان ۲۰۰۸ء] الحکمت

کی تعبیر جن مباحث کے لیے ہے وہ بنیادی طور پر دو ہیں ایک ایمانیات دوسرے اخلاقیات — الکتاب کے تحت جو مباحث بیان ہوئے ہیں وہ قانون سے متعلق ہیں [ص ۶۹، میزان ۲۰۰۸ء] الہامی لٹریچر محرف ہے اصل زبان سے محروم، ترجمہ در ترجمہ ہوا ہے اس کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں۔ غامدی صاحب کا انجیل کے بارے میں یہ موقف قرآن کے نصوص سے انحراف ہے حکمت کو صرف ایمان و اخلاق میں مقید کر دینا غامدی صاحب کا تفرد ہے قرآن انجیل کے حامل حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں صاف طور پر بتاتا ہے وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ [۳:۵۰] اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بعض چیزوں کو جو حرام تھیں اپنی امت کے لیے حلال قرار دیا ظاہر ہے یہ حکمت نہیں شریعت ہے قانون حلال و حرام ہے ہر رسول یہی کام کرتا ہے اپنی امت کو اُن بوجھوں سے آزاد کرتا ہے جو ان کے احبار، رہبان، فقہا شریعت کے نام پر اپنی شریعت کی تخلیق کر کے عوام پر لاد دیتے ہیں غامدی صاحب اس طریقے کو الحکمت کا حصہ نہیں سمجھتے اسے وہ الکتاب کے تحت پیش کرتے ہیں حضرت عیسیٰ پر جو وحی بھیجی گئی وہ محض حکمت محض شریعت محض قانون نہ تھی ان سب کا آمیزہ تھی اسی لیے حرام کو حلال سے تبدیل کیا گیا قرآن بتاتا ہے اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا [۴:۱۶۳] ہر رسول کی کتاب حکمت شریعت اور قطعیت کے ساتھ آتی ہے سورۂ مائدہ میں آتا ہے کہ انجیل میں ہدایت بھی ہے نور بھی ہے نصیحت بھی ہے اور یہ تورات کی تصدیق کرتی ہے وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ [۵:۴۶] حضرت عیسیٰ نے اپنی امت کو کتاب، حکمت، تورات اور انجیل کی تعلیم بھی دی [۵:۱۱۰] حضرت عیسیٰ نے اختلافات کی حقیقت دانائی سے کھول کر رکھ دی یہ دانائی انجیل میں مذکور تھی وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ [۴۳:۶۳] اللہ نے حضرت عیسیٰ ... يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى

عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ [۱۴:۶۱] غالب امت شریعت کے بغیر غلبہ کو قائم نہیں رکھ سکتی لہٰذا وہ حضرت عیسیٰ کی دی ہوئی شریعت کے مطابق ہی عمل کرتے رہے کیونکہ تورات میں تحریف ہو چکی تھی پیغمبر گزشتہ کتاب و شریعت کی تصحیح کے لیے نہیں آتے وہ صرف گزشتہ کتاب وسنت کے درست حصے کی تائید و توثیق کرتے ہیں اور اللہ کی نازل کردہ وحی حجت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو دین و دنیا کی جامع ہوتی ہے —— حضرت عیسیٰ کی امت کو حکم دیا گیا کہ وہ انجیل کے قانون کے مطابق فیصلے کرے اگر انجیل صرف حکمت تھی تو اس آیت کی ضرورت نہ تھی وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [۵:۴۷] اللہ نے ہر امت کے لیے شریعت اور منہاج مقرر فرمایا لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً [۵:۴۸] —— جو پیغمبر حلال وحرام کی تصحیح کرتا ہو لوگوں کے درمیان انہی کی طرح رہتا ہو اس کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے فرشتوں کے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے غامدی صاحب کا تفرد ہے لکھتے ہیں: ان پیغمبروں کا معاملہ اللہ کسی حد تک مختلف ہے جو محض اتمام حجت کے لیے آئے اس کی ایک مثال سیدنا یحییٰ اور سیدنا مسیح ہیں اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ فرشتوں کے زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں لہٰذا لوگوں نے ان سے فائدہ بھی کم اٹھایا ہے [میزان ، ۱۳۸، ۲۰۰۸ء] فائدہ اگر کم اٹھایا ہے تو سوال یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں حضرت عیسیٰ کے ماننے والوں کی تعداد سب سے زیادہ کیوں ہے؟ کیا فرشتے عائلی زندگی بسر کرتے ہیں؟ قرآن بتاتا ہے کہ تمام رسول متاہل زندگی بسر کرتے تھے وہ بیوی بچوں والے ہوتے تھے [۱۳:۳۸]، [۱۷:۹۴، ۹۵]، [۱۳:۳۸] منکرین کا اعتراض تمام رسولوں پر یہی ہوتا ہے کہ یہ تمہارے جیسا بشر ہے تمہارے جیسے کھانا کھاتا اور پانی پیتا ہے [۲۳:۳۳، ۳۴] یہ رسول ہمارے جیسے آدمی ہیں [۱۵:۳۶] وہ انسان کے پیغمبر بننے پر اعتراض کرتے تھے کہ کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجا [۱۷:۹۴] وہ چاہتے تھے کہ پیغمبر کوئی فرشتہ ہو تو قرآن نے جواب دیا ان سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا [۱۷:۹۵] قرآن کہتا ہے کہ ہم نے انبیاء کے جسم ایسے نہیں بنائے کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے لہٰذا ان پر فرشتے ہونے کا گمان درست نہیں ہے، وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ [۲۱:۸]، کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا

ہے کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور دھمکاتا۔ وَقَالُوْا مَالِ ہٰذَا الرَّسُوْلِ یَأْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مَلَکٌ فَیَکُوْنَ مَعَہٗ نَذِیْرًا [۲۵:۷]، [۶:۷،۸]، وَلَوْ جَعَلْنٰہُ مَلَکًا لَّجَعَلْنٰہُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَیْھِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ [۶:۹] لہٰذا غامدی صاحب کا استدلال قرآن کی نصوص کے خلاف ہے۔ ہر پیغمبر فطرت کے لحاظ سے فرشتوں کی طرح معصوم ہی ہوتا ہے اس معصومیت کو صرف دو انبیاء تک محدود کرنا امت کی اجتماعی علمی روایت سے منفرد نظر آنے کا نتیجہ ہے۔

[۴] خیر و شر کی کسوٹی انسان — دین میں معروف و منکر کا تعین فطرت انسانی کرتی ہے [میزان صفحہ ۴۸، ۴۹، طبع دوم ۲۰۰۲] — اس اصول کی تفصیل غامدی صاحب کے الفاظ میں پڑھیے ''یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں وہ جن سے فطرت ابا کرتی اور انھیں برا سمجھتی ہے۔ قرآن ان کی کوئی جامع و مانع فہرست پیش نہیں کرتا، بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ انسان ابتداء ہی سے معروف و منکر دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر کو چھور دے [التوبہ ۹:۷۱] — اس معاملے میں اگر کسی جگہ اختلاف ہو تو زمانۂ رسالت کے اہل عرب کا رجحان فیصلہ کن ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخری بعثت کے لیے اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کو چھوڑ کر انھی کا انتخاب کیا ہے اور معروف و منکر سے متعلق ان کے رجحان کو گویا پیغمبر کی تصویب حاصل ہوگئی ہے''۔ [جاوید غامدی، میزان ص ۴۸۔ ۴۹، اپریل ۲۰۰۲ء، دارالاشراق، لاہور] — میزان ۲۰۰۸ء میں ص ۴۵ پر غامدی صاحب نے مذکورہ بالا تحریر نقل کرتے ہوئے سورۂ توبہ کے بعد والی سطور حذف کر دیں حضرت والا کی عربیت، فہم، شعور کا حسب معمول ارتقاء ہو گیا — یہ کیسے ممکن ہے کہ معروف و منکر جن کے ترک و اختیار پر فرد کی نجات کا دار و مدار ہے اس کا تعین محض ذہن انسانی پر منحصر ہو اور اس کو پرکھنے کا منہاج اہل عرب کا مزاج ہو — اس اصول کی مزید تفصیل ان کی ایک تقریر میں ملتی ہے ''قرآن مجید کے مطابق، آخرت میں انسان کے مواخذے کی بنیاد، اس ہدایت سے روگردانی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے متعدد ذرائع سے اس کو دی ہے۔ اس ہدایت کی پہلی قسط، عہد الست کی صورت میں انسان کی فطرت میں پیوست کی گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کے کائنات کا تنہا مالک ہونے کی ہدایت ہے، چنانچہ، قرآن اس امر میں بالکل قطعی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے معاملے میں انسان پر اس کی فطرت کی شہادت ہی کافی ہے اور اس سلسلے میں کسی عذر کے پیش کیے جانے کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔'' قانون

اتمام حجت'' کی اساس یہی عہد الست ہے۔ اس عہد الست کی یاد داشت کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود ہی کے اندر ہدایت کے مزید اسباب بھی میسر کیے ہیں۔ ان میں سے خیر و شر کا الہام غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ انسان جب برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس برائی کا برائی ہونا خود اس کے اپنے اوپر بالکل واضح ہوتا ہے، خواہ وہ دوسروں کے سامنے کتنے ہی عذرات تراشے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بنیادی اخلاقیات کے معاملے میں بھی انسانی فطرت ہی انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ خیر و شر کے اس الہام کے علاوہ انسان کی خلقت میں بھی اللہ تعالیٰ کی بے پناہ نشانیاں موجود ہیں جو مسلسل اسے بنیادی حقائق کے بارے میں دعوتِ غور وفکر دیتی رہتی ہیں۔ ان تمام نشانیوں کو قرآن انفس کی نشانیوں سے تعبیر کرتا ہے۔ ہدایت کا مزید ذریعہ آفاق ہے چنانچہ انفس و آفاق میں موجود یہ تمام نشانیاں ہدایت کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن جاتی ہیں اور اس ہدایت سے روگردانی بھی انسان کو آخرت میں سزا کا مستحق بنا دیتی ہے۔ یہاں واضح رہنا چاہیے کہ اوپر بیان ہونے والے ہدایت کے تینوں ذرائع تمام انسانوں کے درمیان مشترک ہیں، خواہ وہ مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے'' [جاوید غامدی اسلامی علوم کے اساسی مسائل [ڈاکٹر محمد رفیع الدین میموریل لیکچرز، ۱۹۹۹ء دانش سرا، ۱۰۷، ایڈن کاٹجز، لاہور] اب چونکہ پیغمبر تو نہیں آئیں گے اور اتمام حجت کا قانون رسالت مآبؐ کے ساتھ ہی ختم ہو گیا یہ درست ہے کہ وہی کافۃ للناس ہیں یعنی قیامت تک ہر انسان، ہر امت کے لیے پیغام رسالت ہی واحد پیغام ہے لیکن ختم نبوت کے ساتھ ہی نبوت کے ذریعے قانون اتمام حجت کا اطلاق ممکن نہیں رہا اور امت مسلمہ ''شہادت علی الناس'' کی ذمہ دار نہیں ہے کیونکہ غامدی صاحب ۱۹۹۰ء سے پہلے شہادت علی الناس امت کی اجتماعی لازمی اور شرعی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اس کے لیے امت کو جہاد کی بھی اجازت دیتے تھے ۱۹۹۶ء کے ''قانون دعوت میں'' انہوں نے جہاد کے بجائے صرف تبلیغ دین بحیثیت امت پر یہ ذمہ داری نیابت رسالت کے فرض کے طور پر عائد کی تھی ۲۰۰۸ء کی میزان میں شہادت علی الناس کا اجتماعی فریضۂ امت بھی حضرت والا نے منسوخ کر دیا لہٰذا اب قیامت تک ہر فرد معروف و منکر کے بارے میں خود اپنی فطرت سے فیصلہ کر سکتا ہے اسے نبوت، رسالت کے ذریعے ملنے والے علوم اور الکتاب کی روشنی کی ضرورت نہیں اس کی عقل، فطرت، انفس و آفاق کی نشانیاں کافی ہیں امت مسلمہ اب کوئی وجود نہیں مسلمانوں کو اگر کسی خطۂ زمین میں اقتدار مل جائے تو وہ اس زمین پر معروف و منکر کا انتظام صرف خطبہ جمعہ

اور پولیس کے ذریعے قائم کرنے کے مجاز ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ پھر آخری پیغمبر اور آخری کتاب کی کیا ضرورت تھی عقل فطرت اور انفس و آفاق کی نشانیاں تو کائنات کے آغاز سے ہی موجود ہیں لہٰذا انبیاء کی آمد بھی نعوذ باللہ بلا ضرورت ہی رہی رسالت مآب کے ذریعے اہل عرب پر اتمام حجت کر دیا گیا لیکن قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے اتمام حجت کا کوئی قطعی اور حقیقی طریقہ باقی نہیں رہا دوسرے معنوں میں اب قیامت تک لوگ گمراہ ہوتے رہیں گے کیونکہ حق کو پہچاننے کے لیے کوئی ایسی برہان موجود نہیں جو اتمام حجت کے درجے میں ہو لہٰذا لوگ اپنی فطرت اور حسیات کے ذریعے جس حق کو پالیں وہی ان کے لیے حجت ہے اور قرآن کی آیت کافۃ للناس کا یہی مطلب ہے کہ تمہاری فطرت جس حق پر تم کو مطمئن کر دے وہی الحق ہے —یعنی انسان شارع ہے—[۵] نیا اصول— نبیؐ کی رحلت کے بعد کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔[اشراق دسمبر ۲۰۰۰ء ص ۵۴۔۵۵ بحوالہ غامدی صاحب کا مذہب کیا ہے؟ رفیق اختر]—[۶] شارع فرد خود ہے— زکوٰۃ کا نصاب منصوص اور مقرر نہیں ہے، [قانون عبادات ص ۱۱۹ طبع اپریل ۲۰۰۵ء]—[۷] واحد ماخذ— دین کا تنہا ماخذ اس زمین پر اب محمدؐ کی ذات والا صفات ہے [میزان ص ۹ طبع دوم ۲۰۰۲ء][میزان، ص ۱۳ مقدمہ طبع سوم ۲۰۰۸ء]—[۸] دین کے ماخذ دو ہیں۔[۱] قرآن مجید، [۲]۔سنت [میزان، ص ۹، طبع دوم ۲۰۰۲][میزان ص ۱۳، طبع سوم ۲۰۰۸ء]—سنتوں کی فہرست میں تدفین کو بھی سنت میں شامل کیا گیا ہے حالانکہ تدفین کا طریقہ قرآن کے مطابق قابیل کو پیغمبر نہیں کوے نے بتایا تھا قرآن کی نص سے یہ دلیل ثابت ہے تو کیا سنت پرندے سے بھی اخذ کی جا سکتی ہے؟ فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ لِیُرِیَہٗ کَیۡفَ یُوَارِیۡ سَوۡءَۃَ اَخِیۡہِ قَالَ یٰوَیۡلَتٰۤی اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِثۡلَ ہٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوۡءَۃَ اَخِیۡ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِیۡنَ [۵:۳۱]—[۹] فطرت شارع ہے— حلال و حرام جانور کا تعین فطرت انسانی کرتی ہے اس اصول کی شرح میں غامدی صاحب لکھتے ہیں—اسی لیے شیر، چیتے، ہاتھی، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے وہ جانتا ہے کہ گھوڑے گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں یہ سواری کے لیے پید کیے گئے ہیں [میزان، ص ۳۷ محولہ بالا]۔[حضورؐ اونٹ کیوں کھاتے تھے یہ تو سواری کا اصل جانور ہے] نشہ آور چیزوں کی غلاظت کو سمجھنے میں بھی اس کی عقل عام طور پر صحیح نتیجے پر پہنچتی ہے چنانچہ خدا کی شریعت نے اس معاملے میں انسان کو اصلاً اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے انسان کی فطرت کبھی کبھی مسخ ہو جاتی

ہے لیکن ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی [میزان ص ۳۱۰ محولہ بالا] — ان طیبات وخبائث کی کوئی جامع و مانع فہرست شریعت میں کبھی پیش نہیں کی گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت اس معاملے میں بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ کیا چیز طیب ہے اور کیا خبیث ہے اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ ہو جاتی ہے لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی چنانچہ شریعت نے اس طرح کی کسی چیز کو اپنا موضوع نہیں بنایا وہ امور جن کی حلت وحرمت کا فیصلہ تنہا عقل وفطرت کی رہنمائی میں کر لینا انسانوں کے لیے ممکن نہیں لہٰذا مردار، خون، سور، غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ ، وغیرہ وغیرہ [المائدہ ۵:۳] اس کی وضاحت سورۂ مائدہ میں کر دی گئی ہے [ص ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، میزان ۲۰۰۸] چین، ہندوستان، یورپ میں سور، شراب، منشیات کا استعمال عام ہے بعض یورپی ممالک میں نشہ آور اشیاء کی خاص دکانیں ہیں جہاں سے وہ خاص مقدار میں نوجوانوں کے لیے قانوناً مہیا ہوتی ہیں — چین کوریا فلپائن جاپان وغیرہ میں لوگ کتے، سانپ، چھپکلی، چوہے کھاتے ہیں، تھائی لینڈ میں زندہ بندر کا مغز کھوپڑی سے نکال کر کھایا جاتا ہے دنیا میں بہت سے قبیلے آدم خور ہیں دنیا کی اکثریت حرام چیزیں استعمال کر رہی ہے تو کیا یہ سب غلطی پر نہیں فطرت پر ہیں؟ کیا یہ سب اعمال فطرت کے عین مطابق ہیں؟ انسان کی فطرت کو دین کا مستند ماخذ قرار دینا غامدی صاحب کا تفرد ہے فطرت دین کو پہچاننے کا ذریعے تو ہو سکتی ہے ماخذ نہیں کیونکہ ماخذ نہ مسخ ہو سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے نہ ختم ہو سکتا ہے جس طرح عقل دین کو جاننے پہچاننے کا ایک ذریعہ، آلہ، ہتھیار، وسیلہ تو ہے لیکن ماخذ نہیں ہے کیونکہ ماخذ کو جانچنے ، دیکھنے، پرکھنے کا پیمانہ ماخذ سے باہر ہونا چاہیے اگر عقل خود ماخذ ہے تو اسے پرکھنے کا پیمانہ اس کے اندر ہوگا لہٰذا عقل جو کچھ کہے گی وہ درست ہوگا قرآن اس لیے ماخذ ہے کہ وہ بذاتہ الحق ہے شک سے بالا ہے اس کو پرکھنے کا پیمانہ بھی قرآن ہی ہے اگر انسانوں کی اکثریت فطرت کے مطابق چلتی ہے تو قرآن نے سورۂ نساء کی آیت ۲۳، ۲۴ میں عورتوں کی حلت وحرمت کی تفصیلی فہرست کیوں پیش کی جبکہ غامدی صاحب کی رائے ۱۹۸۵ء میں فطرت کے بارے میں یہی تھی کہ ''فطرت انسانی کا فتویٰ ازل سے یہی ہے کہ ان [رشتوں] کے ساتھ زن وشوہر کا تعلق صریح بے حیائی ہے وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقۡتًا وَسَآءَ سَبِيۡلًا [۴:۲۲] [میزان حصہ اول ص ۱۱۰، ۱۹۸۵ء، دارالاشراق، لاہور] اگر

انسان کی فطرت کا فتویٰ ازل سے یہی ہے کہ فلاں فلاں عورتیں حرام ہیں تو قرآن نے انسان کو فطرت پر کیوں نہیں چھوڑ دیا حلال و حرام عورتوں کی ایک فہرست کیوں پیش فرمادی؟ یہاں قرآن نے انسان کی فطرت پر بھروسہ کیوں نہیں کیا؟ — غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ انسانوں کی بڑی تعداد فطرت پر قائم رہتی ہے اور خبائث کو فطرت کے ذریعے پہچاننے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی لیکن فطرت کے بارے میں غامدی صاحب افضال ریحان کے سوال کے جواب میں کیا فرماتے ہیں آیئے سوال پڑھتے ہیں — س: کہا جاتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اب فطرت ایسی چیز ہوتی ہے جس پر انسان فطری انداز سے خود بخود چلنے لگتا ہے — افضال ریحان نے یہ سوال غامدی صاحب کے فلسفہ فطرت کی روشنی میں پوچھا تھا اور درست سوال تھا غامدی صاحب جواب دیتے ہیں ''انسان فطرت کے خلاف بھی تو چلتا ہے اگر وہ اپنی فطرت کے خلاف نہ چلے پھر تو وہ بالکل جانور بن کر رہ جائے اس کے اندر اپنی فطرت سے انحراف کی پوری قوت موجود ہے اس کے اندر بڑی ترغیب رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی فطرت کے بندھن کو توڑے اور فطرت کے خلاف چلنے میں بھی ایک لذت ہے — فطرت میاں بیوی کے صحیح تعلق میں ہے لیکن اللہ نے زنا میں اتنی کشش رکھ دی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے خلاف ہر عورت سے یہ تعلق بنانا چاہتا ہے لیڈی ڈیانا کا جو حادثہ ہوا ہے آپ کہتے ہیں کہ اس بات کو موخر کردوں لیکن آپ دیکھیں وہ حادثہ کہاں سے شروع ہوا وہ حادثہ اسلام کے خاندانی اصولوں کی پامالی سے شروع ہوا — اب برطانیہ جیسے ملک کے پڑھے لکھے لوگ فطرت پر کیوں نہ چل سکے اس لیے کہ فطرت پر چلنے کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے اسلام نے چودہ سو برس پہلے کہا کہ عورتوں کے بارے میں غض بصر سے کام لو لیکن اس بات پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے انسانوں کو ہر دور میں فطرت پر چلنا مشکل دکھائی دیتا رہا ہے۔ [افضال ریحان اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب ص ۵۶،۵۷ — ۲۰۰۴ء دارالتذکیر لاہور] س۔ سرسید نے کہا تھا کہ قرآن کی تشریح فطرت کے مطابق کی جائے — غامدی صاحب نے اس کا جواب دیا: میں اسلام کی تشریح فطرت کے مطابق کرنے کا قائل ہوں اور نہ فطرت کے خلاف کرنے کا قائل ہوں میں تو اسلام کی تشریح جیسے وہ ہے ویسے کروں گا میرے خیال کے مطابق جب آپ کوئی ذہن ذہن لے کر جائیں گے اسلام کے پاس کہ ہم نے اس کی تشریح ایسے کرنی ہے تو یہ بد دیانتی ہے [ص ۵۷، ۵۸ محولہ بالا] غامدی صاحب کے اس بیان کی روشنی میں فطرت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے وہ خود کہتے ہیں کہ انسانوں کو ہر دور میں فطرت پر چلنا مشکل دکھائی دیتا ہے تو پھر

ایسے انسانوں کی فطرت پر معروف ومنکر حلال وحرام کا تعین چھوڑ دینا کیسا ہے؟ خصوصاً برطانیہ کے لوگوں کی فطرت پر تو حرام وحلال کے سلسلے میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا — اگر انسانوں کی اکثریت بالعموم فطرت پر قائم رہتی ہے لیکن ان میں بھی اختلاف ہو جائے اور ہر شخص اپنے فہم فطرت اور تصور فطرت کو کامل قرار دے تو اس اختلاف کو رفع کرنے کا طریقہ کیا ہوگا؟ فیصلہ کون کرے گا کہ کون سا عمل فطرت کے عین مطابق ہے شارع، شریعت، سنت، دین، الکتاب یا فرد کا نفس، عقل — اگر ہر شخص مدعی فطرت صحیحہ ہو تو اختلاف کس منہاج پر پرکھا جائے گا؟ — حضرت آدمؑ کی فطرت نہایت خالص صحیح اور صادق تھی اس کے باوجود انہوں نے نقل کے مقابلے میں جب عقل وفطرت استعمال کی اور شیطان کے کہنے پر دانہ گندم کھایا جسے ممنوع کر دیا گیا تھا تو ان کی فطرت ان کی رہنمائی سے کیوں قاصر رہی؟ جو فطرت حضرت آدمؑ کی رہنمائی نہیں کر سکی وہ عصر حاضر کے انسان کی رہنمائی کے لیے کیسے کافی ہو سکتی ہے؟ اور جس فطرت نے حضرت آدمؑ کو جو خالص فطرت پر پیدا ہوئے جنھیں خالق کائنات نے براہِ راست ہدایت دی کہ درخت کے قریب نہ جانا شیطان سے بچنے کا حکم دیا وہ شیطان جس نے اللہ کے حکم پر آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ان تمام حقائق اور حقیقت الحقائق سے درخت کی ممانعت کا حکم براہِ راست سننے کے باوجود آدمؑ نے جب نقل کے مقابلے میں عقل، تدبیر، فطرت، حکمت کے ذریعے حقیقت کو پانے کی کوشش کی تو ٹھوکر کھائی قرآن نے اس واقعے کے ذریعے انسان کو ابد تک کے لیے یہ پیغام دیا کہ صرف فطرت صرف عقل صرف تدبیر صرف منطق کے ذریعے تم کبھی منشائے الٰہی کو نہیں پا سکتے جب تک خود کو نقل کے سپرد اور عقل کو اس کے تابع نہ کر دو حضرت آدمؑ جو گناہ کے تصور سے بھی نا آشنا تھے عقل وفطرت نے انھیں نسیان میں مبتلا کر کے عصیان پر آمادہ کیا اس فطرت اور عقل پر عصر حاضر میں اعتماد کر کے انسان حلال و حرام طیب وخبیث خود معلوم کرے گا محض غامدی صاحب کا حسن ظن ہے — تاریخ کے اس دور میں جب دنیا کی ہر قوت انسان کو ہر لمحے فسق وفجور اور عصیان کی طرف براہِ راست دعوت دے رہی ہو، جب انسانی فطرت مسخ کی جا رہی ہو، اس دور میں حلال وحرام کی فہرست انسان کے سپرد کرنے کی فراخی نا قابل فہم ہے — [۱۰] عقل وفطرت کامل رہنما نہیں — کچھ جانوروں کی حلت وحرمت کا فیصلہ تنہا عقل وفطرت کی رہنمائی میں انسان کے لیے ممکن نہیں لہٰذا ان کی ممانعت شریعت نے کی ہے۔[میزان ص ۳۷ طبع دوم ۲۰۰۲ء، میزان ۶۳۲، ۶۳۳، طبع ۲۰۰۸ء] — [۱۱] تغیر دوامی اصول — دین کے ماخذات مستقل نہیں

ہوتے متغیر ہوتے ہیں ان میں اصلاح، کمی بیشی، ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری رہتا ہے رہ سکتا ہے، ماخذات کے لیے معین اصطلاحات لفظاً ظاہراً مستقل ہوتی ہیں جیسے قرآن و سنت لیکن ان کے مطالب و مفاہیم بدل سکتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں [اس اصول کے لیے جناب غامدی صاحب کی درج ذیل کتب کا تقابلی مطالعہ کیجیے میزان جلد اول ۱۹۸۵ء، [کل صفحات ۲۳۲] میزان طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء [کل صفحات ۳۳۷]، میزان طبع سوم ۲۰۰۸ء، اصول و مبادی ۲۰۰۰، میزان ۲۰۰۸ء، ۲۰۰۹ء [کل صفحات ۶۵۸]، مقامات ۲۰۰۶ء، مقامات ۲۰۰۸ء، قانون دعوت ۱۹۹۶ء، اسلامی علوم کے اساسی مسائل ۱۹۹۹ء، قانون دعوت، طبع ۱۹۹۶ء، سیاست و معیشت، طبع ۱۹۹۳ء، برہان ۱۹۹۲ء، برہان ۲۰۰۶ء، پرویز صاحب کا فہم قرآن، خطاب جاوید غامدی، ۲۰۰۴ء دار التذکیر، لاہور آخری کے سوا بقیہ عام کتب غامدی صاحب نے خود شائع کی ہیں، ، غامدی صاحب سے افضال ریحان کا انٹرویو، اشراق اعلام کی فائلیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کے نظریات، آثار، نقوش، افکار، فراز کوہ سے آنے والی ندی مسلسل مٹاتی چلی جاتی ہے — غامدی صاحب ققنس کی طرح اپنی خاکستر سے جی اٹھتے ہیں اور میر کا یہ شعر پڑھتے ہوئے نت نئے افکار کا آشیانہ تعمیر کرتے چلے جاتے ہیں ؎ کوئے جاناں سے خاک لاتے ہیں اپنا کعبہ الگ بناتے ہیں] — [۱۲] اصل الاصول ارتقاء — غامدی صاحب کے یہاں ماخذات دین میں تغیر و تبدل کا اصول ان کے فہم کا ارتقاء ہے جب بھی کوئی خیر، حق واضح ہو جائے گا اس سے رجوع کر لیا جائے گا سوال یہ ہے کہ ارتقاء کے اصول کا ماخذ کیا ہے؟ ارتقاء کو کس اصول اور منہاج پر پرکھا جائے گا؟ ارتقاء اگر خود اصول ہے تو اسے پرکھنے کا پیمانہ بھی محض ارتقاء ہے اس صورت میں رجوع کا اصول خود بخود کالعدم ہو جاتا ہے رجوع اس وقت ممکن ہے جب ارتقاء کے اصول کو پرکھنے کا کوئی منہاج متعین ہو — ارتقاء کب ختم ہوگا اس کا بھی کوئی اصول ان کے یہاں نہیں ملتا اور اگر ارتقاء جاری و ساری ہے تو پھر حضرت والا کا کوئی بیان اور فہم مکمل نہیں ہوا — یعنی ان کا نقطۂ نظر نہ قطعی ہے نہ حتمی نہ آخری نہ تام مکمل بیان پر عدالت میں جرح کی اجازت نہیں ہوتی تو کیا اس روایت کی روشنی میں ہمیں غامدی صاحب پر اعتراض تنقید اور جرح کی اجازت بھی ہے یا نہیں؟ ارتقاء کے اس اصول کے تحت سنت میں پہلے داڑھی شامل تھی پھر وہ نکل گئی جون ۱۹۹۱ء کے اشراق ص ۳۲ کے مطابق داڑھی بھی سنت تھی سنتیں ۱۹۹۷ میں ۲۷ تھیں — اسلام کیا ہے؟ دانش سرا کے صدر ڈاکٹر فاروق کی کتاب اشاعت ۱۹۹۹ء میں سنتوں کی تعداد

۳۹ ہے اصول و مبادی مقدمہ میزان تالیف غامدی صاحب سن ۲۰۰۰ء میں سنتوں کی تعداد چالیس ہے — اسلامی علوم کے اساسی مسائل میں سنتوں کی تعداد چالیس ہے — میزان طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء میں سنتوں کی تعداد صرف ۲۷ ہے ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۹، ۲۰۰۰ء، ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۸ء میں داڑھی سنت سے نکل گئی۔ مئی ۱۹۹۸ اشراق ص ۳۵ پر سنتوں کی تعداد چالیس تھی فروری ۲۰۰۵ء میں اصول و مبادی طبع ہوئی تو اس میں سنتوں کی تعداد صرف ۱۸ رہ گئی پھر ۲۶ رہ گئی، سنتوں کی تعداد نہایت تیزی سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اس کی کوئی دلیل کبھی ہماری نظر سے نہیں گزری — میزان، اصول و مبادی، سنت کیا ہے جیسے تمام کتابچوں اور اشاعتوں میں ۱۹۹۷ء سے لے کر ۲۰۰۸ء تک نومولود کی کان میں اذان کو سنت شمار کیا گیا تھا لیکن جب عامر گزدر صاحب نے موطا امام مالک سے اس کی کراہت کی دلیل پیش کی اور معز امجد اور خالد ظہیر صاحب نے بھی اس دلیل سے اتفاق کیا تو غامدی صاحب نے میزان ۲۰۰۹ء کی اشاعت میں اس سنت کو بھی خارج کر دیا — [۲۰۰۸ء کی میزان میں ص ۱۴ پر رسوم و آداب کے تحت درج ہے ''نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت] لیکن ارتقاء کے اصول کا ماخذ معلوم نہیں ہوسکا۔ غامدی صاحب کو اس سلسلے میں مدیر ساحل نے ان کے فلسفۂ ارتقاء پر ایک خط لکھا جو ساحل میں شائع ہوا مگر انہوں نے اس کا جواب نہیں دیا لیکن ارتقاء کا اصول ان کے یہاں اصل الاصول ہے — مثلاً حدود و تعزیرات طبع اول اگست ۱۹۹۵ء میں ص ۱۱ پر غامدی صاحب نے خدا اور اس کے پیغمبروں کے بارے میں سب و شتم کو محاربہ اور فساد فی الارض کے زمرے میں شامل کیا تھا اور مجرموں کو واجب القتل قرار دیا تھا — محاربہ اور فساد فی الارض: محاربہ اور فساد فی الارض کے معنی، قرآن مجید کی اصطلاح میں یہ ہیں کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھا، قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے اور پوری جرات و جسارت کے ساتھ، اس نظامِ حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول کی ہدایت کے تحت، ایک اسلامی حکومت، کسی خطۂ ارض میں قائم کرتی ہے۔ چنانچہ وہ مجرم جو زنا بالجبر کا ارتکاب کریں یا بدکاری کو پیشہ بنالیں، یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئیں، یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائیں یا اپنی دولت و اقتدار کے نشے میں غریبوں کی بہو بیٹیوں کو سرعام رسوا کریں، یا خدا اور اس کے پیغمبروں کے بارے میں سب و شتم کا رویہ اختیار کریں یا قتل، ڈکیتی، رہزنی، بغاوت، اغوا، دہشت گردی، تخریب، ترہیب اور اس طرح کے دوسرے سنگین جرائم سے حکومت کے لیے امن و امان کا مسئلہ پیدا

کر دیں ان کو سرکوبی کے لیے سزاوں کا ایک مفصل ضابطہ ہے، جو قرآن مجید کی سورۂ مائدہ میں بیان ہوا ہے۔ [جاوید غامدی، حدود و تعزیرات، ص ۱۱، ۱۹۹۵ء المورد لاہور] —— لیکن میزان طبع دوم ۲۰۰۲ء میں محاربہ اور فساد فی الارض کے جرائم کی فہرست میں سے غامدی صاحب نے شتم خدا اور رسول کو فہرست سے ہی خارج کر دیا ہے۔ میزان ۲۰۰۸ء میں بھی یہ جرائم جدید فہرست سے خارج ہی رہے —— جدید اشاعت میں غامدی صاحب لکھتے ہیں موت کی سزا قرآن کی رو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں نہیں دی جا سکتی [ص ۶۱۱، میزان ۲۰۰۸ء طبع سوم] محاربہ اور فساد فی الارض کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''اللہ کا رسول دنیا میں موجود ہو اور لوگ اس کی حکومت میں اس کے کسی حکم یا فیصلے کے خلاف سرکشی اختیار کر لیں تو یہ اللہ رسول سے لڑائی ہے فساد یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون سے بغاوت کر کے لوگوں کی جان مال آبرو اور عقل و رائے کے خلاف برسر جنگ ہو جائے [ص ۶۱۲ میزان طبع سوم ۲۰۰۸ء] ظاہر ہے اب رسول موجود نہیں تو وہ محاربہ بھی ختم ہو گیا جو رسول سے خاص تھا —— محاربے اور فساد کی تشریح میزان ۲۰۰۸ء میں ۶۱۲ سے ۲۱۷ صفحات پر محیط ہے مگر اس بحث میں کہیں سب اللہ اور شتم رسول کے بارے میں کوئی اشارہ تک نہیں دیا گیا ہے —— مگر اشراق مئی جون ۲۰۱۱ء میں دوبارہ توہین رسالت کی سزا قتل کو محاربے اور فساد فی الارض کے زمرے میں شامل کر دیا مگر توہین خدا کے بارے میں حضرت والا نے کوئی رائے نہیں دی —— مسجد میں حاکم کا خطبہ سنت تھا —— نبیؐ نے جو سنت ان کے بارے میں [ہماری مسجدیں] قائم کی وہ یہ تھی کہ نماز جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت امیر ریاست اور اس کے عمال کریں گے [ص ۱۸۷، مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء] اس سنت کا ذکر میزان ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۸ء۔ ۲۰۰۹ء میں سنتوں کی فہرست میں نہیں ہے —— ارتقاء ہو گیا یا رجوع —— میزان میں دینی فرائض کے تحت ص ۴۸۹ پر غامدی صاحب [۲۲:۴۱] سورۂ حج کی آیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ آیت دینی فرائض بیان کرتی ہے جو کسی خطہ ارض میں اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے نظم اجتماعی پر عائد ہوتے ہیں نماز قائم کی جائے زکوٰۃ دی جائے بھلائی کی تلقین، برائی سے روکا جائے یہ چار باتیں لازم کی گئی ہیں [ص ۴۸۹، میزان ۲۰۰۸ء] مگر میزان کے ص ۱۴ پر نماز، زکوٰۃ، سنت کی فہرست میں شامل ہیں۔ تو نماز اور زکوٰۃ فرض ہیں یا سنت؟ دینی فرائض کے تحت کچھ سنتوں کا اضافہ بھی ہوا ہے ''ریاست کی سطح پر نماز قائم کرنے کے لیے جو سنت رسول اللہ نے قائم کی ہے اس کی رو سے [۱] لوگوں سے تقاضا کیا جائے گا کہ وہ اگر مسلمان ہیں تو اپنے ایمان و

اسلام کی شہادت کے طور پر نماز ادا کریں — [۲] نماز جمعہ کا خطاب اس کی امامت ریاست کے صدر مقام کی مسجد میں میں سربراہ مملک صوبوں صوبوں میں گورنر اور مختلف انتظامی وحدتوں میں ان کے عمال کریں گے، اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں یہ سنت قائم کی کہ ہر وہ شخص جس پر زکوٰۃ عائد ہے اپنے سرمائے سے الگ کر کے لازماً حکومت کے حوالے کرے گا اور حکومت اس سے اپنے حاجت مند شہریوں کی ضرورتیں ان کی فریاد سے پہلے ان کے دروازے پر پہنچ کر پوری کرنے کی کوشش کرے گی [ص ۴۸۹، میزان ۲۰۰۸ء] لیجیے سنتوں کی فہرست میں چار اور سنتوں کا اضافہ ہو گیا یہ ریاست کی سطح پر قائم کی جائیں گی یعنی سنتوں کی دو قسمیں ہوئیں فرد کی انفرادی سطح پر ریاست کی اجتماعی سطح پر لیکن یہ تقسیم میزان ۲۰۰۸ء کے ص ۱۴ پر موجود فہرست میں شامل نہیں میزان کے ص ۱۴ پر سنتوں کی فہرست میں ان چار ریاستی سنتوں کا ذکر ہی نہیں اس کی مصلحت ہم سمجھنے سے قاصر ہیں — وہ لکھتے ہیں کہ قرآن و سنت کی رو سے [غیر مسلم شہری کی] ان کی دو واضح اقسام ہیں ایک ذمی دوسرے معاہد [ص ۱۳۲ مقامات ۲۰۰۶ء] بعد میں سنتوں کی فہرست سے ذمی معاہد کا ذکر غائب ہے۔ اسی طرح بیعت، دعوت، ہجرت، حدود و تعزیرات بھی پہلے قرآن و سنت کے دائرے میں داخل تھے بعد میں سنت کے دائرے سے خارج ہو گئے دعوت سنت ہے [قانون دعوت غامدی، ص ۲۲ طبع دوم ۱۹۹۶ء] — [۱۳] پہلا ماخذ — دین کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے قرآن مجید کے بعد دوسرا ماخذ حدیث و سنت ہے۔ دین میں یہی دو چیزیں اصل حجت ہیں [مقامات طبع اول ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۸، المورد لاہور] دین صرف وہی ہے جس کی سند قرآن مجید یا نبیؐ کی حدیث و سنت میں موجود ہیں دین کے ماخذ صرف یہ دو ہی ہیں جو شخص اس بات کو مانتا ہو وہی ان ماخذ کی تعبیر کے لیے اس کام میں تعاون کے لیے آگے بڑھے قرآن و سنت کی تعبیر کے لیے دینی علوم کے ماہرین کی مجلس قائم کی جائے [برہان ص ۱۰۴، ۱۹۹۲ء، دارالاشراق، ۱۴۲ علامہ اقبال روڈ لاہور] مذہبی جماعتیں اپنی دعوت کی بنیاد صرف اللہ کی کتاب اور حضورؐ کی سنت ثابتہ پر رکھیں [برہان، ص ۹۵، ۱۹۹۲ء محولہ بالا] سنت صرف اس طریقے کو ہی نہیں کہتے جس کی ابتداء کوئی نبی کرے بلکہ نبی کی تصویب و تقریر کے نتیجے میں بھی سنت قائم ہوتی ہے [برہان، ص ۵۷، محولہ بالا ۱۹۹۲ء] رمی جمرات سنت ہے [ص ۵۶ برہان ۱۹۹۲ء محولہ بالا] دین کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے اس کے بعد دوسرا ماخذ حدیث و سنت ہے اس کا بیشتر حصہ تواتر عملی کے ذریعے سے ملا ہے دین میں یہی دو چیزیں اصل حجت ہیں اور یہ دونوں اس

زمانے میں اس طرح ہمارے پاس موجود ہیں جس طرح اگلوں کے پاس تھیں [برہان، ص ۴۷، ۱۹۹۲ء محولہ بالا] تدریس ان اہل علم کو سونپی جائے جو تمام معاملات میں اصل مرجع و ماخذ کی حیثیت اللہ کی کتاب قرآن مجید اور سنت محمدؐ ہی کو دیتے ہیں [برہان، ص ۷۷ محولہ بالا] ان اساتذہ کو قرآن وسنت کی روشنی میں ہر نوعیت کی علمی آراء قائم کرنے اور قرآن وسنت ہی کی حدود کے مطابق پوری ازادی کے ساتھ رائے ظاہر کرنے کا حق دیا جائے [برہان ص ۷۷، ۷۸۔ ۱۹۹۲ء محولہ بالا] یہاں حدیث وسنت کے بجائے دین کا ماخذ صرف قرآن سنت رہ گیا ۱۹۹۹ء میں غامدی صاحب نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین میموریل لیکچرز کے سلسلے میں تقریر کی جسے یاسر مجید نے مرتب کیا اس میں وہ کہتے ہیں دین کا ماخذ محمدؐ کی ذات والا صفات ہے اور یہ صرف انہی کا مقام ہے کہ اپنے قول وفعل اور تقریر وتصویب سے وہ جس چیز کو دین قرار دے دیں وہی اب رہتی دنیا تک دین حق قرار پائے [۲:۶۲] یہاں قانون وحکمت وہ دین حق ہے جسے اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ درج ذیل تین ہی صورتوں میں ہمارے پاس موجود ہے: [۱] قرآن مجید، [۲] سنت، [۳] حدیث [جاوید غامدی، اسلامی علوم کے اساسی مسائل، ۱۹۹۹ء، دانش سرا، ۱۰۷، ایڈن کا ٹیجیز ڈیفنس، لاہور] پہلے ماخذ دین قرآن اور حدیث وسنت تھا اب یہ ماخذ الٹ کر سنت اور حدیث ہو گیا۔ سنت میں موجود تقریباً سارا دین رسول اللہ کی بعثت سے قبل بھی اہل کتاب اور مشرکین عرب میں ایک روایت کے طور پر موجود تھا اس حقیقت کی جانب قرآن نے بھی اشارات کیے ہیں اور اس کی تفصیل حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے [ص ۴ محولہ بالا] قرآن اور سنت جس میں چالیس سنتوں کی فہرست شامل ہے بیان کرنے کے بعد وہ دین کی تیسری صورت حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں ''حدیث رسول کے قول فعل تقریر وتصویب کی اخبار احاد کا نام ہے دین سے متعلق جو چیزیں اس میں بیان ہوئی ہیں وہ دو ہی ہیں ایک آپ کا اسوۂ حسنہ دوسرے آپ کی طرف دین کی تفہیم وتبیین ان دونوں ہی سے دین میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اسوۂ حسنہ دین پر عمل سے وجود میں آتا ہے اور تفہیم وتبیین بہر حال تفہیم و تبین ہی ہوتی ہے [ص ۵، اسلامی علوم کے اساسی مسائل محولہ بالا] —— [۱۴] قرآن کی ایک آیت کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے ایک سے زیادہ مطالب ہوں تو قرآن چیستاں بن جائے گا [برہان ۱۹۹۲ء، برہان ۲۰۰۶ء، میں طاہر القادری صاحب پر تنقید کا مطالعہ کیجیے جہاں اس دلیل کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے —— غامدی صاحب ۲۰۰۶ء تک اقدامی جہاد کے قائل تھے اس کی دلیل قرآن سے لاتے تھے

وہ لکھتے ہیں — تیسرے قیام بالقسط: بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے، اسے دین کے لیے ستایا جائے یہاں تک کہ مسلمان کی حیثیت سے کھلا رہنا ہی اس کے لیے ممکن نہ رہے تو اس کا یہ ایمان اس سے تقاضا کرتا ہے کہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں یہ ''ہجرت'' ہے اور اپنے آپ کو اس طرح کی صورت حال میں دیکھ کر اور خدا اور اس کے رسول کی طرف سے اس کی دعوت کے باوجود اس سے گریز کرنے والوں کو اس نے جہنم کی وعید سنائی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ‌ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا‌ فَاُولٰٓـئِكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ‌ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا [۴:۹۷] — اسی طرح دین کو اپنے فروغ یا اپنی حفاظت کے لیے اگر کسی اقدام کی ضرورت پیش آ جائے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ دامے، درمے، سخنے دین کی مدد کی جائے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے اولوالامر اگر اس مقصد کے لیے کسی وقت جہاد و قتال کا فیصلہ کریں تو ہر بندۂ مومن اپنی جان اور اپنا مال اس طرح ان کے حوالے کر دے کہ وہ جس محاذ پر اور جس طرح چاہیں اس سے کام لیں۔ [دین حق ص ۲۰ ستمبر ۲۰۰۶ء المورد، لاہور]۔ اقدامی جہاد قرآن کی جدید تشریح کے باعث — میزان ۲۰۰۸ء میں اقدامی جہاد ہی ختم ہو گیا اس سے پہلے اقدامی جہاد ہر مسلمان فرد اور ہر مسلمان ریاست کے لیے لازم تھا دین حق کے نام سے یہ رسالہ اب میزان ۲۰۰۸ء میں صفحہ ۶۶ پر شامل ہے مگر جہاد و قتال اب ریاست کا کام ہی نہیں ہے لہٰذا وہ عبارت حذف کر دی گئی ہے اسلامی ریاست کا کام صرف اس کی جغرافیائی حدود کے اندر نماز زکوٰۃ جبراً قائم کرنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے جمعہ کا خطبہ اور پولیس استعمال کرنے تک محدود ہے اسلامی ریاست کے لیے فوج کی بھی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ جہاد و قتال ریاست کا کام ہی نہیں ہے تفصیلات کے لیے میزان میں قانون سیاست مطالعہ فرمائیے — المورد کے زیر اہتمام ۱۹۹۷ء میں شائع شدہ کتابچے قانون معیشت میں ص ۵۶ پر غامدی صاحب کا موقف تھا کہ اللہ کی طرف سے وارثوں کے حصے متعین ہونے کے بعد کسی وارث کے لیے وصیت اب جائز نہیں ورثاء کے بارے میں مبنی بر عدل قانون وہی ہے جو اس نے خود بیان فرمایا [یعنی غیر وارث کے لیے وصیت کی جا سکتی ہے لیکن اس سے متعین وارث پر اثر نہیں پڑے گا] یہاں علت حکم منفعت ہے اگر وارث و مورث میں سے کوئی دین بدل لے اور وارث اپنے مورث کو قتل کر ڈالے تو

منفعت کا قاعدہ لاگو نہ ہوگا حدیث کے مطابق کافر مومن کا وارث نہیں ہوسکتا ــــ لیکن قرآن وحدیث وسنت سے اس استدلال کے بعد اب مقامات ۲۰۰۸ء میں غامدی صاحب کا موقف یہ ہے کہ مورث کسی کے حق میں بھی [خواہ وہ وارث ہی کیوں نہ ہو کیونکہ غامدی صاحب نے وارث کے لیے حد مقرر نہیں کی ہے] پوری جائیداد کی وصیت کرسکتا ہے اگر ضرورت، اندیشہ، خطرہ درپیش ہو ــــ چونکہ قرآن نے وصیت کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی جائیداد وصیت پوری کرنے کے بعد تقسیم کی جائے گی لہٰذا وصیت کی حد ــــ پر قرآن کی آیت کی روشنی میں پابندی عائد نہیں کی جاسکتی [ص ۱۴۱ مقامات، ۲۰۰۸ء] A ــــ اسی طرح دین بدلنے سے میراث پر جو اثر پڑتا ہے غامدی صاحب ۲۰۰۶ء تک اس کے قائل تھے میزان حصہ ۱۹۸۵ء اور مختلف کتابچوں میں ان کا موقف تھا کہ وارث دین بدلے تو اسے میراث نہیں ملے گی لیکن ۲۰۰۸ء کی میزان میں حضرت والا کا ارتقاء ہوگیا لکھتے ہیں کوئی اگر اپنے مورث کے لیے منفعت کے بجائے سراسر اذیت بن جائے تو اللہ کی طرف سے علت حکم کا یہ بیان تقاضہ کرتا ہے کہ اسے وراثت سے محروم قرار دیا جائے نبیؐ نے اسی کے پیش نظر جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ کے بارے میں فرمایا نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے [بخاری رقم ۶۴، ۶۷] یعنی اتمام حجت کے بعد اب آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے [ص ۵۲۵، ۵۲۶، میزان ۲۰۰۸ء] یعنی اگر آج اگر آپ کی اولاد اہل کتاب یا مشرکین کا مذہب قبول کرلے تو وہ میراث کی حقدار ہوگی کیونکہ دین کے معاملے میں ان مشرکین اور اہل کتاب پر اتمام حجت نہیں ہوا اور اتمام حجت صرف پیغمبر کرسکتا ہے اتمام حجت صرف عہد رسالت کے مشرکین کفار اہل کتاب پر ہوا جو جزیرۃ العرب میں تھے اس کے سوا دیگر پر بھی اس حکم کا اطلاق اس وقت بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ آپ پیغمبر نہیں لہٰذا میراث میں اپنی کافر اولاد کو حصہ دینا ہوگا غامدی صاحب کا یہ اصول اقوام متحدہ کے منشور بنیادی حقوق کے مطابق ہے جس کے تحت مذہب کی بنیاد پر کسی فرد کے خلاف کوئی امتیازی سلوک [Discrimanation] نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تمام انسان برابر ہیں اور تمام انسان اس لیے برابر ہیں کہ سب عقل رکھتے ہیں ــــ غامدی صاحب وصیت کی قرآنی اجازت میں وسعت پیدا کرتے ہوئے لکھتے ہیں حتی کہ وارثوں کے حق میں بھی ان کی ضرورت، خدمت یا اسی نوعیت کی کوئی دوسری چیز تقاضہ کرے تو وصیت یقیناً ہوسکتی ہے مثلاً بچوں میں سے کسی نے والدین کی زیادہ خدمت کی کوئی بچہ اپنے پیر پر کھڑا نہیں ہے وصیت وارثوں کے حق میں

بھی ہوسکتی ہے اس میں کوئی چیز مانع نہیں۔[ص ۱۴۲، مقامات ۲۰۰۸ء] پہلے قرآن کی ہی آیت سے وارث کے حق میں وصیت کا انکار کیا گیا اور سنت اور اجماع کی روشنی میں وصیت کی تحدید کی گئی اب اسی آیت سے ورائے حدود وصیت کا حکم ثابت کر دیا گیا کہ کل جائیداد کسی کو بھی دے دو—— قرآن کے متعین حصوں سے ورثاء کو محروم کر دو تا کہ وصیت پوری ہو—— غامدی صاحب ۱۹۸۵ء میں لکھتے ہیں قرآن کی آیت غیر مضار وصیۃ من اللہ، واللہ علیم حلیم [النساء۴: ۱۲] میں تاکید ہے کہ وارث بنانے کا یہ عمل کسی حق دار کے لیے ضرر کا موجب نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیے ہیں۔ لیکن آیت کلالہ کی رو سے چونکہ مرنے والا اپنی مرضی سے کسی رشتہ دار کو وارث بنا سکتا ہے۔ اس لیے یہ حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اس حق کو استعمال کرتے ہوئے کوئی شخص وارثوں کی حق تلفی نہ کرے۔ اسے چاہیے کہ اس حق کا استعمال حتی المقدور احتیاط کے ساتھ کرے، یہ ہما شما کا مشورہ نہیں ہے، پروردگار کائنات کی وصیت ہے، اس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اس کے ہر فعل سے باخبر ہے۔ اور اگر بے جانے بوجھے اس سے کوئی کوتاہی ہو جاتی ہے تو اس کا خالق بردبار ہے، اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہے وہ نرم خو ہے بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس کے احکام میں ان کے لیے سہولت ہے، تنگی اور مشقت نہیں ہے۔ [جاوید غامدی، میزان، حصہ اول، ص ۶۵، ۶۶، دارالاشراق، لاہور] اس تحریر کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ صرف لغت عرب پر انحصار کے باعث قرآن کی ایک ہی آیت کے معانی بدلتے جاتے ہیں احکامات حجاب کے سلسلے میں بھی قرآن کے مقصد حجاب کے معانی بدلتے رہے ہیں تفصیلات کے لیے میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء اشراق کی فائلیں، غامدی صاحب کی تقاریر جواب غائب کر دی گئی ہیں، ڈاکٹر فاروق خان کی کتابیں، اسلام کیا ہے؟ اشراق کی فائلیں وغیرہ پڑھ لیجیے ایک ہی آیت ایک ہی اصول ایک ہی قانون سے مختلف احکامات اخذ کیے جا رہے ہیں اور امام فراہی امام اصلاحی کی تشریحات کو بھی قبول نہیں کیا جا رہا ہے—— ۹۲ء میں وہ حجاب کے قائل تھے لکھتے ہیں——

چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان میں وہ قرآن مجید کی صریح ہدایت کے مطابق سر کی اوڑھنی سے اپنا سینہ ڈھانپ کر اور زیب و زینت کی نمائش کئے بغیر کم ہی سامنے آتی ہے اس کی نمود ان ذرائع میں جب بھی ہوتی ہے مغرب کی جاہلی تہذیب و معاشرت کی اشاعت ہی کے لیے ہوتی ہے جس کا فساد ہر صاحب نظر

پر واضح ہے [برہان ص ۹۳، ۱۹۹۲ء] ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۲ء بلکہ ۱۹۹۸ء تک — سر کی اوڑھنی سے سر کو اور اس سے سینہ ڈھانپنا قرآن سے ثابت تھا ۲۰۰۸ء میں مقامات کی نئی اشاعت میں اوڑھنی قرآن سے ہی غیر ثابت ہوگئی اور صرف اسلامی روایت کی شکل رہ گئی — پہلے سر پر اوڑھنی قرآن کی صریح ہدایت تھی معلوم نہیں عربیت کے کس قائدے سے یہ حکم صریح غامدی صاحب نے اخذ کیا اب عربیت کے کس قائدے سے اوڑھنی سر پر ڈالنا قرآن کا حکم نہیں رہا بلکہ واجب بھی نہیں صرف ایک اسلامی رسم جس پر عمل نہ بھی کیا جائے تو عورت گناہ گار نہیں ہوگی لیکن اسے ایسا کرنا نہیں چاہیے مقامات میں لکھتے ہیں ہاتھ پاؤں اور چہرے کے سوا جسم کے ہر حصے کی زیبائش اجنبی مرد کے سامنے نہیں کھولیں گی قرآن نے اسے لازم ٹھہرایا ہے سر پر دوپٹا اوڑھ کر باہر نکلنے کی روایت اسی سے قائم ہوئی ہے اب اسلامی تہذیب کا حصہ بن چکی ہے [ص ۱۵۰ سر کی اوڑھنی مقامات ۲۰۰۸ء] سوال یہ ہے کہ غامدی کے مطابق قرآن نے چہرے کو نہ چھپانا لازم کیا ہے تو کیا سر Head چہرے Face میں شامل ہے اگر نہیں ہے تو عربیت کے کس قاعدے سے سر کی اوڑھنی صرف روایت ہے پہلے حکم صریح تھا — وہ لکھتے ہیں: بوڑھی عورتوں کے لیے بھی پسندیدہ بات یہی ہے کہ احتیاط کریں اور دوپٹا سینے سے نہ اتاریں اس سے واضح ہے کہ سر کے معاملے میں بھی پسندیدہ بات یہی ہونی چاہیے اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو عورتوں کو دوپٹہ سر پر اوڑھ کر رکھنا چاہیے اگرچہ یہ واجب نہیں ہے لیکن مسلمان عورتیں کبھی پسند نہیں کرتیں کہ کھلے سر اور کھلے بالوں کے ساتھ اجنبی مردوں کے سامنے جائیں [مقامات، ص ۱۵۱، طبع اول ۲۰۰۸ء] بہر حال یہ گناہ تو نہیں ہے لہٰذا سر کی اوڑھنی نہ فرض نہ سنت بس اچھی روایت اچھا کام ہے لیکن اسی مقامات میں وہ لکھتے ہیں ''اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے سوا [Excluding hand, foot, face] جسم کے کسی حصے کی زیبائش زیورات وغیرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہیں کھولیں گی قرآن نے اسے لازم ٹھہرایا ہے [سر کی اوڑھنی مقامات ص ۱۵۰ طبع اول ۲۰۰۸ء] ایک جانب ارشاد ہے کہ ہاتھ پاؤں چہرے کے سوا جسم کے کسی حصے کی زیبائش دکھانا جائز نہیں دوسری جانب سر کو حضرت والا نے منہ [Face] کے ساتھ شامل کر دیا — ۲۰۰۸ء کی میزان میں اوڑھنی کا مقصد صرف سینہ ڈھانپنا ہے اب اوڑھنی سے سر چھپانا قرآن کا صریح حکم نہیں ہے یہ عجیب قرآن ہے جس کا مطلب ۱۹۹۲ء میں کچھ ہوتا ہے ۲۰۰۸ء میں کچھ اور ہو جاتا ہے صرف اس لیے کہ قرآن کی تشریح، تفسیر، تبیین کا اصول غامدی صاحب کے طائر خیال کا ارتقاء

ہے۔ جب غامدی صاحب اپنے ہی اصول کے برعکس قرآن کی ایک ہی آیت سے مختلف مفاہیم نکال رہے ہیں تو قرآن چیستان بن گیا چیستان ماخذ دین کیسے ہوسکتا ہے —— ۱۹۸۵ء میں میزان حصہ اول میں رضاعت کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے خواتین کے پردے پر قرآن کی آیت سے ثابت کرتے ہیں کہ سورۂ نور میں پردے کے احکامات عام عورتوں پر گھر میں نافذ العمل ہوں گے بعد میں ان آیات کا مفہوم ہی بدل گیا —— ۱۹۷۵ء سے لے کر ۲۰۰۲ تک غامدی صاحب کا موقف تھا کہ قرآن کریم کے مطابق خواتین کا پردہ اجنبی مرد سے گھر میں بھی ہے اس کے بعد یہ دائرہ وسیع ہوا کہ خواتین کے چہرے کا پردہ گھر اور محفوظ مقامات میں نہیں بلکہ گلی بازار اور غیر محفوظ مقامات پر ہے ان کی تقاریر سن لی جائیں اور ان کے ادارے دانش سرا، دارالاشراق سے شائع ہونے والی کتاب اسلام کیا ہے؟ کا ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۰ء تک کی اشاعتیں پڑھ لیں سب میں یہی لکھا ہے ''میزان'' اسی کتاب کی آخری شکل ہے اسلام کیا ہے کی عبارت دلائل الفاظ تک میزان میں حرف بہ حرف موجود ہیں۔ [میزان-----]

سورۂ نحل کی آیت ۴۴ سے غامدی صاحب میزان ۲۰۰۸ء میزان ۲۰۰۲ء، وغیرہ میں سنت ابراہیمی کا وجوب ثابت کر رہے ہیں جو کبھی ۱۷ کبھی ۲۷ کبھی ۴۰ کبھی ۱۹ کبھی ۲۶ ہیں لیکن برہان ۲۰۰۶ء میں قرآن کی اسی آیت سے وہ ثابت کرتے ہیں کہ رسول کی سنت قرآن کی تبیین کرسکتی ہے گویا تبین پیغمبر کی ذمہ داری ہے سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآن مجید خاموش ہے بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے [ص ۳۸ تا ۴۱ برہان ۲۰۰۶ء] بعد میں اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سنت دین ابراہیمی کی روایت ہے سنت سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا ہرگز اضافہ نہیں ہوتا [ص ۱۱، میزان ۲۰۰۲ء] سنت صرف رسوم وآداب کا نام ہے سنت قرآن سے مقدم ہے سنت دین ابراہیمی کی روایت کے طور پر عرب میں رائج تھی چند چیزوں کے سوا آپ نے ان میں کوئی اضافہ نہیں کیا یہ تواتر عملی سے امت کو منتقل ہوئی ہے ان کا ماخذ اجماع امت ہے [رسوم وآداب، ص ۳۲۱ میزان ۲۰۰۲ء] سورۂ نحل کی ایک آیت سے غامدی صاحب نے مختلف مطالب اخذ کرلیے تو کیا قرآن ماخذ رہ گیا؟ مقامات ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۸ء میں حکمرانوں کا عام آدمی کا معیار زندگی رکھنا سنت تھا قانون معیشت ۱۹۹۷ء میں یہ صرف نمونہ رہ گیا —— سنت کے دائرے سے خارج ہوگیا [ص ۴۵، قانون معیشت ۱۹۹۷ء المورد لاہور] ——

۲۰۰۶ء کے برہان میں وہ لکھتے ہیں قرآن مجید کوئی چیستان نہیں ہے کہ اس کی ہر آیت دو یا

تین متضاد مفاہیم کی حامل قرار دی جائے [ص ۲۵۵، ارباب منہاج القرآن کی خدمت میں] غامدی صاحب کے اپنے اصول کی زد میں خود غامدی صاحب بھی آ جاتے ہیں غامدی صاحب نے آیت وصیت ومیراث کی تشریح میں لکھا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیے ہیں۔۔۔اس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اس کے ہر فعل سے باخبر ہے۔[میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، ص ۵۷، ۵۸] لیکن مقامات ۲۰۰۸ء میں حضرت والا لکھتے ہیں کہ مورث کسی کو بھی پوری میراث کی وصیت کر سکتا ہے۔اور متعین وارثوں کے حق میں بھی یا ان کے متعین حصے کے سوا وصیت لکھ سکتا ہے ارتقاء ہو گیا شاید — پردہ کے بارے میں لکھتے ہیں — رہی حدیث سالم تو اس کی تاویل میرے نزدیک رفع حرج کے اصول پر کی جانی چاہیے [سالم کی گھر میں آمد پر خواتین کو پردے میں مشکلات پیش آئیں اور سورۂ نور کے احکامات حجاب پر عمل کا مسئلہ پیدا ہوا تو غامدی صاحب اس کی تشریح کر رہے ہیں] کسی گھرانے کی خواتین اگر حجاب کے ان حدود کی پابندی کرنا چاہیں جو سورۂ نور میں بیان کیے گئے ہیں رفع حرج کے اصول کی بناء پر اسے عام قانون سے مستثنیٰ کیا جائے گا تاہم یہ بات ملحوظ رہے کہ اس کی حیثیت ایک رخصت کی ہوگی اصل قانون وہی رہے گا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔[ص ۵۷، میزان ۱۹۸۵ء] غامدی صاحب کی دلیل کہ گھر میں مرد سے پردہ سورہ نور اور حدیث سے ثابت ہے تفصیل سے پڑھیے : سورہ نور کی اسی آیت ۳۱ میں عورتوں کو گھر کے اندر کسی غیر محرم کی موجودگی میں اپنی اوڑھنیوں کے آنچل سے اپنے گریبان ڈھانک لینے کا حکم دیا گیا ہے تا کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں ان کے جسم کے نشیب و فراز میں الجھ کر بہک نہ جائیں۔اس حکم کا وجوب بھی ظاہر ہے کہ انہیں عورتوں کے بارے میں ہو سکتا ہے جن کے جسم ابھی امتدادِ زمانہ نے اس کشش سے محروم نہیں کیے جو نگاہوں کے لیے مزلہ ثابت ہو سکتی ہے۔نکاح کی عمر سے گزری ہوئی، بڑی بوڑھیاں جو محرموں اور غیر محرموں سب کے لیے ماؤں کی طرح ہوتی ہیں جن کے جسم ان سب زینتوں سے خالی ہو چکے ہوتے ہیں جو نگاہوں کو کھینچتی اور دلوں کو متوجہ کرتی ہیں، اس وجوبِ حکم کی مخاطب ہی نہیں ہیں۔لیکن چونکہ اس بات کا امکان تھا کہ بعض محتاط بوڑھیاں اسے اپنے لیے بھی واجب سمجھ کر اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کر لیں گی اس وجہ سے اسی سورہ کی آیت ۶۰ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس حکم پر عمل کرنا نکاح کی عمر سے گزری ہوئی بوڑھی عورتوں کے لیے ضروری نہیں ہے وہ اگر یہ احتیاطیں ملحوظ رکھیں تو

ان کے لیے بہتر ہے لیکن وجوب حکم کی مخاطب بہر حال وہ نہیں ہیں۔ نور کی آیت ۳۱ ہی میں مردوں اور عورتوں کے عام خلا ملا پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں قرآن کے تمام دوسرے احکام کی طرح یہ حکم بھی کسی ایسے شخص کے لیے نہیں ہے جو اس خلا ملا کے لیے فی الواقع مجبور ہو —اس سے سوشل آزادیوں کے بارے میں بھی اسلام کے نقطۂ نظر کی غلط تعبیر کا امکان پیدا ہو جائے گا، اس لیے سورۂ نور کی آیت ۶۱ میں لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ[سورۂ نور:۶۱] وضاحت کر دی گئی کہ آیت ۳۱ کے احکام میں کوئی معذور شامل نہیں ہے اور ان احکام کا مقصد معقول روابط پر کوئی قدغن عائد کرنا بھی نہیں ہے۔ [جاوید غامدی، میزان، ص۹۴، ۹۵، حصہ اول ۱۹۸۵ء، دارالاشراق، لاہور]—

جمہور فقہا جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضرت عائشہؓ کے سوا تمام ازواجِ مطہرات سالم کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو صرف انہی کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں اور عام لوگوں کے لیے اس کی تعمیم کے قائل نہیں ہیں۔ ابو داود نے ازواج مطہرات کا یہ مسلک بھی روایت کیا ہے: ''اور ام سلمہ اور دوسری ازواج مطہرات اس بات کو پسند نہیں کرتی تھیں کہ اس طرح کی رضاعت [یعنی بڑی عمر کی رضاعت] کی بنا پر وہ کسی کو اپنے ہاں آنے کی اجازت دیں، ہاں البتہ گہوارے کی رضاعت کو وہ قبول کرتی تھیں اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے استدلال کے جواب میں فرماتی تھیں ماندری لعلھا کانت رخصۃ من النبی صلی الہ علیہ وسلم لسالم دون الناس بخدا ہمیں نہیں معلوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً یہ رخصت عام لوگوں کے لیے نہیں صرف سالم ہی کے لیے بیان فرمائی ہے'۔ [ابو داؤد، کتاب النکاح، باب فی من حرم] میرے نزدیک اس باب میں جمہور فقہاء کی رائے ہی صحیح ہے قرآن مجید نے حرمت رضاعت کا قانون بیان کرتے ہوئے جو اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے اس کا ناگزیر تقاضا ہے کہ حرمت صرف اسی صورت میں ثابت ہو جب کہ کوئی عورت شیر خوارگی کے زمانے میں اور باقاعدہ

اہتمام کے ساتھ کسی بچے کو دودھ پلائے کسی روتے ہوئے بچے کو محض بہلانے کے لیے چھاتی دینے یا کسی جوان یا بوڑھے کو محض رشتہ داری کا تعلق قائم کرنے کے لیے دودھ پلانے پر اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ [النساء۴:۲۳] کے الفاظ کا اطلاق عربیت کی رو سے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ رہی حدیث سالم، تو اس کی تاویل میرے نزدیک رفع حرج [اس اصول کی وضاحت کے لیے دیکھیے اسی کتاب میں رجم کی سزا، اہم مباحث ا۔ کے زیر عنوان سنت سے تبیین کی مثال] کے اصول پر کی جانی چاہیے۔ کسی گھرانے کی خواتین اگر حجاب کے ان حدود کی پابندی کرنا چاہیں جو سورہ نور میں بیان کیے گئے ہیں اور ان کے ہاں کوئی ایسا شخص بھی ہو جس نے انہی کی آغوش میں پرورش پائی، دودھ کے دانت انہیں کے ہاں توڑے، انہیں کے ہاں گھٹنیوں چلا، کھیلا کودا اور جوانی کی عمر کو پہنچا ہو تو بے شک وہ مشکل پیش آ سکتی ہے جو ابو حذیفہ بن عتبہ کی اہلیہ کو پیش آئی۔ وہ بیان کرتی ہیں:

یا رسول اللہ کنا نری سالماً ولداً وکان یدخل علی وانا فضل ولیس لنا الا بیت واحد فما ذا تری فی شانہ [موطا مالک، کتاب الرضاع] ''اے اللہ کے رسول، ہم تو سالم کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے، ہم کھلے ڈلے ہوتے تھے اور وہ بے تکلف اندر چلا آتا تھا۔ ہمارے پاس دوسرا گھر بھی نہیں ہے، آپ فرمایئے اب ہمیں کیا کرنا چاہیے''۔

میری رائے میں اس طرح کی صورت حال اگر فی الواقع کسی گھرانے میں موجود ہو تو جیسا کہ میں نے عرض کیا رفع حرج کے اصول کی بنا پر اسے عام قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔ سالم کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسی اصول پر مبنی ہے اور رضاعت کا تعلق اس کی رو سے بڑی عمر میں بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بات ملحوظ رہے کہ اس کی حیثیت ایک رخصت کی ہوگی۔ اصل قانون وہی رہے گا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ [جاوید غامدی، میزان، حصہ اول، ص۴۷، ۷۵، ۱۹۸۵ء، دارالاشراق لاہور] سالم جیسے بچے کی آمد و رفت پر جو بچپن سے ان عورتوں کی گود میں کھیلا ہے پردے سے متعلق مباحث پیدا ہو گئے اور سورۂ نور کے احکامات حجاب پر عمل میں مشکل پیش آنے لگی تو رسالت مآبؐ سے رجوع کیا گیا لیکن اب اس سورۂ نور کے حوالے سے غامدی صاحب کا تازہ موقف یہ ہے کہ یہ مرد و زن کے اختلاط سے متعلق ہے گھر میں داخل ہوتے ہوئے مرد نظریں بچا کر رکھیں اس سے مقصود نہ دیکھنا یا ہر

وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے لباس با قرینہ ہو ہاتھ، پاؤں، چہرے کا بناؤ سنگھار اور زیورات کی زینت دکھائی جا سکتی ہے ان اعضاء کے سوا باقی ہر جگہ کی زیبائش عورتوں کو چھپا کر رکھنا چاہیے [ص ۴۶۵، ۴۶۶، میزان ۲۰۰۸ء] سوال یہ ہے کہ تمام زیبائش دکھانے کی اجازت غامدی صاحب نے دے دی تو اب دکھانے کے لیے باقی کیا بچا ہے جسے چھپایا جائے اس تکلف اور اس ہدایت کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی یہاں عورت کو سر پر دوپٹہ ڈالنے تک کی ہدایت نہیں کی گئی کیونکہ اب سر کے بال بھی ستر میں شامل نہیں رہے بس عورت کو دوپٹہ سے سینہ ڈھانپ لینا چاہیے مدعا یہی ہے کہ عورتوں کو اپنا سینہ اور گریبان مردوں کے سامنے نہیں کھولنا چاہیے' ' [ص ۴۶۷، میزان ۲۰۰۸ء] سر بال وغیرہ کھول دینے چاہئیں جبکہ نماز کے ستر میں سر بال شامل ہیں میزان میں غامدی صاحب لکھتے ہیں سر کھلا ہو تو نماز ادا نہیں ہوتی [حوالہ] — غامدی صاحب حدیث سالم کی تشریح میں گھر کے اندر پردے کے قانون کی وضاحت فرما رہے ہیں جو بعد میں صرف گلی اور باہر کے پردے تک محدود ہو گیا اور گھر میں پردے کے بجائے صرف احتیاط باقی رہ گئی سر پر دوپٹہ لینے کے بجائے صرف سینے پر ڈالنا کافی ہو گیا پھر رفتہ رفتہ دوپٹہ بھی ایک اسلامی رسم رہ گیا نہ فرض رہا نہ واجب سوال یہ ہے کہ قرآن کی سورۂ نور کی آیات کے مفہوم عربیت کی رو سے مسلسل کیوں بدل رہے ہیں کیا تغیر دین کا اصول ہے؟ اگر ہے تو اس اصول سے انحراف کی صورت میں رجوع کا طریقہ کیا ہے؟ رجوع کرنے کے لیے شرط یہ ہے کہ اصول محکم ٹھوس اور نا قابل تغیر ہو غامدی صاحب کے منہاج میں رجوع کے بجائے ارتقاء ہوتا ہے کیونکہ رجوع کا مطلب ہے کسی مستحکم محکم اصول سے انحراف کی صورت میں اس کی طرف مراجعت اور ارتقاء کا مطلب ہے کسی غیر متعین منزل کی طرف مسلسل و مستقل سفر اس میں پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں — نظر صرف آگے رہنی چاہیے اور اس کی کوئی آخری حد نہیں ہے اس ارتقاء کے تحت عورت کا آنچل سر سے ڈھلک کر سینے تک آیا اس کے بعد اس رسم کی تہذیبی تمدنی یادرہ گئی — اور اب غامدی صاحب کے ارتقاء کے بعد پردے کا قانون ہی غلط قرار پایا وہ فرماتے ہیں کہ امت نے پردے کی آیات کا صحیح مطلب نہیں سمجھا پردے کے احکامات تو صرف اور صرف ازواج مطہرات کے لیے تھے سورۂ نور کے احکامات صرف گھر کے اندر کے لیے ہیں وہ بھی صرف یہ کہ عورت سینے پر کپڑا ڈال لے گھر میں اجنبی مرد سے عورت کا تخلیہ نئی تشریح میں قابل اعتراض نہیں رہا اجنبی مرد گھر کے مہمان خانے سے عورتوں سے حجاب کے پیچھے سے چیزیں مانگنے کا بھی پابند نہیں رہا یہ آزادیاں بھی غامدی صاحب کی جدید

تشریحات دین نے اسے عطا کر دیں ایک مرتبہ پھر میزان کو اچھی طرح دیکھنا ہے — اس ارتقاء کی تفصیل کے لیے اسلام کیا ہے؟ اشاعت ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۰ء کا مطالعہ کیجیے اس کے علاوہ غامدی صاحب کی کتاب قانون معاشرت ۲۰۰۵ء المورد لاہور اور میزان طبع سوم ۲۰۰۸ء کا مطالعہ فرمائیے۔

(۱)

غامدی صاحب امین احسن اصلاحی کی عبارت کو حوالہ بنا کر قرآن کی ایک آیت کے ایک سے زیادہ مفہوم کے امکان کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مسلمانوں کی شیرازہ بندی حبل متین سے ہوتی ہے اس ہدایت کا فطرت تقاضہ ہے کہ ہمارے درمیان جتنے بھی اختلافات ہوں ہم ان کے فیصلے کے لیے رجوع قرآن کی طرف کریں لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خود قرآن کے بارے میں ہماری رائیں متفق نہیں ہیں ایک ایک آیت کی تاویل میں نہ جانے کتنے اقوال ہیں اکثر ایک دوسرے سے متناقض لیکن کوئی چیز ہمارے پاس ایسی نہیں ہے کہ جو یہ فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون سا قول حق ہے ہماری فقہ کے اکثر اختلافات صرف اس بات کو اس کے سیاق اور نظم میں نہ دیکھنے سے پیدا ہوئے اگر سیاق و نظم کو ملحوظ رکھا جائے تو اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی [جاوید غامدی میزان ص ۵۱ طبع سوم ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب نے اس عبارت کو نقل کر کے سب سے پہلے اپنے ہی اصول کی خود نفی کی ہے کہ ''قرآن کی ایک آیت کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے'' کیونکہ میزان میں امین احسن اصلاحی کا یہ قول انہوں نے درج کیا ہے کہ ''اکثر مقامات [قرآن کے] ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا دوسرے قول کی گنجائش نہیں [ص ۵۱، میزان] فراہی اصلاحی اور غامدی صاحب جو نظم قرآن کے مکتب کے ورثاء ہیں خود اپنے اصولوں کی روشنی میں یہ تینوں حضرات قرآن کی بہت سی آیات کے ایک ہی مطلب پر متفق نہیں ہو سکے تو امت مسلمہ پر رونے کی کیا ضرورت ہے کہ اس کے مفسرین ایک آیت کے کئی مطالب بناتے ہیں خود غامدی صاحب نے آیہ حجاب کے کئی مطالب بتائے ہیں وصیت کی آیت کے تین مختلف بتائے ہیں اور تینوں کو عربیت اور نظم قرآن کے ذریعے متعین کیا ہے اگر نظم قرآن کے مکتب کے صرف تین آدمی فراہی، اصلاحی اور غامدی ایک آیت کے ایک مطلب پر متفق نہیں ہو سکتے تو اب اتفاق قیامت تک پیدا نہیں ہو سکے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت ماضی میں بھی ہمیشہ گمراہی میں مبتلا رہی اور آئندہ بھی گناہگار رہے گی کیونکہ امت کے تین عظیم آدمی جنھوں نے اس

امت کی مشترکہ گمراہی کی نشان دہی کی تھی جب خود ایک مطلب پر متفق نہیں ہو سکے تو اب کونسی ایسی قوت ہے جو امت کو ایک آیت کے صرف ایک فہم پر جمع کر سکے نظم قرآن کے مکتب فکر کے محرک حمید الدین فراہی نے نظم قرآن کے تحت قرآن کا جو ترجمہ کیا ہے وہ غامدی صاحب کی نظر میں قابل وقعت ہی نہیں ہے اس لیے اس بارے میں وہ خاموش رہے لیکن امین احسن اصلاحی کے ترجمے کے بارے میں غامدی صاحب نے مئی ۲۰۱۲ء میں پہلی مرتبہ عدم اطمینان ظاہر کر کے اسے مسترد کر دیا لکھتے ہیں ''تدبر قرآن کے معاملے میں دو مسئلے تھے ایک مسئلہ یہ تھا کہ اس میں نظم کا جو تصور پیش کیا گیا ہے ترجمہ اس کے لحاظ سے نہیں ہوا پیش کش کا جو اسلوب اختیار کیا گیا اس میں قرآن اور قاری کے درمیان مصنف کا اطاب حائل ہوتا ہے [شذرات، ص ۱۲، اشراق مئی ۲۰۱۲ء] غامدی صاحب کو قرآن کے تمام اردو تراجم پر اعتراض تھا کہ وہ نظم قرآن کے اصول کے تحت نہیں کیے گئے نظم قرآن کے مکتب کے محرک فراہی اور اصلاحی صاحب تھے اور بہت بڑے عارف و عالم لیکن یہ دونوں عرفاء اور علماء جو نظم قرآن کے سب سے جید مفکرین تھے یہ بے چارے بھی نظم قرآن کے لحاظ سے ترجمہ کرنے سے قاصر ہی رہے ان دونوں کی محرومیوں، کم زوریوں، نارسائیوں کا ازالہ اب غامدی صاحب کا علم اور ترجمہ کرے گا۔ ابرام کی اس کیفیت کے ساتھ ان کا علمی سفر کہاں جا کر کرے گا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے غامدی صاحب اپنے مکتب فکر کے بانیوں کو ہی اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے متعین کردہ اصولوں کے مطابق ترجمہ قرآن مکمل کر سکتے تو وہ امت کے دیگر اکابرین کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اپنے تازہ خطاب میں انہوں نے امت کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ایک گروہ امام غزالی سے شاہ ولی اللہ اور علامہ اقبال تک جبکہ دوسرا گروہ ابن تیمیہ ابن قیم امام فراہی، امام اصلاحی سے لے کر امام الائمہ جاوید غامدی صاحب تک ابن تیمیہ اور ابن قیم کو انہوں نے صرف فکری طور پر مجہول النسب ہونے کے الزام سے بچنے کے لیے پیش کیا ہے ورنہ ابن تیمیہ ابن قیم تو سنت کے اس تصور کو تسلیم ہی نہیں کرتے جو غامدی صاحب کا ہے ابن تیمیہؒ زندہ ہوتے تو غامدی مکتب فکر ایک اور منہاج السنہ لکھ دیتے اصلاً صرف غامدی صاحب ہی امام ہیں کیونکہ فراہی اور اصلاحی سے وہ بنیادی اختلافات رکھتے ہیں۔ پہلے گروہ کے بارے میں انہوں نے حدیث نقل کی ہے جو صرف اور صرف امام الائمیر غامدی صاحب تک محدود اور صرف ان کے خانوادہ علمی پر محیط ہے۔

اس تفسیر میں میں نے چونکہ نظمِ کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہ جاتا صحیح بات اس طرح منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ آدمی اگر بالکل اندھا بہرا متعصب نہ ہو تو اپنی جان قربان کر سکتا ہے لیکن اس سے انحراف برداشت نہیں کر سکتا [میزان ص۵۲ محولہ بالا ۲۰۰۸ء] نظم قرآن کے نتیجے میں قرآن کے مطالب میں وحدت اور کمال کیسے پیدا ہوتا ہے غامدی صاحب کے قلم سے اس کی تشریح دیکھیے ''اس کے نتیجے میں وہ ایک منفرد اور متعین صورت حاصل کرتی ہے اور اپنے وجود میں ایسی وحدت بن جاتی ہے جو ہر لحاظ سے مستقل بالذات اور کامل ہوتی ہے۔[ص۵۳، میزان ۲۰۰۸ء] اگر نظم قرآن کے نتیجے میں ایسی زبردست وحدت ایسا ربط ضبط پیدا ہوتا ہے کہ ایک آیت کی وحدت سے ایک ہی مفہوم نکل سکتا ہے تو غامدی صاحب خود وصیت کی ایک آیت سے ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۸ء تک تین مختلف مفہوم کیسے بیان کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نہ فرقان ہے نہ میزان بلکہ یہ صرف چیستان ہے غامدی صاحب کے اس طرزِ عمل کی توجیہہ امام لیث بن سعد کے اس خط میں مستور ہے جو ابن شہاب زہری کی روایتوں کے بارے میں امام مالک کے ابن شہاب زہری کی روایتوں کے بارے میں امام مالک کے نام لکھا گیا ہے وکان یکون من ابن شہاب اختلاف کثیرہ اذ القیناۃ واذا کاتبہ بعضنا فربما کتب فی الشیٔ الواحد علی فضل رایہ وعلمہ بثلاثۃ انواع ینقص بعضھا بعضاً ولا یشعر بالذی مضٰی من رأیہ فی ذلک الامر فھو الذی یدعونی الیٰ ترک ما انکرت ترکی ایاہ [تاریخ یحییٰ بن معین الدوری ۱۰۹/۴] اور ہم لوگ جب ابن شہاب سے ملتے تھے تو بہت سے تضادات سامنے آتے اور ہم میں سے کوئی جب ان سے لکھ کر دریافت کرتا تو علم وعقل میں فضیلت کے باوجود ایک ہی چیز کے متعلق ان کا جواب تین طرح کا ہوا کرتا تھا جن میں سے ایک دوسرے کا نقیض ہوتا اور انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس سے پہلے کیا کہہ چکے ہیں میں نے ایسی ہی چیزوں کی وجہ سے انھیں چھوڑا تھا جسے تم نے پسند نہیں کیا'' غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر روز جو دستاویزات لکھی جاتی ہیں جو فیصلے سنائے جاتے ہیں جو احکام جاری کیے جاتے ہیں جو اطلاعات بہم پہنچائی جاتی ہیں ان کے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال اگر پیدا ہو جائے کہ ان کے الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو ان میں سے ہر چیز بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گی چنانچہ یہ نری سوفسطائیت

ہے جس کے لیے علم کی دنیا میں ہرگز کوئی گنجائش نہیں پیدا کی جاسکتی[میزان ۳۳،۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کے اس نثر پارے کا اطلاق نہایت ادب کے ساتھ وصیت کی آیت کے معاملے میں ان کے قلم ذہن قلب سے لکھی گئی تین مختلف تفسیروں پر کیا جائے جو ایک دوسرے کی نقیض ہیں تو خود غامدی صاحب کا مقام ان کے اپنے الفاظ کے تحت ان کی نظر میں کیا ہونا چاہیے؟ نری سوفسطائیت، نری جہالت ـــ مفہوم اگر قطعی نہیں ہے تو ہر چیز بے معنی ہو کر رہ جائے گی کیا غامدی صاحب اپنے بارے میں اپنی شہادت اپنی عدالت میں قبول فرمائیں گے؟ اگر واقعی وہ اہل حق ہیں تو انھیں قرآن کی اس آیت کے مطابق اس شہادت کو قبول کر لینا چاہیے جس میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان والوحق کی شہادت دو خواہ اس کی زد خود تم پر تمہارے اقرباء پر پڑتی ہو ـــ یہ ایمان کا لازمی تقاضہ ہے اس کے بغیر کسی فرد کا ایمان معتبر نہیں رہتا ـــ اگر قرآن فرقان ومیزان ہوتا تو کم از کم فراہی صاحب غامدی صاحب اور اصلاحی صاحب ایک آیت کے ایک مفہوم پر اجماع کر لیتے ـــ امت کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں دبستان شبلی کی یہ تثلیث ابھی تک وحدت نہ بن سکی اور ایک آیت کے ایک فہم پر متفق ہونے کے بجائے اپنے ہی اصولوں کے محکم ترین ہونے کے دعووں کے باوجود یہ اقلیت اور ان کے فہم دین کی عقلیت خود ہی متفرق ومنتشر ہوگئی تو اب کونسی قوت ہے جو اس انتشار اور افتراق کا مداوا کر سکے ـــ

....

۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۷ء تک غامدی صاحب آیات حجاب پردہ سے متعلق موضوعات پر اجماع امت تعامل امت کے قائل تھے اب ان آیات کی نئی تفسیر پیش کرتے ہیں آیت کے دونوں مفہوم بالکل مختلف ہیں خود وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کی ایک آیت کا ایک ہی مطلب ہوسکتا ہے مگر خود کبھی دو کبھی چار کبھی سات مطالب بتاتے ہیں ـــ طاہر القادری صاحب نے جب قرآن کی ایک آیت کے کئی مطالب بتائے تو غامدی صاحب نے لکھا ''آدمی کی عربی خام ہو اور اس کا ادبی ذوق پست ہو یا وہ سیاق وسباق کی رعایت ملحوظ رکھے بغیر قرآن کی ہر آیت کو الگ الگ کر کے اس کا مدعا سمجھنے کی کوشش کرے تو یہ البتہ ممکن ہے۔لیکن عربیت کے کسی جید عالم اور قرآن کے کسی صاحب ذوق شارح سے یہ چیز کبھی صادر نہیں ہوسکتی۔ یہ کوئی علم نہیں کہ آپ کسی آیت کے دو یا تین یا اس سے زیادہ معنی بیان کردیں، بلکہ علم، درحقیقت یہ ہے کہ آپ تمام احتمالات کی نفی کر کے زبان وبیان کے قابل اعتماد دلائل کے ساتھ یہ ثابت کردیں کہ

آیت جس سیاق وسباق میں آئی ہے، اس میں اس کا یہی ایک مفہوم ممکن ہے، تاکہ اللہ کی یہ کتاب فی الواقع، ایک میزان کی حیثیت سے اس امت کے سامنے آئے اور اس طرح تشتت وافتراق کے بجائے یہ اس امت کے لیے فصلِ نزاعات اور وحدتِ فکر وعمل کا ذریعہ بنے''۔[برہان ۱۹۹۲، ص ۴۵، ۴۶] — غامدی صاحب کے ان اصولوں کی روشنی میں جو طاہر القادری صاحب کے لیے بیان ہوئے اگر ہم محترم غامدی صاحب کو پرکھیں تو کیا ہم نہایت ادب سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ عربیت کے جید عالم ہیں نہ قرآن کے صاحب ذوق شارح — اس طرح قرآن کی آیت کے کئی مطالب بتانے سے امت تشتت و افتراق میں مبتلا ہوگی قرآن وحدت فکر وعمل کا ذریعہ نہ بن سکے گا — ہم اس گستاخی پر معذرت خواہ ہیں۔

[۱۵] کلام عرب قرآن کے فہم کا واحد دروازہ ہے — ''قرآن کی ہدایت کے غوامض اور اسرار جو بھی ہوں ان کا دروازہ بہرحال زبان ہی ہے یعنی اس کے شہرستان معانی میں داخل ہونے کا صرف ایک دروازہ ہے وہ زبان ہے — اس کے اصول قواعد وہ ایک حاکم کی حیثیت سے موجود رہیں گے اگر کوئی شخص اس دروازے کے سوا کسی اور دروازے سے داخل ہونا چاہے گا تو ظاہر ہے وہ کہیں اور چلا جائے گا اس پر کتاب کا مدعا کبھی واضح نہ ہوگا زبان کے سوا کوئی اور دروازہ نہیں ہے۔[ص ۲۵ پرویز صاحب کا فہم قرآن خطاب غامدی مقدمہ خورشید ندیم ۲۰۰۴ء دارالتذکیر لاہور — مزید لکھتے ہیں — قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے پرویز صاحب نے جو اصول اپنائے ہیں ان میں سب سے اہم اور بنیادی چیز، زبان کے بارے میں ان کا تصور ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ قرآن مجید زبان کے لبادے میں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا مفہوم ہم میں سے ہر شخص پر القا کر دیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی وہ باللفظ نازل ہوا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قرآن امت کو بھی باللفظ ہی منتقل ہوا ہے۔ اب اس کی ہدایت کے غوامض اور اسرار جو بھی ہوں، ان کا دروازہ بہرحال زبان ہی ہے۔ یعنی اس کے شہرستانِ معنی میں داخل ہونے کا صرف ایک دروازہ ہے، اور وہ ہے زبان۔ زبان کے اصول، زبان کے قواعد جو کچھ بھی ہیں، وہ ایک حاکم کی حیثیت سے موجود رہیں گے۔ اگر کوئی شخص اس دروازے کے سوا کسی اور دروازے سے داخل ہونا چاہے گا تو ظاہر بات ہے کہ وہ کہیں اور چلا جائے گا اور اس پر کتاب کا مدعا کبھی واضح نہیں ہوگا کیونکہ وہاں جانے کا دروازہ تو وہی ہے، اس کے سوا کوئی اور دروازہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے فہم کے لیے اس کی زبان سے اعلیٰ سطح کی واقفیت ضروری ہے

[ص ۲۵] غامدی صاحب کے اس نثر پارے میں زبان عربی کو جو مقام و مرتبہ عطا کیا گیا ہے وہ رسالت مآبؐ، صحابۂ کرامؓ اور امت کی اجتماعی علمی روایت پر بھی مقدم ہے کیا زبان — لسان پیغمبر سے زیادہ معتبر اور اسوہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بہتر ہے۔ اگر قرآن صرف اور صرف باللفظ ہی منتقل ہوا ہے تو اہلِ کتاب کی تعریف میں لسان عربی کے مطابق تو صرف یہود و نصاریٰ آتے ہیں — غامدی صاحب نے میزان میں ہر جگہ یہود و نصاریٰ کو ہی اہل کتاب میں شامل کیا ہے ان کے دلائل پڑھیے: نبیؐ نے اسی کے پیش نظر جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے [۵۲۵، میزان ۲۰۰۸ء] اہل کتاب کے تمام گروہ اب جزیہ دے کر زیردست کی حیثیت سے جیئیں گے اگر یہ فیصلہ قبول نہ کیا تو پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کی تلواریں انہیں بھی جہنم رسید کر دیں گی [التوبہ ۹:۲۹] [ص ۵۴۷ میزان] یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ ان سے جزیہ لے کر پوری طرح محکوم زبردست بنا کر ہی اس سرزمین پر رہنے کی اجازت دی جائے [ص ۵۹۷، ۲۰۰۸ء] سورۂ توبہ کی آیت [۹:۲۹] میں حکم یہود و نصاریٰ دونوں کے بارے میں تھے انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا رسالت مآب کے رخصت ہونے کے بعد عذر اور نقض عہد کا رویہ اختیار کیا چنانچہ خیبر کے یہود اور نجران کے نصاریٰ کو عمر فاروقؓ کے لیے جزیرہ نمائے عرب سے جلاوطن کر دیا [ص ۵۹۹، ۲۰۰۸ء] — لیکن حضورؐ نے مجوسیوں کو بھی اہلِ کتاب قرار دے کر ان سے جزیہ وصول کیا تھا حضرت عمرؓ کو اس سلسلے میں تردد تھا۔ ولم یکن عمر یرید ان یاخذ الجزیۃ من المجوس [مسند احمد رقم ۱۵۹۳] لیکن ان کا تردد اس وقت دور ہو گیا جب فرمان رسالت ان کے سامنے آ گیا فروۃ بن نوفل اشجعی نے مجوس سے جزیہ پر اعتراض کیا تو مستور نے کہا تم رسول اللہؐ پر اعتراض کر رہے ہو فوراً توبہ کرو ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا پھر وہ انہیں حضرت علیؓ کے پاس لے گئے انہوں نے بتایا ان المجوس کان اھل الکتاب [ابو یوسف کتاب الخراج ۱۴۰ مصنف عبدالرزاق رقم ۱۰۰۲۹] پیغمبر کی حدیث اور سنت کے بغیر اہلِ کتاب کا مطلب صرف قرآن اور لغت عرب سے متعین نہیں ہو سکتا غامدی صاحب کے ساختہ اس اصول کی زد رسالت مآب پر بھی پڑتی ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ تو پہلے ہی فرما چکے ہیں ''قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر نازل ہوا ہے اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا دین میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیات بنات ہی کی روشنی میں

ہوگا [ص ۲۵، میزان ۲۰۰۸ء] لہٰذا رسالت مآبؐ اہل کتاب کی قرآنی اصطلاح میں وسعت پیدا کرنے کے لیے مجاز ہی نہیں تھے نعوذ باللہ اس اصول کے تحت غامدی صاحب کی سنتوں کی فہرست سے عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور اذان کی سنتوں کو بھی حذف کرنا پڑے گا کیوں کہ ان تینوں کے بارے میں حکم تو رسالت مآب نے دیا ہے اللہ نے ان تینوں کے بارے میں ہدایات کب اور کس ذریعے سے دیں وحی خفی کے غامدی صاحب قائل نہیں وحی جلی میں اس کا ذکر نہیں سنت کی تعریف پر عیدیں پوری نہیں اترتیں لہٰذا ان تینوں کو سنت سے خارج کر دیا جائے غامدی صاحب کے فلسفے کی رو سے ارتداد کی سزا کے حوالے سے عورت کو رسالت مآب کا عطا کردہ استثناء بھی قابل اعتراض ہے کیونکہ سورۂ توبہ میں مشرکین جزیرۃ العرب کے قتال میں عورت و مرد میں فرق نہیں کیا گیا اسی طرح اہل کتاب کے جزیہ دینے میں عورت کو استثناء نہیں دیا گیا — غامدی صاحب کے مطابق ارتداد کی سزا صرف بنی اسمٰعیل کے لیے تھی لیکن رسالت مآب نے اس حکم میں تخصیص کر کے اسے عورتوں کے لیے ساقط کر دیا نعوذ باللہ رسالت مآبؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی فرمائی اہل کتاب فہرست میں مجوس کو شامل کرنا اور مرتد عورت کو استثناء دینا جناب رسالت مآب کا ذاتی عمل نہیں ہے یہ منصب رسالت کا فریضہ ہے جسے تبین بھی کیا جاتا ہے سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآن مجید خاموش ہے بجائے خود ماخذ قانون ہے رسالت مآبؐ کا ہر وہ فیصلہ جس کی تصحیح و ترمیم یا تردید قرآن حکیم نے نہیں کی اللہ تعالیٰ کی تائید سے ہی قابل عمل ہوتا ہے وما ینطق عن الھویٰ کا یہی مفہوم ہے کہ رسالت مآبؐ کے زبان سے نکلنے والا ہر حرف ہر فیصلہ اذن ربی سے نکلتا ہے رسول کو عصمت انہی معنوں میں حاصل ہوتی ہے کہ ان کا ہر قول حکم فعل حجت ہوتا ہے اگر غامدی صاحب سنت کی اس تعریف کو درست تسلیم کرتے جسے وہ ۱۹۹۸ء تک درست مانتے تھے تو یہ اشکالات پیدا نہ ہوتے غامدی صاحب برہان میں لکھ چکے ہیں سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآن مجید خاموش ہے بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے [ص ۴۱، برہان ۲۰۰۶ء] سنت قرآن مجید کے بعد دین کا دوسرا قطعی ماخذ ہے ہمارے نزدیک یہ اصول ایک نا قابلِ انکار علمی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے محمدؐ کے احکام و ہدایات قیامت تک کے لیے اسی طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح خود قرآن واجب الاطاعت ہے محمدؐ صرف خدا کے نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے بعد آپ کا کام ختم ہو گیا رسول کی حیثیت سے آپ کا ہر فعل قول بجائے خود قانونی سند و حجت کی حیثیت رکھتا ہے آ کا یہ مقام خود

قرآن نے بیان کیا ہے اس لیے سنت کی اس قانونی حیثیت کو چیلنج کرنا ممکن نہیں ہے قرآن نے غیر مبہم الفاظ میں فرمایا ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے امرونہی کی بے چوں و چراء تعمیل کی جانی چاہیے وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا [۶۴:۴] [ص ۳۸، برہان، ۲۰۰۶ء المورد لاہور] غامدی صاحب سنت کی اس تعریف پر عمل پیرا ہوتے تو اہل کتاب کے تعین، وصیت کی حقیقت، حجاب کے متعلقات، وغیرہ کے سلسلے میں انہیں پیچ در پیچ راستوں اور لغت کی گلیوں سے گزرنا پڑتا اور ان کا ہر اگلا بیان پچھلے بیان کی تردید اور تنسیخ پر مبنی نہ ہوتا یہ سنت کے طے شدہ راستے کو ترک کرنے کے نتیجے میں انھیں ہر مرتبہ اپنا موقف تبدیل کرنا پڑتا ہے اور بار بار اس نئے موقف کی عقلد ید منطقی لسانی تعبیرات نظم کلام کے نام پر پیش کرنا پڑتی ہیں — غامدی صاحب کے اس اصول کی مزید تفصیلات کے لیے میزان کا باب اصول ومبادی کا مطالعہ کیجیے یعنی نص کا تعین فہم ادراک صرف کلام عرب لغت عرب منسوخ شدہ صحف ساوی اور شعر جاہلیت پر منحصر ہو گیا حتیٰ کہ احادیث، اقوال صحابہ بھی قرآن کی زبان سمجھنے کے لیے بہت زیادہ کفایت نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں ''قرآن مجید کے بعد یہ زبان حدیث نبوی اور آثار صحابہ کے ذخائر میں ملتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ روایت بالمعنی کی وجہ سے ان ذخائر کا بہت تھوڑا ہی حصہ ہے جسے اب زبان کی تحقیق میں سند و حجت کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے یہ افصح العرب والعجم اور فقہاے صحابہ کی زبان ہے [ص ۱۷، ۱۸، میزان ۲۰۰۸ء] اس دعوے سے یہ معلوم ہوا کہ صرف رسالت مآب کی فصاحت و بلاغت سند تھی صحابہ سے روایت بالمعنی ملی — لہٰذا صحابہ کی زبان زبان کی تحقیق میں سند و حجت نہیں دوسرے یہ کہ صحابہ کی روایت بالمعنی صحابہ کے الفاظ کے بجائے دوسروں کے الفاظ میں ملی یعنی عربوں کا حافظہ بھی قابل اعتبار نہیں بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی وہ اس سے آگے بڑھ کر فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لغت وادب کے ائمہ اس بات پر ہمیشہ متفق رہے ہیں کہ قرآن کے بعد یہی [کلام عرب] کلام ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور جو صحت نقل اور روایت باللفظ کی بناء پر زبان کی تحقیق میں سند و حجت کی حیثیت رکھتا ہے [ص ۱۹، ۲۰۰۸ء] حدیث اور اقوال صحابہ تو نہ دین میں حجت ہیں اور نہ ہی قرآن کے الفاظ ولغت کی تحقیق میں — حالانکہ کلام عرب بھی حافظے کے ذریعے منتقل ہو کر طویل عرصے بعد کتابوں میں منتقل ہوا حافظے سے کاغذ تک اس منتقلی کے طویل سفر کے دوران تو عربوں کا حافظہ شک وشبہ سے بالاتر رہا لیکن حدیث کے معاملے میں اہل

عرب کا حافظہ غامدی صاحب کے لیے قابل اعتبار نہیں رہا — حالانکہ میزان میں ہی غلطی سے غامدی صاحب نے اصلاحی صاحب کا ایک حوالہ درج کیا ہے جس کی زد غامدی صاحب پر پڑتی ہے'' برعکس اس کے جو لوگ احادیث و آثار کو سرے سے حجت ہی نہیں مانتے وہ اپنے آپ کو اس روشنی ہی سے محروم کر لیتے ہیں جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قیمتی روشنی ہے میں صحیح احادیث کو تمام تر قرآن ہی سے ماخوذ و مستنبط سمجھتا ہوں [ص ۵۶، میزان ۲۰۰۸ء] اصلاحی صاحب کے اس اصول کا اطلاق غامدی صاحب پر کیجیے وہ قرآن کے الفاظ کے فہم کے لیے قرآن کے بعد صرف کلام عرب پر اعتماد کرتے ہیں جبکہ اصلاحی صاحب احادیث و آثار کو قران کے بعد سب سے قیمتی روشنی سمجھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ لغت عرب کلام عرب قرآن کا ظنی ماخذ ہے یا قطعی ماخذ؟ اگر ظنی ہے اور یقیناً ظنی ہے کہ یہ قرآن نہیں ہے تو امام اصلاحی لکھتے ہیں ''تفسیر کے ظنی ماخذوں میں سب سے اشرف اور سب سے زیادہ پاکیزہ چیز ذخیرہ احادیث ہے [ص ۵۶، میزان ۲۰۰۸ء] ظنی ماخذات میں اصلاحی صاحب نے سب سے پہلے احادیث کو اشرف ماخذ کے طور پر قبول کیا غامدی صاحب کہتے ہیں کہ صرف لغت عرب اور صرف صحف سماوی ہی اشرف ماخذات ہیں ان کے بعد احادیث وہ بھی ہر مقام کی تشریح کے لیے نہیں — اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ اگر احادیث کی صحت پر اطمینان ہو تو تفسیر میں ان کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو اہمیت سنت متواترہ کی بیان ہوئی ہے لیکن ان کی صحت پر اس طرح کا اطمینان نہیں کیا جا سکتا [ص ۵۶، میزآن ۲۰۰۸ء] اصلاحی صاحب سنت متواترہ کو دین کا ماخذ سمجھتے ہیں غامدی صاحب اس کا صاف انکار کرتے ہیں لیکن اس بنیادی اختلاف کے بعد جس سے حصول دین کا طریقہ مشکوک ہو جاتا ہے وہ اصلاحی صاحب سے کامل انحراف کے باوجود بار بار امام اصلاحی کا حوالہ دیتے ہیں میزان کے چھ سو صفحات میں سے تین سو صفحات اصلاحی صاحب کے حوالوں سے بھرے ہوئے ہیں ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں کہ اسلامی تاریخ و تہذیب میں خاندان اور علمیت کی سند کے لیے شجرۂ نسب کی بہت اہمیت ہے جس طرح خاندانوں کے شجرے ہوتے ہیں علوم اسلامی کے حاملین کے علمی شجرے بھی ہوتے ہیں غامدی صاحب اسلامی علمیت کے ذخیرے سے استفادہ کرتے ہوئے کسی امام سے اپنی نسبت کو پسند نہیں کرتے لہٰذا وہ علمی دنیا میں بے نام و نسب گردانے جاتے لہٰذا انہوں نے امام فراہی و اصلاحی سے انحراف کے باوجود ان کا بار بار ذکر کر کے خود کو محروم النسب ہونے کے الزام سے بچایا ہے اگر یہ الزام نہ دیا جاتا تو وہ خود عہد حاضر میں

منصب امامت کے واحد حامل ہوتے اور ان سابقوں و لاحقوں سے نجات بھی پا لیتے۔ افسوس کہ تاریخ کا جبر کیسے کیسے نادر روزگار لوگوں کو دوسروں کی علمی پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے —[۱۶] اجماع امت (جو انتقال علم کا ذریعہ ہے)— سنت صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قران ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے [ص ۱۰ میزان طبع دوم سن ۲۰۰۲ء] امت کا اجماع جن اصطلاحات اور جن مسائل پر ہے غامدی صاحب اس کو حجت نہیں مانتے آخر کیوں؟ اجماع صرف پسندیدہ امور میں حجت کیوں؟ [۱۷] عقل — سارا دین عقل پر مبنی ہے ہماری عقل بہت سے دینی حقائق خود دریافت نہیں کر سکتی دین عقل سے ماوراء کوئی ہدایت عقل کو نہیں دیتا [ص ۱۶۵ تا ۱۶۷ مقامات سن ۲۰۰۸ء] ایمان بالغیب کا مطلب ہے کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے نہیں دیکھے جا سکتے انہیں محض عقلی دلائل کی بنا پر مان لینا [مقامات ص ۱۲۵، سن ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ عقل و دانش پہلی وحی ہے [ریحان افضال کا غامدی صاحب سے انٹرویو ہفت روزہ 'زندگی' ۱۱/۱ اکتوبر ۱۹۹۸ء] — [۱۸] صحابہ کا اجماع، صحابہ کا عملی اور قولی تواتر: قرآن صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے سنت صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے [ص ۱۰ میزان طبع ۲۰۰۲ء] [ص ۱۳، ۱۴، میزان ۲۰۰۸ء] — [۱۹] ایک اہم اصول رجوع کا منفرد طریقہ: تاریخ کا صرف انکار نہیں تاریخ کو ختم کرنے مٹانے کی کوشش — غامدی صاحب کی کتاب درس قرآن مقرر جاوید احمد غامدی مجلد ۸۰ صفحات مولود احمد شاہد صاحب نے المورد کے ذیلی ادارے میکرو وژن کی جانب سے شائع کی مگر اچانک کتاب بازار سے اٹھالی گئی کیوں؟ مقامات ۲۰۰۶ء کی اشاعت کے ساتھ بھی یہی ہوا اس کتاب کے تین حصے تھے اردو، عربی اور انگریزی — ماہنامہ ساحل نے عربی حصے کو اغلاط کا دفتر اور انگریزی حصے کی شاعری کو بڑے شعراء کی شاعری کا سرقہ ثابت کیا تو کتاب غائب کرادی گئی یہ بھی غامدی صاحب کا ایک اصول ہے — یہ ارتقاء تھا یا رجوع یا تاریخ کا انکار؟ اس کتاب کو بازار سے غائب کرانے کے بعد اسی نام سے نئی کتاب مقامات کے نام سے طبع کی گئی کتاب کا حجم بدلا گیا سرورق پر تصویر لگائی گئی عربی انگریزی حصے غائب کیے گئے کتاب صرف اردو میں ہے غامدی صاحب کی انگریزی عربی دانی کی حقیقت واضح ہوگئی جس سے عربی انگریزی حصے نکال دیے گئے اور اس پر لکھا گیا طبع اول سن ۲۰۰۸ء — لطف کی بات یہ ہے کہ ۲۰۰۸ء کے مقامات میں غامدی صاحب کا ۲۰۰۷ء کا ایک مضمون ص ۲۸ پر درج ہے جس میں لکھا ہے کہ "برہان، مقامات اور خیال و

خامہ شائع ہو چکی ہیں، ص ۲۹ پر اس مضمون کی تاریخ اشاعت ۲۰۰۷ء درج ہے یہ اشراق میں ۲۰۰۷ء میں شائع ہو چکا ہے جبکہ جس کتاب ''مقامات'' میں یہ مضمون درج ہے اس پر لکھا ہے طبع اول ۲۰۰۸ء اس سے غامدی صاحب کا انوکھا اصول سامنے آتا ہے التباس پیدا کر دینا —— [۲۰] ایک اہم اصول اپنی تاریخ کا خود انکار —— غامدی صاحب کی کتاب قانون معیشت ۱۹۹۷ء میں المورد نے شائع کی تو اس کے آخر میں ان کی کتابوں کی فہرست میں الاشراق [عربی] الملک —— الناس [زیر طبع] کا اشتہار دیا گیا اس سے پہلے غامدی صاحب کی کتاب قانون دعوت جو ۱۹۹۶ء میں المورد نے شائع کی اس کے آخر میں درج تصانیف میں الاشراق [عربی] الفاتحہ [زیر طبع] کا اشتہار دیا گیا تھا لیکن مقامات ۲۰۰۸ء کے ص ۲۷، ۲۸ پر غامدی صاحب نے اپنی تصانیف زیر طبع، زیر تسوید، مجوزہ کی جو فہرست اپنے قلم سے تحریر کی ہے اس میں عربی تفسیر الاشراق کا ذکر سرے سے غائب ہے یہ رویہ بھی فکر غامدی کا ایک اہم اصول ہے اپنی ہی تاریخ، تصنیف تحریر کا انکار —— اخراج —— ان کے فکر کے محاکمے میں یہ اصول کلیدی اہمیت رکھتا ہے جب عربی زبان میں کتاب لکھ لی گئی ۱۹۹۶ء میں طباعت کے لیے تیار تھی تو ۲۰۰۸ء میں کتابوں کی فہرست سے اس کو کیوں نکال دیا گیا؟ کیا اس تفسیر کی عربی اس قابل نہ تھی یا ساحل نے غامدی صاحب کی ۲۶ صفحات کی عربی تحریر میں جو سینکڑوں غلطیاں بتائی تھیں ان کا خوف تھا [۲۱] اصول: اپنے ارتقاء کا انکار یا اخفاء —— میزان حصہ اول کی پہلی اشاعت ۱۹۸۵ء میں —— میزان کی دوسری اشاعت اپریل ۲۰۰۲ء میں تیسری اشاعت ۲۰۰۸ء میں آئی چوتھی اشاعت ۲۰۰۸ء لیکن کسی پر یہ درج نہیں ہے کہ یہ اضافہ شدہ، ترمیم شدہ، تبدیل شدہ نظر ثانی شدہ اشاعت ہے درمیان میں میزان کے مختلف مباحث اور ابواب میزان حصہ اول، اصول و مبادی، قانون معیشت، حدود و تعزیرات، قانون سیاست، کے نام سے ۱۹۸۵ء، سے لے کر ۲۰۰۵ء تک وقتاً فوقتاً شائع ہو رہے ہیں اور ہر کتاب و کتابچے میں موقف پارۂ سیماب کی طرح بدلتا رہا لیکن کسی اشاعت پر نظر ثانی شدہ اشاعت درج نہیں کیا گیا —— میزان ۲۰۰۸ء میں ''خاتمہ'' کے زیر عنوان وہ لکھتے ہیں ''کتاب کی تصنیف کا کام میں نے ۱۹۹۰ء میں کسی وقت شروع کیا تھا وہ سترہ سال بعد پایہ تکمیل کو پہنچ گیا [ص ۶۵۳، میزان ۲۰۰۸ء] یہ بیان درست نہیں کیونکہ میزان کی تصنیف کا کام ۱۹۷۸ء میں شروع ہو چکا تھا اور اس کا پہلا حصہ میزان حصہ اول کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے —— میزان حصہ اول کا دیباچہ شعبان ۱۴۰۵ ہجری میں لکھا گیا اس کتاب میں نبی اور رسول، قانون

میراث، رجم کی سزا پر شامل مضامین کی اکثر عبارتیں میزان طبع ۲۰۰۲ء اور میزان ۲۰۰۸ء میں شامل ہیں لہٰذا میزان کی آغاز تحریر کی تاریخ ۱۹۹۰ء بیان کرنا غامدی صاحب کی غلط بیانی ہے ان کی غلط بیانی کا ایک اور ثبوت غامدی صاحب کے شایع کردہ کتابچے سیاست و معیشت سے ملتا ہے یہ کتابچہ غامدی صاحب نے دارالاشراق ۹۸(۲) ای ماڈل ٹاؤن لاہور سے ۱۹۹۳ء میں جاری کیا اس میں دو مضامین شامل ہیں قانون سیاست اور قانون معیشت یہ دونوں مضامین بعض ترامیم کے ساتھ میزان طبع ۲۰۰۲ء اور طبع ۲۰۰۸ء میں بھی شامل ہیں قانون سیاست والے مضمون کے اختتام پر غامدی صاح نے اس کی تاریخ تحریر ۱۹۷۹ء درج کی ہے [جاوید غامدی سیاست و معیشت ۱۹۹۳ء دارالاشراق لاہور] میزان ۲۰۰۸ء کا باب قانون سیاست جب وہ ۱۹۷۹ء میں لکھ چکے اور خود اسے ۱۹۹۳ء میں اپنے ادارے سے شائع کر چکے تو اب یہ موقف کہ انہوں نے میزان لکھنے کا آغاز ۱۹۹۰ء سے کیا درست بیان نہیں —— اس غلط بیانی کی ضرورت کیوں پیش آئی یہ مفصل موضوع ہے جس پر انشاء اللہ کبھی گفتگو کی جائے گی —— ''خاتمے'' میں لکھتے ہیں میں بار بار اسے دیکھتا اور اس میں ترمیم واضافہ کرتا رہا اس کے جو ابواب وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں انھیں دیکھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ کوئی غلطی اگر مجھ پر واضح ہوگئی ہے تو اگلے ایڈیشن میں بغیر تردد کے میں نے اس کی اصلاح کر دی [ص ۶۵۳ میزان ۲۰۰۸ء] یہ اعتراف بھی حقیقت کی جزوی ترجمانی ہے میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء میں اور میزان اپریل ۲۰۰۲ء میں مکمل کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن غامدی صاحب نے دانستہ اس کا تذکرہ خاتمے میں نہیں کیا یہ علمی روایت کے خلاف رویہ ہے جو ابواب وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ان میں کسی باب کی نئی اشاعت پر کبھی یہ تحریر نہیں کیا گیا کہ یہ ترمیم شدہ یا اضافہ شدہ اشاعت ہے یہ رویے مصنف کی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتے ہیں دین پیش کرنے والے کو اخلاقی طور پر اعلیٰ درجے پر فائز ہونا چاہیے —— اس رویے کی توجیہہ ہم نہیں کر سکتے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ رویہ آخر کیوں؟ —— حالانکہ میزان کی ہر اشاعت پہلی سے یکسر مختلف ہے ان کی آراء بدلتی رہتی ہیں اصولاً اس کا اظہار کتاب پر کرنا اخلاقی تقاضہ ہے لیکن غامدی صاحب نے یہ اخلاقی تقاضہ کبھی پورا نہیں کیا دنیا کا ہر مصنف کتاب میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کرتا ہے تو اس پر نظر ثانی شدہ اشاعت کی عبارت لازماً تحریر کرتا ہے علمی دنیا میں یہ مسلمہ اصول ہے لیکن غامدی صاحب زندگی کے ہر شعبے میں اپنے اصول خود بناتے ہیں اور انہی کو درست سمجھتے ہیں اس رویے کو ہم غامدی صاحب کے ایک اصول کے طور پر قبول کرتے ہیں جس سے ان

کے علمی رویے کا اندازہ ہوتا ہے ——[۲۲] تاریخ کا انکار—— اور صرف اپنے منبع علم ——فہمِ نفس پر کامل اعتبار و اعتماد—— یہ غامدی صاحب کا اہم ترین اصول ہے ——[۲۳] قدیم صحف: قرآن کے اسالیب واشارات [یہود و نصاریٰ کی تاریخ وغیرہ وغیرہ] سمجھنے کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے [میزان، ص۵۲، طبع دوم ۲۰۰۲ء] اصلاحی صاحب کا موقف ہے کہ یعنی قرآن صرف قرآن یا صاحب قرآن یا صحابہ کرام یا امت کے اجماع اور اسلامی علمیت کے مصادر کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا قرآن جیسے غیر محرف صحیفے کا فہم جس کی حفاظت کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے اس کا درست فہم محرف صحائف پر ہی منحصر ہے اور ان منسوخ صحائف سے ملنے والا فہم ہی معتبر ہے اس کے سوا اعتبار کا کوئی ذریعہ نہیں کیا صحابہ نے فہم قرآن اس طرح حاصل کیا؟ اس ذریعے سے مستشرقین کو جو فہم حاصل ہوگا کیا وہ تام ہوگا —— جبکہ غامدی صاحب کا اصول جو پرویز صاحب پر نقد کرتے ہوئے انہوں نے وضع کیا یہ تھا کہ پرویز کی تعبیر نہ علمی ہے نہ امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق ہے [پرویز صاحب کا فہم قرآن ص۴۸ دارالتذکیر ۲۰۰۴ء] ——[۲۴] تاریخ—— غامدی صاحب کی سنت ابراہیمی کا علم تواتر عملی سے منتقل ہوتا ہے —— لیکن بدعات بھی اس ذریعے یعنی تواتر عملی سے ملتی ہیں پھر سنت و بدعت میں فرق کیسے کیا جائے گا اس کا جواب غامدی صاحب کے پاس ہے —— تاریخ —— ''بے شک بہت سی بدعات رائج ہوگئیں بے عملی بڑھ گئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی ساری تاریخ کا واضح ریکارڈ موجود ہے کیا اصل ہے کیا اختراع ہے یہ سب امت کے سامنے ہے [ماہنامہ اشراق نومبر ۱۹۹۹ء ص۵۳] یہاں غامدی صاحب کا ماخذ تاریخ ہے —— میزان میں اصول ومبادی کے تحت قرآن کے فہم کے لیے ان کا دسواں اصول تاریخ کا پس منظر ہے وہ لکھتے ہیں ''دسویں چیز یہ ہے کہ قرآن کی ایک تاریخ ہے قرآن کی یہ تاریخ بالکل مسلم ہے اور اس کے طالب علموں سے تقاضہ کرتی ہے پہلی یہ کہ نزول قرآن کے خطہ ارض کی تاریخ پر آدمی کی نظر ہونی چاہیے اس دور کی تاریخ سے جس حد تک بھی وہ میسر ہو سکتی ہو پوری طرح استفادہ کیا جائے اس سے قرآن کے بعض اشارات کو سمجھنے اور بعض غوامض کو کھولنے میں حقیقت یہ ہے کہ بڑی مدد ملتی ہے [میزان ۵۵، ۲۰۰۸ء] قرآن کے بعض غوامض تاریخ کے بغیر نہیں کھل سکتے مگر حدیث وسنت کی غوامض کھولنے کے لیے کوئی اہمیت نہیں اللہ کا دین جو کلام اللہ سے مل رہا ہے وہ تاریخ کا محتاج ہے حدیث و سنت جو رسالت مآب ﷺ کی ہستی سے براہِ راست مل رہی ہے اس کی تاریخ کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں ہے ——

غامدی صاحب فہم قرآن کے لیے تاریخ کو ماخذ مانتے ہیں — لیکن غامدی صاحب خبر واحد کو ماخذ دین نہیں مانتے — تو سوال یہ ہے کہ تاریخ کو کیسے اور کیوں ماخذ مان لیتے ہیں — [۲۵] سنت آدمؑ اور سنت غراب — غامدی صاحب کی سنتوں میں قربانی اور تدفین بھی شامل ہے لیکن یہ تو حضرت آدم کے زمانے کی سنت ہے قرآن نے ہابیل قابیل کے حوالے سے دونوں سنتوں کا ذکر کیا ہے۔[المائدہ: ۲۷ تا ۲۹] اسے سنت ابراہیمی کہنا کیا درست ہے؟ لہٰذا سنت آدمؑ بھی غامدی صاحب کا ماخذ ہے۔ تدفین کی سنت تو حضرت آدم سے بھی ثابت نہیں قرآن کی نص کی رو سے تدفین کا طریقہ کوے نے ابن پیغمبر کو سکھایا اسے سنت انبیاء کے بجائے سنت غراب کہا جا سکتا ہے غامدی صاحب نے عیدین کو بھی سنتوں کی فہرست میں شامل کیا ہے جبکہ نماز عید الفطر اور نماز عید الاضحیٰ امت رسول یا ہاشمیؐ سے خاص ہیں ان کا سنت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں۔ تدفین کی سنت تو قابیل نے کوے سے سیکھی تھی — [۲۶] تمام انبیاء کا عمل ماخذ سنت — غامدی صاحب کی سنتوں میں نکاح، طلاق، نماز۔ زکوٰۃ، روزہ، حج، حیض و نفاس میں عورت سے اجتناب، حیض و نفاس کے بعد غسل، غسل جنابت، جانور کا تزکیہ شامل ہیں — لیکن یہ تمام اعمال، سنتیں تمام انبیاء کے یہاں موجود تھیں یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے یہاں یہ اعمال یا سنتیں موجود نہ ہوں وہ ان احکامات سے فطرت کے مطالبات سے بالکل نابلد ہوں اگر یہ تمام کام حضرت ابراہیم سے شروع ہوئے تو اس سے پہلے انبیاء کیا کرتے تھے؟ یہ انبیاء پر تہمت ہے۔ آل عمران [۳:۸۴] قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَعِیۡسٰی وَالنَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّہِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ وَنَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ — غامدی صاحب اس کا جو جواب دیتے ہیں وہ مبہم ہے [انبیاء کے پیغام میں] اس میں حکمت بھی تھی اور شریعت بھی حکمت تغیرات سے بالا تھی شریعت کا معاملہ یہ نہ تھا وہ ہر قوم کی ضرورتوں کے لحاظ سے اترتی رہی سیدنا ابراہیم کی نبوت میں پوری انسانیت کے لیے اس کے احکام بہت حد تک ایک واضح سنت کی صورت اختیار کر گئے [ص ۴۴، میزان ۲۰۰۸ء] نکاح، طلاق، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، حیض و نفاس، غسل، تدفین جنازہ، قربانی ضرورتیں نہیں تھیں کہ ان کے لیے شریعت اترتی یہ تو امور لازم تھے انسان زندہ ہوگا تو مرے گا نکاح کرے گا پاک ہوگا، قربانی، روزہ، نماز، زکوٰۃ، ازلی ابدی عبادات میں اس میں ضرورت کا کیا سوال یہ احکامات تدریجاً بھی نہیں نازل ہو سکتے لہٰذا یہ کہنا کہ ابراہیمؑ کی نبوت میں احکام واضح سنت کا صورت اختیار کر گئے محض سخن سازی ہے آثار و قرائن حقائق

اس کی نفی کرتے ہیں —— اگر یہ تمام اعمال تمام انبیاء کی امتوں میں جاری تھے تو ان کو سنت ابراہیمی قرار دینا بے معنی استدلال ہے —— قرآن واضح کرتا ہے کہ روزے رسالت مآب کی امت سے پہلے بھی دیگر امتوں پر فرض تھے عیسائی، یہودی اور دنیا کی اکثر اقوام کے یہاں روزہ آج بھی رکھا جاتا ہے لہٰذا اسے سنت ابراہیمی نہیں کہا جاسکتا قرآن روزے کو فرض قرار دے رہا ہے غامدی صاحب اسے سنت کہہ رہے ہیں کیا غامدی صاحب کا علم اور فہم قرآن پر قاضی ہے؟۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ [۲:۱۸۳] نکاح، طلاق، مہر، و دیگر معاشرتی احکامات کا تعلق صرف رسالت مآب ﷺ کی امت سے نہیں آپ سے پہلے کی امتوں پر بھی انہی معاشرتی احکامات کا اطلاق ہوتا تھا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمۡ وَیَہۡدِیَکُمۡ سُنَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَیَتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ، وَاللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ وَیُرِیۡدُ الَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الشَّہَوٰتِ اَنۡ تَمِیۡلُوۡا مَیۡلًا عَظِیۡمًا [۴:۲۶،۲۷] یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اللہ کی رضا یہی ہے کہ وہ امت مسلمہ پر ان طریقوں کو واضح کردے اور انہی طریقوں پر اس امت کو چلائے جن کی پیروی اس امت سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء صلحا کرتے تھے یہ گزرے ہوئے صلحاء گزشتہ امتوں سے ہی تعلق رکھتے تھے صلوٰۃ اور زکوٰۃ بھی مسلمانوں اور سنت ابراہیمی کا تسلسل نہیں بنی اسرائیل سے پہلے اور بعد دیگر امتیں بھی صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی پابند تھیں قرآن نے صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو فرض قرار دیا ہے اس کے بغیر کوئی ایمان معتبر نہیں لیکن غامدی صاحب صلوٰۃ و زکوٰۃ کو سنت قرار دیتے ہیں کیا غامدی صاحب کی دلیل قرآن پر قاضی ہے؟۔ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ [۲:۸۳] ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ...... نماز پڑھنا، زکوٰۃ دیتے رہنا —— اس سے معلوم ہوا کہ نماز و زکوٰۃ تمام انبیاء کے یہاں موجود تھے دین کا نظم صلوٰۃ زکوٰۃ اور آخرت کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتا الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ [۲۷:۳]، [۳۱:۴]، وہ جو نماز پڑھتے زکوٰۃ دیتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں فی الحقیقت یہی ہدایت پر ہیں اور نجات پانے والے ہیں اُولٰٓئِکَ عَلٰی ہُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ [۳۱:۵]، حضرت شعیبؑ کی قوم بھی نماز پڑھتی تھی لہٰذا ان پر اعتراض یہ کیا گیا کہ اے شعیبؑ تمہاری نماز تمھیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم باپ دادا کی روش ترک کردیں اور اپنے مال اپنی مرضی سے خرچ کرنے کے بھی مجاز نہ ہوں قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ

تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ [۱۱:۸۷] لہٰذا نماز سنت شعیبؑ بھی ہے قوم بنی اسرائیل کے یہاں اقامت صلوٰۃ کا نظام قائم تھا لیکن غلامی کے بعد انہوں نے اس نظام کا بھی خاتمہ کر دیا لہٰذا حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں کو قبلہ ٹھہرا اور نماز قائم کرو وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَ اَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ [۱۰:۸۷] قوم بنی اسرائیل کو حالت غلامی سے نکلنے کے لیے تعلیم بالغان اور عقلی علوم کے ادارے بنانے کے بجائے خالق کو یاد کرنے والا ادارہ بنانے کا حکم دیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ نماز انبیاء کا طریقہ ہے اور اس کی تائید ان تمام آیات سے ہوتی ہے جہاں استخلاف فی الارض کے بعد صلوٰۃ، زکوٰۃ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم عام ہے یہ فرض ہے اور ہر رسول ہر اسلامی حکومت وخلافت کا اصل کام یہی ہے لہٰذا اللہ نے جس پیغمبر کو بھی خلافت ارضی دی اس نے ان چاروں احکامات کا نفاذ کیا—— [۲۶] خبر —— سنت ابراہیمی کو حضرت ابراہیم سے ثابت کرنے کا واحد ذریعہ غامدی صاحب کے پاس اب خبر ہے خبر سے ان کے نزدیک سنت ثابت نہیں ہوتی بلکہ تواتر عملی سے ثابت ہوتی ہے لیکن وہ خبر کے سوا سنت کو کسی اور طریقے سے تواتر عملی سے عہد ابراہیمی سے لے کر عہد رسالت مآبؐ تک —— ثابت نہیں کر سکتے جب اس کا ثبوت تواتر عملی سے ممکن ہی نہیں تو پھر خبر ہی —— واحد ثبوت ہے لیکن غامدی صاحب اسے ماخذ نہیں مانتے تو پھر ماخذ سنت ابراہیمی خبر کے سوا کیا رہ جاتا ہے؟ سنت ابراہیمی کو اخذ کرنے کا طریقہ براہِ راست مشاہدہ ہے یا بالواسطہ مشاہدہ —— بالواسطہ مشاہدہ ہی خبر ہے لہٰذا غامدی صاحب کا ماخذ خبر ہے مگر وہ اسے تسلیم نہیں کرتے —— [۲۸] ملت —— غامدی صاحب نے سورہ النحل کی آیت ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ [۱۶:۱۲۳] سے ثابت کیا ہے کہ سنت دین ابراہیمی کی روایت اس ذریعے سے ملی ہے یہاں لفظ ملت ہے جسے وہ سنت کے مترادف، متبادل کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور اس آیت سے کبھی ۲۷ سنتیں کبھی ۴۰ سنتیں کبھی ۳۰ سنتیں نکال رہے ہیں علم تفسیر کے ذخیرے میں ملت سے کسی نے سنت کا استنباط نہیں کیا مگر غامدی صاحب کا ماخذ ملت ابراہیم ہے جس کی قائم کردہ سنتوں اور اوامر ونواہی کا کوئی براہِ راست مشاہدہ ان کے پاس نہیں ہے نہ ہی حضرت ابراہیم کا کوئی صحیفہ محفوظ ہے —— [۲۹] صحابہ اور امت کا اجماع —— سنت کے ثبوت کے لیے شرط غامدی صاحب کے پاس صحابہ اور امت کا اجماع ہے مگر سنت کی تعریف متعین کرنے کے لیے وہ ان

ہی شرائط کا اطلاق نہیں کرتے سنت کی تعریف وہ خود متعین فرماتے ہیں — اور اپنی تخلیق کردہ سنت کے لیے بلا دلیل صحابہ اور امت کا اجماع ثابت کرتے ہیں اسی لیے سنتوں کی تعداد مستقل بدلتی رہتی ہے — [۳۰] وحی — غامدی صاحب کے نزدیک وحی ماخذ ہے تمام صحف سماوی اور قرآن بھی قرآن آخری وحی ہے دین وحی سے اخذ ہوتا ہے یعنی سنت وحی ہے کہ دین یہی ہے اگر دین سنت ابراہیمی ہے تو کیا حضرت ابراہیم کی وحی سے یہ ثابت ہے؟ اگر سنت ابراہیمی وحی نہیں ہے تو پھر وہ دین کیسے بن گئی جبکہ اس میں تدفین اور قربانی تو حضرت آدم کی سنت ہے دیگر سنتیں دیگر انبیاء کی مشترکہ ہیں حدیث ہے ختنہ، زیر ناف کے بال مونڈنا، بغل کے بال صاف کرنا، ناخن کاٹنا، مونچھیں پست رکھنا فطرت ہے۔ الفطرت خمس اوخمس [صحیح بخاری کتاب اللباس] غامدی صاحب کے اصول سے تو یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے کی تمام امتیں فطرت سے نابلد تھیں اور ان کے یہاں نکاح، طلاق، پاکیزگی، طہارت، نفاست کا تصور سرے سے مفقود تھا — [۳۱] نقل کرنے کا ذریعہ ماخذ دین ہے — دین کو نقل کرنے کے ذرائع دین نہیں سمجھے جاتے روایت، نقل، تواتر عملی دین کو پہنچانے اور منتقل کرنے کے ذرائع ہیں نہ کہ دین کا معیار یا خود دین — غامدی صاحب ذریعے Medium کو ماخذ Source بلکہ دین قرار دیتے ہیں — تواتر عملی قرن اول کے لیے نہ دین ہے نہ ذریعہ کیونکہ صحابہ رسول اللہ کے ہر عمل کا راست مشاہدہ کر رہے تھے اللہ کے رسول کا ایک عمل جو صحابہ کے لیے خبر واحد سے ثابت تھا غامدی صاحب کے نزدیک دین ہی نہیں ہے تو کیا صحابہ قرن اول میں دین پر عمل نہیں کر رہے تھے — دین تو وہ ہے جسے اللہ اور اس کا رسول دین قرار دیں چاہے وہ خبر واحد سے ملے یا قولی یا عملی تواتر سے — ذریعہ دین نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے بلکہ اللہ اور رسول کے حکم سے کوئی چیز دین بنتی ہے اور پھر بعد میں کسی ذریعے سے پہنچتی ہے دین پہلے موجود ہوتا ہے پھر ذریعہ وجود میں آتا ہے ذریعے کو دین بنانا عجیب بات ہے — [۳۲] سنت ثابتہ — اس مرحلے سے پہلے اس طرح کی بیعت ایک بدعت ہے جس کا کوئی ثبوت نبیؐ کی سنت ثابتہ اور سیرت طیبہ سے پیش نہیں کیا جا سکتا [برہان ص ۱۲۸ اہل بیعت کی خدمت میں ۱۹۹۲ء دارالاشراق لاہور] — [۳۳] سنت — سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآن مجید خاموش ہے بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے [برہان، ص ۴۱، ۲۰۰۶ء المور، لاہور] — [۳۴] قول پیغمبر — دین میں کوئی چیز اگر ثابت کی جا سکتی ہے تو قرآن مجید کے بعد پیغمبر کے قول سے ہی ثابت کی جا سکتی ہے — [برہان، ص ۱۹۲،

۲۰۰۶ء، المورد، لاہور]—[۳۵] حدیث وسنت اور اخبار احاد—قرآن مجید کے بعد دوسرا ماخذ حدیث وسنت ہے—اس کا بیشتر حصہ تواتر عملی کے ذریعے سے ملا ہے باقی جو کچھ حصہ اخبار احاد کی صورت میں تھا اس میں جتنا کچھ ہمارے اسلاف نے قابل اعتماد پایا وہ سب انھوں نے منتقل کر دیا ہے اس میں سے کوئی چیز چھپا کر نہیں رکھی دین میں یہی دو چیزیں اصل حجت ہیں [مقامات ص ۱۳۵، ۲۰۰۶ء، المورد، لاہور]—مقامات، طبع اول، ص ۱۷۸، ۲۰۰۸ء، المورد، لاہور]—[۳۶] سنت ماخذ دین نہیں ہے—غامدی صاحب ۱۹۹۸ء میں کراچی کے محاضرات میں کہہ چکے ہیں کہ ''سنت میں اختلاف کیسے ہو جائے گا جیسے ہی اختلاف ہو جائے گا وہ چیز سنت ثابت نہیں ہوگی اجماع اس کی لازمی شرط ہے جیسے قرآن میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا سنت میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا [ساحل مئی ۱۹۹۸ء، ص ۵۸] غامدی صاحب کے اس اصول کے تحت اب سنت ماخذ نہیں ہے کیونکہ اس میں اختلاف ہو گیا ہے پہلے سنت متواترہ پھر سنت ثابتہ، پھر حدیث وسنت، پھر سنت وحدیث، پھر سنت پھر سنت قرآن پر مقدم پھر ان کی تعداد کبھی ۲۷، کبھی ۲۶، کبھی ۱۷، کبھی کچھ—[۳۷] اس امت کے اہل تحقیق میں کوئی اختلاف نہیں کہ لغت عرب کی تحقیق کے لیے سب سے پہلا ماخذ خود قرآن مجید ہے اور اس کے بعد یہ حیثیت پیغمبرؐ اور صحابہ کے ان اقوال کو جو روایت باللفظ کے طریقے پر منتقل ہوئے ہیں اور پھر ادب جاہلی کو حاصل ہے۔[ص ۱۷۲، برہان ۲۰۰۶ء] ۲۰۰۶ء کی عبارت میں لغت عرب کی تحقیق کے لیے قرآن کے بعد احادیث اور اقوال صحابہ کی حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے یہ فراہی اور اصلاحی صاحب کی تقلید میں ہے تفصیل کے لیے مجموعہ تفاسیر فراہی مطالعہ کیجیے لیکن ۲۰۰۸ء میں میزان میں حضرت کا ارتقاء ہو گیا فرماتے ہیں ''قرآن کے بعد یہی کلام ہے [لغت وادب] جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور جو صحت نقل اور روایت بالفظ کی بناء پر زبان کی تحقیق میں سند وحجت کی حیثیت رکھتا ہے [ص ۱۹، میزان ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کی بددیانتی یہ ہے کہ لغت وادب کے ائمہ کے اس اتفاق کو [ص ۱۹، میزان ۲۰۰۸ء] جس سے غامدی صاحب کو کامل اتفاق ہے انہوں نے دانستہ طور پر حضرت عمر کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش ہے لہٰذا لکھتے ہیں کہ ''قرآنؐ کے بعد یہی کلام ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یہ سند وحجت کی حیثیت رکھتا ہے [ص ۱۹، میزان ۲۰۰۸ء] یہی بات حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے منبر سے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہی ''تم لوگ اپنے دیوان کی حفاظت کرتے رہو گمراہی سے بچے رہو گے لوگوں نے پوچھا ہمارا دیوان کیا ہے فرمایا اہل جاہلیت کے

اشعار قال شعرا الجاحلیہ فان فیہ تفسیر کتا بکم و معانی کلامکم [ص ۱۹ میزان ۲۰۰۸ء] حضرت عمر ہرگز یہ نہیں کہا کہ حدیث سنت اقوال صحابہ پر لغت و ادب عرب کے ائمہ کو سند و حجت حاصل ہے یہ غامدی صاحب کا اخذ واستنباط ہے حضرت عمر نے جب حضرت زیدؓ کے پاس قاصد بھیجا کہ ان کے کلام کو محفوظ کر لیں تو انھوں نے جواب دیا تھا جب سے اللہ کا کلام سنا ہے اپنا کلام بھول گیا ہوں حضرت لبید سبعہ معلقہ کے شعراء میں سے تھے ان کے ایک شعر پر فرزدق جیسا شاعر سجدہ ریز ہو گیا تھا لیکن بسید فرماتے ہیں ما کنت لاقول شعراً بعد ان علمنی اللہ البقرہ و آل عمران کیا حضرت بسید نے اس اثاثے کو گم کر دیا جس پر تفسیر اور الکتاب کا انحصار تھا؟ یہ ہے سوچنے کا اصل سوال — واقعات کو ان کے تاریخ تناظر سے الگ کر کے ان کی روح سے منقطع کر کے اپنے مطالب اخذ کرنا غیر علمی رویہ ہے — لغت و ادب اور شعراء کے دواوین حافظے سے کاغذ پر مدتوں بعد جا کر منتقل ہوئے ہیں یہ ظنی ماخذ سند و حجت ہے لیکن قرآ ن کے فہم کے لیے حدیث اور اقوال صحابہ نہ سند نہ حجت یہ سوال بھی اہم ہے کہ — لغت عرب کی تحقیق کے لیے پیغمبر اور اقوال صحابہ حجت ہیں لیکن سنت کی تعریف متعین کرنے کے لیے ان ماخذات میں سے کوئی ماخذ حجت نہیں ہے بلکہ قرآن بھی حجت نہیں ہے صرف غامدی صاحب کا فہم حجت ہے۔ وصیت کی آیت میں وصیت کا مفہوم غامدی صاحب نے پہلے پیغمبر اقوال صحابہ اجماع تعامل امت سے اخذ کیا ۲۰۰۸ء میزان میں اس فہم میں بنیادی تغیر پیدا ہوا اور پھر اسی سال ۲۰۰۸ء میں مقامات میں وصیت کا فہم لغت عرب سے سابقہ موقف کے بالکل برعکس متعین فرما دیا گیا — [۳۸] دانش پہلی وحی ہے — دانش خود دین کا حصہ ہے یوں کہیں کہ دانش اللہ تعالیٰ کی پہلی وحی ہے اور قرآن دوسری وحی جن معاملات میں دانش کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے وہاں وہ کام کرے گی [ص ۵۸ افضال ریحان کو غامدی صاحب کا انٹرویو، اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب دار التذکیر لاہور، ۲۰۰۴ء] — [۳۹] نیا اصول: نبوت لازمی نہیں — ہم اگر کسی تہذیب کو اسلامی کا نام دینے پر اصرار ہی کریں تو میرے نزدیک ہر وہ تہذیب اسلامی ہے جو تین اساسات کو قبول کر لے رسم و روایات رہن سہن اور آداب و شعائر کے ہزار اختلافات کے باوجود ہم اسے اسلامی تہذیب قرار دے سکتے ہیں، ۱۔ وحدت الہٰ، ۲۔ وحدت آدم، ۳۔ عمل کی بنیاد پر ابدی مکافات — یہ تینوں چیزیں کسی تہذیب میں روح کی طرح سرایت کرتی ہیں اور معمولی تغیرات کے ساتھ انسانی تمدن کے ہر قالب کو قبول کر لیتی ہیں ہر تمدن نے اپنے ذوق اور حوصلے کے مطابق ان اساسات کو لے کر اپنے مخصوص قالب میں

ڈھال لیا اسی وجہ سے کسی خاص قالب یا کسی خاص سانچے کو اسلامی تہذیب نہیں قرار دینا چاہیے۔ یہ اساسات عرب تمدن میں ایک خاص اسلوب میں نمایاں ہوئیں بعد میں عجم کے اختلاط نے ان کے اندر کچھ اور رنگ پیدا کیے اور اب اگر مغربی تہذیب بھی ان اساسات کو قبول کر لیتی ہے تو معمولی تغیرات کے ساتھ یہ تہذیب بھی اسلامی تہذیب قرار پا سکتی ہے [ص ۶۴، انٹرویو افضال ریحان کو، ص ۶۴ محولہ بالا] جناب غامدی نے اسلامی تہذیب سے رسالت محمدیؐ کو خارج فرمادیا — رسالت پر ایمان کے بغیر التوحید کی تصدیق اور تحصیل و معرفت کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ حقیقت توحید اور احکامات الٰہی رسالت کے بغیر انسانوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں رسالت کی عدم موجودگی میں الکتاب جواب قیامت تک رسالت کا قائم مقام ہے اور اس کی حامل امت جو اس الحق کی عملی علامت ہے اس کے بغیر دین کا درست فہم کسی تک کیسے منتقل ہو سکتا ہے غامدی صاحب کا یہ نقطۂ نظر ان کی کتاب میزان کے پہلے باب اصول و مبادی پر خط تنسیخ پھیر دیتا ہے —

[۴۰] دین کا ماخذ ذاتی مطالعہ و تحقیق ہے: دین صرف اسلام ہے کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے میں نے اس دین کو جو کچھ سمجھا ہے وہ اپنی اس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ [جاوید غامدی، میزان، طبع پنجم، فروری، ۲۰۱۰ء، المورد لاہور، دیباچہ صفحہ ندارد]

غامدی صاحب نے ۱۹۸۵ء میں اپنی کتاب میزان حصہ اول شائع کی تو اس میں سنت کی وہ تعریف بیان کی جس پر اجماع امت ہے ۱۹۹۷ء تک وہ سنت کی اس تعریف کو درست سمجھتے تھے ۱۹۹۸ء میں اچانک انہوں نے سنت کی ایک بالکل نئی تعریف پیش کی جو امت میں سلف سے لے کر خلف تک کسی

نے بیان نہیں کی۔ حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی بھی سنت کی اس تعریف کو تسلیم نہیں کرتے جو غامدی صاحب نے میزان میں بیان کی ہے تو سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب کی سنت کی تعریف جس کے سات اصول انہوں نے مبادی تدبر سنت کے تحت تخلیق فرمائے ہیں اس کا ماخذ کیا ہے؟ کیا سنت کی یہ تعریف قرآن نے بیان کی ظاہر ہے بالکل نہیں۔ غامدی صاحب نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کو سنت قرار دیتے ہیں جبکہ قرآن نے اسے فرض قرار دیا ہے یعنی غامدی صاحب قرآن کے بیان کو درست تسلیم نہیں کرتے۔ کیا غامدی صاحب کی سنت کی تعریف رسالت مآبؐ کی کسی حدیث سے متعین ومقید ہوتی ہے تو غامدی صاحب ایسی کوئی حدیث بھی پیش نہیں کر سکے۔ تو غامدی صاحب نے سنت کی اس تعریف کا تعین کیسے کیا اس کے اصول کہاں سے اخذ کیے۔ اس کا جواب انہوں نے دیباچے میں دیا ہے ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے حاصل شدہ دین کا فہم۔ دوسرے معنوں میں غامدی صاحب کے ماخذات دین میں اصل ماخذ ان کے مطالعات وتحقیقات کا حاصل فہم ہے۔ یعنی ماخذ دین غامدی صاحب خود ہیں جبکہ غامدی صاحب کا اصول یہ ہے کہ دین وہ ہے جو پیغمبر بتائیں کہ یہ دین ہے کوئی عالم کوئی فقیہہ کوئی اجماع یہ نہیں کہہ سکتا کہ دین یہ ہے غامدی صاحب دین سنت سے اخذ کرتے ہیں جب غامدی صاحب کی بیان کردہ سنت کی تعریف نہ قرآن سے ثابت ہے نہ حدیث سے تو یہ دین کیسے ہوسکتی ہے۔ [ساحل حوالہ]

[۴۱] دین اور ماخذات دین مستقلاً قابل اصلاح ہیں: غامدی صاحب نے میزان میں اجماع و قیاس کو ماخذات دین میں شامل نہیں کیا اور لکھا کہ صرف قرآن وسنت دین کے ماخذ ہیں اور سنت بھی صرف وہ ماخذ ہے جس کی تعریف غامدی صاحب نے میزان میں خود متعین کی ہے اس کے سوا کوئی چیز سنت نہیں ہے مگر میزان کے خاتمے میں وہ لکھتے ہیں تاہم یہ ایک انسان کا کام ہے جو کسی طرح غلطیوں سے مبرا نہیں ہوسکتا میں بار بار اسے دیکھتا اور اس میں ترمیم و اضافہ کرتا رہا ہوں۔ اس کے [میزان کے] جو ابواب وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں انھیں دیکھ کر ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ زبان و بیان علم ونظر اور اخذ و استنباط کی کوئی غلطی اگر مجھ پر واضح ہوگئی ہے تو اگلے ایڈیشن میں بغیر کسی تردد کے میں نے اس کی اصلاح کردی ہے میں ہر وقت اس کے لیے تیار ہوں کہ آئندہ بھی اس کتاب کی جو غلطی مجھ پر واضح ہوجائے گی یا واضح کردی جائے گی ان شاءاللہ اس کی اصلاح کروں گا [ص ۶۵۰، میزان اشاعت پنجم، ۲۰۱۰ء، المورد، لاہور] یعنی غامدی صاحب دین کے نام پر جو کچھ دین میزان میں قرآن وسنت کے عنوان سے پیش

کرر ہے ہیں وہ ہمہ وقت قابل اصلاح ہے ماضی میں بار بار وہ اس دین کی تصحیح ترمیم اور اس میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔اس دین کے بیان میں ان سے جہاں جہاں غلطی ہوئی اس کی اصلاح انہوں نے ماضی میں بھی کی اور آئندہ بھی اس دین میں اصلاح وترمیم کے لیے وہ تیار ہیں۔وہ علم جس میں اصلاح ترمیم تصحیح واضافہ قطع وبرید، کتر بیونت، کانٹ چھانٹ، کا عمل مسلسل جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا وہ دین کیسے ہوسکتا ہے اور ایسے دین پر عمل کب ہوگا جب کہ وہ اصلاح وترمیم کے دور سے مستقل گزر رہا ہے۔

[۴۲] دین کے ماخذ سنت کی تعریف قطعی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے: غامدی صاحب نے سنت کی تعریف کے سلسلے میں یہ اصول میزان کے صفحہ ۱۴ پر بیان فرمایا ہے کہ سنت یہی ہے کہ اس میں سنتوں کی تعداد انہوں نے ۲۶ بیان کی ہے۔[میزان ص ۱۴ اشاعت ۲۰۱۰ء المورد، لاہور] میزان ۲۰۰۸ء میں سنتوں کی تعداد ۲۷ تھی اس میں رسوم وآداب کے تحت نومولود کے کان میں اذان اور اقامت بھی سنت میں شامل تھی جو ۲۰۱۰ء میں سنت کی فہرست سے خارج ہوگئی۔غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے قرآن ہی کی طرح ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں [میزان ص ۱۴، ۲۰۱۰ء المورد لاہور] یہی موقف انہوں نے میزان ۲۰۰۸ء میں بیان کیا تھا اب میزان کے خاتمے میں لکھ رہے ہیں یہ ایک انسان کا کام ہے جو کسی طرح غلطیوں سے مبرا نہیں اخذ واستنباط کی کوئی غلطی اگر مجھ پر واضح ہوگئی ہے تو اگلے ایڈیشن میں میں نے اس کی اصلاح کردی آئندہ بھی اس کتاب کی جو غلطی مجھ پر واضح ہوجائے گی یا واضح کردی جائے گی میں اس کی اصلاح کروں گا[ص ۶۵۰ محولہ بالا] یہ اصول ص ۱۴ پر سنت کی قطعیت کے اصول سے متصادم ہے اگر سنت قطعی ہے اس کی تعداد قطعی ہے اس میں بحث ونزاع کی کوئی گنجائش نہیں تو پھر اصلاح کا اعلان عام کیوں کیا جارہا ہے۔غامدی صاحب کا اصول نمبر ۴۱ اور اصول ۴۲ دونوں متضاد ہیں یا پہلا اصول غلط ہے یا دوسرا اصول غلط ہے یہ تضاد ہے دین میں کوئی تضاد نہیں ہوسکتا۔

[۴۳] سنت سے متعلق حقائق بالکل قطعی ہیں: غامدی صاحب نے یہ اصول میزان ۲۰۱۰ء اشاعت پنجم کے ص ۶۲ پر بیان کیا ہے لکھتے ہیں نبیؐ نے [سنت] اسے قرآن ہی کی طرح پورے اہتمام سے جاری فرمایا ہے ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے سنت سے متعلق یہ حقائق چونکہ بالکل قطعی ہیں [ص ۶۲ میزان ۲۰۱۰ء، ۲۰۰۸ء] مگر اسی میزان میں غامدی صاحب سنت کی مختلف تعریفیں اور مختلف تعداد بھی بیان کر رہے ہیں ص ۱۴ پر سنتوں کی تعداد ۲۶ بیان کی ہے اور لکھا ہے یہ قطعی ہیں۔ مگر اس کے بعد اسی میزان میں نماز، زکوٰۃ، خطبہ عیدین، خطبہ جمعہ، مہر وغیرہ سے متعلق کئی سنتوں کا اضافہ کر دیا ہے ان سنتوں کی تفصیل آپ آگے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

[۴۴] نماز کا طریقہ [سنت نہیں] شریعت میں مقرر کیا گیا ہے ص ۳۳۰

[۴۵] سجدہ سہو سنت ہے [ص ۳۲۱ میزان ۲۰۱۰ء پر ایک نئی سنت سجدہ سہو ہے لکھتے ہیں نماز کے اعمال و اذکار میں کوئی غلطی یا شبہ غلطی ہو جائے تو یہ سنت قائم کی گئی ہے کہ نماز کے آخر میں دو سجدے کر لیے جائیں۔ [ص ۳۲۱ قانون عبادات میزان ۲۰۱۰ء]

[۴۶] نماز کے اعمال اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہیں یہ اصول ص ۲۸۸ پر بیان ہوا ہے۔

[۴۷] سنت دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبیؐ نے تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری کیا۔ [ص ۱۴، میزان ۲۰۰۸ء] اس اصول کے تحت عیدین اور تدفین سنت کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں کیونکہ عیدین سنت ابراہیمی نہیں ہے سنت رسول ہاشمیؐ ہے غامدی صاحب خود لکھتے ہیں "عید الفطر اور عید الاضحیٰ یہ دونوں تہوار نبیؐ نے اللہ کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کے لیے مقرر فرمائے [میزان ص ۶۴۸، ۲۰۰۸ء]۔ تدفین کی سنت ابن آدم یعنی ابن پیغمبر کو کوے کے ذریعے معلوم ہوئی۔ اس سنت کا ماخذ ایک پرندہ ہے لہٰذا یہ کہنا کہ سنت پیغمبر جاری کرتے ہیں غامدی صاحب کے اصول کے تحت غلط اصول ہے کیونکہ پرندہ پیغمبر نہیں ہے سنتوں کے اصول میں کہیں یہ درج نہیں ہے کہ کوے کی اتباع کرنا اور اس کے بتائے ہوئے طریقے کو امت میں جاری کر دینا سنت ہے اور قربانی کی سنت تو سنت الٰہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں پہچان کے لیے یہ سنت خود ہی قائم کی تھی لہٰذا قربانی سنت آدمؑ نہیں بلکہ سنت الٰہی ہے لہٰذا سنت الٰہی سنت ابراہیمی کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکتی۔ قربانی کا ثبوت ابن آدمؑ سے ملتا ہے لہٰذا یہ سنت آدم ہے۔

[۴۸] دین وحی خفی سے بھی ملتا ہے رسوم و آداب کے باب میں عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کو غامدی صاحب نے تہوار لکھا ہے لکھتے ہیں یہ دونوں تہوار نبیؐ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کے لیے مقرر فرمائے ہیں [ص ۶۴۵، میزان ۲۰۱۰ء] رسول اللہ کو اللہ کی ہدایت ظاہر ہے وحی خفی سے ملی ہو گی لہٰذا وحی خفی بھی ماخذ دین ہے کیونکہ اسی سے غامدی صاحب ماخذ دین سنت کی دو سنتیں عیدین کے تہوار اخذ کر رہے ہیں۔ مگر ماخذات دین میں انہوں نے صرف قرآن و سنت کو شامل کیا ہے۔

[۴۹] عیدین کا خطبہ سنت ہے: غامدی صاحب نے ص ۱۴ پر سنتوں کی فہرست میں عیدین کے دو خطبوں کو شامل نہیں کیا مگر ص ۶۴۶ پر لکھتے ہیں ''ان میں جو اعمال سنت کے طور پر جاری کیے گئے ہیں اور جن کی تفصیلات ہم اسی کتاب میں قانون عبادات کے تحت بیان کر چکے ہیں وہ یہ ہیں ۲۔ نماز اور خطبہ [ص ۶۴۶ میزان ۲۰۱۰ء] لیجیے ایک اور سنت کا اضافہ ہو گیا۔

[۵۰] سنت فرض ہے، سنت رسوم و آداب ہے، سنت سنن فطرت ہے، سنت قرآن پر مقدم ہے، سنت تہوار ہے، سنت ذکر و شکر تفریحات کا نام ہے، سنت انبیاء کے مقرر کردہ رسوم و آداب ہیں، سنت نقل ہے اور نقل و عقل میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا پورے یقین سے مانا جائے کہ عقل و نقل میں منافات نہیں ہو سکتی، سنت علمی نوعیت کی چیز بھی ہو سکتی ہے [ص][سنت شریعت ہے حکمت نہیں] لیکن شریعت کا معاملہ یہ نہ تھا وہ ہر قوم کی ضرورتوں کے لحاظ سے اترتی رہی ابراہیم کی نبوت میں پوری انسانیت کے لیے [شریعت/سنت] کے احکام بہت حد تک ایک واضح سنت کی صورت اختیار کر گئے [ص ۴۴] سنت کا تدریجی ارتقاء ہوا رسول اللہ نے اپنے ارشادات میں انبیاء علیہم السلام کی اس سنت پر عمل پیرا ہونے کی تاکید فرمائی [ص ۶۴۱] یعنی سنت انبیاء سے ملتی ہے اور خبر واحد سے ہی ملتی ہے سنن فطرت انبیاء علیہم السلام نے تزکیہ و تطہیر کے لیے ان کی اہمیت کے پیش نظر دین کا لازمی جزو بنا دیا ہے [ص ۶۴۳]۔ غامدی صاحب کا یہ موقف میزان ۲۰۱۰ء کے ص ۱۴، ص ۴۷، ص ۶۵، ص ۴۴، ص ۴۸۴، ص ۶۳۹، ص ۶۴۶ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے [۵۱] قعدہ سنت ہے: لہٰذا سنت صرف یہی ہے کہ ہر نماز کی دوسری اور آخری رکعت میں نماز پڑھنے والا دو زانو ہو کر قعدہ کے لیے بیٹھے اس کے علاوہ کوئی چیز بھی اس موقع پر سنت کی حیثیت سے مقرر نہیں کی گئی [ص ۶۰، میزان ۲۰۱۰ء]

[۵۲] سنت کی حیثیت دین میں مستقل بالذات ہے رسول اللہ اسے پورے اہتمام پوری حفاظت اور پوری

قطعیت کے ساتھ انسانوں تک پہنچانے کے مکلّف تھے اخبار احاد کی طرح اسے لوگوں کے فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کہ وہ چاہیں تو اسے آگے منتقل کر دیں اور چاہیں تو نہ کریں قرآن ہی کی طرح سنت کا ماخذ بھی امت کا اجماع ہے [ص ۶۰ میزان] سنت بھی قرآن ہی کی طرح پوری قطعیت کے ساتھ متعین ہو جاتی ہے [ص ۶۱، میزان ۲۰۱۰ء] اگر یہ بات درست ہے تو میزان حصہ اول ۱۹۵۸ء میں سنت کی تعریف اجماع امت سے اخذ کی گئی میزان ۲۰۰۲ء میں سنتوں کی تعداد چالیس ہے میزان ۲۰۰۸ء میں سنتوں کی تعداد ۲۷ ہے میزان ۲۰۱۰ء میں سنتوں کی تعداد ص ۱۴ پر چھبیس ہے اس کے بعد مختلف صفحات پر سنتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جس کی تفصیل آپ پچھلے اصولوں کے ذیل میں پڑھ رہے ہیں اگر غامدی صاحب کا یہ اصول صحیح ہے کہ سنت قرآن کی طرح متعین ہے اور قطعی ہے تو قرآن کی آیات ۶۶۶۶ معین اور قطعی ہیں مگر غامدی صاحب کی سنتوں کی تعداد قرآن کی طرح نہ متعین ہے نہ قطعی ہے بلکہ مسلسل بدل رہی ہے اس کے باوجود ص ۱۴ پر فرما رہے ہیں کہ سنت قطعی ہے اس میں کسی بحث و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں مگر میزان کے ص ۶۵ پر فرما رہے ہیں کہ یہ میزان لکھنا ایک انسان کا کام ہے جو غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا غلطی واضح ہو گئی یا کر دی گئی تو اس کی اصلاح کر لوں گا تو غامدی صاحب کا میزان میں پیش کردہ دین نہ قطعی ہے نہ حجت ہے تو یہ دین کیسے ہے اسے دین کیوں تسلیم کیا جائے یہ تو غامدی صاحب کے اپنے اصولو ل کے منافی ہے۔

[۵۳] تواتر عملی حجت ہے: نماز کے یہ اعمال اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہیں [ص ۲۸۸ میزن ۲۰۱۰ء]

[۵۴] نماز میں امام کی غلطی پر متنبہ کرنا سنت ہے: امام کی غلطی پر مقتدی متنبہ کر سکتے ہیں اس کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ سبحان اللہ کہیں گے عورتیں ہاتھ پر ہاتھ مار کر متنبہ کر دیں اگر وہ اپنی آواز بلند کرنا پسند نہ کریں [ص ۳۲۲ میزان ۲۰۱۰ء]

[۵۵] نماز کے آداب نہ سنت ہیں نہ فرض: غامدی صاحب نے ص ۳۲۳ پر نماز کے آداب بیان کیے ہیں مگر یہ نہیں بتایا کہ ان کی حیثیت فرض ہے یا سنت ہے لہٰذا یہ آداب نہ فرض ہیں نہ سنت ان کو ادا نہ کرنے سے یقیناً نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

[۵۶] بالغ عورتیں اوڑھنی لیے بغیر نماز پڑھیں تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کرتے: غامدی صاحب نے قانون عبادات میں نماز کے آداب کے تحت اصول دس بیان کیا ہے کہ بالغ عورت کی اوڑھنی کے بغیر نماز

قبول نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بالغ عورت کے لیے کم از کم نماز میں اوڑھنی اوڑھنا فرض یا سنت ہے مگر غامدی صاحب عورت کے اوڑھی اوڑھنے کو نہ سنت سمجھتے ہیں نہ فرض مقامات ۲۰۰۸ء میں وہ اسے ایک رسم قرار دیتے ہیں جو محض تہذیبی علامت ہے ایک مسلمان عورت کو اسے اختیار کرنا چاہیے۔

[۵۷] شریعت قرآن وسنت سے الگ چیز ہے: جمعہ کی نماز کے لیے جو طریقہ شریعت میں مقرر کیا گیا وہ یہ ہے [ص ۳۳۰ میزان محولہ بالا] غامدی صاحب کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت قرآن وسنت سے اخذ نہیں ہوتی کیونکہ جمعہ کی نماز کا طریقہ قرآن میں نہیں بتایا گیا اور غامدی صاحب نے سنتوں کی فہرست میں جو چھبیس سنتوں پر مشتمل ہے جمعہ کی نماز کا طریقہ سنت سے بیان نہیں کیا۔تو شریعت کہاں سے اخذ ہوگئی قرآن سے یا سنت سے یا حدیث سے یا تواتر عملی سے یا اجماع سے۔غامدی صاحب نے نماز جمعہ کا جو طریقہ شریعت سے بتایا ہے وہ نہ قرآن میں موجود ہے نہ سنت میں۔

[۵۸] عیدین کی نماز کا خطاب اور امامت مسلمانوں کے ارباب حل وعقد ہی کریں گے اس نماز کے لیے سنت یہی ہے: غامدی صاحب نے یہ اصول میزان ۲۰۱۰ء کے ص ۳۳۲ پر بیان کیا ہے ص ۱۴ پر سنتوں کی فہرست میں اس سنت کو شامل نہیں کیا گیا لہٰذا ایک اور سنت کا اضافہ ہو گیا۔

[۵۹] زکوٰۃ کا قانون [قرآن وسنت سے نہیں] شریعت سے ملا ہے شریعت دین کا ماخذ ہے: زکوٰۃ کا قانون اجماع اور تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہے فقہا کے اختلافات سے قطع نظر کر کے اگر شریعت میں اس کی اصل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اسے ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں [ص ۳۴۷ میزان محولہ بالا] سوال یہ ہے کہ شریعت کہاں سے اخذ ہوگی قرآن سے سنت سے حدیث سے اخبار احاد سے خبر واحد سے تاریخ سے تعامل امت سے تعامل صحابہ سے اجماع امت سے مسلک جمہور سے غامدی صاحب نے میزان میں دین کے ماخذ شریعت پر خاص کلام نہیں کیا وہ قانون عبادات میں تمام احکامات شریعت سے اخذ کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت دین کا تیسرا ماخذ ہے۔جو قرآن وسنت سے ماورا ہے۔

[۶۰] زمین کی پیداوار کے معاملے میں زکوٰۃ کے لیے شریعت ماخذ قانون ہے اس معاملے میں وہی ضابطہ اختیار کرنا چاہیے جو شریعت نے زمین کی پیداوار کے لیے متعین کیا ہے [ص ۳۵۱ میزان]

[۶۱] روزہ فرض ہے میزان ص ۱۴ پر غامدی صاحب نے لکھا ہے کہ روزہ سنت ہے ص ۳۵۲ پر لکھتے ہیں تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا [ص ۳۵۲ میزان] روزے کی عبادت

رمضان کے مہینے میں لازم کی گئی ہے [ص ۳۵۴] روزے کا ماخذ مسلمانوں کا اجماع اوران کا عملی تواتر ہے [ص ۳۵۸] روزہ قدیم سنت ہے [ص ۳۵۸] اس سے امید ہے کہ اس کے یہ فرض روزے بھی کسی وقت اللہ ہی کے لیے خالص ہو جائیں گے [ص ۳۶۳] ایمان والوں پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا [ص ۳۶۵] قرآن نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ اسے فرض قرار دیا [ص ۳۵۸] قرآن جسے فرض قرار دے رہا ہے غامدی صاحب اسے سنت قرار دے رہے ہیں۔ یہ لکھنا کہ روزے کا ماخذ مسلمانوں کا اجماع اوران کا عملی تواتر ہے ایک لایعنی بات ہے اگر مسلمان روزہ نہ رکھیں تب بھی قرآن کی نص سے ثابت ہے کہ یہ فرض ہے جہاں قرآن کی نص موجود ہے اگر اجماع وتواتر عملی موجود نہ ہو تب بھی نص حجت ہے اور جن امور میں قرآن کی کوئی نص موجود نہ ہو اور احادیث میں اختلاف ہو وہاں اجماع یا تواتر عملی حجت ہے مثلاً عوت کا زیور پہننا تواتر عملی اوراجماع امت سے ثابت ہے لیکن علامہ ناصرالدین البانی نے عورتوں کے سونا استعمال کرنے کی ممانعت میں آنے والی حدیثوں کو صحیح قرار دیا ہے مگر امت نے ان کی اس رائے کو قبول نہیں کیا کہ اجماع خود حجت ہے امت کا اجماع کسی غلط کام پر نہیں ہوسکتا۔

[۶۲] آدمی اگر اپنے اجتہاد یا گمان کے مطابق کسی چیز کو دین وشریعت کا تقاضہ سمجھتا ہے تو اسی سے قطع نظر کہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم ہے یا نہیں اس کی خلاف ورزی اس کے لیے جائز نہیں: غامدی صاحب نے یہ اصول میزان ۲۰۱۰ء کے ص ۳۶۶ پر قانون عبادات کے تحت بیان کیا ہے ان کی کتاب میزان اجتہاد یا گمان سے اخذ واستنباط کردہ دین ہے لہٰذا غامدی صاحب پر لازم ہے کہ انہوں نے میزان میں جسے فی الواقع شریعت کا حکم سمجھا اس کی تقلید کریں انہوں نے قرآن وسنت کے بارے میں جو چھ اصول میزان میں طے کیے خود ان کی پیروی نہیں کر رہے ایسا کرنا ان کے اصول کے تحت جایز نہیں ہے جو فرد اپنے اصولوں کی خود پیروی نہیں کرتا کیا ہم اس سے دین لے سکتے ہیں میرے محترم غامدی صاحب امید ہے برا نہ مانیں گے۔

[۶۳] جان بوجھ کر روزہ توڑنے کا کفارہ ادا کرنا بہتر ہے لازم نہیں ہے: غامدی صاحب نے یہ اصول ص ۳۶۸ پر بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ ایک بڑا گناہ ہے مگر بڑے گناہ کے لیے کفارہ ادا کرنا صرف بہتر ہے لازمی فرض ضروری نہیں ہے اگر کوئی کفارہ ادا کرے تو وہی کفارہ ادا کرے جو ظہار کے لیے مقرر ہے

[۳۶۸]

شرائط نماز نہ قرآن میں ہیں نہ سنت میں نہ شریعت میں: غامدی صاحب نے شرائط نماز کے تحت تفصیلات میزان میں ص ۲۸۱ تا ۲۸۲ بیان کی ہیں مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کا ماخذ کیا ہے کیوں کہ یہ شرائط نہ قرآن میں ہیں نہ غامدی صاحب کی سنت کی تعریف میں نہ غامدی صاحب نے یہ وضاحت کی ہے کہ ان کا ماخذ شریعت ہے۔ جیسا کہ پہلے بعض امور میں وہ شریعت سے آداب شرائط لاتے ہیں مگر خود شریعت کہاں سے اخذ ہوگی اس بارے میں میزان خاموش ہے۔

[۶۴] نینداور بے ہوشی سے وضو نہیں ٹوٹتا: نینداور بے ہوشی خود ناقض وضو نہیں ہے لیکن اس میں چونکہ آدمی اپنے وضوع پر متنبہ نہیں رہتا اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ اس کے بعد بھی وضو لازماً کر لیا جائے [ص ۲۸۶ میزان محولہ بالا] اگر کوئی نیند اور بے ہوشی کے بعد وضو کیے بغیر نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جائے گی۔

[۶۵] مرض اور سفر کی حالت میں پانی موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی تیمّم کر سکتا ہے [ص ۲۸۶ میزان محولہ بالا]

[۶۶] نماز فرض ہے نماز مسلمانوں پر شب و روز میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے [ص ۳۰۶ میزان محولہ بالا] میزان کے ص ۱۴ پر نماز کو سنت قرار دیا گیا ہے۔ نماز کے پانچ اوقات کا تعین قرآن و سنت میں نہیں ہے معلوم نہیں غامدی صاحب نے پانچ مرتبہ کی شرط کہاں سے اخذ کی ہے۔

[۶۷] نماز کی فرض رکعتیں چھوڑنے پر قیامت میں مواخذہ ہوگا [فرض نمازوں] ان کے علاوہ باقی سب نمازیں نفل ہیں ان کے چھوڑ دینے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مواخذے کا اندیشہ نہیں ہے [ص ۳۱۰، میزان محولہ بالا]

[۶۸] ایک نئی سنت: قصر نماز سنت ہے۔ قصر نماز کی سنت یہ ہے کہ چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی جائیں گی دو اور تین رکعت والی نمازوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ [ص ۳۱۱، میزان محولہ بالا] سنتوں کی فہرست میں ایک نئی سنت کا اضافہ ہو گیا۔

[۶۹] ایک نئی سنت کا اضافہ: مسافر مقیم کا منیٰ میں قصر مزدلفہ و عرفات میں جمع اور قصر کرنا رسول کی قائم کردہ سنت ہے [ص ۳۱۲ محولہ بالا] غامدی صاحب نے سنت کی فہرست میں ایک اور سنت کا اضافہ کر دیا اور

اصول کی فہرست میں ایک نئے اصول کا۔

[۷۰] نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے [ص۳۱۲، میزان] غامدی صاحب میزان کے ص۱۴ پر نماز کو سنت قرار دیتے ہیں۔

[۷۱] باجماعت نماز اور مساجد کا قیام سنت ہے: انبیاء کے دین میں یہ سنت ہمیشہ سے قائم رہی ہے کہ تزکیۂ اجتماعیت کی غرض سے اس [نماز] کو جماعت کے ساتھ اور ممکن ہو تو کسی معبد میں جا کر ادا کیا جائے اسی مقصد سے نبیؐ نے یثرب پہنچ کر سب سے پہلے مسجد تعمیر کی اور مسلمانوں کی ہر بستی اور ہر محلے میں تعمیر مساجد کی روایت اس کے ساتھ ہی قائم ہوگئی۔[ص۳۱۳، ۳۱۴، میزان] غامدی صاحب نے میزان کے ص۱۴ پر صرف ۲۶ سنتوں کی فہرست دی تھی اب اس میں مزید دو سنتوں اور دو اصولوں کا اضافہ ہوگیا۔ غامدی صاحب یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ انبیاء کے دین میں معبد میں ہی عبادت کی اجازت تھی رسالت مآب کی امت کے لیے روئے زمین کو مسجد قرار دیا گیا یہ آپ کی فضیلت ہے فرمایا مجھے چھ باتوں میں نبیوں پر فضیلت دی گئی میرے لیے زمین کو مسجد بنایا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی [ص۱۴۳ میزان] غامدی صاحب اس عبارت کی تشریح میں لکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں ہی میں نہیں بلکہ روئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جاسکتی ہے اور پانی نہ ملے تو تیمّم کر کے وضوع اور غسل دونوں کی ضرورت بھی پوری کی جاسکتی ہے [۱۴۳]

[۷۲] عورتوں کا مسجد میں نماز کے لیے آنا سنت ہے لیکن نہ آئیں تو اس میں کوئی ہرج نہیں: غامدی صاحب نے یہ اصول میزان کے ص۳۱۵ پر بیان کیا ہے ص۱۴ پر سنتوں کی فہرست میں یہ سنت موجود نہیں ہے۔ ایک نئی سنت سامنے آ گئی۔

[۷۳] جمعہ کی اذان ہوتے ہی تمام مسلمان مردوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس اگر کوئی عذر نہ ہو تو اپنی مصروفیات چھوڑ کر نماز کے لیے حاضر ہو جائیں [ص۳۳۰] جمعہ کے دن مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ ظہر کی جگہ اسی دن کے لیے خاص ایک اجتماعی نماز کا اہتمام کریں [ص۳۳۰]۔ یعنی عورتوں کے لیے جمعہ کی نماز لازم ہے اور ان مردوں کے لیے بھی لازم ہے جو کسی عذر کی وجہ سے شرکت نہ کر سکیں عذر کی تعریف غامدی صاحب نے پیش نہیں کی جمعہ کی نماز یہاں (فرض) ہے غامدی صاحب نے ص۱۴ پر اسے سنت کہا ہے۔ جمعہ کی نماز کو سنت کی فہرست میں شامل نہیں کیا انھوں نے عیدین کی نماز کو بھی سنت میں

شامل نہیں کیا لیکن میزان میں رسوم اور رواج کے باب میں نماز عیدین کو سنت میں شامل کرلیا۔ چونکہ جمعہ کی نماز تمام انبیاء نے جاری کی لہٰذا غامدی صاحب کے اصول ومبادی سنت کے مطابق نماز جمعہ بھی سنت ہے وہ لکھتے ہیں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی تذکیر ونصیحت اور اجتماعی عبادت کے لیے انبیاء علیہم السلام کے دین میں اصلاً یہی دن مقرر کیا گیا [ص۳۴۳] اس سے ثابت ہوا کہ جمعہ کی نماز سنت ہے کہ انبیاء کا مشترکہ جاری کردہ عمل ہے مگر غامدی صاحب کی سنتوں کی فہرست سے خارج ہے—— انبیاء کے دین میں یہ سنت ہمیشہ سے قائم رہی ہے کہ تزکیہ اجتماعیت کی غرض سے اس کو [نماز کو] جماعت کے ساتھ اور ممکن ہو تو کسی معبد میں جا کر ادا کیا جائے [ص ۳۱۵] انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ تھی کہ تمام مسلمان [مرد وعورت] باجماعت نماز اور کسی معبد میں جا کر ادا کرتے تھے دیگر انبیاء کی شریعتوں میں نماز مخصوص عبادت گاہوں میں پڑھی جاتی تھی روئے زمین پر ہر جگہ نہیں پڑھی جاسکتی تھی [ص۱۴۳] رسالت مآب ؐ کی امت کی عورتوں کے لیے نماز کے معاملے میں دو سنتیں ہیں وہ نماز کے لیے مسجد میں آسکتی ہیں لیکن نہ آئیں تو اس میں کوئی ہرج نہیں [ص۳۱۶] مسجد میں عورت کا نماز پڑھنا بھی سنت ہے نماز کے لیے نہ آنا بھی سنت ہے۔ سنت غامدی صاحب کی نظر میں دین ہے تو دین میں باجماعت نماز پڑھنا اور نہ پڑھنا یکساں درجے کے کام ہیں یہ عجیب بات ہے لوگوں کو آپ نے متنبہ فرمایا ہے کہ وہ اگر جمعہ کے لیے نہیں آئیں گے تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی جائے گی اور وہ غافل ہو کر رہ جائیں گے [ص۳۴۳] دیگر انبیاء کی شریعتوں میں عورتوں کا باجماعت نماز پڑھنا اور جمعہ کے لیے مسجد میں آنا لازمی تھا رسالت مآب کی امت کی عورتوں کے لیے بھی جمعہ میں آنا لازم ہے خواہ انھیں کوئی عذر ہو کیوں کہ غامدی صاحب نے صرف مردوں کو جمعہ کی نماز میں کسی عذر کے باعث عدم شرکت کی اجازت دی ہے عورتوں کو یہ اجازت نہیں دی [ص۳۳۲] غامدی صاحب ایک طرف عورتوں کا مسجد میں آنا یا نہ آنا سنت قرار دے رہے ہیں [ص۳۱۶] دوسری جانب جمعہ کی نماز میں عذر کے باوجود عورت کا مسجد آنا لازم کر رہے ہیں [۳۳۲] یہ بات ناقابل فہم ہے۔

[۴۷] عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دن بھی مسلمانوں پر لازم ہے کہ جمعہ ہی کی طرح ایک اجتماعی نماز کا اہتمام کریں [ص۳۳۱، میزان ۲۰۰۸ء] عورتیں بھی عیدین کی نماز میں مردوں ہی کی طرح پورے اہتمام کے ساتھ شریک ہوں گی حائضہ عورتیں بھی جماعت اور دعا میں شامل ہو جائیں [ص۳۳۲] عیدین کی نماز

جو فرض نہیں واجب ہے غامدی صاحب کی نظر میں سنت ہے اس میں عورت مرد کی شرکت لازم ہے۔اور عذر ہو تب بھی اس کو عدم شرکت کی اجازت غامدی صاحب نے عطا نہیں فرمائی۔عورت کے باجماعت نماز پڑھ لے یا گھر میں پڑھ لے [ص ۳۱۶] یعنی دو سنتیں ہیں مگر عیدین کے لیے عورت پر فرض ہے کہ وہ باجماعت نماز پڑھے یہ دونوں اصول متصادم ہیں جب سنت عورت کو گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت دے رہی ہے تو دوسری سنت عیدین کی نماز لازم کر رہی ہے حتیٰ کہ یہ ہدایت بھی ہے کہ حائضہ عورت بھی عیدین پڑھنے آئے مگر جمعہ کی نماز جو قرآن کی نص سے فرض ہے اس کے لیے حائضہ عورت کی جماعت میں شرکت غامدی صاحب نے لازم نہیں کی جبکہ غامدی صاحب کے مطابق تمام انبیاء نے جمعہ کا دن مسلمانو ں کے لیے ہر ہفتے اجتماعی عبادت کے لیے طے کیا ہے ہر ہفتے اجتماعی عبادت میں عورت اگر چاہے تو سنت پر عمل کر کے شریک نہ ہو لیکن عیدین کی نماز میں لازماً شرکت کرے غامدی صاحب کے دونوں اصول متضاد ہیں۔

[۴۷] حکمران کی بیعت کرنا سنت ہے، حکمران کے خلاف بغاوت کے داعی کی بیعت بدعت نہیں ہے:
اس میں شبہ نہیں کہ عہد اطاعت لینے کا یہ طریقہ رسول کی سنن میں سے ہے اس بیعت کا تعلق چونکہ سیاسی امارت سے ہے اس وجہ سے ام القریٰ میں آپ نے کسی شخص سے یہ بیعت لی نہ اسلامی انقلاب کے لیے کوئی جماعت قائم کی نہ مرحلہ دعوت میں اپنے پیروؤں سے کبھی اس کا مطالبہ کیا یثرب کے لوگوں نے آپ کو حکمراں کی حیثیت سے مدینہ آنے کی دعوت دی تو آپ نے ان سے بیعت کا مطالبہ کیا [ص ۲۰، برہان ۱۹۹۳ء، دارالاشراق، لاہور] اسلام میں یہ بیعت صرف ارباب اقتدار ہی کے لیے ثابت ہے [ص ۲۲ محولہ بالا] اس بیعت کے بارے میں آپ کی سنت یہی ہے کہ اہل ایمان کی کوئی جماعت اگر کسی نطۂ ارض میں اقتدار حاصل کر لے تو اس کے امیر کو اس جماعت کے افراد سے سمع وطاعت کی بیعت لینی چاہیے اس مرحلے سے پہلے اس طرح کی بیعت ایک بدعت ہے جس کا کوئی ثبوت نبیؐ کی سنت ثابتہ سے پیش نہیں کیا جا سکتا [ص ۲۸ محولہ بالا] قرآن میں مردوں کے لیے صرف بیعت رضوان کا ذکر ہے مگر عورتوں کے لیے رسالت مآبؐ کی بیعت کا ذکر ہے اس طرح کی بیعت مردوں سے نہیں لی گئی آخر کیوں؟ غامدی صاحب نے یہ عقدہ حل نہیں کیا کیا بیعت صرف عورتوں کے لیے فرض ہے؟ مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر سیدنا حضرت حسینؓ کی بیعت قیام حکومت ہی کے مرحلے میں ہوئی اس نوعیت کے لحاظ سے ان کی بیعت کو کسی طرح

بدعت قرار نہیں دیا جاسکتا [ص ۲۹] غامدی صاحب نے خروج یعنی انہدام حکومت کے لیے جو شرط عائد کی ہے اس کے مطابق خروج کرنے والے کو اکثریت کی حمایت حاصل ہونی چاہیے [تفصیلات کے لیے دیکھیے برہان ۲۰۰۶ء برہان ۱۹۹۳ء میزان ۲۰۰۲ء میزان ۲۰۰۸ء، میزان ۲۰۱۰ء] حکمرانوں کے خلاف بغاوت کا حق کسی شخص کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک مسلمانوں کی واضح اکثریت اس کی تائید میں نہ ہو [ص ۴۸۷ میزان ۲۰۰۸ء] حضرت حسین کے ساتھ واضح اکثریت نہیں تھی اور کوفہ کے جن لوگوں نے بیعت کا وعدہ کیا تھا وہ بیعت سے مکر گئے تو اکثریت کی حمایت کے بغیر بیعت لینا غامدی صاحب کے خودساختہ فلسفے کے تحت کیسا عمل قرار پائے گا؟

[۷۵] تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم بند کی جائے تربیت جہاد و قتال کو ممکن بنایا جائے: مخلوط تعلیم کا سلسلہ بالکل بند کر دیا جائے اور طالب علموں کو ہمہ وقت مشغول تن رہنے کے مواقع فراہم کرنے کے بجائے جہاد و قتال کے لیے ضروری تربیت دی جائے [ص ۸۳ برہان ۱۹۹۳ء]

[۷۶] اخبارات رسائل ٹی وی ریڈیو فلم —— حقائق، دعوت، علم، خبر، تخلیقی صلاحیت کو ایک دوسرے تک پہنچانے کے اہتمام میں مصروف رہتے ہیں ان میں سے ہر چیز کسی نہ کسی پہلو سے انسان کی ضرورت ہے اور قرآن وسنت نے بھی ان میں سے کسی چیز کو علی الاطلاق ناجائز قرار نہیں دیا۔ [ص ۹۲ محولہ بالا] اخبارات رسائل ٹی وی ریڈیو فلم ان مقاصد کے لیے نہیں نکالے جاتے جو غامدی صاحب نے بیان کیے ہیں یہ ذرائع سرمایہ کے ذریعے چلتے ہیں اور جدید صنعتوں کی اشیاء کی کھپت ممکن بنانے کے لیے نکلتے ہیں لہٰذا یہ ذرائع صنعتوں ملٹی نیشنل کارپوریشن کے اشتہارات کے بغیر ایک دن بھی نہیں چل سکتے یہ سرمایہ دارانہ نظام کی مصنوعات فروخت کرانے کے لیے اشتہار شائع کر کے اشتہارات سے سرمایہ حاصل کر کے چلتے ہیں جن اداروں کا قیام ہی سرمایے سے مشروط ہے اور سرمایہ کے بغیر یہ رسالے چینل چل ہی نہیں سکتے ان سے خیر دعوت علم کی اشاعت کی امید وابستہ کرنا جدیدیت، جدید سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے اور اس کی مابعدالطبیعیاتی اساسات سے عدم واقفیت کا اظہار ہے۔

[۷۷] قرآن مجید کی صریح ہدایت کے مطابق سر کی اوڑھنی سے سینہ ڈھانپنا لازم ہے: یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان میں [میڈیا میں] وہ قرآن مجید کی صریح ہدایت کے مطابق سر کی اوڑھنی سے اپنا سینہ ڈھانپ کر اور زیب وزینت کی نمائش کیے بغیر کم ہی سامنے آتی ہے [ص ۹۳ برہان ۱۹۹۳ء]

[۷۸] اللہ کی ہدایت ہے کہ عورت اجنبی مرد کے سامنے سر نہیں کھول سکتی عورت کا سر چھپانا فرض ہے: اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے ہاتھ پاؤں اور چہرے کے سوا جسم کے کسی حصے کی زیبائش زیورات وغیرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہیں کھولیں گی قرآن نے اسے لازم ٹھہرایا ہے [ص ۱۵۰، مقامات ۲۰۰۸ء طبع اول المورد لاہور] قرآن سے غامدی صاحب نے ثابت کیا ہے کہ عورت صرف ہاتھ پاؤں اور چہرہ اجنبی مرد کے سامنے کھول سکتی ہے۔ ان کے اس موقف کی تصدیق اصول نمبر ۸۴ سے ہوتی ہے کہ سر اور چہرہ الگ الگ ہیں لہٰذا دونوں کے احکام بھی مختلف ہیں۔ وہ قانون حج کے تحت لکھتے ہیں عورت کے لیے صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہیں وہ سر اور پاؤں ڈھانپے گی [ص ۳۸۷ میزان ۲۰۰۸ء]

[۷۹] سر پر دوپٹہ اوڑھنا قرآن نے لازم نہیں کیا یہ اسلامی روایت: سر پر دوپٹہ یا اسکارف اوڑھ کر باہر نکلنے کی روایت اسی سے قائم ہوئی ہے اور اب اسلامی تہذیب کا حصہ بن چکی ہے [ص ۱۰۵ مقامات ۲۰۰۸ء][ ]

[۸۰] دوپٹے سے سینہ اور گریبان ڈھانپنے کا حکم صرف جوان عورتوں کے لیے ہے: اللہ نے فرمایا ہے کہ دوپٹے سے سینہ اور گریبان ڈھانپ کر رکھنے کا حکم ان بوڑھیوں کے لیے نہیں ہے جو نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں قرآن کا ارشاد ہے وہ اپنا یہ کپڑا مردوں کے سامنے اتار سکتی ہیں اس میں کوئی ہرج نہیں ہے [ص ۱۵۰ مقامات، ۲۰۰۸ء]

[۸۱] قرآن کا حکم تو نہیں ہے مگر پسندیدہ بات یہ ہے کہ عورت سر پر دوپٹہ رکھے: اس سے واضح ہے کہ سر کے معاملے میں بھی پسندیدہ بات یہی ہونی چاہیے اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو عورتوں کو دوپٹا سر پر اوڑھ کر رکھنا چاہیے یہ اگرچہ واجب نہیں ہے۔ [ص ۱۵۰ مقامات]

[۸۲] چہرہ کی تعریف میں سر شامل ہے، چہرہ کی تعریف میں سر شامل نہیں ہے؛ سر الگ ہے چہرہ الگ ہے لہٰذا دونوں کا حکم الگ الگ ہے: غامدی صاحب کے اصول ۷۷، ۷۸، ۷۹ اور ۸۰ اور ۸۱ سے غامدی صاحب کے چار نئے اصول اخذ ہو رہے ہیں ان اصولوں کا ماخذ اوپر کے چار اصول ہیں۔

[۸۲] تملیک ذاتی کی شرط کے لیے کوئی ماخذ قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے: [ص ۳۵۳ میزان طبع سوم ۲۰۰۸ء] میزان میں مبادی تدبر سنت کے تحت جو چھ اصول غامدی صاحب نے بیان کیے ہیں اس کے مطابق یہ عبارت ان کی سنت کی تعریف سے ٹکراتی ہے کہ سنت عملی چیز ہے نظری اعتقادی علمی مسائل کا

سنت سے تعلق نہیں ہے۔

[۸۳] صرف عبادت کی جگہ ستر چھپا کر جانا فرض ہے: قرآن نے اسے ممنوع قرار دیا اور فرمایا کہ عبادت کی ہر جگہ پر آدمی کو ستر چھپا کر اور پورا لباس پہن کر جانا چاہیے [۷:۳۱] آدم کے بیٹو ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس سے آراستہ رہو [ص ۳۸۲، میزان ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کے اصول کے مطابق ستر وہ کم از کم لباس ہے جو ہر مسلمان کو پہننا چاہیے اور زینت کے لیے ستر سے زائد
لباس پہننا لازم ہے مگر غامدی صاحب مساجد کی حاضری کے سوا دیگر تمام مقامات پر عورت مرد کو بے ستر لباس پہننے کی اجازت دے رہے ہیں اور اس اجازت کا ثبوت قرآن سے پیش کر رہے ہیں غامدی صاحب نے نبی کی فضیلت کے تحت ص ۱۴۳ پر آپ کی چھ فضیلتیں بیان کی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ آپؐ کے لیے زمین کو مسجد بنایا گیا [ص ۱۴۳ میزان] اس اصول کے مطابق اب ہر مسلمان مرد عورت کے لیے زمین مسجد ہے یعنی عبادت کی جگہ یعنی عبادت گاہ۔ تو ایک مسلمان عورت پر بھی لازم ہے کہ وہ ہر وقت اپنا ستر پورا رکھے نماز میں غامدی صاحب عورت کو سر چھپانے کا حکم دیتے ہیں لہٰذا زمین مسجد یعنی عبادت گاہ میں چلنے پھرنے والی عورت پر اصول ۸۳ کے تحت ہر وقت سر چھپانا لازم قرار پایا مگر غامدی صاحب عورت کے سر چھپانے کو لازمی نہیں قرار دیتے بلکہ سر چھپانے کو ایک تہذیبی ضرورت سمجھتے ہیں اگر عورت سر کھلا رکھے ستر پورا نہ کرے تو وہ کسی گناہ اور سزا کی مکلّف نہیں ہوگی۔

[۸۴] حج میں مرد اپنا سر چہرہ اور پاؤں کے اوپر کا حصہ کھلا رکھیں گے غیر سلے کپڑے پہنیں گے عورت البتہ سلے ہوئے کپڑے پہنیں گی اور سر اور پاؤں بھی ڈھانپ سکیں گی ان [عورت] کے لیے صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہیں [ص ۳۸۷، ۳۸۸ میزان ۲۰۰۸ء] اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول سر کو چہرے کا حصہ نہیں قرار دیتے سر الگ ہے چہرہ الگ ہے اس لیے اس کے احکامات بھی الگ ہیں [۳۸۸ میزان ۲۰۰۸ء] اصول ۸۷ میں غامدی صاحب بتا رہے ہیں کہ قرآن نے سر پر دوپٹہ اوڑھنا عورت کے لیے لازم نہیں کیا اب قرآن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورت کو حکم دے رہے ہیں کہ وہ حج میں سر ڈھانپے آخر کیوں؟ جب عام زندگی میں سر ڈھانپنا لازم نہیں ہے تو حج میں لازم کیوں؟ اصول ۸۷ میں غامدی صاحب نے قرآن سے ثابت کیا کہ عورت اجنبی مرد کے سامنے اپنا چہرہ ہاتھ اور پاؤں کھول سکتی ہے اب قرآن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورت کو حج میں پاؤں ڈھانپنے کا حکم دے رہے ہیں

قرآن کے منافی احکامات دے کر عورت کی آزادی کو مجروح کرنے کی اجازت غامدی صاحب نے کس نص سے لی ہے؟

[۸۵] عورت کا چہرہ اور سر الگ الگ ہیں لہٰذا دونوں کا حکم الگ ہے: عورتیں سر اور پاؤں بھی ڈھانپ سکیں گی ان کے لیے صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہے [ص ۳۸۸ میزان ۲۰۰۸ء]

[۸۶] حج کے سوا عورت چہرے کا پردہ کرے گی: [حج میں عورت کے لیے] ان کے لیے صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہیں [ص ۳۸۸ میزان ۲۰۰۸ء] اس سے ثابت ہوا کہ مسلمان عورتیں عہد رسالت میں چہرہ کو ڈھانپتی تھیں اسی لیے رسالت مآب نے حج کے حوالے سے ان کو حکم دیا کہ حج کے موقع پر وہ چہرہ کھلا رکھیں تا کہ سفر کی صعوبت میں انہیں مزید زحمت سے بچایا جائے مگر غامدی صاحب عورت پر پابندیاں عائد کرتے ہوئے اور اسے سہولتیں عطا کرتے ہوئے نہ قرآن کا حوالہ دے رہے ہیں نہ سنت کا نہ شریعت کا بس اپنے دریچۂ علمی سے احکامات صادر فرما رہے ہیں۔

[۸۶] عورت کٹے ہوئے بال نہیں رکھ سکتی: عورتیں اپنی چوٹی کے آخر سے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کا لباس پہنیں [ص ۳۸۹ میزان ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کے اس اصول سے واضح ہے کہ مردوں کی مشابہت سے بچنے کے لیے مسلمان عورت کو لمبے بال رکھنے چاہئیں اسے مردوں کی طرح بال چھوٹے کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی لیے حج کے موقع پر عورت علامتی طور پر چوٹی کے آخر سے چند بال کاٹ کر حکم الٰہی کو پورا کرے گی اسے کسی حال میں اپنے فطری قدرتی لمبے بال کاٹنے کی اجازت نہیں ہے۔

[۸۷] قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی نہیں۔ یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ قرآن نازل ہوا ہے اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا دین میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا [ص ۲۵ میزان ۲۰۰۸ء] خدا کی شریعت نے جانوروں کی حلت و حرمت کو اپنا موضوع نہیں بنایا انسان کو اس کی فطرت کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ [ص ۳۶ میزان محولہ بالا] چنانچہ شریعت کا موضوع اس باب میں صرف وہ جانور اور ان کے متعلقات ہیں جن کی حلت و حرمت کا فیصلہ تنہا عقل و فطرت کی رہنمائی میں کر لینا انسان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسی لیے اللہ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے اسے بتایا کہ سور خون مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں جانوروں کی حلت و حرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں

ہیں اللہ نے جانوروں کی حلت وحرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ، اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [۲:۱۷۲۔۱۷۳]، قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَۃً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [۶:۱۴۵]۔ [ص ۳۶، ۳۷، میزان ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب نے اصول بیان کیا کہ قرآن کے حرام کردہ ان چار اقسام کے جانوروں کے سوا ہر مسلمان کے لیے ہر جانور حلال ہے لیکن قرآن کے اس متعین اصول کی نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ہدی کے جانور اگر راستے ہی میں مرنے کے قریب پہنچ جائیں تو رسول اللہ نے فرمایا ذبح کر کے ان کے نعل خون میں ڈبونا اور وہاں کے قریب رکھ دینا پھر ان کا گوشت نہ تم کھانا اور نہ تمہارے ساتھی کھائیں [ص ۳۴۹، ۴۰۰ میزان ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کے اصول کے تحت پیغمبر قرآن کے کسی حکم کی تحدید تخصیص ترمیم وتغیر کا مجاز نہیں لیکن ہدی کے جانور کے سلسلے میں پیغمبر نے تحدید تخصیص ترمیم تغیر کر دیا تو غامدی صاحب نے پیغمبر کے اس تجاوز [نعوذ باللہ] کو کس اصول کے تحت قبول فرمایا غامدی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ جانور مردار نہیں ہے بعد میں آنے والوں کو معلوم ہو جائے [ص ۴۰۰] یعنی دوسرے لوگ وہ جانور کھا سکتے ہیں۔ جب اللہ نے قربانی کے جانور کو حلال قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو اس کے کھانے کی اجازت دی ہے تو ایک حلال شے کو کھانے سے روک دینا بہ ظاہر قرآن کے نص کی خلاف ورزی ہے اور غامدی صاحب کے خود ساختہ اصول کے تحت پیغمبر کو اس کا اختیار ہی نہیں کہ وہ کسی حلال کو حرام قرار دے لیکن اگر غامدی صاحب اپنے اصول کے برخلاف [نعوذ باللہ] پیغمبر کو یہ اجازت دے دیں تو یہ اجازت میزان کی شریعت کا حصہ بن جاتی ہے۔

[۸۸] قربانی کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے: خصی جانور کی قربانی امت کرتی ہے رسالت مآب ؐ سے اس جانور کی قربانی ثابت ہے تو کیا یہ حرام ہے؟ اچھی عمر کی تعریف کیا ہے غامدی صاحب نے اس اصول کو واضح نہیں فرمایا

[۸۹] خدا کی شریعت قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہے: ہم ان نصوص کی وضاحت کریں گے جو قرآن و سنت میں اب خدا کی ابدی شریعت کے طور پر بیان ہوئے ہیں [ص ۴۰۹ میزان ۲۰۰۸ء] اس سے پہلے

اصول نمبر ۔۔۔ میں غامدی نے جس شریعت کا ذکر کیا ہے وہ کہاں سے اخذ ہوتی ہے؟

[۹۰] [۲۴: ۳۲،۳۳] سورۂ نور کی ان آیات میں یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ واضح کی گئی ہے کہ عورتوں سے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ اللہ کے نزدیک جائز ہے اور وہ نکاح ہے [ص ۴۱۰ محولہ بالا]۔ وَّ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ۚ کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ ۚ وَ اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِہٖ مِنۡہُنَّ فَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ فَرِیۡضَۃً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا تَرٰضَیۡتُمۡ بِہٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِیۡضَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا [۴: ۲۴] اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی کے نکاح میں ہوں الا یہ کہ وہ تمہارے قبضے میں آجائیں یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا فریضہ ہے یہ ان عورتوں کی فہرست ہے جن سے نکاح ممنوع قرار دیا گیا ہے [ص ۴۱۱، محولہ بالا] غامدی صاحب کا یہ اصول اوپر بیان کردہ آیت سے ٹکرا رہا ہے جس کا مفہوم انہوں نے بتایا ہے کہ نکاح کے سوا عورت سے جنسی تعلق نہیں ہو سکتا جب کہ قرآن اجازت دے رہا ہے الا ماملکت ایمانکم پھر خود لکھتے ہیں اس استثناء سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے بھی اسے باقی رکھا تا کہ اس طرح کی عورتیں اگر چاہیں تو بغیر کسی رکاوٹ کے مسلمان معاشرے کا حصہ بن سکیں [ص ۴۱۱] لیکن یہ استثنا مشروط ہے جنگ میں پکڑی ہوئی عورتیں اگر کسی سے نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتی تھیں [ص ۴۱۱ میزان] یعنی لونڈی سے تمتع نکاح سے مشروط ہے یہ اصول غلط ہے غامدی صاحب کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ مغرب کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام آزادی کی قدر کا قائل ہے اور لونڈی غلام تو اس نے مجبوراً برداشت کیے کہ وہ اس زمانے کا کلچر تھا اسلام نے تو رفتہ رفتہ اس کلچر کو ختم کر دیا یہ معذرت خواہانہ جدیدیت ہے۔ لیکن خود غامدی صاحب نے اوپر جنسی تمتع کے لیے نکاح کی شرط لازم کر دی ہے لیکن رسالت مآب ؐ کے لیے لکھتے ہیں۔ اسی پابندی کے باعث سیدہ ماریہ کے ساتھ آپ ؐ نکاح نہیں کر سکے اور وہ ملک یمین ہی کے طریقے پر آپ کے گھر میں رہیں [ص ۴۳۱ میزان ۲۰۰۸ء] رسالت مآب ؐ کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا کیوں لازم نہیں تھا کیا سورۂ نور میں رسول کو کوئی استثناء دیا گیا ہے؟ اگر نہیں تو غامدی صاحب نے یہ تحدید کیسے عائد کی۔ غامدی صاحب خود لکھ رہے ہیں کہ ملک یمین بغیر نکاح کے ہی گھر میں رہتی ہے اور رسالت مآب ؐ نے حضرت ماریہ ؓ کو اسی اصول، حکم، نص اجازت کے تحت گھر میں رکھا مگر اوپر بیان کر رہے ہیں کہ نکاح کے بغیر جنسی تعلق قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ رفیع مفتی کی کتاب ''سوال و جواب'' میں جو میزان پر اعتراضات کا جواب ہے لونڈی سے نکاح کی شرط ہٹا دی گئی ہے۔ یہ

غامدی صاحب کے اصولوں کا کھلا تضاد ہے ایک طرف غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ کوئی شخص کسی لونڈی سے نکاح کے بغیر جنسی تعلق قائم نہیں رکھ سکتا دوسری جانب اس اصول کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یہ نکاح اگر دوسرے کی لونڈی سے کیا جائے تو اس میں چونکہ نکاح اور ملکیت کے حقوق میں تصادم کا اندیشہ تھا اس لیے احتیاط کی ہدایت کی گئی ان کے مالکوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کر لیں [یہ اجازت سورۂ نساء کی آیت ۲۵ میں دی گئی] [میزان ص ۴۸۱، طبع سوم ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کی تشریح کے مطابق اگر لونڈی سے نکاح کے لیے مالک سے اجازت لی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مالک بغیر نکاح کے لونڈی سے تمتع کر رہا تھا اگر لونڈی سے نکاح کر کے تمتع کرنا لازم ہوتا تو غامدی صاحب لکھتے کہ مالک سے فسخ نکاح کی درخواست کر کے لونڈی سے نکاح کر لیں مگر انہوں نے صرف مالک کی اجازت کو حجت قرار دیا نکاح فسخ کرنے کو حجت نہیں قرار دیا لہٰذا غامدی صاحب کی تحریر کے تضاد سے خود ثابت ہو گیا کہ لونڈی سے تمتع کے لیے نکاح کی شرط نہ قرآن سے ثابت ہے نہ سنت سے۔ قرآن نے سورۂ نساء کی آیت ۲۵ میں مالکوں کی اجازت سے لونڈیوں سے نکاح کرنے کا حکم دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لونڈی سے تمتع کے لیے نکاح کا لازم ہونا شرط ہی نہیں ہے غامدی صاحب نے یہ شرط اپنے فہم سے عائد کی ہے اور یہ شرط ان کے اصول ۷۸ کی تردید ہے وہ خود اپنے اصول کو قابل تقلید نہیں سمجھتے اگر لونڈیوں سے تمتع کرنے کے لیے نکاح لازم تھا تو مکاتیت کی کی شرط اور مصارف زکوٰۃ میں مد فی الرقاب کی کوئی ضرورت نہ تھی جب لونڈی کا نکاح ہو گیا تو وہ آزاد عورت کے برابر ہو گئی اس کا مرتبہ آزاد عورت کے مساوی ہو گیا جب ایک عورت کسی کے نکاح میں آ چکی ہے تو اسے مکاتبت کے ذریعے زکوٰۃ کی رقم کے ذریعے بیت المال کی مدد سے آزاد ہونے کی اجازت قرآن کیوں دے رہا ہے؟ زکوٰۃ تو محتاج مسکین کے لیے ہے لونڈی جب مرد کے نکاح میں آ گئی تو وہ مسکین و محتاج کہاں رہی اور جب وہ قانونی بیوی ہو گئی تو اسے قید نکاح سے آزاد کرانے کے لیے زکوٰۃ سے مدد دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اور مرد زکوٰۃ کی رقم اپنی بیوی کو ازاد کرنے کے لیے کیوں لے رہا ہے قرآن و حدیث میں بار بار لونڈیوں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن جب ایک لونڈی نکاح کر چکی تو آزادی کا کیا جواز ہے وہ تو آزاد ہی ہے اور نکاح صرف زکوٰۃ کی رقم لینے کے لیے فسخ نہیں کیا جا سکتا نکاح تو ابدی معاہدہ ہے غامدی صاحب لکھتے ہیں انبیاء کے دین میں زوجین کی مستقل رفاقت کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے [ص ۴۰۹] میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکے تو انبیاء دین میں علیحد گی

کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے یہ طلاق ہے ہر شخص کی خواہش ہونی چاہیے کہ جو رشتہ ایک مرتبہ قائم ہو گیا ہے اسے ممکن حد تک ٹوٹنے سے بچانے کی کوشش کی جائے[ص۴۴۰] اگر لونڈی مرد کے نکاح میں ہے تو طلاق اور خلع کے قانون کا اطلاق ہوگا پھر زکوٰۃ کی رقم سے ایک منکوحہ کو مرد کی قید نکاح سے آزاد کرنے کی مہم جوئی نص کی خلاف ورزی ہے لیکن مغرب کو خوش کرنے کے لیے غامدی صاحب اپنے خطیبانہ اسلوب میں لکھتے ہیں ''مکاتبت کا حق اس بات کا اعلان تھا کہ لوح تقدیر اب غلاموں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اپنی آزادی کی تحریر جب چاہیں اس پر رقم کر سکتے ہیں [ص ۴۷۹]۔ غامدی صاحب کے مطابق اگر سورہ محمد میں لونڈی غلام بنانے کی ممانعت ہی ہوگئی تو زکوٰۃ کی مد میں فی الرقاب کی رقم رکھ کر لونڈیوں کی آزادی میں کیوں معاونت کی جارہی ہے غامدی صاحب خود لکھتے ہیں ''زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مستقل مد فی الرقاب بھی رکھی گئی ہے تاکہ غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی اس مہم کو بیت المال سے بھی تقویت بہم پہنچائی جائے [ص۴۸۲، میزان محولہ بالا] آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ مکاتبت کا یہ حق جس طرح غلاموں کو دیا گیا ہے اسی طرح لونڈیوں کو بھی دیا گیا ہے۔[ص۴۷۹ میزان] سوال یہ ہے کہ اگر لونڈیاں مسلمانوں کے نکاح میں ہیں تو مکاتبت اور زکوٰۃ سے ان کی رہائی کی کوشش بے معانی ہے لہٰذا سورۂ محمد سے غامدی صاحب نے میزان کے ص۶۰۴ پر جو استدلال کیا ہے وہ درست نہیں ہے اسلام میں ام ولد کی حیثیت کیا ہے؟ غامدی صاحب نے اس پر روشنی نہیں ڈالی ام ولد وہ لونڈی ہے جسے فروخت نہیں کیا جاسکتا اس سے ہونے والی اولاد مرد کی میراث میں حصہ پائے گی اس لونڈی کو آزاد بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اب وہ مالک کی اولاد کی ماں ہے اور اولاد کو دو سال تک دودھ پلانا ماں کی ذمہ داری ہے اگر لونڈی کا نکاح ہو گیا تو اسے فروخت کرنے کا کیا سوال فروخت سے روکنے کے حکم کی کیا ضرورت بیوی کو فروخت نہیں کیا جاسکتا۔ سورۂ نور وَلۡیَسۡتَعۡفِفِ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ نِکَاحًا حَتّٰی یُغۡنِیَہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ الَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَکَاتِبُوۡہُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا ٭ۖ وَّ اٰتُوۡہُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ وَ لَا تُکۡرِہُوۡا فَتَیٰتِکُمۡ عَلَی الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا لِّتَبۡتَغُوۡا عَرَضَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَ مَنۡ یُّکۡرِہۡہُّنَّ فَاِنَّ اللّٰہَ مِنۡ بَعۡدِ اِکۡرَاہِہِنَّ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ

[۲۴:۳۳] کی آیت میں مکاتب کی اجازت ان غلاموں لونڈی کے لیے ہے جن میں ان کا مالک بھلائی دیکھتا ہو' غامدی صاحب اس کی تشریح میں لکھتے ہیں ''وہ اگر معاہدہ کرنا چاہتا ہے اور نیکی و خیر کے ساتھ

اپنے پاوں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کی یہ درخواست لازماً قبول کی جائے گی [ص ۴۷۹ میزان] اس تشریح سے ثابت ہوا کہ جن میں صلاحیت نہیں ہے ان کی درخواست قبول نہیں کی جائے گی لہٰذا ایسے لونڈی غلام کے لیے نہ مکاتبت ہے نہ فی الرقاب سے کوئی اعانت یعنی لونڈی غلام باقی رہیں گے۔ قرآن میں جہاں جہاں ملک یمین کی اصطلاح غلام لونڈی کے لیے استعمال ہوئی ہے وہاں آقا مرد کو لونڈی سے تمتع کی اجازت ہے اس کے لیے نکاح کی شرط نہیں لیکن آقا عورت غلام سے تمتع نہیں کرسکتی ملک یمین کے لیے نکاح کی شرط غامدی صاحب کا اجتہاد ہے اور ان کے موقف کے منافی ہے وہ لکھتے ہیں سیدہ ماریہ ملک یمین کے طریقے پر آپؐ کے گھر میں رہیں [ص ۴۳۱ میزان] اس سے ثابت ہوا کہ غامدی صاحب کا اصول نوے [۹۰] کہ عورت سے جنسی تعلق نکاح کے سوا حرام ہے خود قرآن کی نص کے اور غامدی صاحب کے اپنے اصول کے منافی ہے وہ لکھتے ہیں تمام ذی صلاحیت لونڈیوں غلاموں کے نکاح کی ہدایت کی گئی [ص ۴۸۱ میزان] ظاہر ہے وہ جو ذی صلاحیت نہیں وہ ملک یمین میں رہیں گے اور ان سے جنسی تمتع جائز ہوگا نکاح اس کا ہوگا جو پہلے سے قید نکاح میں نہیں اگر مالک لونڈی سے نکاح کے بعد تمتع کررہا تھا تو غامدی صاحب وضاحت کرتے کہ وہ نکاح ختم کرکے ذی صلاحیت لونڈی کے نکاح کا انتظام کرے یا نکاح فسخ کرکے لونڈی کو آزاد کردے۔ غامدی صاحب اپنے ہی اصول کی تردید میں لکھتے ہیں قیدیوں کو مسلمان چھوڑ بھی سکتے تھے مگر انھیں قتل کرنے یا لونڈی غلام بنا کر رکھ لینے کی گنجائش اس حکم کے بعد ان کے لیے باقی نہیں رہی [ص ۶۴ میزان] لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ صحابہ نے غامدی صاحب کے بتائے ہوئے اصول پر عمل نہیں کیا صحابہ قرآن کا فہم غامدی صاحب سے زیادہ رکھتے تھے لہٰذا تعامل صحابہ غامدی صاحب سے مختلف ہے اور غامدی صاحب اصول چھیانوے میں بتا چکے ہیں کہ صحابہ کا اجتماعی عمل بھی حجت ہے کیونکہ صحابہ بدعت اختیار نہیں کرسکتے نبیؐ کی طرف سے انھیں اس کی اجازت ملی ہوگی۔

[۹۱] حرام جانوروں کا صرف گوشت حرام ہے باقی دوسرے استعمالات کے لیے یہ جانور حلال ہے: غامدی صاحب نے اصول ۸۷ میں بیان کیا کہ پیغمبر بھی قرآن کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص نہیں کرسکتا مگر خود اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ قرآن میں بیان کردہ حلت وحرمت کے قانون کی تحدید میں لکھتے ہیں یہ سب چیزیں قرآن کی ان آیات سے واضح ہے کہ صرف خورونوش کے لیے حرام ہیں رہے ان کے دوسرے استعمالات تو وہ بالکل جائز ہے [ص ۶۴۰ میزان ۲۰۰۸ء] یعنی سور، مردار کا گوشت حرام ہے مگر

اس کی کھال ہڈیاں دیگر اعضاء کا استعمال حلال ہے۔

[۹۲] قرآن نے سورۂ بقرہ آیت ۲۳۴، ۲۳۵ میں بیواؤں کی عدت کا قانون بیان کیا ہے انھیں چار مہینے دس دن انتظار کرنے کی ہدایت کی یہ اس کے سوا قرآن نے بیوہ کو کوئی ہدایت نہیں دی مگر غامدی صاحب قرآن کی اس آیت کی تحدید، تخصیص ترمیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں اگر [بیوائیں] اپنے مرحوم شوہر کے گھر میں اس کے لیے عدت گزار رہی ہیں تو سوگ کی کیفیت میں گزاریں اور زیب و زینت کی کوئی چیز استعمال نہ کریں [میزان ص ۴۶۲] اللہ تعالیٰ صرف عدت گزارنے کا حکم دے رہا ہے غامدی صاحب نے اس میں تحدید یہ کہ کی عدت اگر شوہر کے گھر میں عدت گزارے تو سوگ کی کیفیت طاری کرنا لازم ہے اور زیب و زینت نہیں کرسکتی یعنی اگر عورت اپنی ماں کے گھر میں عدت گزارے تو ان احکامات کا اطلاق اس پر نہیں ہوگا یہ قرآن کے حکم کی یہ تشریح و توضیح غامدی صاحب کے اصول ۸۷ کی تردید ہے۔

[۹۳] خدا کا مشورہ مسلمان مسترد کر سکتے ہیں مگر عوام کا مشورہ حکمراں مسترد نہیں کرسکتا: سورۂ نساء کی آیت ۲ تا ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے ترکے کے متعین حصوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا تقسیم [ترکہ] کے موقع پر جب قریبی اعزہ اور یتیم و مسکین وہاں آ جائیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان سے اچھی بات کرو [میزان ص ۴۷۷ محولہ بالا] مرنے والے کے ترکے میں وارثوں کے حصے اگرچہ متعین ہیں لیکن تقسیم وراثت کے موقع پر قریبی اعزہ اور یتامیٰ و مساکین آ جائیں تو اس سے قطع نظر کہ قانونی لحاظ سے ان کا کوئی حق بنتا ہے یا نہیں انھیں کچھ دے دلا کر اور اچھی بات کہہ کر رخصت کرنا چاہیے [ص ۴۷۹] غامدی صاحب کے ترجمے اور تشریح میں واضح کر دیا گیا ہے کہ تقسیم میراث کے موقع پر متعین حصوں کے باوجود انفاق کے جذبے کے تحت غریب عزیزوں اور یتامیٰ کو کچھ دینے کا اللہ کا مشورہ قانونی لحاظ سے ان سائلین کے کسی قانونی حق یا مطالبے کا سبب نہیں بنتا یعنی اللہ رب العزت کا مشورہ مسلمان نظر انداز کرسکتا ہے اس حکم سے سائل کو میراث میں کوئی قانونی ترکہ نہیں مل سکتا لیکن دوسری جانب غامدی صاحب حکمراں امام خلیفہ کے لیے عوام کا مشورہ قبول کرنا لازم قرار دیتے ہیں یعنی عوام کا مشورہ اللہ تعالیٰ کے مشورے کے مقابلے میں یقیناً افضل بہتر اور لازم ہے قانون سیاست کے تحت لکھتے ہیں وَالَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمۡ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۪ وَ اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ ۪ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ [۴۲: ۳۸] اس کا تقاضہ ہے کہ امیر کی امارت مشورے کے ذریعے منعقد ہو نظام مشورے سے وجود میں آئے مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں۔ [ص

۴۹۵ میزان] منصب امارت سنبھال لینے کے بعد بھی امیر کو یہ اختیار نہیں کہ اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی رائے کو رد کردے۔[ص ۴۹۵ میزان]

[۹۴] دین اور عقل میں اور عقل ونقل میں کوئی تضاد نہیں ہوسکتا: غامدی صاحب کا یہ اصول شریعت کے تمام معاملات میں قابل عمل نہیں ہے اسی لیے نقل کو عقل پر برتری حاصل ہے اگر دین کا کوئی حکم عقل سے بھی سمجھ میں آجائے تو بہتر مگر کسی حکم پر عمل عقل کے فہم کامل سے یا عقلی دلیل سے مشروط نہیں غامدی صاحب لکھتے ہیں بیٹی صرف اس بیوی کی حرام ہے جس سے خلوت ہو جائے [ص ۴۱۵ میزان ۲۰۰۸ء] یعنی جس بیوی کو خلوت سے پہلے طلاق دی گئی اس کی بیٹی سے نکاح جائز ہے غامدی صاحب لکھتے ہیں بیوی کی بہن پھوپھی خالہ سے بیوی کو طلاق کے بعد نکاح جائز ہے [ص ۴۱۵] ظاہر ہے شریعت نے مصاہرت کے رشتوں میں حرمت اس لیے قائم کی ہے کہ یہ قاطع محبت ہوتے ہیں اسی لیے دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی اجازت نہیں دی گئی لیکن عقلی سوال یہ ہے کہ مرد نے ایک عورت سے نکاح کیا نکاح کے بعد عورت کے بجائے اس کی بیٹی پسند آگئی اس نے نکاح فسخ کردیا اور بیٹی سے نکاح کرلیا۔ مطلقہ صرف عورت نہیں اب مرد کی ساس بھی ہے جس عورت کو اس نے بیوی کی حیثیت سے قبول کر کے مسترد کردیا اس کی ماں کیا اپنے شوہر کو اپنے بیٹے یعنی داماد کی حیثیت سے قبول کرلے گی اور جس لڑکی کا کل وہ باپ تھا آج وہ اس لڑکی کا شوہر بن بیٹھا تو اس کی ساس اس رشتے کو دل سے قبول کرلے گی اور ماں بیٹی داماد میں ایک دائمی کشمکش جنم لے گی یا نہیں؟ نقل کے حکم کو ہمیشہ عقل پر پرکھا جائے تو سوائے پسپائی کے کچھ میسر نہیں آتا ہمارے عقلئین اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں اسی طرح بیوی کو طلاق کے بعد اس کی بہن سے مرد کا نکاح کیا دونوں بہنوں میں محبت کی بقاء کا سبب بنے گا یا قاطع محبت ہوگا؟ ظاہر ہے قاطع محبت ہوگا تو شریعت نے اس کی اجازت کیوں دی؟ بیوی کو طلاق دینے کے بعد مرد ساس سے نکاح کیوں نہیں کرسکتا جب کہ بیوی کو طلاق دے کر اس کی بیٹی سے نکاح جائز ہے؟ باپ مطلقہ بہو سے اور بیٹا باپ کی مطلقہ دوسری بیوی اپنی سوتیلی ماں سے کیوں نکاح نہیں کرسکتا عقلاً اس میں کیا مضائقہ ہے؟ میاں بیوی کے لیے ایک دوسرے کے ماں باپ سے نکاح طلاق کے بعد بھی حرام کیوں ہے؟ باپ بیٹے کو قتل کردے تو باپ کو قصاص میں قتل نہیں کیا جاسکتا بیٹا باپ کو قتل کرے تو میراث سے محروم ہو جائے گا لونڈی سے مرد آقا تمتع کرسکتا ہے غلام سے عورت آقا تمتع نہیں کرسکتی اس کی عقلی دلیل کیا ہے؟ ان سب قوانین کو غامدی

صاحب عقل کی بنیاد پر ثابت کر کے دکھائیں۔

[۹۵] مہر اور خطبۂ نکاح بھی سنت ہے: مہر نکاح اور خطبے کی طرح قدیم سنت ہے [ص ۴۱۷ میزان ۲۰۰۸ء] اسی کتاب کے ص ۱۴ پر سنتوں کی فہرست میں نہ مہر شامل ہے نہ خطبہ نکاح کل سنتوں کی تعداد وہاں ۲۷ ہے اب دو سنتوں کے اضافے سے یہ تعداد ۲۹ ہو گئی۔ واضح رہے کہ میزان ۲۰۱۰ء میں صفحہ ۱۴ پر سنتوں کی تعداد صرف ۲۶ ہے مگر بعد کے صفحات میں جگہ جگہ سنتوں کا اضافہ ہے۔

[۹۶] جس عمل کا ثبوت حدیث و سنت سے نہ ملے لیکن صحابہ کے عمل سے ملے تو صحابہ کا عمل دلیل ہے کہ نبیؐ کی طرف سے اس عمل کی اجازت یقیناً ان کے علم میں تھی اس لیے کہ ہم ان کے بارے میں یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی بدعت اا اختیار کر سکتے تھے: تراویح کی نماز الگ نماز نہیں یہ تہجد ہی کی نماز ہے نبیؐ نے یہ نماز کبھی گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھی [مقامات، ص ۱۱۱، ۱۱۲، طبع دوم جولائی ۲۰۰۶ء، المورد لاہور] رسول اللہؐ نے کبھی یہ نماز گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھی لیکن صحابہ کے عمل سے اس کی اس سے زیادہ رکعتیں بھی ثابت ہیں ان کا یہ عمل دلیل ہے کہ نبیؐ کی طرف سے اس کی اجازت یقیناً ان کے علم میں تھی اس لیے کہ ہم ان کے بارے میں یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی بدعت اختیار کر سکتے ہیں [ص ۱۱۲ مقامات ۲۰۰۶ء]

[۹۷] سرکش عورت کو صرف مرد سزا دے سکتا ہے: سزا اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی کوئی معلم اپنے زیر تربیت شاگردوں کو یا کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے [ص ۴۲۳ میزان] بعض باپ بڑے جلاد اور بعض اساتذہ بڑے ظالم ہوتے ہیں تو کیا مرد ان کی تقلید کر سکتا ہے؟ غامدی صاحب نے یہاں کوئی تحدید عائد نہیں کی۔ سورۂ نساء کی آیت ۳۴ میں قرآن نے عورتوں کو سزا دینے کی ہدایت کی ہے حضورؐ نے اس سزا کی تحدید کی ہے غامدی صاحب لکھتے ہیں ''نبیؐ نے اس کی حد ''غیر مبرح'' کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسی سزا نہ دی جائے جو کوئی پائدار اثر چھوڑے [ص ۴۲۳، میزان ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کے اصول ۸۷ کے تحت پیغمبر قرآن کے کسی حکم کی تحدید نہیں کر سکتا تو نعوذ باللہ رسالت مآب نے تحدید حکم کر کے اپنے اختیارات سے تجاوز فرمایا مگر چونکہ یہ اختیار غامدی صاحب کو پسند آیا لہٰذا حضرت والا نے حضورؐ کی غلطی [نعوذ باللہ] معاف فرما دی اور اس اصول تحدید کو اختیار کر لیا۔ وہ لکھتے ہیں مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے [میزان، ص ۴۲۴] یہی عبارت میزان ۲۰۱۰ء طبع پنجم میں ص ۳۲۱ اور ۳۲۲

پر موجود ہے میزان کی دونوں اشاعتوں میں صفحات کا فرق بتا رہا ہے کہ غامدی صاحب کا پھر ارتقاء ہو گیا ہے لہٰذا دو صفحات میزان سے کم ہو گئے ہیں مگر میزان ۲۰۱۰ء کی اشاعت میں صفحات کی کمی، ارتقاء اور نئے خیالات کا کوئی اظہار سرورق یا دیباچے میں نہیں کیا گیا ہے۔

[۹۸] مرد سرکش عورت کو خود سزا نہیں دے سکتا بیوی کو سزا خاندان کے بزرگ دے سکتے ہیں تمدن بدلنے سے قرآن کا حکم بدل سکتا ہے اس کی تعبیر و تشریح بھی بدل سکتی ہے: تمدن کی تبدیلی کے ساتھ ریاست کیا شوہروں کو پابند کر سکتی ہے کہ پہلی دونوں تدابیر اگر موثر نہ ہوں اور سزا کی نوبت آ جائے تو وہ خود کوئی اقدام نہیں کریں گے بلکہ معاملات عدالت کے سپرد کر دیں گے ہمارا جواب یہ ہے کہ یقیناً کر سکتی ہے اللہ کی ہدایت پر عمل کے لیے یہ محض طریقہ کار کی تبدیلی ہے اس سے کوئی حکم معطل نہیں ہوتا عورت کی اصلاح کے لیے سزا شوہر دے خاندان کے بزرگ دیں یا عدالت اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا [ص ۱۴۶، ۱۴۷ مقامات طبع اول ۲۰۰۸ء، المورد لاہور] قرآن کی آیت میں عورت کے...... پر سزا کا اختیار صرف مرد کو دیا گیا ہے رسول اللہ نے اس اختیار پر تحدید عائد کی کہ سزا ہلکی ہو غامدی صاحب کے اصول ۸۷ کے تحت پیغمبر کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں ہے تو غامدی صاحب کو یہ اختیار کس ذریعے سے حاصل ہوا کہ وہ تمدن کی تبدیلی کے باعث قرآن کے نص میں شوہر کے اختیار کو خاندان کے بزرگوں اور عدالت کو منتقل کر دیں دوسرے معنوں میں ان کا اصول یہ ہے کہ تمدن بدلنے سے قرآن کے حکم کی تعبیر تفسیر تشریح طریقہ بدلا جا سکتا ہے۔ بزرگ تو پندرہ سو سال پہلے بھی تھے تب سزا کا اختیار بزرگ، قاضی، حکومت کو دینے کا خیال کیوں پیدا نہیں ہوا؟ قرآن مرد کو سزا کا اختیار تفویض کر رہا ہے غامدی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ قطعی الدلالۃ ہوتے ہیں تو یہ کیسی قطعیت ہے کہ شوہر کے حکم میں بزرگ ریاست قاضی حکمراں سب داخل ہو گئے اس ارتقاء کی واحد وجہ تمدن کا القاء ہے عصر حاضر میں مذہب انسانی حقوق کے تحت مرد عورت برابر ہیں لہٰذا مرد کا عورت کو سزا دینا عہد حاضر کے تعقل غالب کی روشنی میں ناپسندیدہ نظر آیا تو غامدی صاحب نے قرآن کے فہم کو عہد حاضر کے تعقل غالب سے ہم آہنگ کر کے قرآن کو بچا لیا۔

[۹۹] تقسیم میراث [سورۂ نساء آیت تیارہ بارہ] کے خدائی قانون میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی تقسیم کے حصے طے شدہ ہیں وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی: يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا

السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا[۴:۱۱]اس آیت میں اللہ نے ان نادانوں کو جو اپنے علم و عقل کے غرے یا ذاتی میلان کی بناء پر اس خدائی قانون میں ترمیم کرنا چاہیں تنبیہہ فرمائی ہے کہ یہ تقسیم اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہے اس کے ہر حکم میں گہری حکمت ہے اور اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے انسان اپنی بلند پروازیوں سے اس کے علم کی وسعتوں کو پا سکتا نہ اس کی حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے بندۂ مومن کا کام یہی ہے کہ وہ اللہ کے احکام کو سنے اور ان کے سامنے سر جھکا دے کسی بات کی حکمت سمجھ میں آ جائے تو اس کے حضور میں سجدہ شکر بجا لائے سمجھ میں نہ آئے تو اسے اپنی عقل کے نقص پر محمول کرے احکام الٰہی کے باب میں صحیح رویہ یہی ہے اس تنبیہہ کے بعد بیوی اور شوہر کے حصے بیان کیے گئے ہیں اس کے بعد آخر میں کلالہ کے حصے بیان ہوئے ہیں[جاوید غامدی، میزان حصہ اول، ص ۵۸، ۵۹، دار الاشراق لاہور، مئی ۱۹۸۵ء، ناشر ڈاکٹر منیر احمد کتاب کا یہ نسخہ جناب خورشید احمد ندیم نے ہمارے بزرگ شکیل عثمانی سابق کنٹرولر نیوز ریڈیو پاکستان، اسلام آباد کو ۷/دسمبر ۱۹۹۱ء کو تحفتاً پیش کیا شکیل عثمانی صاحب نے یہ نسخہ ہمیں تحقیق کے لیے عطا فرمایا]

غیر مضار وصیۃ من اللہ واللہ علیم حلیم میں تاکید ہے کہ وارث بنانے کا یہ عمل کسی حق دار کے لیے ضرر کا موجب نہیں ہونا چاہیے اللہ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیے [جاوید غامدی، ص ٦٦، میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، دار الاشراق، لاہور] آیت کلالہ کی رو سے چونکہ مرنے والا اپنی مرضی سے کسی رشتے دار کو وارث بنا سکتا ہے اس لیے حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اس حق کو استعمال کرتے ہوئے کوئی شخص وارثوں کی حق تلفی نہ کرے اسے چاہیے کہ اس حق کا استعمال

احتیاط کے ساتھ کرے یہ ہما شما کا مشورہ نہیں ہے پروردگار کائنات کی وصیت ہے [ص ٦٦، میزان، حصہ اول، ۱۹۸۵، دارالاشراق لاہور] اللہ نے میت کے ترکے میں والدین اور اقرباء کے حصے اس لیے متعین فرمائے ہیں کہ انسان نہیں جانتا کہ ان میں سے کون بہ لحاظ منفعت اس سے قریب تر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے وہاں ان حصوں کو اپنی وصیت قرار دیا ہے جس کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کو اپنی کوئی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے [جاوید غامدی، میزان، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ۱٦۴، دارالاشراق لاہور] سورہ نساء میں تقسیم وراثت کا یہی حکم ہے جس سے اوپر کی آیت کا حکم منسوخ ہوا ہے۔ [ص ۱٦۵، محولہ بالا] يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا [۴:۱۱] جن رشتہ داروں کو اللہ نے کسی میت کے وارث قرار دیا ہے ان کے بارے میں مبنی برانصاف قانون وہی ہے جو اس نے خود بیان فرمادیا ہے چنانچہ اس کی طرف سے اس قانون کے نازل ہوجانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ان وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا [میزان، اپریل ۲۰۰۲ء ص ۱۷۰] ۲۰۰۷ء تک غامدی صاحب کا موقف آیت میراث کے بارے میں یہی تھا کہ اللہ نے یہ حصے خود مقرر کیے ہیں یہ قانون حجت ہے برہان ہے ناقابل تغیر ہے مگر حسب معمول حضرت والا کا ارتقاء ہوگیا۔

[۱۰۰] وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی میراث کے حصے قطعی ہیں: وارث کے حق میں وصیت ہوسکتی ہے: میراث کے حصے قطعی وحتمی نہیں ہیں: میراث کے حصوں کی علم وعقل میں کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جاسکتی: مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اس کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا پھر کوئی وصیت اگر اس نے کی ہو تو وہ پوری کی جائے گی اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی الا یہ کہ اس کے حالات یا اس کی کوئی خدمت یا ضرورت کسی خاص صورت حال میں اس کا تقاضہ کرے [ص ۴۹۹، ۵۰۰ میزان ۲۰۰۸ء] ہر مسلمان اب اسی قانون کے مطابق وصیت [مراد سورہ

نساء آیت: ۷] کا پابند ہے اور دستور کے مطابق وصیت کا حکم باقی نہیں رہا [ص ۵۱۹، میزان ۲۰۰۸ء] انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تقسیم وراثت کے معاملے میں وہ انصاف پر مبنی کوئی فیصلہ کر سکے والدین اور اولاد میں سے کون بہ لحاظ منفعت اس سے قریب تر ہے وہ نہیں جانتا علم و عقل میں اس کے لیے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جا سکتی اس لیے یہ فیصلہ اس کا پروردگار ہی کر سکتا ہے چنانچہ جن رشتے داروں کو اس نے کسی میت کے وارث قرار دیا ہے ان کے بارے میں مبنی بر انصاف قانون وہی ہے جو اس نے خود بیان فرمایا ہے اللہ کی طرف سے اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد کسی مرنے والے کو رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھہرائے ہوئے وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا یہ تقسیم اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہے [ص ۵۲۴، ۵۲۵ میزان ۲۰۰۸ء] تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وارثوں کی کوئی ضرورت یا ان میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز تقاضہ کرے تو اس صورت میں بھی ان کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی [ص ۵۲۵، میزان ۲۰۰۸ء] اس لیے یہ وصیت کی جا سکتی ہے مگر اللہ کی وصیت کے مقابلے میں کوئی مسلمان اب رشتہ داری پر اپنی کوئی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا من بعد وصیۃ کے جو الفاظ ان آیتوں میں بار بار آئیں گے ان سے مراد بھی ایسی ہی کوئی وصیت ہے جو وارثوں کے سوا کسی دوسرے کے حق میں ہو یا وارثوں کی کسی ضرورت کے لیے یا ان کی کسی خدمت کے صلے میں خود ان کے حق میں کی جائے [ص ۵۲۵ محولہ بالا] وارث بنانے کا عمل کسی حق دار کے لیے موجب ضرر نہیں ہونا چاہیے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اللہ نے اصل وارثوں کے حصے خود متعین فرما دیے ہیں [ص ۵۳۱ میزان] یہ اصول اوپر بیان کردہ اصول کی تردید کر رہا ہے جب اصل وارثوں کے حصے متعین ہیں تو پھر ان کے لیے وصیت کیوں؟ کیا آیت کے لفظ و معنیٰ میں کوئی ایسا قرینہ ہے کہ اللہ کے مقررہ حصوں کے باوجود اس میں کوئی وسعت پیدا کی جا سکے یہ وسعت تو قرآن میں ترمیم، اضافہ ہے اور غامدی صاحب کے اصول کے مطابق رسالت مآبؐ کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ قرآن کی کسی آیت کی تحدید تخصیص ترمیم کر سکیں [ص ۲۵ میزان ۲۰۰۸ء] جو حق رسالت مآبؐ کو حاصل نہیں ہے وہ حق غامدی صاحب نے کیسے اور کہاں سے حاصل کیا ہے یہ ہے اصل سوال؟ کیا اللہ وارثوں کی ضرورت نہیں جانتا کیا اسے ورثاء کی ممکنہ کسمپرسی، بدحالی، معاشی تباہی کا اندازہ نہیں یا اللہ کے بندے اللہ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں اور اپنے ورثاء کا خیال اللہ سے زیادہ رکھ سکتے ہیں۔ غامدی صاحب نے آیت میراث کی جو تحدید تخصیص کی

ہے وہ ان کے اصول نمبر ۸۷ کے خلاف ہے جس کے مطابق پیغمبر کو بھی قرآن کی آیت میں وسعت و ترمیم کا اختیار نہیں ہے۔

[۱۰۱] وراثت کا استحقاق قرابت نافعہ کی بنیاد پر قائم ہے مسلمان کسی کافر کا اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا کافر کی تخصیص نہیں ہے ہر قسم کا کافر وارث نہیں ہوسکتا: وراثت کا استحقاق صرف قرابت نافعہ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے قرآن کا ارشاد ہے یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَ لِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصِیْ بِهَاۤ اَوْ دَیْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا [۴:۱۱] [ص ۱۲۱، میزان حصہ اول دارالاشراق، لاہور] ایک یہ کہ وارث و مورث کے مابین کسی وجہ سے دین کا تعلق باقی نہ رہے اور دوسرے یہ کہ کوئی وارث اپنے مورث کو قتل کر ڈالے۔ آپ نے اگر اللہ سے اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق رشتہ استوار کر لیا ہے تو اس طریقے سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ آپ کا تعلق اب اس مودت و محبت کی بناء پر قائم نہیں ہوسکتا جسے معیشت و معاشرت میں منفعت کا باعث قرار دیا جاسکے اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر اس شخص کو چھوڑ دیں گے جو اے ہمارے مالک تیری نافرمانی کرے گا نبیؐ نے فرمایا ہے مسلمان کسی کافر کا وارث ہوسکتا ہے۔ نہ کافر کسی مسلمان کا اور قاتل مقتول کی میراث نہیں پائے گا حضورؐ کے ان ارشادات کو تبیین کے سوا کچھ اور قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ [ص ۱۳۲، ۱۲۴، ۱۲۵، میزان حصہ اول، ۱۹۸۵ء] غامدی صاحب نے کلالہ کے وارث کو پابند کیا ہے کہ وہ تقسیم میراث میں کسی وارث کو ضرر نہ پہنچائے اللہ کے متعین حصوں کے مطابق تقسیم کرے حالانکہ ان ورثاء کی ضرورتیں بھی ہوسکتی ہیں لیکن غامدی صاحب نے کلالہ کے ورثاء میں اللہ کی تقسیم کو بر قرار رکھا غیر کلالہ کے ضمن میں خود اجتہاد فرمایا۔

[۱۰۲] مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے: وراثت کا حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہ قرابت نافعہ ہے لیکن ان [وارثوں] میں سے کوئی اگر اپنے مورث کے لیے منفعت کے بجائے سراسر اذیت بن جائے تو اللہ کی طرف سے علت حکم کا یہ بیان تقاضہ کرتا ہے کہ اسے وراثت سے محروم

قرار دیا جائے نبیؐ نے اسی کے پیش نظر جزیرہ نما عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے یعنی اتمام حجت کے بعد جب یہ منکرین حق خدا اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آ گئے ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرابت کی منفعت بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے چنانچہ یہ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے [میزان ص ۱۷۰، ۱۷۱، طبع دوم ۲۰۰۲ء، دارالاشراق لاہور] میزان حصہ اول میں حضرت والا نے حدیث رسول سے صرف یہ استدلال کیا تھا کہ مسلمان کسی کافر کا کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا اس بیان میں ہر قسم کے کافر کو شامل کیا گیا تھا اب ارتقاء کے بعد اس حکم کی تخصیص کر دی گی کہ صرف اور صرف جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین یہود و نصاریٰ مسلمان کی میراث سے حصہ نہیں پا سکتے اب چونکہ یہ رہے نہیں لہٰذا یہ حکم جو وقتی عارضی تھا اور ایک خاص عہد و خاص تاریخ کے لیے تھا اب خود بخود منسوخ ہو چکا ہے لہٰذا دیگر کفار اور خود یہود و نصاریٰ بھی مسلمان کے وارث ہو سکتے ہیں لیکن ۲۰۰۲ء میں ارتقاء ہو گیا اور اب حدیث صرف عہد رسالت کے مشرکین یہود و نصاریٰ تک محدود کر دی گئی کیونکہ ان پر اتمام حجت ہو چکا تھا لہٰذا صرف وہ کفار مشرکین اہل کتاب اس وقت کے مسلمانوں کے وارث نہیں ہو سکتے تھے اب نہ وہ کفار و مشرکین و اہل کتاب رہے نہ موجودہ مسلمان عہد حاضر کے کفار پر اتمام حجت کر سکتے ہیں کیونکہ غامدی صاحب کے قانون اتمام حجت کے تحت صرف یہ کام پیغمبر ہی کر سکتا تھا اور پیغمبر کے انتقال کے بعد صحابہ نے یہ کام اس لیے کیا کہ پیغمبر قیصر و کسریٰ کو خط لکھ کر اپنی زندگی میں اتمام حجت کر چکے تھے لہٰذا عصر حاضر کے تمام مسلمان تمام کفار مشرکین یہود و نصاریٰ اور تمام دیگر کفار مسلمانوں کے وارث ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ مسلمانوں کے کھلے دشمن نہیں ہیں قرابت کی منفعت ختم نہیں ہوئی ہے۔ غامدی صاحب نے یہی موقف میزان ۲۰۰۸ء کے صفحہ ۵۲۴ اور ۵۲۵ پر برقرار رکھا ہے جس کے تحت صرف جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین و نصاریٰ مسلمانوں کی میراث میں وارث نہیں ہو سکتے کیونکہ اتمام حجت کا قانون ان پر لاگو ہو گیا تھا دوسرے معنوں میں عہد حاضر کے کفار مسلمانوں کے وارث ہو سکتے ہیں یہی موقف غامدی صاحب نے میزان ۲۰۱۰ء کے ص ۵۲۳ پر یہی موقف دہرایا ہے اس میں تبدیلی نہیں کی۔

[۱۰۳] آیت میراث میں اللہ نے وصیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی مورث جس کے لیے خواہ وہ اس کا وارث

ہی کیوں نہ ہو جتنی چاہے وصیت کرسکتا ہے تمام وارثوں کو بھی محروم کر کے کسی ایک وارث یا غیر وارث کے حق میں وصیت کرسکتا ہے۔ وصیت کی تحدید قرآن کی روح کے خلاف ہے قرآن نے وصیت کے لیے کوئی شرط عائد نہیں کی اللہ نے علی الاطلاق فرمادیا ہے جس کے لیے چاہے وصیت کر دو۔ مقامات میں غامدی صاحب کا آیت میراث کے فہم پر مزید ارتقاء ہوا لکھتے ہیں آیت میراث میں وصیت کے لیے اللہ نے کوئی تحدید عائد نہیں کی آیت میں علی الاطلاق فرمایا ہے کہ یہ تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی زبان و بیان کے کسی قاعدے کی رو سے اس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی: تقسیم وراثت کا جو قانون قرآن میں بیان ہوا ہے اس میں بار بار تاکید ہے کہ یہ تقسیم اس وصیت کے بعد ہے جو مرنے والا کسی کے لیے کرتا ہے اس پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں (۱) ایک یہ کہ وصیت کے لیے کوئی حد مقرر کی گئی ہے یا آدمی جس کے لیے جتنی چاہے وصیت کرسکتا ہے۔ (۲) دوسرا یہ کہ وصیت کیا ان لوگوں کے حق میں بھی ہوسکتی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے میت کا وارث ٹھہرایا ہے۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں کسی تحدید کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق فرمادیا ہے کہ یہ تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی۔ زبان و بیان کے کسی قاعدے کی رو سے اس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وارثوں کے حق میں خود اللہ نے وصیت کردی ہے لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ ان کے لیے کوئی وصیت بر بنائے رشتہ داری نہیں ہوسکتی مگر انہی وارثوں کی کوئی ضرورت یا ان میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اسی نوعیت کی کوئی دوسری چیز تقاضہ کرے تو وصیت یقیناً ہوسکتی ہے چنانچہ کسی کا بچہ اگر زیر تعلیم ہے دوسرے بچے برسر روزگار ہیں اور وہ ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکا یا بچوں میں سے کسی نے والدین کی زیادہ خدمت کی ہے یا کسی کو اپنی بیوی کے معاملے میں اندیشہ ہے کہ اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا تو وہ ان کے حق میں وصیت کرسکتا ہے وصیت ان وارثوں کے حق میں بھی ہوسکتی ہے اس میں کوئی چیز مانع نہیں [عبارت کا سن تحریر ۲۰۰۸ء درج ہے۔ مقامات ص ۱۴۱، ۱۴۲، طبع اول ۲۰۰۸ء، المورد لاہور] غامدی صاحب کے فلسفے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ رب العزت کا علم مورث کے ورثاء کے بارے میں کامل نہیں ہے [نعوذ باللہ] لہٰذا غامدی صاحب نے مورث کی مشکلات، خدشوں وسوسوں اور اندیشوں کے پیش نظر اللہ اور اس کے رسول سے بڑھ کر رحم کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ حقیقت میں ارحم

الراحمین ہیں [نعوذ باللہ]

آیت وصیت کی تفسیر میں میں غامدی صاحب کا ارتقاء آپ نے دیکھ لیا اصول نمبر ۸۷ میں غامدی صاحب نے رسالت مآب کو بھی پابند کیا ہے کہ وہ قرآن کی کسی آیت کی تخصیص تحدید توسیع ترمیم نہیں کر سکتے مگر رسول کو جو اختیار حاصل نہیں ہے وہ غامدی صاحب نے اپنے لیے حاصل کر لیا اور رسول کو جس اختیار سے غامدی صاحب نے محروم فرما دیا ہے اپنے لیے اس اختیار کا دروازہ خود کھول لیا دین وہ ہے جسے غامدی صاحب کا فہم قبول کرے سوال یہ ہے کہ میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، میزان طبع دوم ۲۰۰۲ء میزان ۲۰۰۸ء میزان ۲۰۱۰ء میں ان کو عربیت، لغت، زبان، بیان، محاورے کے ذریعے وصیت کے لا محدود ہونے کا فہم کیوں حاصل نہ ہو سکا ۱۹۸۵ء، ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۸ء میں یہی قرآن تھا یہی آیت تھی یہی عربی زبان تھی زبان و بیان کے تمام قاعدے بھی یہی تھے تب غامدی صاحب کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وصیت پر کوئی تحدید نہیں ہو سکتی اور مورث اگر چاہے تو کسی وارث کے حق میں بھی پوری میراث وصیت کر سکتا ہے قرآن کی ایک ہی آیت سے غامدی صاحب چار مختلف مطالب کس اصول کے تحت اخذ کر رہے ہیں جبکہ میزان میں ان کا اصول یہ ہے کہ قرآن کی ایک آیت کے صرف ایک ہی معانی ہو سکتے ہیں۔

[۱۰۴] قانون اتمام حجت کے باوجود بھی کسی قوم کو ختم کرنے کی سزا نہیں دی جا سکتی: اس سے مستثنیٰ صرف بنی اسرائیل رہے جن کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سیدنا مسیحؑ کے ان کو چھوڑنے کے بعد ان کی ہلاکت کے بجائے ہمیشہ کے لیے مغلوبیت کا عذاب ان پر مسلط کر دیا گی [ص ۴۹] یہود نے سیدنا مسیحؑ کا انکار کیا تو قانون اتمام حجت کے تحت ان پر اللہ کا عذاب غامدی صاحب کے اصول کے تحت نازل ہو کر ان کا خاتمہ ہونا چاہیے تھا مگر اللہ نے بس قیامت تک مغلوب کر دیا مگر کس کا مغلوب کیا؟ یہ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا غامدی صاحب نے ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ یہود مسیح کے ماننے والوں کے ہاتھوں مغلوب رہیں گے اور یہود عیسائیوں کے ہاتھ مغلوب ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مسیح کے منکرین رسالت مآبؐ کے منکرین کے ہاتھوں مغلوب ہیں جب کہ عیسائی تو مسیح کو ابن اللہ مانتے ہیں شرک میں گرفتار ہیں۔ یہود کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے سیدنا مسیحؑ کی پیروی نہیں کی تو وہ قیامت تک مغلوب کر دیے گئے اور ان کی وہ نسلیں بھی جن پر اتمام حجت نہیں ہوا اپنے آبا و اجداد کے جرم کی سزا قیامت تک بھگتتی رہیں گی غامدی صاحب کے فلسفے کے تحت بعد والی نسلوں پر یہ غلبہ ظلم ہے۔ سیدنا مسیح کے بعد آنے والے

یہودیوں کا کیا قصور مگر غامدی صاحب تمام یہود کو قیامت تک مغلوبیت کے دائمی عذاب کا مستحق سمجھتے ہیں جنھوں نے رسالت مسیح کا انکار کیا لیکن دوسری جانب رسالت مآبؐ کے معاملے میں یہود ونصاریٰ کے حوالے سے ان کا موقف یہ ہے کہ رسالت محمدیؐ کے انکار کے باوجود ان پر مغلوبیت کا عذاب مسلط نہیں ہوگا اور یہود ونصاریٰ کے متعلق قرآن وحدیث کے تمام احکامات صرف عہد رسالت کے یہود ونصاریٰ سے متعلق ہیں جن پر اتمام حجت ہوا بعد کے یہود ونصاری پر چونکہ اتمام حجت نہیں ہوا اور نہ کبھی اتمام حجت ہوسکتا ہے لہٰذا مشرکین کے لیے قتال اور اہل کتاب کے لیے جزیہ دے کر ذمی بننے کا قانون اب قیامت تک کسی مشرک اور کسی یہودی عیسائی پر لاگو نہیں ہوسکتا [تفصیلات کے لیے غامدی صاحب کی کتاب میزان کا قانون دعوت قانون جہاد ملاحظہ کیجیے] لہٰذا وہ قرآن وحدیث کے تمام احکامات سے وہ ماوراہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا سیدنا مسیحؑ کو رسالت مآب صلعم پر برتری حاصل ہے کہ ان کو نہ ماننے والے یہود کی قیامت تک آنے والی نسل بغیر اتمام حجت کے مستحق عذاب ولعنت ہے لیکن رسالت مآب کے منکرین یہود ونصاریٰ کی آیندہ آنے والی نسلیں معاف ہیں یہ دہرے معیار قرآن نے متعین کیے ہیں یا غامدی صاحب نے —— یہودیوں نے مسیح کا انکار کیا تو ان پر قیامت تک مغلوبیت لکھ دی گئی مگر نصاریٰ نے آخری پیغمبر کا انکار کیا جنھیں دوسرے پیغمبروں پر بعض فضیلتیں بھی حاصل ہیں تو ان کے منکرین کو اللہ نے مغلوبیت کا عذاب قیامت تک نہیں چکھایا اور رسول کی زندگی میں جو عذاب ذمی، جزیہ وغیرہ کے ذریعے مسلط کیا گیا تھا وہ بھی صرف انہی یہودیوں عیسائیوں کے لیے اللہ کا خاص انعام تھا جو عہد رسالت کے تھے رسول رحمت نے اپنے جذبۂ رحمت کے تحت اپنے منکرین کی آنے والی نسلوں کو اس عذاب سے محفوظ رکھا غامدی صاحب کے خیال میں رسول کی دعوت کے پانچ مراحل ہوتے ہیں انذار، انذار عام، اتمام حجت، ہجرت و برأت، جزاوسزا [قانون دعوت میزان ص ۵۳۴ تا ۵۴۳] پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑنے کے بعد عذاب آسمان سے مسلط کیا جاتا ہے۔دوسری صورت میں عذاب کا فیصلہ رسول اور اس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے [ص ۵۴۳، میزان ۲۰۰۸ء] سوال یہ ہے کہ مسیحؑ جو رسول تھے ان کے معاملے میں آسمان سے عذاب کیوں نہیں آیا اور ان کے منکرین یہود قیامت تک مغلوب کیوں رہیں گے اور رسالت محمدی کے منکرین یہودیوں پر کیوں غالب رہیں گے؟ منکرین عیسیٰ کو سزا منکرین محمدؐ کے ذریعے کیوں دی جارہی ہے؟ اس کی کیا حکمت ہے؟

[۱۰۴] اجنبی عورتوں سے مسلمان عورتوں کو اجنبی مردوں کی طرح پردہ کرنا چاہیے: (اجنبی لوگوں کے سامنے) زیبائش کی چیزیں البتہ مستثنیٰ ہیں جو عادتاً کھلی ہوتی ہیں یعنی ہاتھ پاؤں اور چہرے کا بناؤ سنگھار اور زیورات (یعنی عورت اجنبی مردوں کے سامنے چہرے کے بناؤ سنگھار اور زیورات کی زینت دکھا سکتی ہے) یعنی وہ اعضا جنھیں انسان عادتاً اور جبلی طور پر چھپایا نہیں کرتے اور وہ اصلاً کھلے ہی ہوتے ہیں لہٰذا ان اعضاء کے سوا باقی ہر جگہ کی زیبائش عورت کو چھپا کر رکھنی چاہیے [ص ۴۶۵، ۴۶۶ میزان ۲۰۰۸ء] قریبی اعزہ اور متعلقین کے سامنے اظہار زینت کی پابندی نہیں ہے اس سے واضح ہے کہ اجنبی عورتوں کو بھی مردوں کے حکم میں سمجھنا چاہیے اور ان کے سامنے بھی مسلمان عورتوں کو اپنی چھپی ہوئی زینت کے معاملے میں محتاط رہنا چاہیے [میزان ص ۴۶۶، ۲۰۰۸ء]

[۱۰۵] عورتیں اپنا سر مردوں کے سامنے کھول سکتی ہیں: مدعا یہی ہے کہ عورتوں کو اپنا سینہ اور گریبان مردوں کے سامنے کھولنا نہیں چاہیے ڈھانپ کر رکھنا چاہیے [میزان، ص ۴۶۷ محولہ بالا]

[۱۰۶] سورۂ احزاب میں پردے کا حکم صرف ازواج مطہرات کے لیے ہے: غامدی صاحب نے یہ نقطۂ نظر مولانا ابو الکلام آزاد سے سرقہ کیا ہے۔ یہ ان کی ذاتی تحقیق نہیں ہے لکھتے ہیں آپ کی ازواج مطہرات لوگوں سے پردے میں ہوں گی اور قریبی اعزہ و میل جول کی عورتوں کے سوا کوئی ان کے سامنے نہ آئے گا جس کو کوئی چیز لینا ہو گی وہ بھی پردے کے پیچھے سے لے گا [میزان ۴۷۳ محولہ بالا] سوال یہ ہے کہ ازواج مطہرات امت کی مائیں ہیں قرآن کے حکم کے تحت کوئی مسلمان ان سے نکاح نہیں کر سکتا یہ امت پر حرام ہیں جو خواتین امت کے لیے حرام ہیں غامدی صاحب ان کو انتہائی سخت پردے میں بٹھا رہے ہیں ان پر پابندیاں عائد کر رہے ہیں اور وہ خواتین جن کا نکاح ہر اجنبی مرد سے ہو سکتا ہے ان خواتین کو گھومنے پھرنے مردوں سے ملنے آزادانہ اختلاط کی اجازت عام دے رہے ہیں بلکہ خواتین اور مردوں کو اپنے پروگرام میں مخلوط محفل آرائی کا موقع بھی فراہم کر رہے ہیں جبکہ اس اختلاط کے نتیجے میں عورتوں مردوں کی زنا کاری میں مبتلا ہونے کا شدید خطرہ ہے ان کی یہ دلیل کہ پردہ کا حکم صرف ازواج مطہرات کے لیے ہے نہ تاریخ سے ثابت ہے نہ اجماع امت سے نہ قرآن سے نہ عقل سے۔ ان کی عقلی دلیل اسی قسم کی ہے کہ اسلام کے ناقد کہتے ہیں کہ یہ کیسا اسلام ہے مدینۃ النبی کے معاشرے میں ایک لونڈی تو آزاد ہے جہاں چاہے جا سکتی ہے اس پر حجاب کے احکامات کا اطلاق نہیں ہوتا اور آزاد عورت

گھر کے اندر بند ہے اس پر احکامات حجاب کا اطلاق کر دیا گیا ہے اس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے یہ عجیب حکمت دین ہے کہ غلام آزاد ہیں اور تمام آزاد عورتیں غلام ہیں اعتراض کرنے والے کے منہاج میں آزادی کا تصور ہی مختلف ہے وہ یہی اعتراض غامدی صاحب کے فلسفے پر بھی کر سکتا ہے۔ قرآن کی آیت کا فہم صرف لغت عرب سے نہیں تعامل صحابہ اجماع امت اور ازواج مطہرات کی بیان کردہ توجیہات سے ملے گا تمام امت کا فہم ایک طرف تاریخ کی شہادت ایک طرف اس کے مقابلے پر صرف اور صرف غامدی صاحب کے مطالعے اور تحقیق کی بنیاد پر اخذ کردہ دین کسی کے لیے حجت نہیں ہے۔

[۱۰۷] داڑھی رکھنے کا حکم ہے بڑھانے کا نہیں: آپؐ نے متکبرانہ وضع ترک کر دینے کی نصیحت کی اور فرمایا ہے کہ وہ داڑھی بڑھا لیں لیکن مونچھیں ہر حال میں چھوٹی رکھیں اس نصیحت کا صحیح محل یہی تھا مگر لوگوں نے اسے داڑھی بڑھانے کا حکم سمجھا اور اس طرح ایک ایسی چیز دین میں داخل کر دی جو اس سے کسی طرح متعلق نہیں ہو سکتی [میزان ص ۲۳۵ محولہ بالا]

[۱۰۸] سستی چیز کے ساتھ مہنگی چیز دے دینا ناجائز ہے: قرآن کا حکم ہے پورا ناپو کسی کو گھاٹا نہ دو لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اشیاء میں ملاوٹ کا معاملہ یہی ہے اگر کوئی شخص دودھ میں پانی گندم میں جو ملا کر بیچتا ہے تو جرم کا ارتکاب کرتا ہے خریدار کو اس کی خریدی ہوئی چیز پوری نہیں دیتا یہ دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے [میزان ص ۲۳۱، ۲۳۲، محولہ بالا] غامدی صاحب کے اس اصول کو عقل کی میزان پر پرکھتے ہیں اس وقت گندم چالیس روپے کلو ہے جو سو روپے کلو اگر کوئی دکاندار گندم خریدنے والے کو گندم میں جو ملا کر دیتا ہے تو یہ دکان دار کا نقصان ہے اور خریدار کا فائدہ۔ خریدار کا فرض ہے کہ ایسی صورت میں وہ مال واپس کر دے یا جو تلوا کر اس کی اضافی قیمت دکان دار کو ادا کرے گندم جو کی ملاوٹ اب گھاٹے کا کام نہیں ہے ایسی صورت میں گناہ گار دکاندار نہیں خریدنے والا ہوگا۔ جو دکاندار کو قیمتی مال واپس نہیں کرتا اور اس ملاوٹ پر دکان دار کو بد دیانت بھی قرار دیتا ہے۔

[۱۰۹] حرم مدینہ مکہ کی طرح حرام ٹھہرایا گیا ہے: آپؐ نے فرمایا کہ ابراہیمؑ نے جس طرح مکہ کو حرام ٹھہرایا ہے میں نے اسی طرح مدینہ کو حرام ٹھہرایا ہے [ص ۴۰۱، میزان محولا بالا] غامدی صاحب کے اصول کے تحت حرام وحلال کا فیصلہ صرف اللہ کر سکتا ہے اور رسول کو اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو حلال و حرام قرار دے تو نعوذ باللہ رسالت مآبؐ نے اپنے اختیار سے تجاوز کیا؟ اور غامدی صاحب نے اپنے اصول نمبر

۸۷ کی روشنی میں اس عمل پر کوئی اعتراض نہیں کیا [نعوذ باللہ] اپنے اصول سے انحراف غامدی صاحب کے اپنے اصول کی نفی ہے جو قانون عبادات کے تحت بیان ہوا ہے ''آدمی اگر اپنے اجتہاد یا گمان کے مطابق کسی چیز کو دین وشریعت کا تقاضہ سمجھتا ہے تو اس سے قطع نظر کہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم ہے یا نہیں اس کی خلاف ورزی اس کے لیے جائز نہیں [میزان ۳۶۸، ۲۰۰۸ء]

[۱۱۰] دوسرے مقصد کے لیے بقرہ اور انفال دونوں میں یکون الدین کلہ للہ کی تعبیر اختیار کی گئی ضمیر منصوب کا مرجع مشرکین عرب ہیں لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ ان الفاظ کے معانی یہاں اس کے سوا کچھ نہیں کہ دین سرزمین عرب میں پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے اس کے لیے قتال کا جو حکم دیا گیا اس کا تعلق شریعت سے نہیں قانون اتمام حجت سے ہے حجت پوری ہو جائے تو منکرین پر عذاب آ جاتا ہے عذاب کا یہ فیصلہ رسولوں کی طرف سے انذار، انذار عام، اتمام حجت، ہجرت و برأت کے مراحل سے گزر کر آتا ہے [ص ۵۹۷ میزان ۲۰۰۸ء] سوال یہ ہے کہ جب قرآن نے صرف اور صرف سرزمین عرب میں دین کو پورے کا پورا اللہ کے لیے کرنے کا حکم دیا تو رسالت مآبؐ نے نعوذ باللہ اس حکم سے تجاوز کرتے ہوئے ۔حبشہ، قیصر وکسریٰ اور عرب کے اردگرد کے تمام حکمرانوں کو اتمام حجت کے قانون کے مراحل پورے کیے بغیر بس ایک خط لکھ کر اتمام حجت کیے بغیر حکم دے دیا کہ یا دین قبول کرو یا جگ کے لیے تیار ہو جاؤ جب کہ قرآن نے صرف اور صرف سرزمین عرب میں دین کو پورے کا پورا اللہ کیے خالص کرنے کا حکم دیا تھا اس حکم میں توسیع، تجاوز، اضافہ، ترمیم تصحیح رسالت مآب نے نعوذ باللہ کیسے کی رسول کو تو غامدی صاحب نے میزان میں اس اختیار سے ہی محروم کر دیا [تفصیلات کے لیے ص ۲۵، میزان دیکھیے]۔

[۱۱۱] صرف ظلم وعدوان کے خلا.ف قتال فرض ہے یہ قتال دفاعی نوعیت کا ہو سکتا ہے۔: قیامت تک دین کے قیام کے لیے دنیا کی کسی قوم پر حملہ نہیں کیا جا سکتا مسلمان صرف ظلم وعدوان کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں: قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے مسلمانوں کے لیے قتال کی بس ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم وعدوان کے خلاف جنگ ہے اس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی [ص ۶۰۱ میزان محولہ بالا] یہاں غامدی صاحب نے اقدامی جہاد کا ذکر نہیں کیا ہے صرف دفاعی جہاد کا ہی بیان ہے کیونکہ آپ پر حملہ ہو تو آپ ظلم وعدوان کا شکار ہوئے لہٰذا آپ صرف دفاع

کر سکتے ہیں لیکن سورۂ احزاب میں عریانی فحاشی پھیلانے والوں کے بارے میں حکم ہے قتلو تقتیلا تو کیا انٹر نیٹ کے ذریعے دنیا میں ۲۵ ہزار ویب سائٹس کے ذریعے عریانی فحاشی پھیلانے والی قوموں پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے یا نہیں؟ انٹرنیٹ کے ذریعے فتنہ کس طرح لوگوں کے دین، فطرت، اخلاق، عادات، اطوار اقدار کو بدل کر انہیں ملحد بنا رہا ہے اس کی تفصیلات کے لیے کرس ہیجز کی معرکہ آراء کتاب Impire of illusion کا باب illusion of love کا مطالعہ کافی رہے گا۔ مسلمانوں اور مسلمانوں کے سوا کسی دوسری قوم کو ظلم سے بچانے کے لیے مسلمان اقدامی جہاد کر سکتے ہیں یا نہیں غامدی صاحب نے مظلوموں کی مدد سے متعلق قرآن کی اس اجازت پر بھی پابندی لگا دی ہے کیوں کہ جہاد فتنہ ختم کرنے کے لیے ہوتا ہے اور غامدی صاحب کے خیال میں اب کسی کو جبر سے مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا لہٰذا نہ دنیا میں فتنہ باقی ہے نہ اس کے خاتمے کے لیے جہاد کہا جا سکتا ہے۔ دشمن کی جانب سے حملے کے خدشے کے پیشِ نظر اس کے ایٹم بم پھینکنے سے پہلے مسلمان دشمن پر ایٹم بم پھینک سکتے ہیں یا نہیں غامدی صاحب نے ان امور پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

[۱۱۲] یہ دفاعی جہاد کیا مسلمان ریاست کرے گی؟ غامدی صاحب نے قانون سیاست کے تحت ریاست کے دینی فرائض کے بارے میں سورۂ حج کی آیت اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ [۲۲:۴۱] سے استدلال کیا ہے ریاست نماز زکوٰۃ بھلائی کی تلقین اور برائی سے روکے گی برائی سے روکنے کا کام غامدی صاحب کے خیال میں ایک مسلمان ریاست کی عالمگیر آفاقی ذمہ داری نہیں بلکہ ریاست کی جغرافیائی حدود کے اندر رہتے ہوئے ایک مقامی، قومی، جغرافیائی ذمہ داری ہے لہٰذا وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک ایسی تعریف پیش کرتے ہیں جو مغرب کے لیے نہایت عمدہ اور قابل قبول ہے۔ وہ سورۂ توبہ کی آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ ”اگر وہ توبہ کریں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو [میزان ص ۴۸۹، ۴۹۰] مگر یہ نہیں بتاتے کہ یہ آیت تو قتال سے متعلق ہے کیا غامدی صاحب کی اسلامی ریاست کفار سے قتال کرے گی؟ اس کے تو وہ قائل ہی نہیں ہیں کہ قتال تو صرف ظلم وعدوان کے خلاف ہوتا ہے اور کفار کی ریاست کا وجود نہ ظلم ہے نہ عدوان۔ نہی عن المنکر کی تشریح کے لیے غامدی صاحب [۳:۱۰۴] آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ بعض جرائم کے لیے جو سزائیں شریعت میں مقرر کی گئی ہیں وہ اسی آیت کے حکم

کی فرع ہیں ان کے خیال میں مغرب نے آزادی حریت کی اسلامی اقدار قائم کر کے مذہبی جبر کا خاتمہ کر دیا ہے اور آزادی اظہار رائے اور جمہوریت کے ذریعے دنیا بھر کو آزادی کی نعمت عطا کر دی ہے [تفصیلات کے لیے افضال ریحان کی کتاب اسلام بمقابلہ مغرب میں غامدی صاحب کے انٹرویو سے استفادہ کیجیے] امر بالمعروف نہی عن المنکر کو وہ نہایت محدود کرتے ہوئے لکھتے ہیں "پہلی صورت [امر بالمعروف] کے لیے جمعہ کا منبر ہے جو اسی مقصد سے ارباب حل وعقد کے لیے خاص کیا گیا ہے [ص ۴۹۰ میزان] دوسرے معنوں میں امر بالمعروف صرف اور صرف مسلمانوں کے لیے ہے اور مسلمانوں میں سے بھی صرف ان مسلمانوں کے لیے جو مسجد میں آئیں گے باقی اس کار خیر سے مبرا رہیں گے جو نہیں آئی ں گے وہ نیکی کے حکم کا درست فہم حاصل نہ کر سکیں گے غامدی صاحب کی اس رائے سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ کفار مشرکین اہل کتاب کو امر بالمعروف کی تلقین اسلامی ریاست کا سرے سے کام ہی نہیں ہے کیونکہ اسلامی ریاست ایک آفاقی ریاست دارالاسلام نہیں ہوتی وہ ایک جدید قومی ریاست ہوتی ہے جو صرف اپنی قوم کے کام سے کام رکھتی ہے پرائے جھگڑوں میں نہیں پڑتی اور اپنی قوم کے بھی صرف صالح عناصر کو امر بالمعروف کرتی ہے جو جمعہ کو مسجد میں آجائیں جو جمعہ کو مسجد میں نہ آئیں وہ تو امر بالمعروف کے فریضے سے بھی باہر رہیں گے دوسری صورت [نہی عن المنکر] کے لیے پولس کا محکمہ ہے جو مسلمانوں کی ریاست میں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا جاتا ہے [ص ۴۹۰ میزان] یعنی غامدی صاحب اسلامی ریاست کے دفاع تحفظ کے لیے فوج کی ضرورت کے بھی قائل نہیں ہیں نہی عن المنکر فوج کا نہیں پولس کا کام ہے لہٰذا فوج کی ضرورت کے لیے انہوں نے ایک سطر بھی تحریر نہیں کی غالاً ان کے لیے جاپان، سوئٹزرلینڈ، ویٹی کن، مثالی ریاستیں ہیں جہاں فوج کا وجود نہیں۔نھون عن المنکر ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں فتنے کی سرکوبی، دفاعی اقدامی جہاد کی اہمیت کی دنیا میں مظلوموں کی مدد، طاغوت کی قوت توڑنے کی ضرورت سب کچھ شامل ہے برے کاموں سے روکنے کا حکم نہ صرف اسلامی ریاست کے شہریوں کے لیے ہے بلکہ دیگر اقوام کے لیے بھی ہے جو میڈیا وار کے ذریعے دنیا کے تمم معاشروں کو شدید اخلاقی بحران میں مبتلا کر کے ان کی شرم وحیاء چھین کر ان کو ایک وحشی درندے میں تبدیل کر رہی ہیں کا فریضہ صرف پولس ہی انجام دے گی اور جب غامدی صاحب کی اسلامی ریاست پر امریکی فوج حملہ کرے گی تو وہ اپنی پولس کو حکم دیں گے کہ امریکی فوج کو گرفتار کر لو یہ نہایت مضحکہ خیز انداز نظر ہے وہ لکھتے ہیں ریاست کے دینی

فرائض یہی ہیں۔[ص۴۹۰، میزان]

رسالت مآبؐ نے قیصر وکسریٰ، نجاشی، شاہ مصر، حاکم بحرین، حاکم یمامہ، حاکم دمشق شاہ عمان[میزان ص۶۰۱ محولہ بالا] کو کیوں خطوط لکھے اور ان تمام اقوام کے بادشاہوں پر قانون اتمام حجت کے چار مراحل پورے کیے بغیر[جو غامدی صاحب نے میزان ص۵۳۴ تا ۵۴۳ میں قانون دعوت کے تحت بیان کیے ہیں] ان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا جب قرآن کے تحت جزیرہ عرب میں اللہ کے دین کا غلبہ ہوگیا تو اس غلبے کو ارد گرد تک وسیع کرنے کی اجازت رسولؐ کو قرآن کی کس نص سے حاصل ہوئی۔ غامدی صاحب اپنے قانون اتمام حجت کی نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس دوران رسولؐ نے اپنی دعوت جزیرہ نمائے عرب سے باہر قریب کی تمام قوموں کے سامنے بھی پیش کردی اور ان کے سربراہوں ا۔نجاشی، ۲۔مقوقس، ۳۔خسرو پرویز، ۴۔قیصر، ۵۔منذر بن سادی، ۶۔ہوذہ بن علی، ۷۔حارث بن ابی شمر، ۸۔جیفر [کل آٹھ ملوک] کو خط لکھ کر ان پر واضح کر دیا کہ اب اسلام ہی ان کے لیے سلامتی کی ضمانت بن سکتا ہے اس کے معنیٰ یہ تھے کہ خدا کی جو حجت آپ کے ذریعے سے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر قائم ہوئی ہے وہ آپ کے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے جزیرہ نما عرب سے باہر کی ان قوموں پر قائم ہو جائے گی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد دنیا ہی میں جزاوسزا کے قانون کا اطلاق ان قوموں پر بھی کیا جائے چنانچہ یہی ہوا اس سے واضح ہے کہ یہ محض قتال نہ تھا بلکہ اللہ کا عذاب تھا جو سنت الٰہی کے مطابق پہلے عرب کے مشرکین اور اس کے بعد عرب سے باہر کی بعض قوموں پر نازل کیا گیا[میزان ص۶۰۱ ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب نے اتمام حجت کے قانون کے چار مراحل بیان کیے ہیں انذار، انذار عام، اتمام حجت، ہجرات و برأت، جزاوسزا۔[میزان ۵۳۴ تا ۵۴۳، ۲۰۰۸ء] نعوذ باللہ رسالت مآبؐ نے عرب کے ارد گرد ۸ ریاستوں کے بارے میں اس قانون کی پیروی نہیں فرمائی اس قانون کی صحیح پیروی صرف جزیرۃ العرب کے لوگوں کے بارے میں کی گئی۔ یہ تو امتیازی سلوک ہے کہ ایک قوم عرب کو تمام مواقع مہیا کر کے اتمام حجت کیا جا رہا ہے مگر اس کے مقابلے پر غیر عرب آٹھ قوموں کو صرف ایک خط لکھ دیا گیا کیا صرف پیغمبر کا ایک خط اتمام حجت کے لیے کافی ہے اگر پیغمبر کا خط اتمام حجت کے لیے کافی ہے تو جزیرہ العرب کے لوگوں پر اتنا وقت صرف کرنے کی کیا ضرورت تھی ان کے مقتدر لوگوں کو رسالت مآب صرف ایک خط لکھ دیتے اور ان پر اللہ کا عذاب نازل کر دیتے غامدی

صاحب نے قانون دعوت کے تحت اتمام حجت کا جو قانون بیان کیا ہے اس میں پیغمبر کے خط کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا غامدی صاحب کے اپنے اصول کے تحت پیغمبر کا خط اتمام حجت کے قانون کا متبادل یا مترادف نہیں ہے دوسرا سوال یہ ہے کہ رسالت مآب قیامت تک تمام امتوں کے لیے رسول ہیں اور ان کی کتاب بھی روشنی کا واحد مینار ہے وہ کافتہ اللناس ہیں تو رسالت مآبؐ نے اتمام حجت کے قانون کے تحت صرف آٹھ سربراہان کو کیوں خط لکھے اور صرف عرب کے اردگرد تک کیوں محدود رہے یہ بھی امتیازی رویہ قرار پاتا ہے کہ بقیہ دنیا ایشیاء، چین، افریقہ، یورپ، امریکہ کو دعوت سے محروم رکھا گیا نہ ان کو خط لکھا گیا نہ ان پر عذاب الٰہی مسلط کیا گیا اور رسالت مآب کافتہ للناس ہونے کے باوجود صرف نو قوموں پر اللہ کا عذاب اللہ کی سنت کے مطابق نافذ کرا کے رخصت ہو گئے غامدی صاحب کا قانون اتمام حجت محض ایک افسانہ ہے یہ قانون بھی ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۱۰ تک نت نئے رنگ بدلتا رہا ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

غامدی صاحب مغرب کے سامنے ایک ایسی اسلامی ریاست کا تصور پیش کر رہے ہیں جس سے مغرب کو کسی درجے میں بھی کسی قسم کا خوف محسوس نہ ہو علامہ یوسف قرضاوی اور مصر میں اخوان المسلمین کا منحرف سیاسی گروہ ''حزب وسط'' اسی قسم کے اسلام کو پیش کر رہا ہے ہارورڈ یونیورسٹی نے حزب وسط کے معذرت خواہانہ اسلام پر ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے Islam without fear ، غامدی صاحب بھی مغرب کو ایسے ہی اسلام کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ ایسی مریل ریاست میں مسلمانوں کو ہر قسم کی آزادی ہو گی لہٰذا غامدی صاحب لکھتے ہیں ریاست نماز، زکوٰۃ کے سوا کسی چیز کو بھی قانون کی طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتی حج پر جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔ جہاد و قتال کے لیے جبری بھرتی کا کوئی قانون نافذ نہیں کر سکتی۔ نماز، زکوٰۃ کے سوا باقی سب معاملات میں یہ صرف ترغیب و تلقین تبلیغ و تعلیم ہی ہے جس کے ذریعے سے وہ اصلاح کی جدوجہد کر سکتی ہے [ص ۴۹۲، ۴۹۳ میزان محولہ بالا] ظاہر ہے مغرب کو ایسے قانون دعوت قانون سیاست قانون ریاست قانون جہاد سے کیا اختلاف ہو سکتا ہے۔

[۱۱۳] ظلم و عدوان کے خلاف بھی قتال فرض نہیں اگر حربی قوت خاص حد تک نہ پہنچ جائے۔ دوسرے معنوں میں دفاعی جہاد بھی نہیں ہو سکتا۔ غامدی صاحب نے اصول ۱۱۱ میں فرمایا تھا کہ صرف ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہو سکتی ہے یعنی جہاد تو نہیں ہو سکتا صرف جنگ کی جا سکتی ہے [ص ۶۰۱ میزان ۲۰۰۸ء] لیکن اب فرماتے ہیں کہ ظلم و عدوان کا وجود متحقق بھی ہو تو جہاد اس وقت تک فرض نہیں ہوتا جب تک دشمن کے

مقابلے میں مسلمانوں کی حربی قوت ایک خاص حد تک نہ پہنچ جائے [ص ۵۸۶ میزان] دوسرے معنوں میں دشمن اگر ظلم و عدوان کرتے ہوئے آپ پر حملہ کر دے اور غامدی کی ریاست میں فوج تو سرے سے ہے ہی نہیں صرف پولس ہے [حوالے کے لیے میزان کا باب قانون سیاست پڑھیے] اور پولس تو فوج کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتی لہٰذا غامدی صاحب نے اسلامی ریاست کو جو بغیر فوج کے ہے جہاد سے ہمیشہ کے لیے مستثنیٰ کر دیا کیونکہ فوج جب بنے گی تب بنے گی اتنی طاقت ور ہوگی جتنا دشمن ہے اور ایک اور دو کا تناسب قائم ہوگا تب تک دشمن کا مقابلہ ہی نہ کیا جائے اور چونکہ دشمن کا مقابلہ ہماری اسلامی حکومت کی پولس بالکل نہیں کرے گی نہ کر سکتی لہٰذا دشمن اسلامی حکومت کو ہی ختم کر دے گا اور اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں غامدی صاحب کے اصول کے مطابق جہاد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جہاد کی شرط حکومت ہے کیونکہ غامدی صاحب کی دلیل کے مطابق سید احمد شہید نے بھی جب انگریز کے خلاف جہاد کیا تو پہلے آزاد علاقے میں حکومت قائم کی لہٰذا جہاد موکول علی السلطان کے دائرے میں آتا ہے لہٰذا غامدی صاحب کے اصولوں کے تحت قائم اسلامی حکومت انشاءاللہ پولس کے ذریعے اپنا دفاع کرنے سے قاصر رہے گی لہٰذا باقی ہی نہیں رہے گی تو غامدی صاحب کے دین پر چلنے کے نتیجے میں نہ اسلامی ریاست بچے گی نہ دفاعی جہاد ہوگا نہ اقدامی جہاد ہوگا اور جب ریاست ہی نہ رہے گی تو جہاد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود ختم ہو جائے گا اور مغرب کا وہ اعتراض بھی ختم ہو جائے گا کہ بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے۔

[۱۱۴] ریاست جہاد و قتال کے لیے جبری بھرتی کا کوئی قانون نافذ نہیں کر سکتی نماز، زکوٰۃ کے علاوہ کسی چیز کو بھی قانون کی طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتی نماز زکوٰۃ کے سوا باقی تمام امور میں صرف ترغیب و تلقین سے اصلاح کی جدوجہد کر سکتی ہے۔ [قانون سیاست، ص۴۹۲۔۴۹۳، میزان محولہ بالا]

[۱۱۵] جہاد میں نفیر عام کے بعد حصہ نہ لینا جرم ہے: جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا صرف اس صورت میں جرم ہے جب کوئی مسلمان نفیر عام کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے اس وقت یہ بے شک نفاق جیسا بڑا جرم بن جاتا ہے یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ہے اس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے یہ ان فرائض میں سے نہیں ہے جنھیں پورا نہ کیا جائے تو آدمی مجرم قرار پائے۔ [ص ۵۸۶، میزان محولہ بالا]

[۱۱۶] فوج کے بغیر بھی قانون جہاد کا اطلاق ہوگا: غامدی صاحب نے قانون سیاست میں بتایا تھا کہ ریاست کے پاس ینھون عن المنکر کے لیے پولس موجود رہے گی [ص ۴۹۰ قانون سیاست، میزان

۲۰۰۸ء] مگر اسی ریاست کے لیے قانون جہاد کا اطلاق کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ جہاد کا جذبہ محرکہ محض قاتلوا فی سبیل اللہ ہے یعنی محض اللہ کے لیے [ص ۵۸۶، ۵۸۷، میزان] سوال یہ ہے کہ پولس کے ساتھ فی سبیل اللہ جہاد کیسے ممکن ہے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں رسول اللہ سے صحابی نے عرض کیا مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے جو اجر و ثواب میں جہاد کے برابر ہو آپؐ نے فرمایا ایسا کوئی عمل نہیں ہے [یعنی نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی جہاد کے برابر نہیں ہے] پھر آپؐ نے پوچھا کیا یہ کر سکتے ہو کہ جب مجاہدین گھروں سے نکلیں تو مسجد میں جا کر برابر نماز میں کھڑے رہو ذرا دم نہ لو اور برابر روزے رکھتے جاؤ کبھی افطار نہ کرو؟ اس نے کہا بھلا ایسا کون کر سکتا ہے [قانون جہاد، ص ۵۸۹ میزان] ایک جانب رسالت مآبؐ جہاد کا یہ درجہ بیان کر رہے ہیں اور غامدی صاحب کے اصول نمبر ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴ جہاد کی ایک ایسی تصویر پیش کر رہے ہیں جو عالم اسلام کے لیے اجنبی ہے مگر مغرب کے لیے قابل قبول۔

[۱۱۷] انسان کو حق ہے کہ وہ اپنے آزادانہ فیصلے سے جو دین اور جو نقطۂ نظر چاہیں اختیار کریں: فتنہ کے معنی کسی شخص کو ظلم و جبر کے ساتھ اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں یہ Persecution ہے یہ دنیا اللہ نے آزمائش کے لیے بنائی ہے اور اس میں انسانوں کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے آزادانہ فیصلے سے جو دین اور جو نقطۂ نظر چاہیں اختیار کر لیں لہٰذا کوئی شخص یا گروہ اگر دوسروں کو بالجبر ان کا دین چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے تو یہ درحقیقت اس دنیا کے لیے اللہ کی پوری اسکیم کے خلاف اعلان جنگ ہے [میزان، ص ۵۹۴، ۵۹۵] دوسرے معنوں میں رسول اللہ نے مشرکین مکہ، یہود خیبر، اہل کتاب پر جو جبر کیا وہ اللہ کی اسکیم کے خلاف عمل تھا حضرت ابوبکر نے مرتدین کے خلاف قتال کیا تو انہوں نے بھی غامدی صاحب کے اصول کے خلاف عمل کیا اور رسالت مآبؐ نے بھی غامدی صاحب کے اصول کی تقلید نہیں کی [نعوذ باللہ] حضرت عمر نے خیبر کے یہود کو جلا وطن کیا خلافت راشدہ نے جزیرۃ العرب سے اہل کتاب اور مشرکین کو نکال دیا تو یہ سب کام دین اسلام قبول نہ کرنے کے باعث کیے گئے تو نعوذ باللہ رسول اللہ کی بعثت کا مقصد اللہ کی پوری اسکیم کے خلاف اعلان جنگ تھا کیونکہ اللہ نے انسانوں کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے آزادانہ فیصلے سے جو دین اور جو نقطۂ نظر چاہیں اختیار کر لیں اسی لیے مستشرقین اور مغربی مفکرین درست کہتے ہیں کہ اسلام ایک استعماری مذہب ہے جو جبراً ماضی میں بھی لوگوں کو مسلمان بناتا رہا ہے ورنہ انھیں قتل اور جلا وطن کرتا رہا ہے۔

[۱۱۸] مسلمان فتنہ کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں: قانون جہاد کے تحت غامدی صاحب نے لکھا تھا مسلمانوں کے لیے قتال کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے اس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جاسکتی [ص ۶۰۱، میزان] اسی قانون جہاد میں لکھتے ہیں کہ اقدام کی غایت دو ہیں ایک یہ کہ فتنہ باقی نہ رہے دوسرے عرب میں دین صرف اللہ کا ہو جائے [ص ۵۹۴ میزان] فتنہ کے خلاف جنگ کا یہ حکم قیامت تک کے لیے باقی ہے زمین پر اس طرح کا کوئی فتنہ جب سر اٹھائے مسلمانوں کی کوئی حکومت اگر اتنی قوت رکھتی ہو تو اس پر لازم ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لیے اٹھے اور جنگ کا اعلان کر دے مسلمانوں کے لیے قرآن کی یہ ہدایت ابدی ہے اسے دنیا کا کوئی قانون بھی ختم نہیں کر سکتا [ص ۵۹۵، میزان ۲۰۰۸ء] چلیے جنگ کے مقصد میں غامدی صاحب نے اپنے اصول کے خلاف خود ہی ایک اور مقصد کا اضافہ کر دیا مگر سوال یہ ہے کہ اسلامی ریاست جو صرف پولس رکھتی ہے وہ یہ قتال کیسے کرے گی؟ اگر مسلمانوں پر فتنہ اور ظلم و عدوان کے خلاف جہاد فرض ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاست کا قیام بھی فرض ہے کیونکہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے فرض کا مقدمہ بھی فرض ہوتا ہے نماز فرض ہے تو وضو بھی فرض ہے جہاد فرض ہے تو ایک ایسی ریاست کا وجود بھی فرض ہے جو یہ جہاد کر سکے اس بارے میں غامدی صاحب کا دین ان کی کتاب میزان خاموش ہے معلوم نہیں کیوں؟

[۱۱۹] مہر فرض ہے مہر سنت ہے: اس کے صلے میں ان کے مہر ادا کرو ایک فرض کے طور پر اسے فرض ٹھہرانے کے بعد البتہ باہمی رضا مندی سے جو کچھ طے کرلو تو ہرج نہیں [میزان ص ۴۱۶، ۲۰۰۸ء] نکاح اور خطبے کی طرح یہ [مہر] بھی ایک قدیم سنت ہے [ص ۴۱۷، میزان] میزان کے ص ۱۴ پر سنتوں کی فہرست میں مہر کی سنت شامل ہی نہیں ہے [ص ۱۴ میزان ۲۰۰۸ء]۔

[۱۲۰] حدود و تعزیرات کا نفاذ کوئی شخص انفرادی طور پر نہیں کرسکتا: جرائم کے ذیل میں ۵ جرائم [جن میں قتل و جراحت بھی شامل ہیں] کا ذکر کر کے غامدی صاحب لکھتے ہیں ان کی سزا کا حکم مسلمانوں کو ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں بلکہ پورے مسلمان معاشرے کو دیا گیا ہے۔اور اس لحاظ سے ان کے نظم اجتماعی سے متعلق ہے چنانچہ کوئی شخص یا جماعت اگر کسی خطہ ارض میں سیاسی اقتدار نہیں رکھتی تو اسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کوئی سزا کسی مجرم پر نافذ کرے ان آیات کے مخاطب امراء و حکام ہیں۔[ص ۶۱۱ میزان، ۲۰۰۸ء]

[۱۲۱] مسلمان انفرادی حیثیت میں قصاص لے سکتے ہیں: تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی کوئی باقاعدہ حکومت اگر کسی جگہ قائم نہ ہو اور قصاص کا معاملہ مقتول کے اولیاء ہی سے متعلق ہو جائے تو وہ اپنی اس حیثیت میں حدود سے تجاوز کریں اور قتال کے طور پر جوش انتقام میں قاتل کے علاوہ دوسرں کو بھی قتل کرنے کی کوشش کریں اور عورت کے بدلے میں مرد کے قتل کا مطالبہ کریں یا لاش کو آگ میں جلائیں یا مثلہ کریں [میزان، ص ۶۲۰، محولہ بالا] واضح رہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں جو مکی صورت ہے اللہ تعالیٰ نے حکومت و ریاست کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کو بدلہ لینے کی اجازت دی ہے اس اجازت کو غامدی صاحب تسلیم کرتے ہیں لہٰذا عامدی صاحب کا یہ موقف خود قرآن اور غامدی صاحب کے اصول ۱۲۰ کی روشنی میں خود مسترد ہو گیا کہ حدو تعزیرات کے لیے ریاست یا نظم اجتماعی کا وجود لازمی ہے۔

[۱۲۲] رسولوں کی امت پر عذاب لیبارٹری کے تجربات کی طرح ثابت کیے جاتے ہیں: پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ ان کے ذریعے سے [مراد رسولوں کی تکذیب کے بعد عذاب ہے] اسی دنیا میں برپا کردی اس سے مقصود یہ تھا کہ آخرت کا تصور بھی اسی معیار پر ثابت کردیا جائے جس معیار پر سائنسی

حقائق [معمل] لیبارٹری کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں اس کے بعد ظاہر ہے کہ کسی کے پاس عذر باقی نہیں رہ سکتا۔ [ص ۱۶۵ میزان ۲۰۰۸] مخاطب پوچھ سکتا ہے کہ یہ سہولت صرف پچھلوں کو کیوں دی گئی ہم اس سے کیوں محروم رہے اور تمام بنی آدم اب قیامت تک سائنسی معیار کے تجربے سے کیوں محروم کر دی گئی اگر نوع انسانی یہ خواہش ظاہر کرے کہ ہمیں بھی سائنس کی تجربہ گاہ کی طرح حقیقت کُلی تجربہ کر کے ثابت کر دی جائے کیونکہ یہ تو امتیازی سلوک ہے کہ ایک قوم کو سائنسی طریقے سے خدا کا مشاہدہ کرایا جارہا ہے اور قیامت تک آنے والی ہزاروں نسلوں کو صرف ایمان بالغیب کی دعوت دی جارہی ہے۔ یہ تو ایک الزامی جواب تھا اصل سوال یہ ہے کہ عذاب کے بعد تو عذر کا سوال ہی باقی نہیں رہتا جب عذاب آجاتا ہے تو نہ توبہ قبول ہوتی ہے نہ رجوع کی اجازت پھر تو امت کو مٹادیا جاتا ہے۔ عذر زندہ فرد پیش کرتا ہے مرنے والا فرد نہیں۔

[۱۲۳] ایمان عمل صالح اصل دین ہیں: تمدن کی تبدیلی سے شریعت بدل جاتی ہے: ایمان اور عمل صالح اصل دین ہیں ان میں کوئی ترمیم و تغیر کبھی نہیں ہوا قرآن اس معاملے میں واضح ہے تمدن کی تبدیلی کے ساتھ شریعت تو بے شک تبدیل بھی ہوئی ہے [ص ۱۹۷، میزان، ۲۰۰۸ء] قانون وحکمت دین حق ہے [ص ۱۳ میزان ۲۰۰۸ء] دین قرآن مجید اور سنت ہے [ص ۱۳، میزان] دین لاریب [قرآن وسنت] انہی دو صورتوں میں ہے ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔ [ص ۱۵، میزان] دین کی حقیقت ایک لفظ میں اللہ کی عبادت ہے [ص ٦٦ میزان] عبد و معبود کے اس تعلق کے لیے یہ عبادت جب مابعدالطبیعیاتی اور اخلاقی اساسات متعین کرتی مراسم طے کرتی اور دنیا میں اس تعلق کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حدود قیود مقرر کرتی ہے تو قرآن کی زبان میں اسے دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [ص ٦٨ میزان] خدا کے دین کو قرآن الحکمہ [مابعدالطبیعیاتی اور اخلاقی اساسات] اور الکتاب [مراسم اور حدود و قیود] سے تعبیر کرتا ہے۔ [ص ٦٨ میزان] دین کا مقصد تزکیہ ہے [ص ۲٦۳، میزان] دین کا ظہور تین صورتوں میں ہوتا ہے پرستش اطاعت اور حمیت وحمایت [ص ۲٦۳ میزان]۔

[۱۲۴] الکتاب شریعت ہے: [قرآن] اس الکتاب کو وہ شریعت بھی کہتا ہے الحکمۃ ہمیشہ سے ایک ہی ہے لیکن شریعت انسانی تمدن میں ارتقاء اور تغیر کے باعث البتہ بہت کچھ مختلف رہی ہے [ص ٦٨ میزان] قرآن وسنت میں خدا کی ابدی شریعت ہے [ص ۴۰۹ میزان] نماز کے لیے جو اعمال شریعت میں

مقرر کیے گئے ہیں [وہ سات ہیں] [ص ۲۸۸ میزان] کیا یہ سات اعمال قرآن میں بیان ہوئے ہیں جو شریعت ہے؟ نماز کے لیے شریعت کے مقرر کردہ اذکار یہی ہیں [ص ۲۹۳ میزان] سوال یہ ہے کہ قرآن میں جو شریعت ہے ان اذکار کا اس میں کوئی ذکر نہیں اور غامدی صاحب کی سنت میں بھی اس کا ذکر نہیں۔ نماز کے لیے جو رکعتیں شریعت میں مقرر کی گئی ہیں [ص ۳۱۲ میزان] قران میں رکعتوں کی تعداد کا سرے ذکر ہی نہیں ہے اور غامدی صاحب کی سنتوں کی فہرست تعداد رکعات سے خالی ہے۔ نماز کے جو اعمال واذکار شریعت میں مقرر کیے گئے ہیں [ص ۳۲۳ میزان] قرآن میں تو ان اعمال واذکار کا کوئی ذکر نہیں اور میزان میں غامدی صاحب کے اصول ومبادی کے تحت سنت میں ان کا ذکر ہو نہیں سکتا نماز کے یہ امور جن کا ذکر نہ شریعت میں ہے نہ دین میں نہ قرآن میں نہ سنت میں تو ان امور کا ماخذ کیا ہے؟ جب نماز جیسی اہم ترین عبادت کی رکعتیں، طریقے، اذکار، اعمال، مصادر دین میں نہیں ہیں تو یہ کہاں سے آئے ہیں؟ جمعہ کی نماز کا جو طریقہ شریعت میں مقرر کیا گیا ہے [ص ۳۳۲ میزان] میزان میں غامدی صاحب نے جو طریقہ بتایا ہے اس کا نہ قرآن میں ذکر ہے نہ سنت میں، نہ شریعت میں۔ معلوم نہیں ان کی شریعت کون سی ہے؟ زکوٰۃ کا قانون [شریعت سے نہیں] مسلمانوں کے اجماع اور عملی تواتر سے ہم تک پہنچا ہے [ص ۳۵۰ میزان] حج وعمرہ کا جو طریقہ شریعت میں مقرر کیا گیا ہے [ص ۳۸۷ میزان] یہاں غامدی صاحب نے جو طریقہ تفصیل سے بتایا ہے وہ نہ قرآن میں ہے نہ سنت میں ہے تو کیا شریعت قرآن وسنت سے ماوراء یا اس کے متوازی یا متبادل کوئی ذریعۂ علم ہے؟ قربانی کا قانون [شریعت سے نہیں] مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہے [ص ۴۰۵ میزان ۲۰۰۸ء] اس کے بعد جو قانون بتایا گیا ہے وہ نہ قرآن سے اخذ کردہ ہے نہ سنت سے تو یہ قانون کہاں سے آیا۔ کیا شریعت اور قانون کا مطلب حدیث، وحی خفی، خبر واحد، تعامل صحابہ، اجماع امت، تعامل امت تو نہیں ہے غامدی صاحب نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ معاشرتی ضرورت کے لیے مفصل قانون اللہ نے انبیاء کے ذریعے سے بنی آدم کو دیا ہم ان نصوص کی وضاحت کریں گے جو قرآن وسنت میں۔ خدا کی ابدی شریعت کے طور پر بیان ہوئے ہیں [ص ۴۰۹ میزان] یہاں شریعت کو قرآن وسنت بتایا گیا ہے لیکن اوپر غامدی صاحب نے جو شریعت بیان کی ہے وہ نہ قرآن میں ہے نہ سنت میں۔ اس قانون معاشرت میں غامدی صاحب نے بعض ایسی شقیں بھی شامل کی ہیں جو نہ قرآن سے ثابت ہیں نہ غامدی صاحب کی سنتوں کی

فہرست میں ان کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے یہ شریعت سے ملی ہوں گی مگر وہ کونسی شریعت ہے جو قرآن وسنت کے علی الرغم ہے؟ قرآن وسنت سے ماوراء ہے قرآن وسنت سے مختلف ہے لفظ نکاح شریعت اسلامی کی معروف اصطلاح ہے [ص ۴۴۹ میزان] جبکہ غامدی صاحب ص ۱۴ پر سنتوں کی فہرست میں اسے شریعت اسلامی کے بجائے سنت کی فہرست میں شامل کر چکے ہیں [ص ۱۴ میزان ۲۰۰۸ء] شریعت اسلامی میں غامدی صاحب نماز، معاشرت، جمعہ، حج وعمرہ کے سلسلے میں اعمال اذکار شامل کر چکے ہیں جو نہ قرآن میں ہیں نہ سنت میں لہٰذا شریعت غامدی صاحب کی ایسی اصطلاح ہے جو قرآن وسنت کے سوا بھی دین کے احکامات معلوم کرنے کا معتبر ذریعہ ہے ممکن ہے غامدی صاحب کی مراد فطرت، عقل، تاریخ ہو کیونکہ وہ فطرت کو علم کا ماخذ عقل کو پہلی وحی اور تاریخ کو قرآن کے بعض غوامض کی حقیقت معلوم کرنے کا معتبر ذریعہ قرار دے چکے ہیں۔

[۱۲۴] اسلامی ریاست سے باہر جہاد فساد ہے: شوہر باپ حکمراں سب اپنے اپنے دائرہ اختیار میں اسی کے مکلّف ہیں کہ منکر کو قوت سے مٹا دیں لیکن اس دائرے سے باہر اس طرح کا اقدام جہاد نہیں بلکہ بد ترین فساد ہے [جس کے لیے دین میں ہرگز کوئی گنجائش نہیں [ص ۵۵۹ میزان] قانون سیاست اور قانون جہاد میں غامدی صاحب نے اسلامی ریاست کو امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ صرف قومی جغرافیائی ریاست کے دائرے میں ادا کرنے کی اجازت دی ہے پھر غامدی صاحب کی ریاست کے پاس صرف پولیس ہے جو نہی عن المنکر کے لیے بنائی گئی ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ غامدی صاحب کی اسلامی ریاست کبھی پولس کے ذریعے عالمی کفر کے خاتمے کے لیے بیرونی جہاد نہیں کرسکتی وہ صرف قومی منکر ہی مٹا سکتی ہے یہی اس کا اصل دائرہ ہے اگر کرے گی تو یہ بدترین فساد ہی ہوگا۔ [۱۲۴] عقل اصلاً رہنمائی کے لیے بنی ہے نہ کہ گمراہ کرنے کے لیے عقل اپنی فطرت کے لحاظ سے میزان عدل ہے: قلب کی اسلامی منہاج میں ذریعۂ علم ورہنمائی کے حوالے سے کوئی حیثیت نہیں ۔ عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے لیکن اگر ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ان کی اصل حقیقت اور صورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے [ص ۳۴، میزان ۲۰۰۸ء] عقل ونقل میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا دین کی بنیاد ہی عقل کے مسلمات پر قائم ہے لہٰذا اگر کوئی چیز ان مسلمات سے مختلف نظر آتی ہے تو ان پر بار بار غور کرنا چاہیے۔ یہ چیز ظاہر ہے کہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب پورے یقین کے

ساتھ مانا جائے کہ عقل ونقل میں کوئی منافات نہیں ہوسکتی [ص ۶۵ میزان ۲۰۰۸ء] خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے اور عقل سے بھی بڑی نعمت قرآن ہے اس لیے کہ عقل کو بھی حقیقی رہنمائی قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے یہ نہ ہو تو عقل سائنس کی ساری دوربینیں اور خردبینیں لگا کر بھی اندھیرے میں بھٹکتی رہی ہے [ص ۳۶۲، میزان] عقل اصلاً رہنمائی کے لیے بنی ہے نہ کہ گمراہ کرنے کے لیے یعنی یہ مانا جائے کہ عقل اپنی فطرت کے لحاظ سے انسان کے اندر میزان قسط ہے [ص ۱۰۸ میزان]۔ [قرآن مجید بالصراحت کہتا ہے کہ سارا دین عقل پر مبنی ہے وہ اپنے تمام احکام وعقائد اسی بنیاد پر انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کے لیے ہر جگہ عقلی دلائل پیش کیے ہیں وہ کہتا ہے کہ گریز کرنے والے اپنی عقل سے کیوں کام نہیں لیتے [ص ۱۶۵، ۱۶۶، مقامات، ۲۰۰۸ء] عقل بہت سے دینی حقائق خود دریافت نہیں کرسکتی لیکن اللہ کے نبیوں کی طرف سے وضاحت کے بعد انھیں سمجھنے کی صلاحیت بے شک رکھتی ہے [ص ۱۶۶] آئن اسٹائن کا نظریہ اضافت طلبہ دریافت نہیں کر سکتے لیکن اب ہر روز اسے سمجھتے اور بغیر تردد کے مان لیتے ہیں استاد عقل ہی کو خطاب کرتا ہے اور اسی سے تقاضہ کرتا ہے کہ وہ اسے مانے [ص ۱۶۶] دین عقل ہی کو خطاب کرتا ہے اور عقل سے ماورا کوئی ہدایت عقل کو نہیں دیتا اس کی تمام ہدایات بالکل عقل کے مطابق ہیں [ص ۱۶۷، محولہ بالا]۔ پروردگار نے عقل کی نعمت اس لیے عطا کی ہے کہ ہم کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کو نظر انداز نہ کریں اس کے فیصلوں کے آگے سر جھکا دینا ہی ہمارے لیے باعث شرف ہے ہم زندگی کا سفر اسی کی روشنی میں کرتے ہیں [مقامات ص ۶۷ طبع دوم جولائی ۲۰۰۶ء] عقل کا مقام بے شک یہی ہے لیکن اس کے بعض حدود ہیں اس کا ذریعۂ معلومات ہمارے حواس ہمارا وجدان ہی ہے عقل مجبور ہے کہ اپنے فیصلوں کے لیے انہی دونوں ذرائع پر اعتماد کرے عقل جب تک انہی پر منحصر ہے وہ اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی [ص ۶۷ مقامات] اس کے اندر بہت سے حقائق وہ خود دریافت کر لیتی ہے لیکن بعض حقیقتیں ایسی بھی ہیں جو اگر سامنے آجائیں تو وہ انھیں سمجھ سکتی ہے مگر انھیں خود دریافت کر لینا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا بعض اوقات اس پر جذبات غالب آجاتے ہیں تعصّبات حاوی ہوجاتے ہیں اور حالات اسے متاثر کر لیتے ہیں انہی حدود کی بنا پر وہ مجبور ہے کہ اپنے لیے کوئی ایسا رہنما تلاش کرے جو اسے ان حقائق تک پہنچائے جو اس کی پہنچ سے باہر ہیں [ص ۶۸] عقل کے اندر اس تلاش کے لیے ابتدا ہی سے قوی تقاضہ رہا ہے اللہ نے اپنی وحی اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے نازل کی ہے جس طرح انسان

کی رہنمائی عقل ہے اسی طرح عقل کی رہنمائی وحی الٰہی ہے انسان اگر عقل کی رہنما سے محروم ہو جائے تو ہم اسے پاگل کہتے ہیں اسی طرح عقل اگر وحی کی رہنمائی سے محروم ہو جائے تو وہ باؤلی ہو جاتی ہے [ص ۶۸] عقل اور وحی کا یہی تعلق ہے جس کی وجہ سے وحی کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتی جسے سمجھنا عقل کے لیے ممکن نہ ہو [ص ۶۸]۔ اپنے دل و دماغ کو تسلیم و رضا کے بالکل آخری درجے میں خدا کے حوالے کر دے قرآن کی اصطلاح میں وہ مومن ہے دل کو طہارت۔ عقل کو روشنی اور ارادوں کو پاکیزگی اسی سے حاصل ہوتی ہے یہی ایمان ہے [ص ۲۴۲ میزان] ایمان کا محل دل اور عقل ہے عقل و دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکہ دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ مومن ہے حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا اس وجہ سے ایمان کے دو شاہد قرار دیے گئے ہیں ایک قول ایک عمل اور چونکہ قول بھی جھوٹ ہو سکتا ہے اس وجہ سے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن نہیں قرار دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اس کے ایمان کی تصدیق کرے [ص ۸۲ میزان] ایمان اور عقل کی بحث میں یہ نکتہ فراموش کر دیا گیا ہے کہ تقیہ اور نفاق کیا ہے۔ دل ایمان سے لبریز ہے لیکن جان کے خوف سے زبان۔ حق کے بیان سے عاجز ہے تو یہ کیفیت تقیہ ہے نفاق یہ ہے کہ قول و فعل سے ایمان کا دعویٰ ہے لیکن قلب ایمان سے خالی ہے یہ حالت نفاق ہے اسی لیے منافق کو جہنم میں سب سے نچلے درجے میں رکھا جائے گا کہ نفاق شرک و کفر سے بدتر کیفیت ہے مشرک و کافر دین حق کی مخالفت کھل کر کرتا ہے کسی قسم کی منافقت، مداہنت میں مبتلا نہیں ہوتا عقل منافق کو پکڑنے سے قاصر رہتی ہے اور تقیہ کرنے والا کا محاسبہ کرنے سے عاجز ہوتی ہے کہ وہ قلب کو پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی انسان کے باطن میں جھانک نہیں سکتی یہ عقل محض Pure Reason کا مسئلہ ہے مگر جب عقل دل میں جاگزیں ہوتی ہے کہ حدیث کے مطابق عقل کا مقام دل ہے تو وہ قلب سلیم کے ساتھ مل کر عقل سلیم میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں اسے فراست ایمانی حاصل ہوتی ہے جو عقل کے حجابات الٹ دیتی ہے اور چیزوں کو ویسا ہی دکھاتی ہے جیسا کہ وہ حقیقت میں ہیں یہی دعا رسالت مآبؐ نے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں بار بار کی ہے۔

غامدی صاحب میزان میں فرماتے ہیں: تعقل کا منشاء یہ ہے کہ آدمی زندگی کے معاملات میں محض جذبات شہوات اور خواہشات کو اپنا رہنما نہ بنائے بلکہ اس کے اندر خدا نے جو عقل رکھی ہے اس کو رہنما بنائے اور اس کی رہنمائی پر اعتماد کرے [ص ۹۴۔۹۵] حالانکہ عقل رہنمائی کی اہل ہی نہیں رہنمائی تو

شریعت سے ملتی ہے خود غامدی صاحب میزان میں لکھتے ہیں "علم الٰہی کا قابل اعتماد ذریعہ صرف ملائکہ ہیں جو انبیاء کے پاس آتے ہیں اور جتنا کچھ خدا ان کو دیتا ہے وہ بے کم و کاست ان کو پہنچا دیتے ہیں [ص ۱۲۴، میزان] عقل جب تک ایمان، نقل، دل سے فیض یاب نہ ہو اور، وحی الٰہی کے سامنے سجدہ نہ کرے جو دنیا میں ساجد نہیں ہے وہ آخرت میں سجدہ نہیں کر سکے گا یہ قرآن کی نص ہے۔ عقل جذبات کی اسیر ہوتی ہے Reason is the slave of passions وہ حقیقت کو پا کر بھی عقل کے ذریعے جذبات سے اوپر نہیں اٹھ سکتی اس لیے حضرت ابراہیم کا جب کفار سے مکالمہ ہوا اور انہوں نے پوچھا کہ بتوں کو کس نے توڑا تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا اس بڑے بت سے پوچھو جو سلامت ہے تو انہوں نے کہا یہ تو بول نہیں سکتے فرمایا پھر تم ان کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ قرآن بتاتا ہے کہ وہ اپنے قلب کی طرح پلٹے دلیل نے حقیقت منکشف کر دی عقل نے حقیقت تسلیم کر لی مگر وہ پھر بدل گئے کہ عقل اسیر جذبات ہوتی ہے انہوں نے اپنے آبا و اجداد سے تعلقات کے جذبات کو ترجیح دی حضرت ابراہیمؑ کا نمرود سے مکالمہ ہوا فرمایا خدا سورج مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال دو وہ لاجواب ہو گیا رسالت مآبؐ نے کفار کو دلیل دی میرا خدا وہ ہے جو تمہیں موت دیتا ہے دعویٰ یہ تھا کہ اگر تمہارا خدا وہی ہے جو میرا ہے تو تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر موت دیتا ہے اور اگر تمہارا خدا کوئی اور ہے تو میرے خدا کی مسلط کردہ موت سے بچ کر دکھا دو دلیل عقل نے قبول کی قلب نے قبول نہیں کی کیونکہ عقل محض pure reason کے مقدر میں حضوری نہیں کفار مکہ الکتاب کو اور اور رسول اللہ کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے سگے بیٹوں کو۔ فہم ادراک عقلی استدلال کا مسئلہ نہیں تھا مسئلہ تکبر۔ تفاخر، مسابقت کا تھا کہ قرآن مکہ کے دو بڑوں پر کیوں نہ اترا جن پر اس دنیا میں اللہ کا فضل ہے یعنی امراء تو قرآن امیر کبیر لوگوں پر کیوں نازل نہ ہوا؟۔ عقل صرف ذریعہ ، وسیلہ اور آلہ ہے وہ اس منہاج ایمان کی دلیل مہیا کر سکتی ہے جس منہاج کا فرد اسے استعمال کرے عقل خود منزل کا سراغ نہیں لگا سکتی وہ تو محض آلۂ کار ہے۔ اس لیے عقل ماخذ علم نہیں ہے ذریعۂ علم ہے۔

[۱۲۵] عقل گمراہ کر سکتی ہے: عقل کسی جرم کی سزا کا تعین ہی نہیں کر سکتی: ورثاء میں مورث سے قریب کون ہے علم و عقل میں اس اس کے لیے کوئی بنیاد ہی تلاش نہیں کی جا سکتی۔ عقل کے اتنے قصیدے پڑھنے کے بعد اچانک غامدی صاحب عقل کی مذمت، محدودیت، نارسائی، بے بسی بے کسی کا اچانک اعتراف کر کے عقل کی عاجزی تسلیم کرتے ہیں۔ اور جرم کے بعد قرار واقعی تادیب و تنبیہہ ہے لیکن یہ تادیب و تنبیہہ کس

جرم میں کتنی اور کس طریقے سے ہونی چاہیے اس کی تعین کے لیے کوئی بنیاد چونکہ عقل انسانی کو میسر نہیں ہے اس وجہ سے اللہ نے جو شریعت دی اس میں نظم اجتماعی سے متعلق تمام بڑے جرائم کی سزا خود مقرر کر دی [ص ۵۱۰، میزان ۲۰۰۸ء]

اللہ کی جانب سے میراث میں ورثا کے مقررہ حصوں کی حکمت کے بارے میں لکھتے ہیں یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَھُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ وَ اِنْ کَانَتْ وَاحِدَۃً فَلَھَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَیْہِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ اِنْ کَانَ لَہٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَہٗٓ اَبَوٰہُ فَلِاُمِّہِ الثُّلُثُ فَاِنْ کَانَ لَہٗٓ اِخْوَۃٌ فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ یُّوْصِیْ بِھَآ اَوْ دَیْنٍ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا فَرِیْضَۃً مِّنَ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا [۴:۱۱] سلسلہ کلام کے بیچ میں یہ آیت خاص مقصد کے لیے آئی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تقسیم وراثت کے معاملے میں وہ انصاف پر مبنی کوئی فیصلہ کر سکتا والدین اور اولاد میں سے کون بہ لحاظ منفعت اس سے قریب تر ہے وہ نہیں جانتا علم و عقل میں اس [فہم و تحقیق] کے لیے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جا سکتی اس لیے یہ فیصلہ اس کا پروردگار ہی کر سکتا تھا۔ [میزان ص ۵۲] عقل کی نارسائی بے بسی بے کسی کا مرثیہ پڑھنے کے بعد وہ لکھتے ہیں۔ اس قانون کے نزول کے بعد اب کسی مرنے والے کو وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا یہ تقسیم اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہے [ص ۵۲۵ میزان] پھر اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ وہ اگر بندہ مومن ہے تو اس کے لیے یہی زیبا ہے کہ اس کا حکم سنے اور سر جھکا دے [ص ۵۲۵] مگر وہ خود سر جھکانے کے بجائے اچانک سر اٹھا لیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ تاہم اس کے معانی یہ نہیں ہیں کہ وارثوں کی کوئی ضرورت، ان میں سے کسی کی خدمت یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز تقاضہ کرے تو اس صورت میں بھی ان کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی [ص ۵۲۵] دونوں بیانات متضاد ہیں اور اس تضاد کا اصل سبب، مرجع، اصول نمبر ۱۲۴ ہے جس میں غامدی صاحب عقل کے آستانے پر سر جھکا دیتے۔ عقل گو آستاں سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اسی لیے اقبال نے کہہ دیا تھا گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں

ہے

عقل کی حقیقت یہی ہے مگر اس وسیلے، ہتھیار، اوزار، ذریعے [Mean] کو عموماً لوگوں نے اصل ہدف مقصد [End] ماخذ منبع، اصل الاصول، سرچشمہ [Source] سمجھ لیا دنیا کی تئیس روایتی تہذیبوں میں عقل صرف آلہ ہے وسیلہ ہے مگر مغربی فکر و فلسفے میں عقل ہی ماخذ قانون ہے۔ یہ وہ بنیادی فرق ہے جو مشرق و مغرب کے منہاج علمی میں تفریق پیدا کر دیتا ہے اسلامی تاریخ میں معتزلہ، خوارج، اہل قرآن اور دیگر فرقوں کا ظہور اسی نقطۂ نظر میں افراط و تفریط کے باعث پیدا ہوا سرسید، ابوالکلام آزاد، احمد دین امرتسری، غلام احمد پرویز، علامہ مشرقی، جاوید غامدی، وغیرہ عقل کو کبھی ماخذ مان کر اس کی عظمت بیان کرتے ہیں کبھی ذریعہ سمجھ کر اس کی تحقیر کرتے ہیں دونوں رویے ان سب کے یہاں ساتھ ساتھ چلتے ہیں لہٰذا یہ لوگ مسلسل اپنے بیانات بدلتے رہتے ہیں۔

[۱۲۵] ا۔عورت تنہا لمبا سفر نہیں کرسکتی: ۲۔مردوں کے ہجوم میں حصہ بن کر نہیں چل سکتی: ۳۔عورت حکمران بن سکتی ہے: غامدی صاحب نے پہلے دو اصول قانون معاشرت کے تحت ص ۴۷۰ پر بیان کیے ہیں [میزان ص ۴۷۰، ۲۰۰۸ء] مگر قانون سیاست کے تحت خود اس اصول کی تردید کر کے ہر شہری کو ریاست کا سربراہ بننے کی اجازت دے دی ہے قانون سیاست میں وہ عورت مرد کے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے نہایت پُر کاری سے ''شہری'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جو دونوں اصناف کو محیط ہے اس پُر کاری کا سبب یہ ہے کہ میزان کے ایک باب قانون سیاست و معیشت میں جو ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں وہ تین صفحات میں یہ بحث مدلل طریقے سے سمیٹ چکے تھے کہ عورت کسی حالت میں اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہوسکتی ان کا یہ موقف ۱۹۹۷ء تک قائم تھا مگر ۱۹۹۸ء میں جہاں ان کے بنیادی نظریات میں تبدیلی پیدا ہوئی وہیں عورت زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کی حق دار ٹھہری اور امامت سیاست قیادت سیادت کی بھی حق دار ہوگئی غامدی صاحب کا قانون سیاست عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی ممانعت نہیں کرتا دوسرے لفظوں میں جب عورت غامدی صاحب کے فلسفے کے تحت امامت کبریٰ کی مستحق ہے تو اسی عہدے کی بناء پر وہ خود بخود امامت صغریٰ کی بھی حق دار ہے لہٰذا عورت مردوں کی جماعت کی امامت کرسکتی ہے اور غامدی صاحب کے مذہب میں حکمران کا مسجد میں خطبہ اور جمعہ کی امامت رسول اللہ کی سنت ہے لہٰذا عورت کا مردوں کی امامت کرنا سنت کا تقاضہ ہے جو دین ہے۔ غامدی صاحب

کے اس جدید فلسفے کی روشنی میں اجتہادی عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کے شاگرد خورشید احمد ندیم کا ادارہ ایسی بے شمار کتابیں چھاپ چکا ہے جس میں امامت کبریٰ کے ساتھ امامت صغریٰ یعنی مسجدوں کے اندر عورت کی امامت کی اجازت قرآن وسنت سے ثابت کی گئی ہے اور عورت کو کارزار زندگی میں مردوں کے مساوی حقوق دیے گئے ہیں ان کتابوں، غلط سلط محرف، مشکوک، دلائل سے اسلامی تاریخ کے شاذ واقعات سے ایک نئی شریعت تخلیق کی گئی ہے قانون سیاست میں وہ شہریت اور اس کے حقوق کا عنوان قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وہ تمام حقوق انھیں حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کی ریاست میں ان کو حاصل ہونے چاہئیں۔ ان کے درمیان کسی فرق کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں پائی جا سکتی [ص ۴۹۱ میزان] لہٰذا عورتیں غامدی صاحب کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں انتخابات میں کھڑی ہو سکتی ہیں صدر وزیر اعظم بن سکتی ہیں ان کے حقوق تمام شہریوں کے برابر ہیں قانون سیاست سے غامدی صاحب نے وہ تین صفحے خارج کر دیے ہیں جس میں انہوں نے امامت کبریٰ کے لیے اپنے خطیبانہ لہجے میں عورت مرد کی خلقی، نفسی، عضوی، جذباتی بنیادوں کا تقابلی جائزہ لے کر مردوں کی عظمت خصوصیات کا قصیدہ لکھا تھا اور قرآن کی نص سے حضرت داؤد کے حوالے سے ثابت کیا تھا کہ اسلامی ریاست کا حکمراں صرف مرد ہو سکتا ہے اور مرد ہی ہونا چاہیے وہ صفحات اب میزان کی جدید اشاعت سے خارج کر دیے گئے ہیں قرآن کی عجیب نص ہے کہ کل تک اس سے مرد کی امامت ثابت ہو رہی تھی آج اسی قرآن کے ہوتے ہوئے اسی قرآن سے مرد عورت دونوں کی امامت ثابت ہو رہی ہے قرآن کی ایک آیت سے دو مطالب اخذ کرنا غامدی صاحب کے اصول کے منافی ہے ان کا اصول یہ ہے کہ قرآن کی ایک آیت کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے تفصیلات کے لیے میزان کا باب اصول ومبادی اور برہان میں طاہر القادری صاحب پر غامدی صاحب کی تنقیدات کے بین السطور کا مطالعہ کیا جائے۔ ایک جانب غامدی صاحب رسالت مآبؐ کے حوالے سے ثابت کر رہے ہیں کہ عورت مردوں کے ہجوم کا حصہ نہ بنے مگر صدر وزیر اعظم بننے والی عورت جو ہمیشہ مردوں کے ہجوم میں ہی رہے گی تو اس کی یہ آزادی کس نص سے ثابت ہے عورت صدر بن کر لازماً لمبے سفر بھی کرے گی تب وہ دین پر عمل کیسے کرے کیا وہ عہدہ ترک کر دے؟

[۱۲۶] عورت کا اصل مقام گھر ہی ہے: ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے تا کہ

گھر میں رہنے والی ہ بی بی اگر عدالت کے ماحول میں گھبراہٹ میں مبتلا ہوتو گواہی کو ابہام واضطراب سے بچانے کے لیے ایک دوسری بی بی اس کے لیے سہارا بن جائے [ص ۵۱۶ میزان] یہاں غامدی صاحب ثابت کررہے ہیں کہ عورت اصل میں گھر میں مقیم ایک مخلوق ہے مگر دوسری جانب اسے وہ امامت کبریٰ کا حق دار بھی بنا رہے ہیں یہ تضاد ہے۔

[۱۲۷] قرآن خود اپنے اجمال کی تفصیل ہے ایک جگہ ایک آیت کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی لیکن دوسری جگہ وہ بالکل آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے: غامدی صاحب نے میزان کے اصول ومبادی میں دعویٰ کیا ہے کہ قرآن اپنا مدعا اپنی مختلف صورتوں اور گوناگوں پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں وہ خود اپنے اجمال کی تفصیل اور اپنے معجزانہ کلام کی ایسی شرح وتفسیر بن گیا ہے کہ دنیا کی دوسری کتابوں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِہًا مَّثَانِیَ تَقۡشَعِرُّ مِنۡہُ جُلُوۡدُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ ثُمَّ تَلِیۡنُ جُلُوۡدُہُمۡ وَقُلُوۡبُہُمۡ اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ہُدَی اللّٰہِ یَہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ ہَادٍ [۳۹:۲۳]۔ وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِیَذَّکَّرُوۡا [بنی اسرائیل ۱۷:۴۱] تصرف کے معنی گردش دینے کے ہیں یعنی ایک ہی بات کو مختلف طریقوں اور بوقلموں اسلوبوں سے پیش کرنا فرمایا الٓرٰ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ [۱۱:۱] [میزان، ص ۴۱، ۴۲، ۲۰۰۸ء] یعنی پہلے اعجاز، جامعیت اور اختصار کا طریقہ اختیار کیا گیا پھر انہی گٹھے ہوئے جامع اور مختصر گویا دریا بہ کوزہ جملوں کی تفصیل کردی گئی [ص ۴۲ محوہ بالا] قرآن کے ایک مقام میں ایک پہلو مخفی ہوتا ہے دوسرے مقام میں واضح ہوجاتا ہے ایک جگہ اس کا اصل غیر معین ہوتا ہے دوسرے سیاق میں وہ رخ بالکل معین ہوجاتا ہے ایک ہی لفظ ایک آیت میں مبہم نظر آتا ہے دوسری آیات میں وہ بالکل بے نقاب ہوجاتا ہے ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی لیکن دوسری جگہ وہ بالکل آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے [ص ۴۲] قرآن کی یہ شان بیان کرنے کے بعد حضرت والا کا حال یہ ہے کہ قرآن کی آیت حجاب، آیت میراث، کے مفاہیم آج تک قرآن کی دوسری آیتوں سے حضرت پر منکشف نہیں ہوسکے لہٰذا اب ان کی تشریح وتفسیر آیات جاوید غامدی اور میزان کے ذریعے پیش کی جارہی ہے۔

[۱۲۸] سنت کا تعلق صرف عملی چیزوں سے نہیں ہے اختلافی امور میں بھی سنت رہنمائی کرتی ہے: عدت میں عورت کو نفقہ اور سکونت مہیا کرنا رسول کی سنت ہے: غامدی صاحب نے مبادی تدبر سنت کے تحت

دعویٰ کیا تھا کہ سنت اپنی نوعیت کے لحاظ سے صرف دین ہے [ص ۵۷ میزان] سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہو یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں علم وعقیدہ تاریخ شان نزول اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا سنت سے تعلق نہیں [ص ۵۸] لہٰذا علمی نوعیت کی کوئی چیز بھی سنت نہیں ہوسکتی اس کا دائرہ کرنے کے کام ہیں [ص ۵۸] کرنے کے کام بھی غامدی صاحب نے معین کردیے ہیں ۲۰۰۸ء کی میزان کے ص۱۴ پر یہ کرنے کے کام صرف ۲۷ تھے ۲۰۱۰ء کی میزان کے ص۱۴ پر کرنے کے یہ کام صرف ۲۶ ہیں ۲۰۰۲ء کی میزان میں کرنے کے یہ کام یعنی سنت کی تعداد ۴۰ ہے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں: وہ چیز بھی سنت نہیں ہو سکتی جو نبیؐ نے لوگوں کی رہ نمائی کے لئے بنائی [ص ۶۰] سنت سے متعلق اپنے ان اصولوں کی خود خلاف ورزی کرتے ہوئے قانون معاشرت کے باب میں سنت کی تعریف کا دائرہ وسیع کر دیتے ہیں اور لکھتے ہیں ''بعض لوگ فاطمہ بنت قیس کی روایت ہماری اس رائے کے خلاف پیش کریں گے جس کے مطابق رسالت مآبؐ نے عدت میں نفقہ اور سکونت دینے سے انکار کر دیا تھا [ص ۴۵۶ میزان] غامدی صاحب اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں یہ [روایت] جب سیدنا عمرؓ کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم ایک عورت کے قول پر اپنے پروردگار کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو ترک نہیں کر سکتے [ص ۴۵۶ محولہ بالا] یعنی رسالت مآب کی سنت یہی ہے کہ عورت کو عدت میں نفقہ وسکونت دیا جائے گا۔ غامدی صاحب نے الحمدللہ حضرت عمر پر جرح نہیں فرمائی اور ان کے قول کو تنقید کے بغیر اپنے موقف کی حمایت میں نقل کر دیا۔ اس سے دو مسئلے واضح ہوگئے پہلا یہ کہ صحابہ کرام اور حضرت عمرؓ جن امور کو سنت سمجھتے تھے ان میں اور غامدی صاحب کی سنتوں میں فرق ہے۔ دوسرا یہ کہ غامدی صاحب صحابہ کے طے کردہ سنتوں کو سنت سمجھتے ہیں اور صحابی کے قول کے سامنے سنتوں کی خودساختہ تعریف پیش نہیں فرماتے۔

[۱۲۹] حکمرانوں سے پیدا شدہ اختلافی امور میں بھی سنت سے رجوع کیا جائے گا: غامدی صاحب کے اصول سنت کے مطابق سنتیں طے شدہ ہیں اور میزان ۲۰۱۰ء کے نسخے کے مطابق سنتوں کی تعداد متعین ہے اور ۲۶ ہے ۲۰۰۸ء کی میزان میں سنتوں کی تعداد ۲۷ تھی اور ۲۰۰۲ء کی میزان میں سنتوں کی تعداد چالیس تھی اور یہ متعین سنتیں غامدی صاحب کے مطابق دین ہیں لہٰذا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی اور سنتوں کے بارے میں غامدی صاحب ص۱۴ میزان پر لکھ چکے ہیں کہ '' یہ قطعی ہیں سنتوں کے بارے میں اب کسی بحث

ونزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے'' [ص ۱۴، میزان ۲۰۰۸ء، ۲۰۱۰ء] جب سنت دین ہے اور اس میں کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا تو حکمرانوں سے اختلاف کی صورت میں اختلاف کے حل کے لیے سنت سے رجوع کرنے کی ہدایت ایک لایعنی، بے معنی اور مہمل ہدایت ہے مگر غامدی صاحب اپنے مبادی سنت کی واضح تردید اور نفی کرتے ہوئے لوگوں کو سنت سے رجوع کا مشورہ دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں اہل ایمان اپنے اولی الامر سے اختلاف کا حق بے شک رکھتے ہیں بلکہ اس طرح کا کوئی معاملہ اگر اولیٰ الامر سے بھی پیش آ جائے اور اس میں قرآن وسنت کی کوئی ہدایت موجود ہو تو اس کا فیصلہ لازماً اس ہدایت کی روشنی ہی میں کیا جائے گا [ص ۴۸۴، میزان ۲۰۰۸ء] ظاہر ہے حکمرانوں سے اختلاف کی تاریخ میں ہمیں کبھی یہ شہادت نہیں ملتی کہ کسی عالم یا عوام کا حکمرانوں سے نماز روزہ حج زکوٰۃ غسل تدفین عیدین بغل کے بال زیر ناف کے بال، نومولود کے کان میں اذان پر ہوا ہو۔ غامدی صاحب کے مطابق یہ تو طے شدہ امور ہیں تواتر عملی اور اجماع امت سے ثابت ہیں ان میں بحث مباحثے کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا غامدی صاحب کے سنت سے متعلق اصولوں میں ایک نئے اصول کا اضافہ ہو گیا کہ سنت —— حکمراں سے اختلافی امور میں بھی معاملات طے کرنے کے لیے رہنمائی کرتی ہے۔

[۱۳۰] ریاست کی سطح پر نماز قائم کرنے کی سنت دو امور کا تقاضہ کرتی ہے: چار نئی سنتیں: غامدی صاحب نے میزان ۲۰۱۰ء کے ص ۱۴ پر سنتوں کی تعداد ۲۶ رکھی ہے مگر ص ۴۸۹ پر دینی فرائض [قانون سیاست] کے تحت چار اور سنتوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ سنت کی رو سے ا۔ لوگوں سے تقاضہ کیا جائے گا کہ وہ اگر مسلمان ہیں تو نماز ادا کریں، ۲۔ نماز جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت سربراہ مملکت گورنر اور عمال کریں گے [۴۸۹ میزان ۲۰۰۰ء] زکوٰۃ کے بارے میں یہ سنت قائم کی ہے کہ ہر شخص مال مواشی پیداوار کا حصہ اپنے سرمائے سے الگ کر کے حکومت کے حوالے کرے گا اور حکومت دوسرے مصارف کے ساتھ اس سے اپنے حاجت مند شہریوں کی ضرورتیں ان کی فریاد سے پہلے ان کے دروازے پر پہنچ کر پوری کرے گی حکمران زکوٰۃ کے بعد ان کی رضامندی کے بغیر ان پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کر سکتے [ص ۴۸۹ میزان] لیجیے سنتوں کی فہرست بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

[۱۳۰] قرآن بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے اجماع اور قولی تواتر سے منتقل ہوا ہے: قرات کے اختلافات کے باعث مغرب کے علاقوں میں قرآن الگ طریقے سے پڑھایا جاتا ہے: یہ تغیر اجماع اور قولی تواتر کی نفی

ہے: غامدی صاحب نے قرآن نے بارے میں دو دعوے کیے ہیں دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں پہلا دعویٰ ہے ''قرآن صحابہ نے اپنے اجماع اور قولی تواتر کے ذریعے سے پوری حفاظت کے ساتھ بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے دنیا کو منتقل کیا [ص ۱۳، میزان] قرآن صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملاحظہ ہو [۱۴] اجماع کے بارے میں علامہ عمار ناصر راشدی نے مفتی واحد صاحب سے تحریری مباحثے میں لکھا ہے کہ اجماع کا دعویٰ محض افسانہ ہے اپنی کتاب حدود وتعزیرات میں انہوں نے غامدی صاحب کی اتباع میں اجماع کی تردید میں تین صفحات لکھے ہیں [] لیکن ان سو صفحات میں اجماع کی اصطلاح استعمال نہیں کی لیکن اب غامدی صاحب اجماع سے قرآن ثابت کر رہے ہیں لیکن ص ۲۷ پر قرات کے اختلافات کے تحت تسلیم کر تے ہیں ''قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں امت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس وقت تلاوت کر رہی ہے [میزان ص ۲۷] ص ۱۴ اور ص ۲۷ کی عبارت یکسر متضاد ہیں اجماع اور قولی تواتر کے مقابلے پر مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر عظیم اکثریت کی اصطلاحات خود ثابت کر رہی ہیں کہ یہ اجماع کا رد ہے اس کے بعد پانچ صفحات میں انہوں نے قرات کے اختلاف پر بحث کر کے اس کے خلاف دلائل دیے ہیں لیکن ان دلائل کے باوجود اجماع کا دعویٰ ثابت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قراتوں کے اختلافات وغیرہ تو تمام امہات کتب میں موجود ہیں لہٰذا غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ قرآن، تواتر اور اجماع سے منتقل ہوا ہے ثابت نہیں ہوتا لہٰذا ان کی دلیل اور ان کے اصول کی روشنی میں قرآن بھی دین کا معتبر ذریعہ نہیں قرار پاتا [نعوذ باللہ]

[۱۳۱] قومی ریاست سنت کی رو سے جائز ہے: ایک نئی سنت قومی ریاست: [مسلمان] جس طرح اپنی الگ الگ قومی ریاستیں قائم کر سکتے ہیں اسی طرح دین وشریعت پر عمل کی آزادی ہو تو غیر مسلم اکثریت کی ریاستوں میں شہری کی حیثیت سے اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن کر رہ بھی سکتے ہیں ان میں سے کوئی چیز قرآن وسنت کی رو سے ناجائز نہیں [سن تحریر ۲۰۰۸ء جاوید غامدی، مقامات ص ۱۷۵، طبع اول، ۹، ۲۰۰۸ء] ۲۰۰۸ء کی میزان کی فہرست سنت میں یہ سنت شامل ہونے سے رہ گئی۔

[۱۳۲] سود لینا حرام ہے دینا حرام نہیں ہے: ذاتی اور کاروباری کے لیے قرض پر لوگ جو سود دیتے ہیں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح سود لینا حرام ہے علماء یہی کہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی کوئی بنیاد قرآن وسنت میں نہیں ہے قرآن نے کسی جگہ بھی ایک لفظ بھی سود دینے

والوں کی مذمت میں نہیں کہا ہے بلکہ انہیں مظلوم قرار دیا ہے۔ اور وہ تنگ دست ہوں تو انہیں اصل زر کی واپسی کے لیے مہلت دینے کی تلقین فرمائی ہے [اصل میں سود کھلانے والوں سے مراد قرض لینے والے نہیں] اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو سود کا کاروبار کرنے والوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے گاہک ڈھونڈتے ہیں [سن تحریر ۲۰۰۸ء] [مقامات ص ۱۴۵، طبع اول ۲۰۰۸ء]

[۱۳۳] قرآن نے مقروض کو اصل زر کی واپسی تک مہلت دینے کی تلقین کی ہے: افراط زر سے جو کمی واقع ہوتی ہے اس کی تلافی اصل زر کے ساتھ مقروض کے ذمے ہے۔

غامدی صاحب کے یہاں تضاد بیانی درجۂ کمال کو چھو لیتی ہے مقامات میں سود کا مسئلہ کے زیر عنوان ص ۱۴۵ پر لکھتے ہیں [قرآن نے سود لینے والوں کو مظلوم قرار دیا] اور تنگ دست ہوں تو اصل زر کی واپسی کے لیے مہلت دینے کی تلقین فرمائی ہے [ص ۱۴۵ مقامات ۲۰۰۸ء] اللہ تعالیٰ مظلوم مقروض کو صرف اور صرف اصل زر کی واپسی کے لیے بھی مہلت دلوا رہا ہے قرآن کی نص صریح ہے جس کے بارے میں غامدی صاحب کا اصول ۸۷ یہ ہے کہ خدا کا پیغمبر بھی جس پر یہ قرآن نازل ہوا اس کے کسی حکم کی تحدید تخصیص ترمیم تغیر نہیں کر سکتا [ص ۲۵ میزان ۲۰۰۸ء] لیکن غامدی اسی کتاب مقامات کے ص ۱۴۵ پر سود خور بنکاروں کی حمایت میں اپنے بیان کردہ قرآنی اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''غیر کاروباری ضرورتوں کے لیے دیا گیا قرض ہے تو افراط زر سے جو کمی واقع ہوتی ہے اس کی تلافی کے سوا کسی زائد رقم کا مطالبہ نہ کیا جائے [ص ۱۴۴، مقامات، ۲۰۰۸ء]

[۱۳۴] جو چیزیں بیان فطرت کے طور پر آئی ہیں وہ بھی سنت نہیں ہیں: سنت کے اصول ومبادی کے ضمن میں غامدی صاحب کا پانچواں اصول ہے کہ۔ وہ چیزیں جو محض بیان فطرت کے طور پر آئی ہیں وہ بھی سنت نہیں [میزان ص ۵۹، ۲۰۰۸ء] اس اصول کے تحت وہ سنت اور فطرت میں فرق فرماتے ہیں لہٰذا شیر چیتے، ہاتھی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''انسان فطرتاً انہیں دسترخوان کی لذت کے لیے قابل استعمال نہیں سمجھتا [ص ۶۰ میزان] اس کے بعد اس اصول میں استثناء کرتے ہوئے بیان فطرت کی اشیاء کو سنت سے الگ کرتے ہوئے لکھتے ہیں الا یہ کہ انبیاء علیہم السلام نے ان میں سے کسی چیز کو اٹھا کر دین کا لازمی جزو بنادیا ہو [ص ۵۹ محولہ بالا] سوال یہ ہے کہ تمام انبیاء کے بارے میں آپ کو یہ خبر کیسے ملی کہ انہوں نے کسی چیز کو سنت سمجھا اور کسی چیز کو اٹھا کر دین کا لازمی جزو بنایا ظاہر ہے انبیاء کے بارے میں خبر کس ذریعے سے ملے گی؟ وہ خبر جس ذریعے سے بھی ملے غامدی صاحب کی نظر میں وہ ذریعہ دین اخذ کرنے کے لیے معتبر نہیں ہے وہ خبر واحد کو مستقل بالذات ماخذ دین نہیں مانتے غامدی صاحب سنت کی تعریف میں انبیاء علیہم السلام کا ذکر نہیں کرتے بلکہ دین ابراہیمی کا ذکر کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں ''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبیؐ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری کیا [ص ۱۴ میزان محولہ] سنت کی یہ تعریف اوپر بیان کردہ ص ۵۹ کی تعریفِ سنت سے بالکل مختلف اور متضاد ہے ایک جانب غامدی صاحب فطرت کو سنت تسلیم نہیں کرتے دوسری جانب فطرت کو ''سنن فطرت'' کہہ کر سنت کی تعریف میں داخل کر دیتے ہیں [ص ۶۴۳ میزان ۲۰۰۸ء] اس کے لیے وہ حدیث کا حوالہ دیتے ہیں پانچ چیزیں فطرت ہیں ختنہ، زیرناف کے بال مونڈنا، بڑے ہوئے ناخن کاٹنا، بغل کے بال صاف کرنا اور مونچھیں پست رکھنا زمانہ بعثت سے پہلے بھی

عرب بالعموم ان پر عمل پیرا تھے یہ سنن فطرت ہیں [ص ۶۴۳ محولہ] اگر یہ سنن فطرت ہیں اور ان پر عرب عمل پیرا تھے تو عربوں سے پہلے دنیا کی تمام اقوام کیا ان سنن فطرت پر عامل تھیں اگر تھیں تو اس کا حوالہ موجود نہیں ہے اور اگر دین فطرت پر عربوں سے پہلے کی قوموں کا تعامل معلوم نہیں تو غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ سنت اجماع سے ثابت ہوتی ہے بالکل غلط ٹھہرے گا اور اسے سنت تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ اجماع اور تواتر عملی اس طریقے میں منقطع ہے۔ غامدی صاحب کا یہ بیان ان کی سنت کی متعین کردہ تعریف کے منافی ہے وہ لکھتے ہیں سنت دین ابراہیمی کی روایت ہے ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ [۱۶:۱۲۳] پھر ہم نے تمھیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا اس ذریعے سے [ملت ابرہیم کی پیروی سے] جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے [ص ۱۴ میزان] اس کے بعد غامدی صاحب نے سنت کے سلسلے میں ملت ابراہیمی کی پیروی کے حوالے سے چھبیس سنتوں کا ذکر کیا ہے [ص ۱۴، میزان ۲۰۱۰ء]

اس تضاد کو رفع کرنے کے لیے غامدی صاحب نے سنن فطرت کو فطرت سے الگ کر کے خالص سنت ثابت کرنے کے لیے عجیب دلیل دی۔ یہ سنن فطرت ہیں جنہیں انبیاء نے تزکیہ و تطہیر کے لیے ان کی اہمیت کے پیش نظر دین کا لازمی جزو بنا دیا ہے [ص ۶۲۳ میزان] غامدی صاحب کا یہ بیان بھی ان کی تعریف سنت سے صریحاً متصادم ہے وہ لکھتے ہیں کہ سنت دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبیؐ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اضافوں کے ساتھ دین کی حیثیت سے جاری کیا [ص ۱۴] دین۔ رسالت مآب ملت ابراہیمی کی سنتوں کی اصلاح کر کے جاری کر رہے ہیں غامدی صاحب فرما رہے ہیں کہ انبیاء نے ان کو دین کا لازمی جزو بنا دیا۔ تو دین انبیاء سے مل رہا ہے یعنی دین ابراہیمی کی روایت اور ملت ابراہیمی کی پیروی سے مل رہا ہے؟

☆ روزہ سنت ہے روزہ فرض ہے: غامدی صاحب عبادات کے تحت سنت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''روزہ و اعتکاف سنت ہے [ص ۱۴، میزان] لیکن اسی میزان میں لکھتے ہیں ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے [ص ۳۵۴] روزہ مسلمانوں پر اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح پہلی قوموں پر [ص ۳۵۸] قرآن نے روزہ فرض قرار دیا [ص ۳۶۱] یہ فرض روزے بھی کسی وقت اللہ کے لیے خالص ہو جائیں گے [ص ۳۶۵] قرآن کا ارشاد ہے کہ ایمان والوں پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے [ص ۳۶۷] جو شخص اس

مہینے میں موجود ہو اس پر فرض ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے [ص ۳۶۹] اگر روزہ فرض ہے تو اسے سنتوں کی فہرست میں کیوں رکھا گیا ہے؟ اگر قرآن روزے کو فرض کہہ رہا ہے تو غامدی صاحب اسے سنت کیسے قرار دے رہے ہیں جبکہ اصول و مبادی میں غامدی صاحب قرآن کو میزان، فرقان، میزان عدل کہتے ہیں قرآن اس لیے اتارا کہ ہر شخص اس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا باطل؟ چنانچہ تولنے کے لیے یہی ہے یہ حجت قاطع ہے ہر معاملے میں یہی کتاب قول فیصل اور یہی صحیفہ معیار ہے تمام اختلافات میں یہی مرجع قرار پائے گی ہر شخص پابند ہے کہ اس پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے [ص ۲۴ میزان ۲۰۰۸ء] قرآن دین کی حتمی حجت ہے [ص ۱۷] دین کے معاملے میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اب اسی کی روشنی میں ہوگا [ص ۱۵۴] اس اصول کے تحت ہم دیکھتے ہیں کہ کیا روزہ فرض ہے یا سنت کیونکہ ہم میں اور غامدی صاحب میں روزے کی حیثیت پر اختلاف ہو گیا ہے تو قرآن کہتا ہے روزہ فرض ہے اب ہم کس کا حکم مانیں قرآن یا غامدی صاحب کا۔

☆ رسول کو صرف قرآن کا معجزہ دیا گیا: نبیؐ کو جو معجزہ اس حیثیت سے دیا گیا وہ قرآن ہے [ص ۱۳۲] واقعہ معراج اور واقعہ شق القمر کو غامدی صاحب معجزہ تسلیم نہیں کرتے غامدی صاحب کی یہ عبارت حضرت موسیٰ کو عطا کردہ دو معجزوں عصائے موسوی اور ید بیضا کے تناظر میں لکھی گئی ہے کہ اللہ نے انہیں یہ دو معجزے عطا کیے [ص ۱۳۱ محولہ بالا] ظاہر ہے اس بیان میں حضرت موسیٰ کو عطا کردہ الکتاب تورات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے لہٰذا غامدی صاحب کو یہاں الکتاب کے بجائے معراج اور شق القمر کا ذکر کرنا چاہیے تھا یا الکتاب القرآن کے ساتھ ان دو معجزوں کا بھی ذکر کیا جاتا۔ مگر سرسید کے مکتب فکر کی طرح وہ بھی رسالت مآب کے معجزوں سے صرف نظر فرماتے ہیں۔

[۱۳۵] دنیا کی قدیم ترین مسجد بیت الحرام ہے اس کے بانی سیدنا ابراہیم ہیں: بیت الحرام کے بانی سیدنا ابراہیم نہیں ہیں یہ مسجد ابراہیمؑ سے پہلے موجود تھی یہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں دنیا کی مسجدوں میں قدیم ترین مسجد بیت الحرام ہے اسے سیدنا ابراہیم نے تعمیر کیا [ص ۳۲۲ میزان] اس کا مطلب یہ ہوا کہ کعبہ، بیت عتیق، بیت الحرام، وادی بطحا میں خدا کا پہلا گھر سیدنا ابراہیم نے ہی تعمیر کیا اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا جس طرح یروشلم کی مسجد کے بانی سیدنا داؤد ہیں اور یثرب کی مسجد خدا کے آخری پیغمبر نے تعمیر کی ہے [ص ۳۲۲ میزان] لیکن اپنے موقف کی خود تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اس کے

باشندوں نے جب بت پرستی اختیار کرلی اوراس کے جوار سے منتشر ہوگئے تو پرستش کی غرض سے اس معبد کے پتھر بھی ساتھ لیتے گئے، سیدنا ابراہیم بابل سے ہجرت کے بعداس کو تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچے تو اس کی پرانی تعمیر کا صرف ایک چمکتا ہوا پتھر باقی رہ گیا تھا اسمعیل کی قربانی کے بعداللہ نے انھیں حکم دیا کہ اس معبد کو دوبارہ تعمیر کیں باپ بیٹے نے مل کر اسی یادگار پتھر کے نیچے زمین کھودنا شروع کی پرانی بنیادیں کچھ تگ ودو کے بعد نکل آئیں تو انھیں بلند کیا[ص ۳۷۱محولہ بالا]

عورت سے دبر میں مجامعت نص کی خلاف ورزی ہے: مرد عورت سے جس سمت سے چاہے مجامعت کرسکتا ہے۔عورت سے ملاقات لازماً اسی راستے سے ہونی چاہیے جو اللہ نے مقرر کررکھا ہے فاتوھن من حیث امرکم اللہ تو ان سے ملاقات کرو جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا۔ یہ چیز بدیہات فطرت میں سے ہے لا ریب خدا کا حکم ہے [ص ۴۳۴ محولہ بالا] فاتو حرثکم انی شئتم لہٰذا تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ[عورت] اس کی اپنی کھیتی ہے اس وجہ سے وہ اس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان سے جس آن سے جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے[ص ۴۳۵ محولہ بالا]

[۱۳۶] ذخیرہ احادیث وآثار سنت متواترہ کا مقام نہیں رکھتے: دین سنت نہیں سنت متواترہ ہے: احادیث حجت نہیں ہیں احادیث وآثار حجت ہیں غامدی صاحب میزان میں دین صرف قرآن وسنت کو قرار دیتے ہیں [ص ۱۳ میزان] اوراسی کو حجت مانتے ہیں لیکن اس کے برعکس ص ۵۶ پر ایک حوالے سے دین اور حجت کی نئی تعریف پیش کرتے ہیں اوراس تعریف سے اختلاف بھی نہیں کرتے بلکہ اس حوالے کو اپنے موقف کو موکد کرنے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ”تفسیر کے ظنی ماخذوں میں سے سب سے اشرف اور پاکیزہ چیز ذخیرہ احادیث وآثار ہے اگر ان کی صحت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوتا تو تفسیر میں ان کی وہی اہمیت ہوتی جو اہمیت سنت متواترہ کی ہے لیکن ان کی صحت پر اس طرح کا اطمینان نہیں کیا جاسکتا[ص ۵۶ میزان] جو لوگ احادیث وآثار کو سرے سے حجت ہی نہیں مانتے وہ اپنے آپ کو اس روشنی سے محروم کرلیتے ہیں جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قیمتی روشنی ہے۔[ص ۵۶ میزان] دین لاریب[قرآن وسنت] صرف انہی دو صورتوں میں ہے ان کے علاوہ کوئی چیز نہ دین ہے نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے[ص ۱۵] حدیث سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا[ص ۱۵] حدیث قرآن وسنت کے دائرے کے اندر حجت ہے[ص ۱۵] حدیث قرآن وسنت میں محصور اسی دین کی تفہیم و

تبین ہے [ص ۱۵] حدیث کا بہت تھوڑا حصہ روایت یا معنی کی وجہ سے زمان کی تحقیق میں حجت کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ [ص ۱۷] حدیث سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔ [ص ٦١]

[۱۳۷] قرآن کے بعد سب سے زیادہ قیمتی روشنی حادیث وآثار ہیں: قرآن کی زبان کے لیے احادیث نبوی اور آثار صحابہ قرآن کے بعد دوسرا مستند ذریعہ نہیں۔ قرآن کے بعد سب سے زیادہ مستند ماخذ صرف کلام عرب ہے: احادیث وآثار —— قرآن کے بعد سب سے زیادہ قیمتی روشنی ہے [ص ۵٦ میزان] قرآن کی زبان کے لیے سب سے پہلے قرآن ہی کی طرح طرف رجوع کرنا چاہیے [ص ۱٦] قرآن کے بعد [زبان کی تحقیق کے لیے یہی کلام ہے [کلام عرب] جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے [ص ۱۹] غامدی صاحب کی رائے میں قرآن کی زبان کے معاملے میں قرآن کے بعد احادیث وآثار مستند ماخذ نہیں بلکہ سب سے زیادہ مستند ماخذ یہی کلام عرب ہے —— یہ کلام صرف زبان اسالیب ہی کا ماخذ نہیں ہے عرب کی تہذیب وثقافت کا بھی آئینہ دار ہے اہل عرب کن چیزوں کو معروف کن کو منکر قرار دیتے تھے خیر وشر کے معیارات کیا تھے تمدن سماج کی تشکیل کن عناصر سے ہوئی تھی۔ سیاسی نظریات کیا تھے چنانچہ زبان ہی کے معاملے میں نہیں ان سب چیزیوں کے لیے بھی قرآن کے طلباء کو اس کلام کی طرف مراجعت کرنی چاہیے [ص ۲۰ میزان] قرآن مجید کے بعد یہ زبان حدیث نبوی اور آثار صحابہ میں ملتی ہے روایت بالمعنی کی وجہ سے ان ذخائر کا بہت تھوڑا حصہ ہی جسے اب زبان کی تحقیق میں سند وحجت کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے [ص ۱۷ میزان] قرآن کی ایک آیت کا صرف ایک ہی مطلب ہوسکتا ہے: [قرآن کے] اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی [ص ۵۱] جو چیز قرآن کو برہان قاطع بناتی ہے اور تاویل کے تمام اختلافات ختم کرکے القرآن لا یحتمل الا اویلا واحدا [قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہوتی] کی حقیقت اس سے متعلق ثابت کردیتی ہے وہ تنہا نظم ہی ہے [ص ۵۱ میزان] نظم کلام کے باعث [تفسیر کرتے ہوئے] ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا [ص ۵۲ میزان] قرآن کا متن قرأت ...... کے سوا کسی دوسری قرأت کو قبول ہی نہیں کرتا [ص ۲۹] میں نے ہر آیت کی تاویل اسی قرأت [حفص قرات عامہ] کی بنیاد پر کی ہے اور میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا

ہوں کہ اس کے سوا کسی دوسری قرات پر قرآن کی تفسیر کرنا اس کی بلاغت معنویت اور حکمت کو مجروح کیے بغیر ممکن نہیں [ص ۲۹] چنانچہ اس کے نتیجے میں [سورت] وہ ایک منفرد اور متعین صورت حاصل کرتی ہے اور اپنے وجود میں ایسی وحدت بن جاتی ہے جو ہر لحاظ سے مستقل بالذات اور کامل ہوتی ہے [ص ۵۳] اس دعوے کے باوجود نشوز، شہادت علی الناس، اوڑھنی، میراث حجاب کی آیات کے غامدی صاحب نے ایک سے زیادہ مطالب بیان کر کے اپنے تمام اصولوں کی کامل تردید فرمادی ہے۔

[۱۳۸] قرآن کے بعض اشارات اور غوامض کے فہم کا انحصار علم تاریخ پر ہے: اس دور کی تاریخ سے پوری طرح استفادہ کیا جائے اس سے قرآن کے بعض اشارات کو سمجھنا اور بعض غوامض کو کھولنے میں حقیقت یہ ہے کہ بڑی مدد ملتی ہے [ص ۵۵] حیرت ہے کہ قرآن کے بعض اشارات وغوامض کو سمجھنے میں اجماع امت، مسلک جمہور، اورا کابرین امت کے علم سے کوئی مدد نہیں ملتی۔خود قرآن بھی اپنے مفاہیم اس وقت تک منکشف کرنے سے قاصر ہے جب تک دوسرا ذریعہ علم تاریخ میسر نہ ہو قرآن تاریخ کا محتاج ہے مگر حدیث، پیغمبر، صحابہ، تعامل صحابہ امت کے اکابرین کے علم کا محتاج نہیں ہے۔

[۱۳۹] دین کا جو مقصد قرآن میں بیان ہو ہے وہ تزکیہ ہے لہٰذا دین میں غایت اور مقصود کی حیثیت تذکیہ کو ہی حاصل ہے اللہ کے نبی اسی مقصد کے لیے مبعوث ہوئے دین اسی مقصود کو پانے کے لیے نازل ہوا ہے [ص ۷۷، ۷۸]

[۱۴۰] قربانی کی سنت آدمؑ اور تمام انبیاء کے پاس تھی یہ سنت آدم بھی ہے سنت الٰہی بھی ہے، سنت ابراہیم بھی اور سنت رسول ہاشمیؐ بھی: عرصے تک یہ اہتمام کیا گیا کہ بنی آدم اگر اپنے ایمان وعمل کی قبولیت یا عدم قبولیت اسی دنیا میں جاننا چاہیں تو جان لیں یہ گویا حقیقت کو اس زمانے کے ہر شخص کے لیے تجربے اور مشاہدے کے درجے تک پہنچا دینا تھا اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ لوگ اللہ کے حضور قربانی پیش کرتے پھر آسمان سے ایک آگ اترتی اور قبولیت کی علامت کے طور پر اسے کھا لیتی تھی سورہ آل عمران [۳] کی آیت ۱۸۳ میں اس نوعیت کی قربانی کا ذکر ہے آدم کے بیٹے ہابیل کا قتل اس طرح کے ایک واقعے کے نتیجے میں ہوا۔ [المائدہ: ۲۷۔۳۰ میں اس کی تفصیل ہے][ص ۹۱ میزان] ایک طرف غامدی صاحب قربانی کو سنت ابراہیمی کے طور پر پیش کر رہے ہیں [ص ۱۴ میزان] دوسری جانب اسے اللہ کی سنت، آدم کی سنت بھی ثابت کر رہے ہیں۔

[۱۴۱] جہاد و قتال کی ضرورت دو صورتیں ہیں ظلم و عدوان کے خلاف اتمام حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف [ص ۵۷۹] میزان جہاد کا اقدام صرف نظم اجتماعی کرسکتا ہے [ص ۵۸۱] اقدام کے دو مقاصد ہیں ایک یہ کہ فتنہ باقی نہ رہے دوسرے یہ کہ سرزمین عرب میں دین صرف اللہ ہی کا ہو جائے [ص ۵۹۴] فتنہ کے معنی ہیں کسی شخص کو ظلم و جبر کے ساتھ اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش یہ قتل سے زیادہ سنگین جرم ہے انسان کو اللہ نے حق دیا ہے کہ وہ اپنے آزادانہ فیصلے سے جو دین اور جو نقطۂ نظر چاہیں اختیار کریں [ص ۵۹۵] مذہبی جبر کے خلاف جنگ کا حکم قیامت تک کے لیے باقی ہے [ص ۵۹۵] مذہبی جبر کے علاوہ ظلم و عدوان کی دوسری صورتیں بھی اسی کے تحت سمجھنی چاہئیں جیسے سورہ حجرات میں اہل ایمان کے اس گروہ سے جنگ —— جو مصالحت کے باوجود باز نہ آئے [ص ۵۹۵] مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت رہ گئی ہے وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ [ص ٦٠١]

[۱۴۲] دین کے فروغ و حفاظت کے لیے: اقدام کی ایک اور شکل بھی جائز ہے: زبان علم و سناں سے دین کے لیے جدوجہد قرآن سے ثابت ہے دین کی حفاظت بقاء اور تجدید و احیاء کے لیے جہاد لازم ہے۔ اسی طرح دین کو اپنے فروغ یا اپنی حفاظت کے لیے اگر کسی اقدام کی ضرورت پیش آجائے تو ایمان کا تقاضہ ہے کہ جان و مال سے دین کی مدد کی جائے قرآن کے مطابق یہ اللہ کی نصرت ہے مدینہ میں اقتدار کے بعد اس کی ضرورت پیش آئی اور لوگوں سے جہاد و قتال کا مطالبہ کیا گیا تو قرآن نے اس کی دعوت دی [الصّف ٦١: ١٠-١۴] سلف و خلف میں دین کی حفاظت بقا اور تجدید و احیاء کے جتنے کام بھی ہوئے ہیں ایمان کے اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہوئے ہیں امت کی تاریخ میں زبان و قلم تیغ دستاں اور درہمو دینار سے دین کے لیے ہر جدوجہد کا ماخذ یہی نصرت ہے [ص ۵۷، ٦٧ محولہ بالا] غامدی صاحب کے دونوں اصول متضاد ہیں پہلے فرمایا کہ جہاد اب صرف اور صرف ظلم و عدوان کے خلاف ہوسکتا ہے اب فرما رہے ہیں کہ دین کے فروغ اور حفاظت کے لیے بھی جہاد ہوسکتا ہے۔

[۱۴۳] قرآن کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ مجرموں کی تعذیب کے لیے ہمیشہ قائم رہے گی: عقل کی روشنی میں توقع کی جاسکتی ہے ایک دن جہنم کی بساط لپیٹ دی جائے گی: غامدی صاحب صنعت تضاد میں کلام کرنے کے ماہر ہیں ان کے اصولوں کی اس فہرست میں آپ عقل پر ان کے متضاد و متخالف خیالات پڑھ کر ششدر رہ جائیں گے شعراء صنعت تضاد میں شعر کہنا کمال سمجھتے ہیں غامدی صاحب نثر

میں تضاد سے حسن تکلم پیدا کرتے ہیں قرآن کی آیات پر تدبر کے جو اصول انہوں نے میزان کے اصول و مبادی میں تفصیل سے بتائے ہیں ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لکھتے ہیں قرآن کی ان تصریحات سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے مجرموں کی تعذیب کے لیے دوزخ ہمیشہ قائم رکھی جائے گی اس کے باوجود یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک دن اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی [ص ۱۹۱ میزان] صنعت تضاد کا کمال دیکھیے کہ قرآن کی تصریحات سے دوزخ کا دوام [Permnace] ثابت ہونے کے باوجود حضرت والا محض اپنے فہم، تحقیق، تفکر، کفار سے محبت کے باعث بغیر کسی دلیل کے امید کر رہے ہیں کہ جہنم ایک دن ختم کر دی جائے گی۔ کیا قرآن کی آیت اپنا منشا بیان کرنے سے قاصر ہے اگر ایسا ہے تو غامدی صاحب کے اصول کے تحت قرآن حجت نہیں ہوسکتا کیا قرآن کی ایک آیت کے دو معانی ہوسکتے ہیں غامدی صاحب کے اصول کے تحت اگر قرآن کی آیت کے دو معانی ہوسکتے ہیں تو یہ فرقان نہیں چیستان ہے قرآن کی تصریحات سے ثابت ہے کہ دوزخ کو دوام حاصل ہے اس تصریح کے مقابلے پر حضرت والا اپنے ہی اصولوں کے خلاف امید کا دیا روشن کر رہے ہیں۔

جہنم ختم ہوجائے گی اس کی عقلی دلیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا عذاب وعدہ نہیں وعید ہے اور عالم کا پروردگار یہ حق یقیناً رکھتا ہے کہ اپنی رحمت سے ان مجرموں کی سزا میں تخفیف کرے یا خاک اور راکھ بنا کر ہمیشہ کے لیے اس جہنم کی مٹی میں دفن کر دے فَاَمَّا الَّذِیۡنَ شَقُوۡا فَفِی النَّارِ لَھُمۡ فِیۡھَا زَفِیۡرٌ وَّ شَھِیۡقٌ ، خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ [۱۱:۱۰۶، ۱۰۷][ص ۱۹۱ میزان] حیرت ہے کہ عالم کے پروردگار کو خود معلوم نہیں کہ اسے کیا کرنا ہے جو ارحم الراحمین ہے اسے غامدی صاحب رحم کی ہدایت فرما رہے ہیں وہ خود لکھتے ہیں جانتے بوجھتے کفر و شرک کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے دائمی عذاب ہے اسی طرح کوئی مسلمان کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے تو اس کے لیے بھی یہی سزا بیان ہوئی ہے قانون وراثت کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بھی اسی کی وعید فرمائی گئی ہے [ص ۱۹۱] سوال یہ ہے کہ قرآن کی ان تصریحات کے باوجود غامدی صاحب کے دل میں منکرین کے لیے جذبات رحم کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟ غامدی صاحب نے لفظ و معنی کے سفر پر ص ۳۲ تا ۳۳ لکھا ہے لفظ و معنی کا سفر کبھی الگ نہیں ہوتا وہ جب تک مستعمل رہتا ہے اپنے معنی کے ساتھ مستعمل رہتا ہے زبان سے متعلق یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر جو کچھ ہم بولتے لکھتے ہیں اس اعتماد کے

ساتھ بولتے لکھتے ہیں کہ دوسرے اس سے وہی کچھ سمجھیں گے جو ہم کہنا چاہتے ہیں یہ خیال اگر ایک لمحے کے لیے بھی پیدا ہو جائے کہ الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو ان میں سے ہر چیز بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گی [ص ۳۳] ایک انسان کے لفظ و معنی کے سفر میں یہ قطعیت ہے مگر بس خدا کا کلام ہی ایک ایسا عجوبہ ہے کہ اس کی دو دو تاویل غامدی صاحب پیش کر رہے ہیں ۔غامدی صاحب کی یہ امید، توقع اور کفار کو تکلیف سے نجات دلانے کی یہ آرزو ان کے متعین کردہ قرآنی اصولوں کے خلاف ہے ان کا پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں [ص ۵۲ میزان] یہ الفرقان ہے ہر معاملے میں یہی کتاب قول فیصل اور یہی صحیفہ معیار ہے تمام اختلافات میں یہی مرجع قرار پائے گی ۔اس پر کوئی چیز حاکم نہیں ہوسکتی [ص ۲۴ میزان] قرآن کے الفاظ کی دلالت اس مفہوم پر بالکل قطعی ہے جو کچھ کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت سے کہتا ہے اور کسی معاملے میں اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں [ص ۲۵ میزآن] وہ اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کر دیتا ہے اس میں کسی ریب و گماں کے لیے ہرگز کوئی گنجائش نہیں [ص ۳۵، میزان] ۔یہی چیز قرآن کو برہان قاطع بناتی ہے اور تاویل کے تمام اختلافات ختم کرتی ہے [ص ۵۱] لیکن غامدی صاحب دوزخ کے بارے میں قرآن کی روشنی میں دو تاویلات پیش کر رہے ہیں اگر وہ یہ کہہ دیں کہ قرآن کی روشنی میں دوزخ کے دوام کی تاویل ہی واحد تاویل اور یہی حجت ہے اور دوزخ کے خاتمے کی تاویل دراصل میری خود ساختہ تاویل بلکہ میری آرزو خواہش امید تمنا ہے تو اس تضاد کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ قرآن بالکل قطعی اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت سے کہتا ہے اور غامدی صاحب دوزخ کے دوام کی قطعیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنی توقع کو پورا کرنے کے لیے اس قطعیت کا نہایت قطعیت سے انکار کر دیتے ہیں ۔صرف انکار ہی نہیں کرتے وہ لائحہ عمل بھی بیان کر دیتے ہیں جس کے تحت ہی اب اللہ رب العزت دوزخ کا خاتمہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں [نعوذ باللہ] ہوسکتا ہے غامدی صاحب کہیں کہ میں نے اپنی توقع ،تمنا، آرزو کے اختتام پر قرآن کی آیت بھی تو پیش کی ہے اگر قرآن کی یہ آیت جس سے غامدی صاحب نے دوزخ کے خاتمے کا مفہوم اخذ کیا ہے فی الحقیقت اسی مفہوم کی حامل ہے تو قرآن کی وہ آیات جن میں دوزخ کے دوام کا ذکر ہے ان میں اختلاف پیدا ہو گیا یہ اختلاف غامدی صاحب کے اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ میزان کے اصول و مبادی میں وہ ثابت کر چکے

ہیں کہ قرآن میں تضاد ممکن نہیں اس اختلاف کو رفع کرنے کا ایک طریقہ غامدی صاحب نے اصول و مبادی میں بتایا ہے لیکن خود اس طریقے کو عملاً اور علماً رد کر دیا ہے رفع اختلاف کا طریقہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں ''ایک مقام میں ایک پہلو مخفی ہوتا ہے دوسرے مقام میں وہ واضح ہو جاتا ہے ایک جگہ اس کا اصل رخ غیر معین ہوتا ہے دوسرے سیاق وسباق میں وہ رخ بالکل معین ہو کر سامنے آجاتا ہے ایک ہی لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے دوسری آیات میں وہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے قرآن کی مشکلات خود قرآن سے واضح ہو جاتی ہیں [ص ۴۲ میزان] ''قرآن آپ اپنی تفسیر کرتا ہے'' اس بات کو قرآن کی روشنی میں بطور اصول مان لینا چاہیے [ص ۴۳ میزان] ایک حوالے سے لکھتے ہیں [قرآن کی آیت کی تفسیر کے بارے میں] میں نے ہر جگہ ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے [ص ۵۲ میزان] لیکن دوزخ کے معاملے میں حضرت والا کو معلوم نہیں کیوں دو اقوال اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اب آیئے تصریف آیات کے تحت دیکھتے ہیں کہ کیا دوزخ کو دوام حاصل ہے یا وہ غامدی صاحب کی خواہش نفس کے مطابق ایک دن تہس نہس ہو جائے گی۔

قرآن بتاتا ہے اِنَّکُمۡ لَفِیۡ قَوۡلٍ مُّخۡتَلِفٍ [۸:۵۱] [آخرت کے بارے میں] تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے اس آیت کے اتباع میں غامدی صاحب کے اقوال بھی ایک دوسرے سے متضاد ہیں قرآن کہتا ہے لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡہَا الۡمَوۡتَ اِلَّا الۡمَوۡتَۃَ الۡاُوۡلٰی وَ وَقٰہُمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ [۵۶:۴۴] [جنتی] وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے بس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابِ جَہَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ، لَا یُفَتَّرُ عَنۡہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡہِ مُبۡلِسُوۡنَ ، وَ مَا ظَلَمۡنٰہُمۡ وَ لٰکِنۡ کَانُوۡا ہُمُ الظّٰلِمِیۡنَ ، وَ نَادَوۡا یٰمٰلِکُ لِیَقۡضِ عَلَیۡنَا رَبُّکَ قَالَ اِنَّکُمۡ مّٰکِثُوۡنَ ، لَقَدۡ جِئۡنٰکُمۡ بِالۡحَقِّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَکُمۡ لِلۡحَقِّ کٰرِہُوۡنَ [۴۳:۷۴تا۷۸] [۲:۸۱] دوزخ میں جانے والے ہمیشہ اس میں رہیں گے فَالۡیَوۡمَ لَا یَمۡلِکُ بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ نَّفۡعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ وَ نَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ بِہَا تُکَذِّبُوۡنَ [۳۴:۴۲] عذاب کی شدت کے احساس سے تو کافر چلائیں گے اے کاش میں مٹی ہوتا اِنَّاۤ اَنۡذَرۡنٰکُمۡ عَذَابًا قَرِیۡبًا ۚۖ یَّوۡمَ یَنۡظُرُ الۡمَرۡءُ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰہُ وَ یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا [۷۸:۴۰] ، اِنَّکُمۡ لَذَآئِقُوا الۡعَذَابِ الۡاَلِیۡمِ [۳۷:۳۸] ، اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡہِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا [۴:۵۶] ، لَوۡ یَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا حِیۡنَ لَا یَکُفُّوۡنَ عَنۡ وُّجُوۡہِہِمُ النَّارَ وَ لَا عَنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ [۲۱:۳۹] ، کُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡہَا مِنۡ غَمٍّ

اُعِیۡدُوۡا فِیۡھَا وَ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ [۲۲:۲۲] رہے مجرمین تو وہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے کبھی ان کے عذاب میں کمی نہ ہوگی اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے وہ پکاریں گے اے مالک تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کردے تو اچھا ہے وہ جواب دے گا تم یوں ہی پڑے رہو گے ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے مگر تم میں سے اکثر کو حق ہی ناگوار تھا وَ قِیۡلَ الۡیَوۡمَ نَنۡسٰکُمۡ کَمَا نَسِیۡتُمۡ لِقَآءَ یَوۡمِکُمۡ ہٰذَا وَ مَاۡوٰىکُمُ النَّارُ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ۔ ذٰلِکُمۡ بِاَنَّکُمُ اتَّخَذۡتُمۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ ہُزُوًا وَّ غَرَّتۡکُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا ۚ فَالۡیَوۡمَ لَا یُخۡرَجُوۡنَ مِنۡہَا وَ لَا ہُمۡ یُسۡتَعۡتَبُوۡنَ [۳۴:۴۵،۳۵] آج ہم بھی اسی طرح تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے تمہارا ٹھکانہ اب دوزخ ہے اور کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے لہٰذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو ذلک یوم الخلود [۵۰:۳۴] وہ دن حیات ابدی کا دن ہوگا دوزخ میں داخل ہو جاؤ تم ہمیشہ یہاں رہو گے [۳۹:۷۲] دوزخیوں کے لیے اللہ کی رحمت سے دوری ہے [۶۷:۱۱] ہر طرف سے موت آرہی ہوگی مگر وہ مرنے میں نہیں آئے گا [۱۴:۱۷] جہنم میں نہ جیے گا نہ مرے گا [۲۰:۷۴] وہ موت کو پکاریں گے آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بہت سی موتوں کو پکارو [۲۵:۱۴] چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں نکل نہیں سکیں گے ان کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے [۵:۳۷] ظالموں سے کہا جائے گا کہ ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو [۱۰:۵۲] اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے نہ کسی کو دوست پائیں گے نہ مددگار [۳۳:۶۵] وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے نہ عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت ملے گی [۲:۱۶۲] نہ عذاب میں کمی کی جائے گی نہ ان کو مہلت ملے گی [۱۶:۸۵] آگ میں جلنے والے دوزخ کے داروغہ سے کہیں گے اپنے پروردگار سے کہو کہ ایک روز تو ہم سے عذاب ہلکا کردے [۴۰:۴۹] اللہ تعالیٰ کفار کی فتح و پکار پر ایک دن کے لیے بھی عذاب میں تخفیف کے لیے آمادہ نہیں مگر غامدی صاحب کفار، مشرکین، ملحدین، منافقین، کفار کی محبت میں انھیں جہنم سے نجات کی خوش خبری جہنم کے خاتمے کی بنیاد پر دے رہے ہیں مگر کیوں؟ کفار ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں رہیں گے [۴۳:۷۴، ۷۵] سو مزہ چکھو ہم تم پر عذاب بڑھاتے جائیں گے [۷۸:۳۰] قرآن کہہ رہا ہے کہ ہم کفار پر مسلسل جہنم میں عذاب بڑھاتے جائیں گے مگر غامدی صاحب کفار کو خوش خبری دے رہے ہیں کہ بس جہنم فنا کر دی جائے گی جو کام تم کرتے تھے اس کی پاداش میں ہمیشہ کے لیے عذاب کے مزے چکھتے رہو [۳۲:۱۴] نہ یہ

دوزخ سے نکالے جائیں گے نہ ان کی توبہ قبول ہوگی [۴۵:۳۵] کفار کہیں گے اے مالک ہم کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے تو کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے [۱۱:۴۰] کفار کی درخواست، التجا، التماس، استدعا، آہ و زاری، گریہ و بکا، چیخ و پکار، رنج و الم، درد و غم، دیکھنے کے باوجود اللہ رب العزت ان کو دوزخ سے نکلنے کے لیے کوئی راہ نہیں بتا رہا مگر غامدی صاحب کا فہم قرآن اتنا زبردست ہے کہ وہ کفار کی خواہش کی تکمیل کے لیے حشر برپا ہونے سے پہلے جہنم کے دہکنے اور بھڑکنے اور ھل من مزید کہنے سے پہلے ہی میزان کے ذریعہ اللہ رب العزت کے اختیارات کی تحدید کے لیے میدان میں اتر آئیں ہیں ۔ وَیَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَی ، الَّذِیْ یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی، ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی [۸۷:۱۱تا۱۳] اور جو اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا پھر نہ اس میں مرے گا نہ جیئے گا۔ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ، وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا یُقْضٰی عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا کَذٰلِکَ نَجْزِیْ کُلَّ کَفُوْرٍ ، وَهُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْهَا رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ کُنَّا نَعْمَلُ اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَکَّرَ وَجَآءَکُمُ النَّذِیْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ [۳۵:۳۵ تا ۳۷] اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کی آگ ہے نہ ان کا قصہ پاک کردیا جائے گا کہ مرجائیں اور نہ ان کے لیے جہنم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی اس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک اعمال کریں ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا اور تمہارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آچکا تھا اب مزا چکھو ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے۔ان آیات بینات کے باوجود اگر غامدی صاحب دوزخ کے خاتمے کی نوید سناتے ہیں تو یہ دنایت ہے دوزخ کے خاتمے کا نقطۂ نظر ہماری تاریخ کے بعض گمراہ فلسفیوں اور بعض گمراہ فرقوں نے اختیار کیا تھا غامدی صاحب فلسفے کے بھی طالب علم رہ چکے ہیں لہٰذا یہ رائے انہوں نے فلسفے ے مطالعے کے دوران حفظ کرکے اپنے تفرد کے طور پر پیش کی جس طرح وہ ابوالکلام آزاد کی بعض آراء کو جو اجماع امت سے مختلف ہیں اپنے تفردات کے طور پر پیش کرتے ہیں

اللہ کے قانون اتمام حجت اور غامدی صاحب کے قانون اتمام حجت کے صولوں کے تحت پیغمبر کا کسی بھی اجنبی قوم کو صرف ایک خط لکھ دینا کافی ہے کسی قوم پر اللہ کا عذاب قانون اتمام حجت کے چار مراحل کے

بغیر نازل نہیں ہوتا[ص۱۷۴] اللہ تعالیٰ رسولوں کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں ان کی دعوت کے چند مراحل اور ان مراحل کے چند لازمی نتائج ہیں جو انھی کے ساتھ خاص ہیں یہ دعوت کی کسی دوسری صورت سے متعلق نہیں ہیں رسولوں کی دعوت کے پانچ مراحل ہیں ۱۔انذار، ۲۔انذار عام، ۳۔اتمام حجت، ۴۔ہجرت و برأت، ۵۔جزاوسزا[قانون دعوت ۵۳۸ تا ۵۴۳ میزان ۲۰۰۸ء] ان اصولوں کے باوجود اتمام حجت صرف خط لکھنے سے بھی ہو جاتا ہے لہٰذا غامدی صاحب لکھتے ہیں —— رسول کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آپ کے جانشینوں نے چند ہی برسوں میں ان سب سلطنتوں کا تختہ الٹ دیا جن کے حکمرانوں کو اپنی وفات سے پہلے آپ نے خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی تھی اور بتا دیا تھا کہ وہ سلامتی چاہتے ہیں تو آپ کی دعوت قبول کر لیں اس لیے کہ خدا کے رسول کی طرف سے اتمام حجت کے بعد انھیں لازماً مغلوب ہو کر رہنا ہے ان کی سلطنت اب قائم نہیں رہ سکتی[ص۱۷۴] اس کے معانی یہ ہوئے کہ اتمام حجت کے قانون کے دو مختلف مناہج ہیں۔ ایک منہج وہ جو رسول کی قوم سے خاص ہے لہٰذا قوم پر اتمام حجت اس منہاج کے تحت پانچ مراحل میں مکمل ہوتا ہے اور رسول کے وہ مخاطب جو خاص اس کی قوم سے تعلق نہیں رکھتے ان کے ساتھ ان مراحل اتمام حجت کو روبہ عمل لانا ممکن ہی نہیں ہوتا لہٰذا دوسری قوموں کے لیے اللہ کے اذن سے رسول کا اتمام حجت یہی ہے کہ ان قوموں کے نام رسول کی جانب سے ایک خط لکھ دیا جائے یہ اتمام حجت کا متبادل ہے وما ینطق عن الھویٰ ظاہر ہے پیغمبر یہ کام اللہ کی اجازت کے بغیر تو نہیں کر سکتا۔ کیونکہ رسول کی زبان سے کوئی لفظ اللہ کی مرضی کے خلاف نہیں نکل سکتا۔

[۱۴۴] ایک مسلم قوم کا عالم دوسری کافر قوم میں تبلیغ کے لیے جانے کا مجاز نہیں اس کی دعوت کا اصل کام مقامی ہے آفاقی نہیں۔ دعوت کے ہر داعی کے لیے اصل مخاطب کی حیثیت اس کی اپنی قوم کو حاصل ہے آیت کا یہی حصہ ہے جس سے اس دعوت کا دائرہ بالکل متعین ہو جاتا ہے اور اس چیز کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اس کے داعی اصل حق داروں کو چھوڑ کر یہ دولت جہاں تہاں دوسروں میں بانٹتے پھریں[میزان ص۵۵۲] کچھ لوگ دین کا علم حاصل کر کے اپنی قوم کے لیے نذیر بنیں[ص۵۵۱] دعوت دینے کے مکلّف ہر مسلمان نہیں ہے[ص۵۵۲] دین کا عالم بن کر اپنی قوم کو انذار کیا جائے[ص۵۵۲] اگر علماء اور داعیوں کی تعداد اصل حق داروں کی ضرورت سے زیادہ ہو تو کیا اس صورت میں بھی عالم یا داعی دوسری قوم

کی طرف دعوت کے لیے سفر نہیں کر سکتا۔اس پابندی کے ذریعے غامدی صاحب نے قیامت تک کے لیے دوسری قوموں کے لیے دعوت وتبلیغ کے امکانات معدوم کردیے ایک جانب وہ شہادت علی الناس کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ذریت ابراسم کا یہی منصب ہے جس کے تحت یہ اگر حق پر قائم ہو اور اسے بے کم وکاست اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتی رہے تو ان کے نہ ماننے کی صورت میں وہ جو جاہلیت خالصہ بدعت ضلالت اور جہالت ہے اور امت کا فریضۃ ہے کہ وہ تمدن کا رخ درست کر کے اسے قیامت تک اللہ ان قوموں پر اسے غلبہ عطا فرما دیتے ہیں [ص ۵۵۰] جناب غامدی کے اوپر بیانکردہ اصول کے تحت جب امت کے عالم دعوت کا کام نہیں کریں گے اور کفار انکار نہیں کریں گے تو امت کو غلبہ کیسے ملے گا غلبے کا جو طریقہ غامدی صاحب نے بتایا ہے اس کے تحت امت کے لوگ کفار عالم تک حق پوری قطعیت کے ساتھ پہنچادیں گے وہ اس حق کو رد کردیں گے تو اللہ اس انکار کے صلے میں مسلمانوں کو غلبہ عطا کردے گا کیا کفار تک مسلمان قطعیت کے ساتھ دین کی دعوت پہنچا سکتے ہیں اس بارے میں غامدی صاحب کی عجیب وغریب موقف ان کے شاگرد رفیع مفتی کی کتاب سوال وجواب کے ص ۲۶۱ پر پڑھا جاسکتا ہے جو کافر اور غیر مسلم سے متعلق ہے یہ کتاب میزان سے متعلق سوالات کا جواب ہے جو غامدی کی ہدایت پر مرتب کیے گئے ہیں ایک جانب وہ دعوت کے دائرے کو مقامی بنادیتے ہیں مگر سورۃ توبہ کی آیت ۱۲۲ اور سورہ الحج کی آیت ۷۸ میں لکھتے ہیں [علماء] اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق امت کی ہر بستی اور ہر قوم میں اس دعوت کو ہمیشہ زندہ رکھیں [۵۵۳] جب عالم صرف اپنی قوم کو مخاطب کرے گا تو ہر بستی اور ہر قوم تک دعوت کیسے پہنچے گی جبکہ عالم کے سوا کوئی عامی مسلمان دعوت دین دینے کا اہل ہی نہیں ہے اگر امت کو علماء میسر نہ ہوں تو عام مسلمان کی ہرگز یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ کفار کو دعوت دے۔

[۱۴۵] دنیا میں صالحین کی قیادت قائم ہو اور دین کا غلبہ ہو یہ تمنا ہونی چاہیے دنیا کی قیادت صالحین کو منتقل ہو جائے دین کا غلبہ قائم ہو جائے اور اللہ کی بات ہر بات سے اونچی قرار پائے بے شک ہر داعی کی تمنا ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے [ص ۵۵۳ میزان] غلبہ دین کا طریقہ یہ ہے کہ ”ذریت ابراہیم حق پر قائم ہو اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں کو دعوت پہنچاتی رہے تو نہ ماننے کی صورت میں اللہ ان قوموں پر اسے غلبہ عطا فرماتے ہیں [ص ۵۵۰]

[۱۴۶] وہ کسی حال میں بھی [دین] اس میں کوئی ترمیم و اضافہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوں پورا حق جس طرح قرآن و سنت سے ثابت ہے اس کی ساری ہدایت احکام لوگوں کو بتائیں [ص ۵۵۴]۔ غامدی صاحب اپنے اصولوں کی تردید کرتے ہوئے دین کے ماخذات قرآن و سنت میں مسلسل ترمیم و اضافہ کر رہے ہیں قرآن کی ایک ہی آیت کے کبھی چار پانچ چھ مطالب بتاتے ہیں کبھی کہتے ہیں قرآن کی ایک آیت کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے کبھی سنتوں کی تعداد چالیس بتاتے ہیں کبھی ستائیس کبھی چھبیس [میزان ۲۰۰۲ء، میزان ۲۰۰۸ء، میزان ۲۰۱۰ء] میزان کی آخری اشاعت ۲۰۱۰ء طبع پنجم میں صفحہ ۱۴ پر سنت کے عنوان کے تحت سنتوں کی تعداد چھبیس ہے لیکن اسی میزان کے مختلف ابواب میں کئی اور امور کو انہوں نے سنت میں شامل کر دیا ہے لہٰذا سنتوں کی فہرست میں اب مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اضافے سے متعلق تفصیلات ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں دین میں ترمیم و اضافہ کی یہ صورت جاری ہے تو حتمی دین کب میسر ہو گا اور کب پیش کیا جائے گا [۱۴۶] حکمت تغیرات سے بالا ہوتی ہے شریعت ہر قوم کی ضرورت کے مطابق اترتی ہے [ص میزان] الکتاب کو شریعت کہتے ہیں [ص ۶۸] شریعت انسانی تمدن میں ارتقاء اور تغیر کے باعث البتہ بہت کچھ مختلف رہی ہے [ص ۶۸] اللہ کی ہدایت کے دو حصے ہیں قانون حکمت [ص ۱۵۲] قانون پہلے آتا ہے حکمت بعد میں آتی ہے انسان خلق و خالق دونوں سے متعلق اپنے عمل کو پاکیزہ بنائے یہی چیز عمل صالح ہے تمام شریعت اس کی فرع ہے تمدن کی تبدیلی کے ساتھ شریعت تو بے شک تبدیل بھی ہوتی ہے لیکن ایمان اور عمل صالح اصل دین ہیں ان میں کوئی ترمیم و تغیر کبھی نہیں ہوا [ص ۱۹۷] غامدی صاحب بار بار لکھتے ہیں کہ تمدن کی تبدیلی سے شریعت یعنی الکتاب تو ہمیشہ بدلتی رہی ہے یعنی حکمت تو مستقل غیر متغیر رہی مگر شریعت قانون یعنی الکتاب بدلتی رہی۔ سوال یہ ہے کہ اگر تمدن ہمیشہ تبدیلی و تغیر کی زد میں رہتا ہے اور فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو قرآن پر الکتاب کا اختتام کیوں کر دیا گیا؟ یا تو اللہ تعالیٰ نے اب تمدن کو قیامت تک منجمد کر دیا اور اس میں کوئی بنیادی تغیر اب کبھی برپا نہیں ہو گا یا کتاب کو منجمد کر دیا کہ تمدن کتنا ہی تبدیل ہو امت مسلمہ کا فرض ہے کہ ہر تمدن کو اب اس کتاب سے ہم آہنگ تمدن کے مطابق تبدیل کر دے یعنی اب قیامت تک تمدن کی حقانیت صداقت اور اعتبار کا پیمانہ محض قرآن حکیم ہے جو تمدن اس قرآن سے ہم آہنگ نہیں قرآن کے مطابق ڈھالتی رہے جب بھی تمدن متغیر ہو اسے مسخر کر دے ظاہر ہے غامدی صاحب کی اجتہادی روح اس تغیر کو قبول نہیں کر سکتی تو کیا

الکتاب کو اب متغیر تمدن کے مطابق ڈھال دیا جائے مسئلے کا حل یہی ہے لہٰذا تجدد پسند اصلاح پسند اور غامدی صاحب جیسے مخلصین قرآن کو جدید مغربی مسلط کردہ تمدن کے مطابق ڈھالنے کی سعی کر رہے ہیں۔

....

[۱۴۶] سورۂ نور میں قرآن نے کہا ہے کہ عورت سر کی اوڑھنی سے سینے کو ڈھانپے: سورۂ نور میں مسلمان عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سر کی اوڑھنیوں سے اپنے گریبانوں کو ڈھانپیں: ان الفاظ سے گریبانوں کو ڈھانکنے کا حکم تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات صریح طور پر معلوم نہیں ہوتی کہ سر کی اوڑھنی سر پر لینا لازم ہے مستحب ہے یا یہ محض عرب خواتین کا ایک رواج ہے [ص۲۳۴ محمد رفیع مفتی سوال جواب ۲۰۰۸ء المورد لاہور]

[۱۴۷] سورۂ نور میں قرآن نے یہ نہیں کہا کہ عورت سر کی اوڑھنی سے سینے ڈھانپے: میزان ۲۰۰۸ء میں مرد وزن کے اختلاط کے زیر عنوان غامدی صاحب نے سورہ نور کی آیات ۲۷ تا ۳۱ کا ترجمہ کیا ہے [۲۴:۳۰] کا ترجمہ کرتے ہوئے غامدی صاحب نے اپنے سابقہ ترجمے اور سابقہ موقف کو یک لخت بدل دیا ہے لکھتے ہیں اور اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے سینوں پر ڈالے رہیں اور زیت کی چیزیں نہ کھولیں۔ اوپر سورہ نور کی اسی آیت سے ثابت کر رہے تھے کہ سر کی اوڑھنیوں سے اپنے گریبانوں کو ڈھانکیں لیکن ظاہر ہے اس ترجمے سے یہ بات خود بخود مستنبط ہوتی ہے کہ اوڑھنی قرآن نے سر کے لیے مخصوص کی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سر اوڑھنی سے سینہ ڈھانپنا تو لازم ہو مگر جس مقصد کے لیے اوڑھنی کا ذکر کیا گیا ہے اوڑھنی اس مقصد سے ماوراء ہو اور دوسرے کسی مقصد کا وصیلہ ہو۔ لہٰذا اپنے فکری سقم کو دور کرنے کے لیے غامدی صاحب نے ترجمے میں ہی تحریف فرمادی تا کہ کسی قسم کا اعتراض روانہ ہو سکے ورنہ معترض یہ پوچھ سکتا تھا کہ حضرت یہ کیسی آیت ہے کہ جس سے سر کی اوڑھنی کو ڈھانکنے کا حکم تو ثابت ہی نہیں ہو رہا مگر سر کی اوڑھنی سے سینہ ڈھانپنے کا حکم ثابت ہو گیا ہے وہ یہ بھی پوچھ سکتا تھا اچھا حضرت جب سر کی اوڑھنی سے سینے کو ڈھانپے گی تو اوڑھنی کا کچھ حصہ سر پر رہے گا یا نہیں۔ یا اوڑھنی سر سے سرک کر سینے کو لپیٹ کر عورت کے کندھوں سے لپٹ جائے گی ان تمام اعتراضات کے پیش نظر غامدی صاحب نے نہایت پرکاری سے ترجمہ ہی بدل دیا۔ مگر ترجمہ بدلتے ہوئے وہ بھول گئے کہ قرآن کی آیت یدنین علیھن من جلابیبھن کی تاویل وہ کس اصول کے تحت کریں گے حکم ہے کہ اہل ایمان عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی چادریں اپنے

اوپر لٹکا لیا کریں تو یہ سینے والی چادر سینے سے اوپر جا کر واپس آئے گی یا یہ چادر گلے اور کندھے سے اٹھ کر سر پر جا کر نیچے لٹکے گی یا یہ چادر سر پر ہی رکھی جائے گی اور وہاں سے پلو کی صورت میں لٹکالی جائے گی چونکہ یہ چادر سر سے نیچے آتی یہ اور عورتیں عرب میں اسے لٹکاتی تھیں صرف ازواج مطہرات نہیں بلکہ تمام مومنات اسی کے پیش نظر غامدی صاحب میزان میں تسلیم کرتے ہیں اور مومنات کو حکم دیتے ہیں کہ ''عورت کے لیے [حج میں] صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہیں [ص ۳۸۸ میزان] غامدی نے عورت کے لیے حج میں جو اصول بیان کیا وہ سورۂ احزاب کی آیت ۵۸ کی تحدید و تخصیص ہے کیونکہ سورہ میں حکم دیا گیا کہ عورت جب بھی باہر نکلے تو اپنی چادر کے پلو لٹکا لے۔ اسی لیے حج میں اسے سہولت کے لیے پلو لٹکانے سے منع کیا گیا ہے اور غامدی صاحب نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے اس کے باوجود انہوں نے سورۂ احزاب کی پلو سے متعلق آیت کے ترجمے میں بھی تحریف کی ہے ان کا ترجمہ ہے اے پیغمبر مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ [باہر نکلیں تو] اپنی کوئی چادر اپنے اوپر ڈال لیا کریں [ص ۴۷۰ میزان] اپنی کوئی چادر سے کیا مراد ہے گویا عورتیں باہر نکلنے کے لیے کسی خاص چادر کا اہتمام نہیں کرتیں جو مل جائے ڈال کر نکل آتی ہیں بستر کی چادر گھر کی چادر سب اسی کام کے لیے وقف ہیں حجاب کے لیے کسی چادر کا کوی اہتمام ہی نہیں ہے گویا مومنات کے لیے اس حکم کی کوئی خاص اہمیت ہی نہیں ہے۔ اور چادر اوپر ڈال لیا کریں تو کس طرح کس کے اوپر ڈال نہیں سکتے کہ قرآن نے سر کا پردہ لازم نہیں کیا چہرے کو چھپا نہیں سکتے کہ چہرہ تو ظاہر ہونے والی زینت ہے اس کا پردہ لغت عرب اور کشاف کی تفسیر کے خلاف ہے اس کا مطلب ہے کہ چادر صرف سینے پر ڈالیں اس چادر سے نہ سر چھپایا جائے گا نہ چہرے پر پلو لٹک کر اس کے حسن کو غیر نمایاں کرے گا۔

[۱۴۸] سر پر دوپٹہ رکھنا صرف پسندیدہ بات ہے: غامدی صاحب لکھتے ہیں: سر کے معاملے میں بھی پسندیدہ بات یہی ہونی چاہیے کہ عورتوں کو سر پر دوپٹہ اوڑھ کر رکھنا چاہیے یہ اگرچہ واجب نہیں ہے قرآن نے اسے لازم ٹھہرایا ہے کہ مسلمان عورتیں ہاتھ پاؤں چہرے کے سوا جسم کے کسی حصے کی زیبائش اجنبی مردوں کے سامنے نہیں کھولیں گی [ص ۱۵۰، مقامات ۲۰۰۸ء]

[۱۴۹] سینہ ڈھانپنے کے لیے دوپٹہ ہی ضروری نہیں ہے: دوپٹا اوڑھنا کوئی شرعی حکم نہیں: دوپٹہ ہماری تہذیبی روایت ہے دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے اس کا کوئی جواز نہیں یہ تہذیبی شعار

ہے اصل چیز سینہ ڈھانپنا ہے یہ مقصد کسی اور ذریعے سے حاصل ہو جائے تو کافی ہے اس کے لیے دوپٹہ ہی ضروری نہیں ہے [غامدی جاوید احمد اشراق ماہنامہ مئی ۲۰۰۲ء، ص ۴۷، المورد لاہور] واضح ہے کہ پہلے غامدی صاحب کے خیال میں سر پر دوپٹا یا اسکارف اوڑھ کر باہر نکلنے کی روایت قرآن کے اس حکم سے قائم ہوئی ہے جس میں اللہ کی ہدایت ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے ہاتھ پاؤں اور چہرے کے سوا جسم کے کسی حصے کی زیبائش مردوں کے سامنے نہیں کھولیں گی [مقامات ص ۱۵۰، ۲۰۰۸ء]

[۱۵۰] لفظ و معنی کا سفر کبھی الگ نہیں ہوتا: لفظ اپنے معنی میں ہی مستعمل ہوتا ہے: ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال اگر پیدا ہو جائے کہ الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو ہر چیز بالکل بے معنیٰ ہو جائے گی: غامدی صاحب میزان میں لکھتے ہیں: دنیا کی ہر زندہ زبان کے الفاظ و اسالیب جن مفاہیم پر دلالت کرتے ہیں وہ سب متواترات پر مبنی اور ہر لحاظ سے بالکل قطعی ہوتے ہیں۔

لفظ اور معنی کا سفر کبھی الگ الگ نہیں ہوتا، وہ جب تک مستعمل رہتا ہے اپنے معنی کے ساتھ مستعمل رہتا ہے۔ ہم کسی لفظ کے مفہوم سے ناواقف ہو سکتے ہیں اور اس کی تعین میں غلطی بھی کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنے مفہوم کی قطعیت کے بغیر ہی مستعمل ہے یا کسی دور میں مستعمل رہا ہے اس کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کی سب زبانوں میں یہ انسان کا مشترک سرمایہ ہے۔

جملوں میں مجاز اور حقیقت کو الگ الگ پہچاننے میں کوئی فرد تو بے شک غلطی کر سکتا ہے لیکن انسان کا یہ اجتماعی شعور کبھی متردد نہیں ہوتا اور ہم اسی کی روشنی میں فرد کو اس کی غلطی پر متنبہ کرتے ہیں۔ زبان سے متعلق یہی حقیقت ہے کہ جس کی بنا پر ہم جو کچھ بولتے اور لکھتے ہیں اس اعتماد کے ساتھ بولتے اور لکھتے ہیں کہ دوسرے اس سے وہی کچھ سمجھیں گے جو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں ہر روز جو دستاویزات لکھی جاتی ہیں جو فیصلے سنائے جاتے ہیں جو احکام جاری کیے جاتے ہیں جو اطلاعات بہم پہنچائی جاتی ہیں اور جن علوم کا ابلاغ کیا جاتا ہے ان کے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال اگر پیدا ہو جائے کہ ان کے الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو ان میں سے ہر چیز بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گی

[میزان ص ۳۲، ۳۳، ۲۰۰۸ء]

[۱۵۱] لفظ کا مفہوم قطعی نہیں ہوتا: الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر کبھی قطعی نہیں ہوتی: اس عدم قطعیت کے باوجود کوئی حکم بے معنی نہیں ہوتا: اسی لیے قرآن کی آیت من بعد وصیۃ میں لفظ و معنی کا سفر الگ الگ ہے:

۱۹۸۵ء میں اس کے معانی تھے ایسی وصیت جو صرف غیر وارث کے حق میں ہی ہوسکتی ہے لیکن وارث کے حق میں قطعاً نہیں ہوسکتی: ۲۰۰۲ء میں اس کے معنی تھے مرنے والے کو وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں: ۲۰۰۸ء میں اس کے معنی تھے ایسی ہی کوئی وصیت جو وارثوں کے سوا کسی دوسرے کے حق میں ہو یا وارثوں کی کسی ضرورت کے لیے یا ان کی کسی خدمت کے صلے میں ان کے حق میں کی جائے ۲۰۰۸ء میں ہی اس لفظ کے معنی کا ایک نیا سفر تھا جس کے مطابق وصیت کے لیے وارث غیر وارث کی تحدید ہی نہیں ہے کسی وارث غیر وارث کے حق میں کتنی وصیت کی جائے اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے زبان و بیان کے کسی قاعدے کی رو سے اس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی وارثوں کی کوئی ضرورت یا کسی کی خدمت کا تقاضہ ہو تو وصیت یقیناً ہوسکتی ہے وصیت وارثوں کے حق میں بھی ہوسکتی ہے اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے وارث کے حق میں پوری جائیداد کی بھی وصیت دیگر ورثاء کو محروم کر کے ہوسکتی ہے: غامدی صاحب نے پہلے زبان کا فلسفہ بیان کیا کہ لفظ کا مفہوم قطعی ہوتا ہے ایسا نہ ہو تو کسی لفظ کا فہم بے معنی ہو جائے گا مگر جناب غامدی صاحب نے وصیت کے لفظ و معنی کا جو سفر ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۸ء تک طے کیا ہے اس کی تفصیل کے لیے میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء کا ص ۸۳، میزان ۲۰۰۲ کا میزان ۲۰۰۸ء کا ص ۵۲۵ اور مقامات طبع اول ۲۰۰۸ء کا صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲، ملاحظہ کیجیے لفظ و معنی کے سفر کا اصول جس طرح لہولہو ہوا ہے وہ سامنے ہے۔

[۱۵۲] انسانی فطرت صرف کھانے کی چیزوں کے بارے میں بالعموم صحیح رہنمائی کرتی ہے: انسانی فطرت پینے کی چیزوں کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کرتی۔ غامدی صاحب کے یہاں فطرت محدود ہے جو صرف کھانے کے امور میں متحرک ہے لکھتے ہیں۔ انسان کی یہ فطرت بالعموم اس کے صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کرلیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے [ص ۳۵ میزان ۲۰۰۸ء] قرآن نے صرف یہ بتا کر کہ تمام طیبات حلال اور تمام خبائث حرام ہیں انسان کو اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے [ص ۳۶، ۲۰۰۸ء] قرآن نے بھی صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر کیا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ، اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [۲:۱۷۲-۱۷۳] ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو تم کو ہم نے عطا کی ہیں۔

[۱۵۳] منکرین مسیح [یہود] پر منکرین رسالت مآب [عیسائیوں] کا غلبہ ہوگا: منکرین مسیح یہود پر قیامت تک اللہ کا عذاب رہے گا: منکرین محمدؐ عیسائیوں پر قیامت تک اللہ کا عذاب نہیں ہوگا ان پر عذاب صرف رسالت مآب اور عہد صحابہ تک محدود تک تھا اس کے بعد وہ قیامت تک عذاب سے بری ہو گئے کیونکہ ان کے یہاں توحید ہے: منکرین عیسیٰ یہودیوں پر قیامت تک ہمیشہ کے لیے انکار نبوت مسیحؑ کے باعث ذلت کا عذاب مسلط رہے گا: منکرین محمدؐ عیسائیوں یہودیوں مشرکین پر عذاب رسالت مآبؐ اور صحابہ کے ہاتھوں نازل ہونے کے بعد اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور ان کے لیے قیامت تک باب رحمت کھل گیا: یہودیوں پر انکار مسیح کے باعث اللہ کا عذاب اس لیے نہیں اترا کہ وہ اہل کتاب تھے توحید کے قائل تھے لہٰذا توحید کی وجہ سے ان کو ہلاک کرنے کے بجائے قیامت تک ان پر ہمیشہ کے لیے ذلت کا عذاب مسلط کر دیا گیا وقتاً فوقتاً ایسے لوگ ان پر مسلط ہوتے رہیں گے جو انہیں نہایت برے عذاب چکھائیں گے: غامدی صاحب نے یہ تمام اصول اپنی کتاب میزان ۲۰۰۸ء کے باب ایمانیات ص ۱۶۹، قانون دعوت ص ۵۴۷ قانون جہاد ص ۵۹۹ پر بیان کیے ہیں۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں [اہل کتاب کے لیے] جزیہ ادا کرنے کی رعایت [سورۂ توبہ آیت ۲۹] اصلاً ان کے توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ کی گئی تھی مگر انہوں نے نقض عہد کیا تو خیبر کے یہود اور نجران کے نصاریٰ کو بھی جلا وطن کر دیا گیا؟ [میزان ص ۵۹۹] اتمام حجت کے باوجود اللہ کی سنت کے برعکس عذاب سے بنی اسرائیل کو کیوں استثنا دیا گیا اس کے جواب میں غامدی صاحب لکھتے ہیں۔ جن کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سیدنا مسیحؑ کے ان کو چھوڑنے کے بعد ان کی ہلاکت کے بجائے ہمیشہ کے لیے مغلوبیت کا عذاب ان پر مسلط کر دیا گیا [ص ۵۹۸ میزان باب جہاد] عہد رسالت مآبؐ کے عذاب کی تشریح میں لکھتے ہیں یہ محض قتال نہ تھا اللہ کا عذاب تھا جو مشرکین یہود و نصاریٰ عرب سے باہر کی بعض قوموں پر [رسالت مآبؐ اور صحابہ کی تلواروں کے ذریعے] نازل کیا گیا لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زبردست بنا کر رکھنے کا حق اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا قیامت تک کوئی شخص نہ اب دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی کو مفتوح، محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم وعدوان کے خلاف جنگ ہے یہی قتال اللہ کی راہ میں ہے اس کے سوا کسی مقصد کے لیے

بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی۔[ص ۶۰۱ میزان]

[۱۵۴] رسول اپنی قوم کے حق و باطل میں امتیاز کا واحد ذریعہ ہوتا ہے: ایک جانب غامدی صاحب ص ۱۸۵ میزان پر رسول کو فرقان، برہان، قرار دیتے ہوئے حق و باطل میں امتیاز کا واحد ذریعہ لکھتے ہیں لیکن عذر کی بنیاد پر ایمان سے محروم شخص کے لیے نجات کے راستے بھی بتاتے ہیں کسی بھی نبی کے دور میں اس پر ایمان سے محرومی کسی صریح عذر ہی کی بنا پر قابل معافی ہو سکتی ہے۔[ص ۸۵، سوال و جواب المورد، لاہور ۲۰۰۸ء] اگر رسول حق و باطل میں امتیاز کا واحد ذریعہ ہے تو ایمان لانے میں عذر کا کیا سوال؟ اگر رسول حجت ہے تو یہ حجت کیسی ہے کہ آدمی اس حجت کو پا لینے کے باوجود ایمان سے محروم ہی رہا اور اس کی عذر خواہی بھی پیش رہا ہے۔

بینک کی نوکری حرام ہے کیونکہ بینک کا مال اور کاروبار حرام ہے مگر اس حرام مال سے قرض لینا حلال ہے اور اس حرام مال کے قرض پر حرام سود دینا سود لینے والے کے لیے حرام مگر دینے والے کے لیے حلال ہے۔

[۱۸۹] کسی انسان کی جان صرف دو صورتوں میں لی جا سکتی ہے وہ کسی کو قتل کر دے یا نظم اجتماعی سے سرکشی کر کے فساد فی الارض کا مرتکب ہو توہین رسالت کے مجرم کی سزا قتل نہیں ہے: توہین رسالت کا جرم۔ جرائم کی دونوں صورتوں میں شامل نہیں: توہین رسالت کے جرم میں قتل کی سزا دینا قتل ناحق ہے قرآن کی رو سے اس قتل ناحق کی سزا ابدی جہنم ہے: جو شخص توہین رسالت پر کسی کو قتل کی سزا دیتا یا اس سزا کا مطالبہ کرتا یا اس سزا کا نفاذ کرتا ہے وہ سب جہنمی ہیں [شاید توہین کرنے والا جنتی ہے]: اخلاقیات کے باب میں انسان کی جان کی حرمت کے تحت غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ انسان کی جان دو ہی صورتوں میں لی جا سکتی ہے ایک وہ کسی کو قتل کر دے۔۲۔ فساد فی الارض کا مرتکب ہو اس کے سوا ہر قتل ایک ناحق قتل ہے جس کی سزا قرآن کی رو سے ابدی جہنم ہے [۲۲۸ میزان ۲۰۰۸ء] حدود و تعزیرات کے تحت میزان باب سات میں وہ اس مضمون کی شرح و وضاحت میں کہ قتل کی سزا کس جرم کے مرتکب کو دی جائے لکھتے ہیں۔ موت کی سزا قرآن کی رو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں نہیں دی جا سکتی [ص ۶۱۱ میزان ۲۰۰۸ء] محاربہ اور فساد فی الارض کے تحت غامدی صاحب نے میزان کے ص ۶۱۲ پر المائدہ کی آیت ۳۳ اور ۳۴ کی تشریح میں جن جرائم کو فساد فی الارض کے تحت شامل کیا ہے ان میں توہین رسالت اور توہین خدا کا

جرم سرے سے شامل نہیں ہے [ص ۶۱۲ میزان] اس سے پہلے ۱۹۹۳ء میں غامدی صاحب نے میزان کا باب ''حدود و تعزیرات'' کتابچے کی شکل میں شائع کیا تھا تو اس میں فساد فی الارض سے متعلق جرائم میں انہوں نے توہین رسالت کو جرم کی فہرست میں شامل کیا تھا مگر توہین خدا کو اس فہرست میں بھی شامل نہیں کیا تھا۔ غامدی صاحب کے اس فلسفے کے تحت قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی دوسرے جرم میں بلکہ توہین رسالت کے جرم میں بھی کسی فرد موت کی سزا دینا قرآن کے نص کی خلاف ورزی ہے۔ یہ قتل ناحق ہے کیونکہ توہین رسالت کا جرم فساد فی الارض سے متعلق جرائم میں شامل ہی نہیں ہے لہٰذا جو شخص، گروہ، حکومت، ریاست توہین رسالت کے جرم پر قتل کی سزا کا مطالبہ، نفاذ اور اجراء کرتی ہے وہ سب قتل ناحق کے مجرم ہیں جس کی سزا ابدی جہنم ہے لہٰذا توہین رسالت کی سزا کا اطلاق کرنے والے غامدی صاحب کے اصولوں کے تحت جہنم میں ہوں گے مگر توہین کا ارتکاب کرے والا ظاہر ہے بے گناہ مظلوم اور جنتی ہے وہ جہنم میں بھلا کیسے جا سکتا ہے۔

[۱۹۰] سورۂ نور میں صرف اس زانیہ یا زانی سے قرآن نے نکاح حرام ٹھہرایا ہے حرم ذلک علی المومنین جو ثبوت جرم کے بعد سزا کا مستحق قرار پائے: ثبوت جرم کے بغیر زنا کی سزا پائے بغیر زانی یا زانیہ کی شہرت رکھنے والے رکھنے والی سے نکاح قرآن کی نظر میں حرام نہیں ہے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں: زانی زانیہ سے ہر نکاح باطل ہے [ص ۶۲۵ میزان ۲۰۰۸ء] آیت میں لاینکح کے الفاظ نہی کے مفہوم میں ہیں اور اللہ نے اسی کی وضاحت میں فرمایا ہے کہ زانی یا زانیہ سے نکاح اور اہل ایمان پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے [ص ۶۲۵] تاہم جیسا کہ بیان ہوا ہے یہ حکم صرف اس زانی کے بارے میں ہے جو ثبوت جرم کے بعد سزا کا مستحق قرار پائے [ص ۶۲۶] دوسرے معنوں میں مشہور معروف زانی زانیہ جن کے خلاف عدالت میں کوئی مقدمہ نہ ہو جرم ثابت نہ ہوا ہو، بدکرداری کی شہرت کے باوجود کوئی سزا بھی نہ ہوئی ہو ایسے زانی زانیہ سے نکاح جائز ہے۔ اس معاملے میں انسان اپنی عقل سے کام لینے کا بھی مکلّف نہیں ہے۔ عصر حاضر میں تو اسلامی ممالک میں بھی زنا کی سزا نہیں دی جاتی لہٰذا معروف مشہور بلکہ اعتراف جرم کی شہرت رکھنے والے زانی زانیہ سزا سے محروم ہیں لہٰذا ان سے نکاح قرآن کی رو سے جایز کیسے ہو گیا۔ اس اصول کے باعث فلم ٹی وی وٹو گرافی کی صنعت میں کام کرنے والی خواتین کے نکاح کو ممکن بنانے کے تمام انتظامات غامدی صاحب کی شریعت نے یقینی بنا دیے ہیں۔ [ص ۶۲۶]

[۱۹۱]عصر حاضر میں زنا کی سزا کا اطلاق ممکن نہیں ہے۔زنا کی سزا سے پہلے ضروری ماحول حالات کا وجود ضروری ہے: ضروری ماحول حالات ریاست کے بغیر ممکن نہیں: تمام اسلامی سزائیں ریاست یا نظم اجتماعی دے سکتا ہے لہٰذا ریاست اسلامی کی ذمہ داری ضروری ماحول حالات مہیا کرنا ہے۔ضروری ماحول حالات اور حفاظت سے محروم سب لوگ اس جرم کی سزا سے یقیناً مستثنیٰ ہیں ۔زنا کی سزا اسلامی حکومت نافذ کرتی ہے لہٰذا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جہاں زنا ناممکن ہوجائے مگر غامدی صاحب کی میزان میں ایسی حکومت کا قیام اس حکومت کی اصلاح وتعمیر کا کوئی منصوبہ ان کی میزان میں موجود نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ زنا کی سزا کا اطلاق عہد حاضر میں ممکن ہی نہیں ہے۔غامدی صاحب لکھتے ہیں: خاندان کی حفاظت سے محرومی اور ناقص اخلاقی تربیت کے باعث بھی زنا کی سزا معطل ہوسکتی ہے [ص ۶۲۶] ظاہر ہے یہ تمام کام بھی اسلامی ریاست ہی کی ذمہ داری ہیں لہٰذا جہاد، حدود وتعزیرات ،امر بالمعروف نہی عن المنکر ،زکوٰۃ ،صلوٰۃ کا نظام اور دنیا کے مظلوموں کی مدد کے لیے قرآن کے حکم جہاد کے اطلاق کا نظام اس وقت تک قائم ہی نہیں ہوسکتا جب تک ایک اسلامی حکومت موجود نہ ہو یعنی شریعت پر مکمل عمل سیاسی اقتدار اور نظم اجتماعی کے بغیر ممکن ہی نہیں سیاسی اقتدار کی عدم موجودگی میں مسلمان کبھی شریعت پر کامل عمل کے قابل ہی نہیں ہوسکتے نماز کا مقدمہ وضو ہے زنا کی سزا کا نفاذ اور اس کے لیے صالح معاشرے کی تعمیر کا مقدمہ اسلامی نظم ریاست وحکومت ہے اس کے بغیر صرف نیک خیالات کے اظہار سے کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی۔شریعت کے ہر عمل کا مقصد غامدی صاحب کے خیال میں محض تزکیہ ہے اس کی تفصیل انھوں نے میزان میں بہت عمدہ طریقے سے بیان کی ہے۔لہٰذا تزکیہ کے ذریعے اخلاقی وجود کی تیاری کے لیے ایک مزّکی ریاست بھی لازمی ہے جو ایسے حالات اسباب مہیا کرے جو فرد کی تطہیر اصلاح تعمیر کے ساتھ ساتھ اس کو ہر قسم کے فساد قلب، شر اور خباثت سے محفوظ رکھنے کی ضمانت مہیا کرسکے اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود غامدی صاحب کے فلسفے کے تحت تزکیہ اگر اصل دین ہے تو تزکیہ کا مقدمہ اسلامی ریاست کا قیام بھی دین کا ایک لازمی تقاضہ بن جاتا ہے تاکہ فرد کی شخصیت اس زمین پر علائق دنیا سے محفوظ رہتے ہوئے معرفت رب کے قابل ہوسکے مگر غامدی صاحب اسلامی ریاست کے سلسلے میں تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

غامدی صاحب کی رائے میں زنا کی سزا دینے سے پہلے ایسے حالات ماحول، اسباب،

ذرائع، وسائل پیدا کرنے ضروری ہیں جو زنا کو ناممکن بنا دیں سد ذریعہ کے بغیر سزا کا اطلاق انصاف نہیں ہے لہٰذا وہ لکھتے ہیں [مجرم زنا] اپنے حالات کے لحاظ سے کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں چنانچہ سزا کے تحمل سے معذور، مجبور اور جرم سے بچنے کے لیے ضروری ماحول، حالات اور حفاظت سے محروم سب لوگ اس سے یقیناً مستثنیٰ ہیں [ص ۶۲۶ میزان]

[۱۹۲] مسلمانوں کے لیے قیامت تک قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ صرف اور صرف ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے: قتال کی دوسری صورت بھی فرض ہے جب کبھی دین کے فروغ یا حفاظت کے لیے جہاد و قتال کا مطالعہ کیا جائے تو جہاد فرض ہے: نصرت دین کے لیے جہاد سورہ صف آیت ۱۰ تا ۱۴ اور سورۂ توبہ آیت ۲۴ کی روشنی میں امت پر فرض ہے ۔غامدی صاحب نے میزان کے قانون جہاد میں قرآن سے یہ قانون اخذ کیا ہے کہ ظلم و عدوان کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر [قیامت تک کسی سے کوئی] جنگ نہیں کی جا سکتی مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے [ص ۶۰۱، میزان] جہاد یا اقدام کے دو مقاصد تھے۔ ۱۔فتنہ باقی نہ رہے ۲۔سرزمین عرب میں دین اللہ کا ہو جائے [ص ۵۹۴] فتنہ مذہبی جبر [Persecution] ہے یہ روایت اب دنیا سے ختم ہوگئی ہے مگر فتنے کے خلاف قرآن کی جہاد کی ہدایت ابدی ہے [ص ۵۹۵] دین کو اپنے فروغ یا اپنی حفاظت کے لیے اگر کسی اقدام کی ضرورت پیش آئے تو ایمان کا تقاضہ ہے کہ جان و مال سے دین کی مدد کی جائے یہ اللہ کی نصرت ہے رسول اللہ کو مدینہ میں اقتدار حاصل ہونے کے بعد اس کی ضرورت پیش آئی اور لوگوں سے جہاد و قتال کا مطالبہ کیا گیا [ص ۷۵، میزان ۲۰۰۸ء] سلف وخلف میں دین کی حفاظت بقا تجدید و احیاء کے تمام کام ایمان کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہوئے ہیں زبان و قلم تیغ و سنان اور درہم و دینار سے دین کے لیے ہر جدوجہد کا ماخذ یہی نصرت ہے ایمان کا یہ تقاضہ اگر کسی وقت سامنے آ جائے تو بندۂ مومن کو دنیا کی کوئی بھی چیز اس سے عزیز تر نہیں ہونی چاہیے۔ [ص ۷۶، میزان]

پہلے غامدی صاحب کا دعویٰ تھا کہ قتال کی بس ایک ہی صورت باقی ہے مگر میزان میں دین حق کے باب میں وہ قتال کی دوسری صورت کو بھی فرض قرار دے رہے ہیں۔ یہ تضاد غامدی صاحب کی شخصیت کا جزو لازم ہے۔

[۱۹۳] دین کا غلبہ صرف تبلیغ دین سے ہوگا: دین کے غلبے کے لیے ہجرت، نصرت، قیام بالقسط تین

لازمی تقاضے ہیں: ذریت ابراہیم اگر حق پر قائم ہو اور اسے بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتی رہے تو ان کے نہ ماننے کی صورت میں اللہ ان قوموں پر اسے غلبہ عطا فرماتے ہیں اور اس سے انحراف کرے تو انھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں [ص ۵۵۰ میزان] غلبہ دین کی حکمت عملی سے غامدی صاحب ہجرت نصرت قیام بالقسط کے تین شرعی تقاضوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا میزان میں لکھتے ہیں انسان کو خارج کے لحاظ سے جو حالتیں اس دنیا میں پیش آ سکتی ہیں ان کی رعایت سے ان کے عاوہ تین اور تقاضے بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں ہجرت، نصرت، قیام بالقسط [ص ۵۷ میزان ۲۰۰۸ء]

[۱۹۴] امت وسط ذریت ابراہیم ہے: امت وسط بنی اسمٰعیل ہے: امت وسط بنی اسرائیل ہے: امت وسط نصاریٰ ہیں: امت وسط امت مسلمہ ہے: امت وسط صحابہ کرام ہیں: ذریت ابراہیم اگر حق پر قائم اور حق کو پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتی رہے تو ان کے نہ ماننے کی صورت میں اللہ ان قوموں پر اسے غلبہ عطا فرماتے ہیں یہودی مسلمان عیسائی کو آج بھی غلبہ مل سکتا ہے اگر وہ حق قطعیت سے دنیا تک پہنچا دیں۔ یہود و نصاریٰ کے پاس بھی دین خالص موجود ہے اگر وہ قطعیت سے یہ حق اقوام عالم تک پہنچا دیں اور وہ قبول نہ کریں تو اللہ رب العزت پر یہود و نصاریٰ کو غلبہ عطا کر دیں گے: وحدت ادیان کا فلسفہ برحق فلسفہ ہے: عیسائیت یہودیت اسلام یکساں طور پر الحق ہیں۔ غامدی صاحب ۱۹۹۵ء تک امت وسط امت مسلمہ کو سمجھتے تھے اور شہادت علی الناس کے مرتبے پر اسے فائز قرار دیتے تھے ۲۰۰۵ء کے بعد وہ امت وسط کے بارے میں مختلف النوع رائے رکھتے ہوئے لکھتے ہیں: (۱) اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا [۷۳:۱۵] شہادت کا یہ منصب رسولوں کے علاوہ سیدنا ابراہیمؑ کی ذریت کو بھی عطا ہوا قرآن نے اسی کے پیش نظر انھیں خدا کے رسول اور اس کے بندوں کے درمیان ایک جماعت امت وسط وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا ؕ وَ مَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَۃَ الَّتِیۡ کُنۡتَ عَلَیۡہَاۤ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡہِ ؕ وَ اِنۡ کَانَتۡ لَکَبِیۡرَۃً اِلَّا عَلَی الَّذِیۡنَ ہَدَی اللّٰہُ ؕ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ [۲:۱۴۳] قرار دیا۔ [ص ۷۱ میزان ۲۰۰۸ء]۔ (۲) سورۂ حج کی آیت ۸ میں قرآن نے بتایا ہے کہ ذریت ابرہیم کو بھی اللہ نے اس شہادت کے لیے اس طرح منتخب کیا جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض جلیل القدر

ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ [۳:۳۳] اللہ نے فیصلہ فرمایا کہ اب یہ منصب ان کی ذریت کو بھی بحیثیت جماعت عطا ہوگا اور ان کے ذریعے سے دین کی حجت سارے عالم پر قائم کی جائے گی قرآن و بائبل دونوں میں اس عالمی دینونت کی سرگزشت تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ تین و زیتون طور سنین اور مکہ کے شہر امین کی قسم میں اسی کا حوالہ دیا ہے۔ زیتون وہ پہاڑ ہے جہاں سیدنا مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد ان کے منکرین پر قیامت تک کے لیے عذاب کا فیصلہ سنایا گیا اور بنی اسرائیل میں سے ان کے ماننے والوں کی ایک نئی امت نصاریٰ کی ابتداء ہوئی۔ تین اسی پر واقع ایک گاؤں ہے۔ جبل طور کے بارے میں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل نے بحیثیت امت اپنی زندگی اسی پہاڑ سے شروع کی۔ ام القریٰ مکہ سے بنی اسمٰعیل نے اپنی قومی زندگی کا آغاز کیا اور خدا کی زمین پر اس کی عبادت کے اولین مرکز، بیت الحرام کی تولیت انھیں عطا کی گئی۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تینوں ذریت ابراہیم کے لیے خدا کی دینونت کے مقامات ظہور ہیں۔ قرآن نے ان کی شہادت پیش کر کے فرمایا ہے کہ دنیا میں اس جزا وسزا کو دیکھنے کے بعد وہ کیا چیز ہے جو قیامت میں خدا کی جزا و سزا کو جھٹلا سکتی ہے؟ [میزان ص ۵۴۹، ۲۰۰۸ء] ارشاد فرمایا ہے: وَ التِّیۡنِ وَ الزَّیۡتُوۡنِ، وَ طُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ، وَ ہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ، لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ، ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ، اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ، فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ، اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ [التین ۹۵:۱۔۸] ”تین اور زیتون گواہی دیتے ہیں اور طور سنین اور [تمہارا] یہ شہر امین بھی کہ انسان کو ہم نے [ان مقامات پر] پیدا کیا تو اس وقت وہ بہترین ساخت پر تھا۔ پھر ہم نے اسے پستی میں ڈال دیا اس طرح کہ وہ خود ہی پستیوں میں گرنے والا ہوا۔ رہے وہ جو ایمان پر قائم رہے اور انھوں نے نیک عمل کیے تو ان کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کے بعد کیا چیز ہے۔ [اے پیغمبر] جو روز جزا کے بارے میں تمھیں جھٹلاتی ہے؟ [ان سے پوچھو] کیا اللہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں ہے؟“ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کو اسی بنا پر درمیان کی جماعت امۃ وسطاً قرار دیا ہے جس کے ایک طرف خدا اور اس کا رسول اور دوسری طرف الناس یعنی دنیا کی سب اقوام ہیں اور فرمایا ہے کہ جو شہادت رسول نے تم پر دی ہے اب وہی شہادت باقی دنیا پر تمھیں دینا ہوگی: وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا [۲:۱۴۳] ”اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک درمیان کی جماعت بنایا تاکہ تم

لوگوں پر [حق کی] شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر یہ شہادت دے''۔ یہی بات آل عمران میں اس طرح واضح فرمائی ہے: کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡھَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ [۳:۱۱۰] ''تم وہ بہترین جماعت ہو جو لوگوں [پر حق کی شہادت] کے لیے برپا کی گئی ہے۔ [اس لیے کہ] تم [ایک دوسرے کو] بھلائی کی تلقین کرتے ہو برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر سچا ایمان رکھتے ہو''۔ قرآن کی یہ آیت جو خاص امت مسلمہ سے متعلق ہے اس کو غامدی صاحب وسیع کرتے ہوئے یہود ونصاریٰ کو بھی اس آیت کا مصداق قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ذریت ابراہیم کا یہی منصب ہے جس کے تحت یہ اگر حق پر قائم ہو اور اسے بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتی رہے تو ان کے نہ ماننے کی صورت میں اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اسے غلبہ عطا فرماتے ہیں اور اس سے انحراف کرے تو انھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل، دونوں اس وقت اسی عذاب سے دوچار ہیں۔ [میزان، ص ۵۵۰] دوسرے معنوں میں عیسائی اور یہودی اگر آج بھی پوری قطعیت کے ساتھ حق دنیا کی سب قوموں تک پہنچا دیں تو اللہ ان کو غلبہ عطا فرما دے گا یعنی غامدی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے پاس آج بھی دین خالص توحید خالص اور کتاب خالص حق کی صورت میں موجود ہے۔

غامدی صاحب امت وسط کا منصب بیک وقت عیسائی یہودی اور مسلمانوں کو عطا فرما کر وحدت ادیان کے جدید فلسفے کی تائید و توثیق کر رہے ہیں مگر یہ تائید و تصدیق نہایت شاطرانہ طریقے سے کی جا رہی ہے جس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا جدید مغرب وحدت ادیان کے نقطۂ نظر کا پرجوش حامی ہے اس فلسفے کا عالمانہ فلسفیانہ جواز روایت کے مکتب فکر کے بانی رینے گینوں اور ان کے شاگردشواں، مارٹن لنگز، ولیم چیٹک حسین نصر کی تحریریں میں پڑھا جا سکتا ہے جو جدیدیت کی ہی ایک فرع ہیں۔

[۱۹۵] حرام چیزوں کا استعمال صرف حالت اضطرار میں ہی حسب ضرورت مجبوری کے باعث عارضی طور پر جائز ہے: غامدی صاحب لکھتے ہیں محرمات [حرام چیزوں] سے استثناء صرف اور صرف حالت اضطرار کا ہے اور وہ بھی غیر باغ ولا عاد یعنی اس طرح کہ آدمی نہ خواہش مند ہو نہ وہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھنے والا ہو حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃُ وَ الدَّمُ وَ لَحۡمُ الۡخِنۡزِیۡرِ وَ مَاۤ اُھِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ وَ الۡمُنۡخَنِقَۃُ وَ الۡمَوۡقُوۡذَۃُ وَ الۡمُتَرَدِّیَۃُ وَ النَّطِیۡحَۃُ وَ مَاۤ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیۡتُمۡ وَ مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَ اَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ؕ ذٰلِکُمۡ فِسۡقٌ ؕ اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ

الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَ اخْشَوْنِ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [۵:۳] موت یا حرام میں کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راہ بظاہر کھلی ہوئی باقی نہ رہ جائے ایسی حالت میں اس کو اجازت ہے کہ حرام چیزوں میں سے بھی کسی چیز سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے [ص ۶۳۹ میزان] مگر ایسا بندہ یعنی نہ تو دل سے چاہنے والا ہے اور نہ سدرمق کی حد سے آگے بڑھنے والا: رخصت بہر حال رخصت ہے اور حرام بہر شکل حرام ہے نہ حرام شیر مادر بن سکتی ہے نہ رخصت کوئی ابدی پروانہ ہے: کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دفع اضطرار کی حد سے آگے بڑھے [۶۳۹، میزان]۔

[۱۹۵] بینکوں سے قرض لینے کے سلسلے میں حالت اضطرار کا اصول لاگو نہ ہوگا: بینکوں کا تمام کام اور سرمایہ حرام ہے مگر اس سے بلا کسی استثناء کے حرام مال کا قرض لینا بلا شک وشبہ حلال ہے اور اس حرام قرض پر حرام سود دینا بھی مقروض کے لیے شریعت میں حلال ہے مگر یہ حرام سود صرف لینے والے کے لیے حرام ہے مگر حرام سود دینے والے کے لیے حرام دینے کا عمل حلال ہے: قرآن نے کسی جگہ سود دینے والی کی مذمت نہیں کی: سود خوروں سے قرض لے کر اس پر سود دینے والا قرآن کی نظر میں مظلوم ہے لہٰذا بینک کا ہر مقروض قرآن کی نظر میں مظلوم ہے: غامدی صاحب نے اوپر اصول بیان کیا کہ حرام چیزوں کو صرف اضطراری حالت میں استعمال کیا جا سکتا ہے مگر اب اچانک حرام حالت اضطرار میں حرام کھانے کی ان شرائط کو نظر انداز کر کے حرام کھانے کی اجازت عام بھی دی جا رہی ہے۔ بینکوں کے حرام کام، حرام کاروبار، حرام سرمایے، کے بارے میں غامدی صاحب کا نقطۂ نظر جو محمد رفیع مفتی نے اپنی کتاب سوال جواب میں معیشت کے عنوان سے ص ۱۳۳ تا ۱۵۲ بیان کیا ہے اس میں غامدی صاحب نے بینکاری کے پورے نظام کو سودی قرار دے کر اس میں صرف اور صرف نوکری کو حالت اضطرار کے تحت عارضی طور پر مجبوراً حلال قرار دیا ہے مگر بینک سے سودی قرضہ لینے کو بغیر کسی حالت اضطرار کے حلال قرار دیا ہے اور اس پر سود ادا کرنا بھی حلال ہے ان کا نقطۂ نظر رفیع مفتی بیان کرتے ہیں۔ ۱۔ بینک سودی ادارہ ہے اسلام میں سود کھانا کھلانا حرام ہے کسی بڑے عذر اور مجبوری کے تحت تو ایسا ہوسکتا ہے کہ آدمی کچھ دیر کے لیے بنک میں ملازمت کرے لیکن یہ ملازمت اصلاً جائز نہیں [ص ۱۴۰] بنک کی ملازمت انتہائی مجبوری کے سوا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے [ص ۱۴۳] بینک سے سود پر قرضہ لینا جائز ہے شریعت نے سود

کھانے یعنی سود لینے سے منع کیا ہے سود دینے سے نہیں [ص ۱۳۶] سود لینا حرام ہے سود پر قرض دینا حرام نہیں ہے غامدی صاحب کی رائے کے مطابق آپ ٹریکٹر خریدنے کے لیے زرعی بینک سے سود پر قرض لے سکتے ہیں [ص ۱۴۹] غامدی صاحب اور رفیع مفتی صاحب نے بینک سے حرام مال کا قرضہ لینے اور اس پر حرام سود کو حلال کرتے ہوئے حالت اضطرار کی شرط سرے سے عائد نہیں کی غامدی صاحب لکھتے ہیں قرآن نے کسی ایک جگہ ایک لفظ بھی سود دینے والوں کی مذمت میں نہیں کہا بلکہ انہیں مظلوم قرار دیا [ص ۱۴۴ مقامات ۲۰۰۸ء]

[۱۹۶] دین میں فرض سنت اور نفل کے ساتھ واجب کا بھی زمرہ ہے: غامدی صاحب دین میں یا تو فرض کے قائل ہیں یا نفل کے یا سنت کے۔ مگر کبھی کبھار وہ اپنے اصول سے انحراف کرتے ہوئے واجب کو بھی دین یا شریعت میں شمار کرتے ہیں مگر فرض نوافل مستحب اور واجب کی توضیح وتشریح نہیں کرتے سنت چونکہ متعین ہیں اور چھبیس ہیں لہٰذا سنت کو وہ واجب اور مستحب کی فہرست سے بالکل الگ رکھتے ہیں مگر فرض، نوافل واجب مستحب کے بارے میں وضاحت نہیں کرتے کہ شریعت میں ان کا کیا مقام ہے اور یہ قرآن وسنت میں کہاں مذکور ہیں میزان میں لکھتے ہیں [عورت کو بھلے طریقے سے رخصت کرو] اس سے واضح ہے کہ یہ ایک حق واجب ہے [ص ۴۴۸، میزان] داڑھی کا ترک فرض و واجب کا ترک نہیں [ص ۱۳۸، مقامات ۲۰۰۸] دوپٹا اگرچہ واجب نہیں ہے [ص ۱۵۰ مقامات ۲۰۰۸ء] داڑھی رکھنا واجب ہے [ص ۲۲۴، ۲۲۵ سوال جواب المورد لاہور ۲۰۰۸ء]

[۱۹۷] حدود وتعزیر یا سزا کا نفاذ حکومت یا نظم اجتماعی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خود بدلہ لینے یا سزا دینے کا اختیار نہیں رکھتا: اس اصول کی تشریح میں جناب غامدی صاحب لکھتے ہیں اللہ نے قریش کی طرف سے ظلم وعدوان کے باوجود زمانہ رسالت میں نظم اجتماعی کے قیام کی شرط کے پورا ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو [اقدام] کی اجازت دی اس کے بغیر یہ اب بھی کسی مسلمان کے لیے جایز نہیں ہوسکتا [ص ۵۸۱، میزان ۲۰۰۸ء] [قتل ودیگر جرائم] کی سزا کا حکم مسلمانوں کو ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں ہے بلکہ پورے مسلمان معاشرے کو دیا گیا ہے اور اس لحاظ سے ان کے نظم اجتماعی سے متعلق ہے یہ ایک بدیہی بات ہے [ص ۶۱۱، میزان ۲۰۰۸ء] یہی وجہ ہے کہ ان کا حکم ہی قرآن کی ان سورتوں میں بیان ہوا ہے جو اس وقت نازل ہوئی ہیں جب یثرب کا اقتدار رسول اللہ کو منتقل ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی

با قاعدہ حکومت قائم ہوگئی تھی کوئی شخص یا جماعت اگر کسی خطۂ ارض میں سیاسی اقتدار نہیں رکھتی تو اسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کوئی سزا کسی جرم پر نافذ کرے ان سزاوں کے مخاطب مسلمانوں کے امراء حکام ہیں عام مسلمان ان احکام کے مخاطب ہی نہیں ہیں [۶۱۱ میزان ۲۰۰۸ء]

[۱۹۸] حکومت اور نظم اجتماعی کے بغیر بھی مقتول کے اولیاء قصاص لے سکتے ہیں قتل کے بدلے میں قاتل کو قتل کر سکتے ہیں مسلمان دنیا میں جہاں بھی ہو اسلامی حکومت کے بغیر ظلم کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں جو مکی سورت ہے اللہ نے مسلمانوں کو حکومت نظم اجتماعی کے بغیر بدلہ لینے کی اجازت دی: غامدی صاحب نے اوپر جو کچھ فلسفہ بیان کیا کہ بدلہ یا سزا فرد کا حق نہیں صرف اور صرف ریاست نظم اجتماعی کی ذمہ داری ہے اور لہٰذا سزا کا حکم صرف ان سورتوں میں بیان ہوا جو مدینہ میں اقتدار کے بعد نازل ہوئیں اب اک دم اس فلسفے اور اصول سے یکسر مختلف اصول بیان کرتے ہیں میزان میں لکھتے ہیں [قتل] کے اس جرم کے مرتکبین کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہے مقتول کے اولیا کے ساتھ بھی ہے اور ان کو اللہ نے پورا اختیار دے دیا ہے لہٰذا دنیا کی کوئی عدالت ان کی مرضی کے بغیر قاتل کو کوئی رعایت نہیں دے سکتی۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اگر قصاص پر اصرار کریں تو ان کی مدد کرے اور جو کچھ وہ چاہیں اسے پوری قوت کے ساتھ اور ٹھیک ٹھیک نافذ کر دے۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی کوئی با قاعدہ حکومت اگر کسی جگہ قائم نہ ہو اور قصاص کا معاملہ مقتول کے اولیاء ہی سے متعلق ہو جائے تو وہ اپنی اس حیثیت میں حدود سے تجاوز کریں اور مثال کے طور پر جوش انتقام میں قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرنے کی کوشش کریں یا اپنی شرافت ونجابت اور برتری کے زعم میں اپنے غلام کے بدلے میں آزاد عورت کے بدلے میں مرد کے قتل کا مطالبہ کریں یا مجرم کو عذاب دے دے کر ماریں یا مار دینے کے بعد اس کی لاش پر غصہ نکالیں یا قتل کے ایسے طریقے اختیار کریں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے: فلا یسرف فی القتل کے الفاظ اسی تنبیہ کے لیے آئے ہیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ قیامت میں یہی اختیار مقتول کو بھی حاصل ہوگا اور اس کی مرضی کے بغیر قاتل کو وہاں بھی کوئی رعایت نہ مل سکے گی۔ [میزان ۲۲۹]، ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کی جانب سے ریاست کے بغیر حد کے نفاذ کی اجازت ان کا اجتہاد نہیں ہے بلکہ یہ اجازت اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں مکہ کے مظلوم مسلمانوں کو عطا فرمائی ہے یہ سورۂ مکی ہے وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ

فِّی الْقَتْلِ اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا [۱۷:۳۳] [] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مکہ میں مقیم مظلوم مسلمانوں کو اسلامی حکومت ریاست اور نظم اجتماعی کے بغیر قصاص لینے کی اجازت دی ہے غامدی صاحب نے قرآن کی نص سے نظم اجتماعی ریاست حکومت نظم سیاسی کے بغیر قتل کے بدلے کی اجازت کا ذکر نہیں کیا بلکہ بزعم خود اپنی جانب سے اجازت دے دی مگر میزان کے دیگر مقامات پر اس اجازت کی تردید بھی فرمادی ہے۔ قرآن کی یہ آیت غامدی صاحب کے اس موقف کا مکمل رد ہے جس کے تحت وہ قتل کے بدلے کو صرف اور صرف اسلامی ریاست سے مشروط کرتے ہیں قرآن کی سورۂ نحل مکی ہے اس میں بھی مسلمانوں کو کفار سے بدلہ لینے کی اجازت دی گئی واضح رہے کہ اس وقت مکہ میں مسلمانوں کی حکومت نہیں تھی۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُم بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ، وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ، وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ ، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ [۱۶:۱۲۵ تا ۱۲۸] خطاب ریاست، حکومت، نظم اجتماعی سے نہیں ہے اللہ نے اجازت دی ہے تو بدلہ لینے والے کی مدد کا وعدہ بھی اس اجازت میں مخفی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۳ میں بھی مکہ کے مسلمانوں کو بدلہ لینے کی اجازت دی گئی اور بدلہ لینے والے کی مدد کا وعدہ اللہ نے کیا تھا سورۂ شوریٰ مکی ہے اس میں بھی اللہ نے مومنین کو کفار کی زیادتیوں ظلم کے جواب میں صرف خاموش رہنے اور غامدی صاحب کی طرح نظم سیاسی، اقتدار اسلامی، خلافت، حکومت کے قیام تک صبر کرنے کی تلقین نہیں کی بلکہ مومنین کی خوبی یہ بتائی کہ جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پھر جو کوئی معاف کردے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ، وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ، وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْھِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ، اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ، وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ [۴۲:۳۹، ۴۳]۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ بدلہ قصاص، قتل وغیرہ کے لیے صرف اسلامی ریاست کا ہونا لازمی نہیں ہے اس کے بغیر بھی یہ فرائض انجام دیے جاسکتے ہیں۔

[۱۹۹] دین کا ایک ہی ماخذ ہے وہ ذات رسالت مآب ہیں: سنت مقدم ہے قرآن موخر ہے: دین

دوصورتوں میں ہم تک نہیں پہنچا ہے قرآن مجید اور سنت: ہر شخص پابند ہے کہ قرآن پر کس چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے: دانش اللہ کی پہلی وحی ہے اور قرآن دوسری وحی یعنی دین کا پہلا ماخذ دانش اور دوسرا ماخذ قرآن ہے: قرآن دین کا آخری ماخذ ہے کیونکہ قرآن دین کی پہلی کتاب نہیں آخری کتاب ہے: سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن پر مقدم ہے: قرآن پر رسول مقدم ہے کہ قرآن تو ہمیں رسول سے ملا ہے رسول پہلے ہے قرآن بعد میں: سنت رسول پر مقدم ہے کہ سنت پہلے ہے اور رسول بعد میں: رسول سب پر مقدم ہے کیونکہ رسول نہ ہوتا تو ہمیں نہ قرآن ملتا نہ سنت ملتی قرآن کے مقدمات فطرت کے حقائق دین ابراہیمی کی روایت نبیوں کے صحائف ہیں: غامدی صاحب اپنے ان اصولوں کی تشریح میں کیا بولتے ہیں لکھتے ہیں پڑھیے: سنت کیا ہے اس پر غور کریں تو سنت مقدم ہو جاتی ہے قرآن موخر ہو جاتا ہے [ساحل مئی ۹۸ ص ۵۷ محاضرات غامدی مارچ ۱۹۹۸ء، کراچی] ان کے دینے سے قرآن ہمارا مرجع بنا ہے انہوں نے سنت سے کسی چیز کو دین قرار دیا تو ہمارے لیے وہ بھی ماخذ بنا کتابوں میں یہ بات لکھ دینی چاہیے کہ دین کا ایک ہی ماخذ ہے وہ ذات رسالت مآب ہے [ص ۵۴ ساحل مئی ۱۹۹۸ء محاضرات غامدی مارچ ۱۹۹۸ء کراچی] قرآن کی دعوت اس کے پیش نظر جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہیں ۱۔ فطرت کے حقائق ۲۔ دین ابراہیمی کی روایت، ۳۔ نبیوں کے صحائف۔ [ص ۴۴۔ ۴۵ میزن ۲۰۰۸ء] یعنی غامدی صاحب کی نظر میں قرآن پر یہ تینوں چیزیں مقدم ہیں مگر اسی میزان میں وہ لکھتے ہیں ''ہر شخص پابند ہے کہ [قرآن] اس پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے [ص ۲۴ میزان ۲۰۰۸ء] اسی میزان میں یہ بھی لکھتے ہیں ''سنت قرآن کے بعد نہیں قرآن سے مقدم ہے۔ [ص ۴۷، میزان ۲۰۰۸ء] پھر لکھتے ہیں فطرت کے حقائق نبیوں کے صحائف اور سنت قرآن کے مقدمات ہیں اب دین میں کیا موخر ہے کیا مقدم ہے یہ محض چیستان ہے جس کی وضاحت غامدی صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ افضال ریحان کو انٹرویو دیتے ہوئے ان کا نیا موقف سامنے آتا ہے سوال: یعنی دانش خود دین کا ایک بنیادی حصہ ہے؟ جواب یوں کہیں کہ دانش اللہ تعالیٰ کی پہلی وحی ہے اور قرآن دوسری وحی جن معاملات میں دانش [پہلی وحی] کو آزاد چھوڑا گیا ہے وہاں وہ کام کرے گی [افضال ریحان اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب حریف یا حلیف: انٹرویو جاوید غامدی ص ۵۸، ۲۰۰۴ء دار التذکیر لاہور] ہمارے ہاں غلطی یہ کی گئی ہے کہ جن معاملات کو عقل انسانی [پہلی وحی دانش] پر چھوڑا گیا تاہم ان میں اسلام کو لے آئے ہیں اور جن معاملات پر وحی کے ذریعے ہدایت دی

گئی تھی [دوسری وحی قرآن] ان پر عقل پہلی وحی کو لے آئے ہیں [ص ۵۹ محولہ بالا] غامدی صاحب میزان میں لکھتے ہیں [قرآن] دین کی پہلی نہیں بلکہ آخری کتاب ہے [ص ۴۳ میزان ۲۰۰۸ء] سوال یہ ہے کہ پہلا ماخذ کون ہے؟ دانش عقل، قرآن، رسول، سنت، کس کو کس پر فوقیت دی جائے غامدی صاحب محض التباس ذہنی پیدا کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔

[۲۰۰] اللہ نے قرآن مختلف قبیلوں کو اپنی اپنی زبان اور لہجے میں پڑھنے کی اجازت دی: قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے اس کے بعد یہ بات تو بے شک مانی جاسکتی ہے کہ مختلف قبیلوں کو اسے اپنی اپنی زبان اور لہجے میں پڑھنے کی اجازت دی گئی [ص ۳۱ میزان ۲۰۰۰ء]

[۲۰۱] فطرت انسانی اس کی بالعموم صحیح رہنمائی کرتی ہے: غامدی صاحب لکھتے ہیں فطرت کے حقائق قرآن کے مقدمات میں شامل ہیں فطرت معروف ومنکر میں امتیاز کا نام ہے وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور جن سے فطرت اِبا کرتی ہے [ص ۴۵ میزان ۲۰۰۸ء] [حرام جانوروں سے] اس لیے ان سے ابا اس کی فطرت میں داخل ہے انسان کی یہ فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کرلیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے [ص ۳۵، میزان] اس کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ بھی ہوجاتی ہے لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی [ص ۳۶] قرآن نے تمام طیبات کو حلال اور تمام خبائث کو حرام قرار دے کر انسانوں کو اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔ [ص ۳۶] طیبات و خبائث کی کوئی جامع و مانع فہرست شریعت میں کبھی پیش نہیں کی گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت اس معاملے میں بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کرلیتا ہے کہ کیا چیز طیب اور کیا خبیث ہے [ص ۶۳۱، میزان ۲۰۰۸ء] نشہ آور چیزوں کی غلاظت کو سمجھنے میں اس کی عقل عام طور پر صحیح نتیجے پر پہنچتی ہے چنانچہ خدائی شریعت نے اس معاملے میں انسانوں کو اصلاً اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے [ص ۶۳۲ میزان ۲۰۰۸ء]۔

[۲۰۲] انسان فطری طور پر بڑا خبیث ہے: انسان وہ ہے جو اپنی فطرت کے خلاف چلتا ہے: انسان کو ہر دور میں فطرت پر چلنا مشکل دکھائی دیتا رہا ہے: اگر انسان اپنی فطرت کے خلاف نہ چلے تو پھر بالکل جانور بن کر رہ جائے: انسان کے اندر اپنی فطرت سے انحراف کی پوری قوت موجود ہے۔ زنا میں اتنی کشش ہے

کہ انسان اپنی فطرت کے خلاف ہر عورت سے یہ تعلق بنانا چاہتا ہے:۔

JA Ghamdi

[ص۲۰۳] ہر زمانے میں ہر سنت پر عمل ممکن نہیں: ایسے حالات میں سنت کا متبادل عقل سے دریافت کیا جاسکتا ہے: تجہیز و تکفین تدفین سنت ہے۔لیکن مردے کو غسل تجہیز و تکفین کے بغیر بھی یعنی سنت پر عمل کے بغیر دفن کیا جاسکتا ہے سمندر میں میت کو پانی میں بہا دیا جائے تکفین و قبر کی سنت پر عمل کی ضرورت نہیں ہے: یہ اصول عقل سے معلوم ہوتا ہے جو سنت کا متبادل بتا دیتی ہے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں: غسل کے بعد میت کو کفن دینا بھی دین ابراہیمی کی سنت ہے [ص ۶۴۷ میزان، ۲۰۰۸ء] میت کو زمین میں قبر بنا کر دفن کرنا سنت ہے [ص ۶۴۷] میت کو غسل اور تجہیز و تکفین کے بغیر بھی دفن کیا جاسکتا ہے۔[ص ۶۴۷] دوسرے معنوں میں ہر سنت پر ہر زمانے میں عمل ممکن نہیں مگر اس صورت میں سنت کا متبادل سنت نہیں ہے بلکہ انسان عقل سے جو بھی متبادل دریافت کرے گا وہ سنت کا قائم مقام نہ ہونے کے باوجود بالکل قائم مقام ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ میت کے معاملے تین سنتوں پر عمل لازمی نہیں اختیاری ہے حالات و ممکنات کے ماتحت ہے یہ اختیار سنت سے حدیث سے نہیں حدیث غامدی صاحب سے ملا ہے یعنی عقل سے۔پس ثابت ہوا کہ عقل جو غامدی صاحب کے حکم کے مطابق پہلی وحی ہے ان امور میں حجت ہے جہاں وحی اور سنت ہمارے کام آنے سے قاصر ہیں جن راہوں اور راستوں میں نعوذ باللہ وحی اور سنت کی روشنی کسی کام نہیں آتی وہاں عقل کی وحی کا چراغ ہمارے لیے شعلہ فروزاں شمع تاباں اور قندیل ہدایت ہے۔

[۲۰۴] اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح اس وقت جائز ہے جب مسلمانوں کو مشرکانہ تہذیب پر غلبہ حاصل ہو: ”اور تم سے پہلے کے اہل کتاب کی پاک دامن عورتیں بھی [حلال ہیں] جب تم ان کے مہر ادا کرو، اس شرط کے ساتھ کہ تم بھی پاک دامن رنے والے ہو، نہ بدکاری کرنے والے اور نہ چوری چھپے آشنا بنانے والے۔[مائدہ:۵]۔آیت کے سیاق سے واضح ہے کہ یہ اجازت اس وقت دی گئی جب توحید کے معاملے میں کوی ابہام باقی نہیں رہا اور مشرکانہ تہذیب پر اس کا غلبہ ہر لحاظ سے قائم ہوگیا۔اس کے لیے آیت کے شروع میں لفظ الیوم کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت میں وقت کے حالات کو بھی یقیناً دخل تھا۔لہٰذا اس بات کی پوری توقع تھی کہ مسلمان ان عورتوں سے نکاح کریں گے تو یہ ان سے

متاثر ہوں گی اور اس طرح شرک وتوحید کے مابین کوئی تصادم نہ صرف یہ کہ پیدا نہیں ہوگا بلکہ ہوسکتا ہے کہ ان میں بہت سی ایمان و اسلام سے مشرف ہو جائیں۔[ص ۴۱۹، میزان ۲۰۰۸ء][ص ۴۱۹ میزان]
غامدی صاحب نے شریعت کی ایک اجازت اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو غلبۂ دین سے مشروط کر دیا جبکہ سورۂ مائدہ کی آیت ۵ میں شارع نے ایسی کوئی تخصیص یا تحدید قائم نہیں کی تھی یہ غامدی صاحب کے اصول سے انحراف ہے جو میزان کے ص ۲۵ پر بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر بھی قرآن کی آیت کی تحدید نہیں کر سکتے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر اہل کتاب عورتوں سے نکاح غلبۂ دین سے مشروط ہے تو دین کے غلبے کی کوئی حکمت عملی میزان کے کسی باب اور کسی قانون میں سرے سے نہیں بیان کی گئی۔ مسلمان تو تین سو سال سے مغلوب ہیں لہٰذا قرآن کی یہ آیت مشروط ہے غلبۂ دین سے لہٰذا غلبہ دین بھی دین کے اہم امور میں شامل ہونا چاہیے تاکہ آیت پر عمل کو ممکن بنایا جاسکے مگر غامدی صاحب کو غلبے کے لفظ سے توحش ہے انہوں نے برہان میں غلبۂ دین کی حکمت عملی پر بہت کچھ لکھا ہے مگر سوال یہ ہے کہ وہ دین کے جس غلبے سے نکاح کی اجازت کو مشروط کر رہے ہیں اُس غلبے کا نبوی طریقہ کار عصر حاضر میں کیا ہوگا؟

غامدی صاحب اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہتے کہ اگر ایک اسلامی مملکت موجود ہو مگر مغرب کی ثقافتی یلغار، انٹرنیٹ، میڈیا، سوشل میڈیا، اشتہارات، تعلیمی نظام، موبائل فون، پورنو گرافی، اسپورٹس اور انٹرٹینمنٹ انڈسٹری فرد کے نفس امارہ کو ابھار کر اس کے سفلی جذبات کو بھڑکا کر زنا پر آمادہ کر رہے ہوں تو اس صورت میں کیا اسلامی ریاست قتلوا تقتیلا کے حکم پر عمل کرتے ہوئے ان ریاستوں پر حملہ کر سکتی ہے جو فساد فی الارض کے مرتکب ہیں اور یہ فساد۔ قرآنی اصطلاح بہ نظر غامدی صاحب۔ فتنہ یعنی مذہبی جبر [Perecution] سے زیادہ خطرناک کام کر کے انسان کے قلب، اس کی روح، جوہر، فطرت کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں غامدی صاحب صرف مذہبی جب جبر کو فتنہ کہتے ہیں تو دوسرے معنوں میں وہ عصر حاضر کے ان فتنوں کی فتنہ گری تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور مسلمانوں کو صلح کلی کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیا اس ثقافتی یلغار کے ہوتے ہوئے کوئی انسان اپنے دین پر تو کجا اپنی فطرت پر بھی قائم رہ سکتا ہے ثقافتی یلغار انسانی فطرت کو کس طرح مسخ کر دیتی ہے اس کی تفصیل مغرب کی کتابوں میں موجود اعداد و شمار میں پڑھی جاسکتی ہے Impire of illusion کا باب illusion of love کتاب Beauty Myth عجیب وغریب انکشافات کرتے ہیں۔

ص ۶۴ انٹرویو اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر صرف تیرہ ہیں ان سب کا مقصد قرآن کی اصطلاح میں تزکیہ ہے: اور دین کا مقصد اللہ کی عبادت و بندگی ہے اصلی مقصود خدا کی عبادت ہے مگر اس کا طریقہ ہی یہ ہے کہ اس کے نبیوں کی اطاعت کی جائے [۴:۸۰] نزاعات میں نبی کی فیصلوں کو قلب سے مانے [ص ۱۴۴ میزان] یہ اطاعت رسمی چیز نہیں انسان کو خدا کی محبت اسی اطاعت و اتباع سے حاصل ہوتی ہے [ص ۱۴۵، میزان]

[۲۰۵] انسان کی تہذیب نفس رہن سہن کے طریقے تمدن کے مظاہر رسوم و آداب کہلاتے ہیں انبیاء جو دین لے کر آئے وہ بھی اپنے ماننے والوں کو بعض رسوم کو آداب کا پابند کرتا ہے دین کا مقصد تذکیہ ہے لہٰذا دین کے یہ رسوم و آداب بھی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر مقرر کیے گئے ہیں [ص ۶۴۱، میزان] نفس انسانی تطہیر کے لیے باطن کی تطہیر کے ساتھ کھانے اور پینے کی چیزوں میں بھی خبث وطیب کا فرق ہر حال میں ملحوظ رہنا چاہیے خبائث ہر حال میں ممنوع ہیں [ص ۶۳۱] دین کا ظاہر پانچ چیزوں سے عبارت ہے (۱) کلمہ طیبہ کی شہادت۔ (۲) نماز قائم کی جائے زکوٰۃ ادا کی جائے رمضان کے روزے رکھے جائیں بیت الحرام کا حج کیا جائے دین کا باطن پانچ چیزوں سے عبارت ہے: ۱۔اللہ پر ایمان، ۲۔فرشتوں پر ایمان، ۳۔نبیوں پر ایمان، ۴۔کتابوں پر ایمان، ۵۔روز جزاء پر ایمان۔ اس ایمان کا تقاضہ عمل صالح اور تواصی بالحق و تواصی بالصبر ہے اس ایمان کے تین تقاضے ہیں ہجرت، نصرت، قیام بالقسط [۷۳، ۸۴، ۷۵، میزان] دین کا مقصد قرآن کی اصطلاح میں تزکیہ ہے [ص ۷۷] دین کی حقیقت اللہ کی عبادت ہے۔ [ص ۶۶ میزان] انسان ہر لحاظ سے اپنے پروردگار کا بندہ بن جائے [ص ۶۷ میزان]

[۲۰۶] اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر صرف تین ہیں: [انٹرویو ص ۶۴]

[۲۰۷] شریعت ایک واضح سنت کا نام ہے: شریعت قرآن ہے: شریعت حکمت نہیں قانون ہے جو زمانے کے استھ بدلتا رہتا ہے: شریعت حکمت کی طرح تغیرات سے بالا نہ تھی وہ ہر قوم کی ضرورتوں کے لحاظ سے اترتی رہی یہاں تک کہ سیدنا ابراہیم کی نبوت میں پوری انسانیت کے لیے اس کے احکام بہت حد تک ایک واضح سنت کی صورت اختیار کر گئے [ص ۴۴ میزان] بنی اسرائیل کی ایک باقاعدہ حکموت قائم ہو جانے کا مرحلہ آیا تو تورات نازل ہوئی اور اجتماعی زندگی سے متعلق شریعت کے احکام بھی اترے [ص ۴۴]

اب شریعت حکمت کی طرح غیر متغیر ہے۔ شریعت کے احکام اجتماعی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور

الکتاب کے ذریعے اترتے ہیں: شریعت اور حکومت لازم وملزوم ہیں۔ شریعت قانون سے اور قانون کا اطلاق حکومت ریاست نظم اجتماعی کے بغیر ممکن نہیں: تورات صرف شریعت تھی حکمت نہ تھی لہٰذا اس کمی کا ازالہ زبور وانجیل سے کیا گیا: زبور وانجیل قانون نہیں حکمت ہیں۔ کتاب قانون اور شریعت سے متعلق ہوتی ہے جو تغیرات سے بالا نہیں ہوسکتی کیونکہ ثبات ایک تغیر نو ہے زمانے میں: شریعت کے اوامر نواہی جو قرآن میں بیان ہوئے حتمی ہیں:

اس عرصے میں حکمت کے بعض پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوئے تو زبور وانجیل کے ذریعے سے انہیں نمایاں کیا گیا۔[ص۴۴] حکمت ہر طرح کے تغیرات سے بالا تھی۔[ص۴۴]

شریعت کے جو اوامر ونواہی یقین کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں انھیں چھوڑ کر شریعت کا کوئی تصور اگر قائم کیا جائے گا تو وہ ہر لحاظ سے ناقص اور قرآن کے فساد کے بالکل خلاف ہوگا[ص۴۷] لیکن شریعت کے قوانین تو قابل تغیر ہیں تو کیا قرآن کے اوامر ونواہی بھی قابل تغیر ہیں یہ ہے اصل سوال کیونکہ شریعت کے بارے میں غامدی صاحب کے متضاد بیانات اسلامی شریعت اور قرآن کے احکام کے بارے میں بہت سے شبہات پیدا کرتے ہیں مثلاً اگر زمانہ بدلنے سے شریعت بدلتی رہتی ہے تو کیا اللہ نے اب زمانے کی رفتار کو روک دیا ہے یا اللہ نے اپنے قوانین میں اتنی وسعت اور لچک پیدا کردی ہے کہ وہ ہر زمانے کے لیے قابل عمل ہیں تو کیا اللہ میں نعوذ باللہ یہ صلاحیت نہیں کہ وہ پہلے دن سے ہر شریعت، قانون، الکتاب، اس طرح بناتے کہ وہ ہر تغیر کے ساتھ چل سکتے غامدی صاحب کے فلسفے سے صفات الٰہی میں نقص کا عنصر داخل ہو جائے اور دین پر یقین کی بنیادیں خود بخود منہدم ہو جاتی ہیں۔ غامدی صاحب قرآن کو قانون اور شریعت تسلیم کرتے ہیں لکھتے ہیں لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا دراں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اس کا سرے سے تعلق نہیں[ص۳۷ میزان]

[۲۰۸] قرآن کے کچھ احکام قیامت تک منسوخ ہو چکے ان کے نسخ کا علم قرآن وسنت سے نہیں صرف و حقیق سے ممکن ہے: تحقیق کے نتائج میں اختلاف ہو تو اس کا حل قرآن نے نہیں بتایا۔ شریعت الکتاب قانون کے دو حصے ہیں ایک حتمی وابدی دوسرا عارضی اور وقتی خدا کا حکم قرآن میں قطعی بھی ہے اور غیر قطعی بھی: قرآن میں کیا چیز شریعت کا حکم اور خدا کا ابدی فیصلہ ہے اور کیا چیز اسی انذار رسالت کے مخاطبین کے

ساتھ خاص کوئی قانون ہے جواب لوگوں کے لیے باقی نہیں رہا[ص ۴۹]۔

[۲۰۹] اسلام میں مرد وعورت اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ کھولنے کے لیے بجائے جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں: چنانچہ اللہ نے جہاں اجازت دی ہے اس کے سوا مرد عورت خلوت وجلوت میں اپنا ستر کسی کے سامنے نہیں کھولتے: نماز اور حج صرف ستر میں ہو سکتے ہیں اور نماز کا ستر یہ ہے کہ ا۔عورت سر ڈھانپے،۲۔حج کا ستر یہ ہے کہ عورت سر پیر ڈھانپے۔ستر لازمی ہے لہٰذا عورت ومرد کو بروقت ستر کا خیال رکھنا چاہیے۔

غامدی صاحب ستر کے معاملے میں کبھی بہت حساس اور کبھی بہت لاپرواہ ہو جاتے ہیں قدیم و جدید کی کشمکش ان کے باطن میں ہمہ وقت برپا رہتی ہے اس لیے وہ جوش خطابت میں کبھی عورت کو اوڑھنی سے بھی آزاد کر دیتے ہیں اس کے زیورات لباس کو زینت میں شامل نہیں کرتے احزاب کے حکم کہ عورت چادر کے پلو لٹکا لیں اسے ایک وقتی حکم قرار دیتے ہیں لیکن کبھی ان کا ایمان جوش میں آتا ہے خطابت پس منظر میں چلی جاتی ہے تو وہ امت کی اجتماعی علمی روایت سے جڑ جاتے ہیں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ غامدی صاحب مرد وعورت کو خلوت وجلوت میں ستر میں رہنے کا حکم دیتے ہیں ستر وہ کم سے کم لباس ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی لہٰذا عورت مرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ غامدی صاحب کے اصول کے تحت خلوت وجلوت میں اپنا ستر کسی کے سامنے نہ کھولے غامدی صاحب نے میزان کے قانون عبادات میں حج ونماز کی تشریح میں لکھا ہے کہ دوپٹے بغیر عورت کی نماز نہیں ہوتی اور حج میں سر اور پیر کو چھپانا لازم ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت کے ستر میں سر شامل ہے لہٰذا اسے سر کو ہر حال میں چھپانا چاہیے مگر غامدی صاحب اپنے اصول کی خود خلاف ورزی کر کے مقامات ۲۰۰۸ء میں دوپٹے کو محض ایک روایت غیر واجب غیر لازم قرار دیتے ہیں یہ ان کا تضاد ہے ایک جانب عورت کو سر کھولنے کی اجازت دیتے ہیں اپنے چہرے کا حسن، بناؤ سنگھار اور زیورات دکھانے کی بھی اجازت عام دیتے ہیں مگر اچانک اس کے برعکس عورت مرد کو ہدایت دیتے ہیں: نویں چیز حفظ فروج ہے۔یعنی جو شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ ضبط نفس اور تقویٰ کا ثمرہ ہے۔ برہنگی،عریانی اور فواحش سے اجتناب کرنے والوں کے لیے یہ تعبیر قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عفت وعصمت کی بالکل آخری درجے میں حفاظت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے جہاں اجازت دی یہ اس کے سوا خلوت وجلوت میں اپنا ستر وہ

کسی کے سامنے نہیں کھولتے اور نہ کوئی ایسا لباس کبھی پہنتے ہیں جو ان اعضا کو نمایاں کرنے والا ہو جو اپنے اندر کسی بھی لحاظ سے جنسی کشش رکھتے ہیں۔ فواحش سے اجتناب کا یہی درجہ ہے جس سے وہ تہذیب پید ہوتی ہے جس میں حیا فرماں روائی کرتی اور مرد و عورت دونوں اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ کھولنے کے بجائے جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں۔[میزان ص ۲۵۲]

[۲۱۰] امام حمید الدین فراہی اور امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تحقیقات سے واضح کر دیا کہ قرآن کا کوئی اور اسوب اپنے مقدمہ کے اعتبار سے شاذ نہیں ہوسکتا اس کا اسلوب ہی عرب کا معروف اسلوب ہے: زبان کی ابائت نظر انداز کر کے قرآن کی کوئی شرح وضاحت صحیح نہیں ہوسکتی: دورِ حاضر میں قرآن کے بس دو بڑے عارف تھے سب سے بڑے حمید الدین فراہی اس کے بعد امین احسن اصلاحی: قرآن آپ اپنی تفسیر کرتا ہے: قرآن پنے الفاظ واسالیب کی مشکلات کے حل کے لیے بھی اپنے اندر نظاہر وشواہد رکھتا ہے: قرآن برہان قاطع ہے: اس کی ایک آیت کی تاویل میں صرف اور صرف ہی ہی قول ہوسکتا ہے اس وحدت کا سبب نظم قرآن کا اصول ہے: نظم قران کا اصول تاویل کے تمام اختلافات ختم کر دیتا ہے: نظم قرآن کے اصول اور تاویل کے تمام اختلافات ختم ہونے کے باوجود امین احسن اصلاحی اور حمید الدین فراہی ایک آیت کی کچھ تاویل کریں: اوپر بیان کردہ غامدی صاحب کے اصولوں کی روشنی کے باوجود عملی اختلاف سے یہ ثابت ہوا کہ اس دور کے سب سے بڑے قرآنی عارف کیا یہ بیان جو رسائل الامام انفراہی میں بیان ہوا کہ قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں' جو میزان کے ص ۵۲ پر حجت کے طور پر پیش کیا گیا ہے خود غامدی صاحب کے تفسیری انحرافات کے بعد حجت نہیں ہے لہذا میزان کے ان تضادات سے غامدی صاحب کا صل الاصول یہ قرار دیا کہ "قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز ہرگز گنجائش موجود ہے اسی لیے آیات جہاد، آیات حجات، آیات میراث، آیات سود کی ایک تاویل غامدی صاحب کرتے ہیں اس تاویل کے لیے امام فراہی و اصلاحی کو آخری حجت کے طور پر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قرآن عربی متن میں نازل ہوا ہے ایسی زبان جو نہایت واضح ہے جس میں کوئی اینچ پینچ نہیں ہے۔

قرآن کے بارے یں یہ ایک واضح حقیقت ہے۔ اسے مانیے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ قرآن کا کوئی لفظ اور کوئی اسلوب بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے شاذ نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے مخاطبین کے لیے بالکل معروف اور جانے پہچانے الفاظ اور اسالیب پر نازل ہوا ہے۔ زبان کے لحاظ سے اس کی کوئی چیز اپنے اندر کسی نوعیت کی کوئی غرابت نہیں رکھتی، بلکہ ہر پہلو سے صاف اور وضح ہے۔ چنانچہ اس کے ترجمہ وتفسیر میں ہر جگہ اس کے الفاظ کے معروف معنی ہی پیش نظر رہنے چاہئیں۔ ان سے ہٹ کر اس کی کوئی تاویل کسی حال میں قبول نہیں کی جاسکتی۔

ہمارے اس دور میں مدرسۂ فراہی کے اکابر امام حمید الدین فراہی اور استاذ امام امین احسن اصلاحی نے جو کام قرآن مجید کی زبان پر کیا ہے اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ان سب معاملات میں قرآن مجید کا اسلوب ہی عرب کا معروف اسلوب ہے۔ قرآن کے جو طالب علم ان مباحث کا ذوق رکھتے ہیں وہ اس سلسلے میں امام فراہی کی ''مفردات القرآن''، ''اسالیب القرآن''، ''جمہرۃ البلاغہ''، ''مجموعۂ تفاسیر'' اور استاذ امام امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' میں اپنے لیے بہت کچھ رہنمائی پاسکتے ہیں۔ قرآن کی تفسیر میں اس اصول کی رعایت اس کی ابانت کا تقاضا یہ اور اس کی ابانت جس طرح کہ اوپر بیان ہوا خود قرآن کی نص سے ثابت ہے۔ اسے نظر انداز کرکے قرآن کی کوئی شرح و وضاحت بھی صحیح قرار نہیں پاسکتی۔ [ص ۲۰، ۲۱ میزان]

یہ دورِ حاضر میں امام حمید الدین فراہی کے بعد قرآن کے سب سے بڑے عارف [امین احسن اصلاحی] کا بیان اور زندگی بھر کا تجربہ ہے۔ قرآن کا جو طالب علم بھی تدبر کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے گا، اس حقیقت کو اس کے ورق ورق پر ثبت پائے گا۔ چنانچہ اس روشنی میں بطور اصول ماننا چاہیے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضا [قرآن آپ اپنی تفسیر کرتا ہے] یہ بات صرف قرآن کی تعلیمات، اس کے تاریخی اشارات اور اس کی تلمیحات ہی کے حدت صحیح نہیں ہے، بلکہ قرآن کا یہ عجیب معجزہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ واسالیب کی مشکلات کے حل کے لیے بھی اپنے اندر نظائر وشواہد کا ایک قیمتی ذخیرہ رکھتا ہے۔ [ص ۴۳ میزان]

وہ چیز جو قرآن کو برہان قاطع بناتی اور تاویل کے تمام اختلافات ختم کرکے امام فراہی کے الفاظ میں القرآن لا یحتمل الا تاویلا واحدا کی حقیقت اس سے متعلق ثابت کردیتی ہے وہ تنہا نظم ہی ہے

اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

''میں نے اس تغیر میں چونکہ نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے، اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی بول اختیار کیا ہے بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے، کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ صحیح بات اس طرح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ آدمی اگر بالکل اندھا بہرا متعصب نہ ہو تو اپنی جان تو قربان کر سکتا ہے، لیکن اس سے انحراف برداشت نہیں کر سکتا''۔ [تدبر، قرآن ۲۲/۱]

قرآن کا یہی نظم ہے جس کی بنا پر اس نے اپنے مخاطبین کو جب اپنے مانند کوئی کلام لانے کے لیے کہا تو متفرق آیات نہیں، بلکہ ایک یا ایک سے زیادہ سورتیں ہی پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہے:

[۳۱:۲۴]

[۵۰:۸]

[۳۹:۴۲۔۴۱]

[۱۷:۳۳]

....

[۱۴۷] قانون وراثت کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بھی [دائمی عذاب] اسی کی وعید فرمائی گئی ہے [ص ۱۹۱ میزان] یہ بات تو اصولاً درست ہے کہ جو میراث کے الٰہی قانون کی خلاف ورزی کرے گا وہ جہنم میں ابدی طور پر رہے گا لیکن سوال یہ ہے کہ میراث کے کس قانون کی خلاف ورزی پر یہ وعید غامدی صاحب سنا رہے ہیں مثلاً غامدی صاحب نے میزان حصہ ۱۹۸۵ء میں میراث کا وہ قانون بیان کیا جس پر اہل السنّت والجماعت کا اجماع ہے اس میں لکھا کہ وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی اللہ نے ورثاء کو ضرر و غرر سے محفوظ رکھنے کے لیے خود وارثوں کے حصے متین کر دیے میزان ۲۰۰۲ء میں غامدی صاحب نے اسی قانون میں کچھ ترمیم و اضافے کر کے کسی مستحق محتاج ضرورت مند وارث کے حصے میں وصیت کا کچھ جواز پیدا کر دیا مگر وصیت کی وسعت بیان نہیں فرمائی میزان ۲۰۰۸ء، ۲۰۰۹ء، ۲۰۱۰ء میں وصیت کے قانون میں کچھ اور وسعت پیدا کر کے وصیت کے دائرے میں تمام وارثوں کو حسبِ ضرورت، حاجت شرکت و

شمولیت کی اجازت دے دی مقامات ۲۰۰۸ء میں اس قانون میں اس قدر زبردست وسعت پیدا کی اور فرمایا کہ وصیت مورث کسی غیر وارث کے حق میں بھی کرسکتا ہے وارث کے حق میں بھی کرسکتا کل جائیداد کی وصیت بھی کرسکتا ہے یعنی اللہ کے مقرر کردہ وارثوں کو محروم کر کے اپنے منتخب کردہ شخص کو کل جائیداد ہبہ کرسکتا ہے سوال یہ ہے کہ میراث کے کون سے قانون کے خلاف ورزی کرنے والا جہنم کا مستحق ہوگا اگر غامدی صاحب کے حلقۂ اثر کے کسی مخلص و نیک شخص نے ۱۹۸۵ء میں غامدی صاحب کے پہلے موقف کے تحت میراث تقسیم کی اور اپنے وارثوں کی انتہائی شدید ضرورت۔ احتیاج، مالی خستہ حالی کے باوجود ان کو معاشی ابتری میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگیا اور اللہ کی جانب سے کسی ایک وارث کے حق میں تمام جائیداد کی وصیت کی اجازت کے باوجود غامدی صاحب کے ۱۹۸۵ء کے فلسفے کے تحت اپنی ضرورت مند بیوی محتاج اولاد کو فقر و فاقہ کسمپرسی میں چھوڑ کر مرگیا جس کے باعث اس کی اولاد کفر میں مبتلا ہوگئی تو یہ شخص جہنم کا حق دار ہوگا یا نہیں؟ اس شخص کو غلط سلط قانون بنانے والے کا مقام و مرتبہ غامدی صاحب کے اس اصول کی روشنی میں کیا ہوگا۔

[۱۴۸] امام زہری کے بارے میں غامدی صاحب کے طے کردہ اصول کے مطابق خود غامدی صاحب کی بھی کوئی رائے قابل قبول نہیں ہوگی کیونکہ امام زہری پر غامدی صاحب ایک ہی چیز کے متعلق تین طرح کا جواب دیتے ہیں غامدی صاحب نے امام زہری کی تدلیس اور ادراج کے باعث اہم معاملات میں ان کی کسی رائے کو قبول کرنے سے انکار کیا اسی اصول کی بنیاد پر خود غامدی صاحب کی کوئی رائے اہم دینی معاملات میں قبول نہیں کی جاسکتی غامدی صاحب نے اصول یہ بتایا کہ اگر کوئی شخص ایک ہی معاملے میں تین مختلف آراء رکھتا ہے تو اس کی دینی رائے غیر معتبر ہے اس اصول کو موکد کرنے کے لیے غامدی صاحب لکھتے ہیں: امام لیث بن سعد نے امام مالک کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ امام زہری کی کوئی روایت بھی اس طرح کے اہم معاملات میں قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ [میزان ص ۳۱، ۳۲ کتابت کرنا ہے][میزان ۳۱، ۳۲، ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کے اس اصول کے تحت اہم دینی معاملات میں غامدی صاحب کی کوئی رائے بھی قابل اعتناء نہیں ہے۔

[۱۴۹] سنت تمام انبیاء کا مشترکہ ورثہ ہے مگر یہ تدریجاً ترتیب پاتی رہی حضرت ابراہیم کی نبوت میں اس کے احکام بہت حد تک ایک واضح سنت کی صورت اختیار کر گئے [ص ۴۴ میزان ۲۰۰۸ء] سنن فطرت کو

انبیاء نے تذکیر و تطہیر کے پیش نظر دین کا لازمی جزو بنایا [ص ۶۴۳ میزان] کیا یہ سنتیں بھی حضرت ابراہیمؑ سے پہلے واضح سنت کی صورت اختیار نہیں کر سکی تھیں دین ابراہیمی کی روایت ہے یہ حصہ اصطلاح میں سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے [ص ۴۶ میزان] اگر سنت دین ہے اور تمام انبیاء میں مشترک ہے تو اس کے تدریجاً ارتقاء کی منطق ہمارے فہم سے بالا ہے سنت میں غامدی صاحب نے جن امور کو شامل کیا ہے نماز، زکوٰۃ، سنن فطرت، نکاح طلاق وغیرہ ان کے بغیر تو کوئی مذہبی معاشرت دینی ریاست اور نبوی حکومت تو قائم ہی نہیں ہوسکتی تو حضرت ابراہیم سے پہلے کیا انبیاء نے کسی ریاست پر حکمرانی نہیں کی ان لازمی امور واحکام نے بڑی مشکل سے حضرت ابراہیم کے عہد میں کامل صورت تو اختیار نہیں کی البتہ ایک واضح سنت کی صورت اختیار کی [ص ۴۴ میزان] یعنی تدریجی ارتقاء کے باوجود سنتیں ابراہیمؑ کے عہد میں بھی کامل نہیں ہوسکیں یعنی سنت مختلف انبیاء کے احکامات کا مجموعہ ہے جو تمدن کی تبدیلی کے ساتھ رفتہ رفتہ ضرورت کے مطابق واضح شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ کیونکہ سنت غامدی صاحب کی تقسیم کے مطابق حکمت نہیں ہے بلکہ شریعت قانون ہے جو تمدن کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے۔ حضورؐ نے تو حضرت ابراہیم کی سنتوں کی اصلاح ترمیم واضافے کیے۔ مگر حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت ابراہیمؑ تک جو ہزاروں پیغمبر آئے ان کی سنتوں کی اصلاح کا کیا طریقہ تھا؟ غامدی صاحب نے ہمیں صحف سابقہ کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا جب کہ ان کا ایمان ہے کہ قرآن کی دعوت کے مقدمات میں ا۔ فطرت کے حقائق، ۲۔ دین ابراہیمی کی روایت، ۳۔ نبیوں کے صحائف شامل ہیں [ص ۴۵] وہ ان مقدمات میں ذات رسالت مآب کو بھول گئے کیونکہ ذات محمدؐ پہلے ہے قرآن بعد میں آپ پہلے آئے قرآن بعد میں آیا آپ نے ہمیں بتایا کہ یہ معبود ہے یہ الکتاب ہے تو آپ کے کہنے پر ہم ایمان لائے کہ وہی مالک ہے اور یہی کتاب ہے لہٰذا دین کا اصل ماخذ تو ذات رسالت مآب ہے اور قرآن سے پہلے۔

[۱۵۰] عہد رسالت میں تورات انجیل محفوظ حالت میں تھیں: تورات پانچ صحیفوں خمسۂ موسوی پر مشتمل ہے پہلے چار صحیفوں میں یہ تاریخی بیانات کے ساتھ اپنے نزول کی ترتیب سے نقل ہوئی ہے اور تثنیہ اسے بالکل اسی طرح ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہے جس طرح قرآن کی مرتب کیا گیا اپنی موجودہ صورت میں غالباً یہ پانچویں صدی ق م میں کسی وقت مرتب کی گئی تاہم سیدنا مسیح نے جس طرح اس کا ذکر کیا ہے اس کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تصویب بھی اس کو [تورات ے مرتبہ نسخے] کسی حد تک

حاصل ہے تورات کی جو روایت [version] زمانہ رسالت کے یہود و نصاریٰ کے پاس تھا قرآن فی الجملہ اس کی تصدیق کرتا ہے [ص ۱۵۲] قرآن جس انجیل پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہ اس کا ایک بڑا حصہ سیرت کی ان کتابوں میں محفوظ ہے [ص ۱۵۳ میزان] یہاں سیرت کی کتابوں سے غامدی صاحب کا اشارہ متی، مرقس، لوقا اور لوخیا کے صحائف کی طرف ہے۔ [ص ۱۵۳] غامدی صاحب کی تحقیق اگر درست ہے کہ رسالت مآبؐ کے عہد میں موجود تورات کی روایت متن کتاب محفوظ تھی اور یہ وہی معتبر متن تھا جس کی سیدنا مسیح نے تصدیق فرمائی تھی تو قرآن نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

[۱۵۱] عہد رسالت میں تورات محفوظ حالت میں نہیں تھی: پورا قرآن ضبط تحریر میں لایا گیا یہ اہتمام پچھلے صحیفوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہوسکا یہاں تک کہ تورات کے متعلق تو یہ علم بھی کسی کو نہیں ہے کہ اس کے مختلف صحیفے کس زمانے میں اور کن لوگوں کے ہاتھوں مرتب ہوئے [ص ۱۵۵ میزان] غامدی صاحب کا یہ بیان تورات کے بارے میں اوپر دیے گئے بیان کی تردید ہے صنعت تضاد میں انھیں کمال حاصل ہے وہ مزید لکھتے ہیں دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو ان کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب سے بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہوگئیں جن کا سراغ اب ناممکن ہے [ص ۱۵۶] ایک جانب یہ دعویٰ ہے کہ تورات انجیل میں بے شمار تحریفیں داخل ہوگئی ہیں ان کی زبان تک باقی نہیں رہی وہ ترجمہ در ترجمہ ہوئی ہیں مگر غامدی صاحب اس نقطۂ نظر کی خود تردید کرتے ہوئے میزان کے ص ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳ پر عہد رسالت میں موجود تورات و انجیل کے بیشتر حصے بلکہ تمام تر متن کو قابل اعتماد درست قرار دے رہے ہیں ۔اور صحف سماوی کے فہم کو فہم قرآن کا مقدمہ بھی قرار دیتے ہیں قرآن کی دعوت جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہیں [۱] فطرت، [۲] دین ابراہیمی کی روایت، [۳] نبیوں کے صحائف قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے ان موضوعات پر جو روشنی قدیم صحیفوں سے ہوتی ہے اس کا بدل نہیں۔ [ص ۴۷، میزان]

صنعت تضاد کے جادوگر جناب غامدی صاحب کے بارے میں ہماری یہ رائے محض طنز و مزاح نہیں یہ ایک سوچی سمجھی رائے ہے کیونکہ ۲۰۰۸ء سے لے کر ۲۰۱۲ء تک غامدی صاحب کے فکر میں جو ارتقاء نظر آرہا ہے وہ اصلاً ان کے وجود میں برپا وہ داخلی کشمکش ہے جو الکتاب اور تمدن حاضر میں مسلسل وسیع ہوتی ہوئی خلیج کو نہایت اضطراب کے عالم میں پاٹنا چاہتی ہے تمدن کو روکنا تو ان کے بس میں نہیں ہے اور ان کو یقین کامل

ہے کہ تمدن تو ہمیشہ متغیر رہتا ہے کہ یہ فطرت کا تقاضہ ہے لہٰذا ان کے اختیار میں صرف یہی ہے کہ قرآن کی ایسی تشریح تعبیر توضیح توجیہہ وتفسیر پیش کی جائے جو عہد جدید کے تمدنی تقاضوں سے ہم ہنگ ہو جائے اور امت مسلمہ مغرب کے متوقع جبر استبداد ظلم اور دہشت گردی سے نجات پا سکے ان کا یہ اجتہادی سفر در اصل اسی موقف کی جستجو اور ان کے باطن میں برپا تہلکے کی گفتگو ہے اس کا ثبوت مقامات میں عورت کی تادیب کا مضمون ہے وہ لکھتے ہیں اس آخری چیز کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمدن کی تبدیلی کے ساتھ کیا ریاست شوہروں کو پابند کرسکتی ہے کہ پہلی دونوں تدابیر اگر موثر نہ ہوں اور سزا کی نوبت آ جائے تو [شوہر] خود کوئی اقدام نہیں کرے گا بلکہ معاملہ عدالت کے سپرد کر دیں گے [ص ۱۴۶ مقامات ۲۰۰۸ء] اس کے بعد فوراً اثبات میں جواب دیتے ہیں ہمارا جواب ہے کہ یقیناً کر سکتی ہے اللہ کی ہدایت پر عمل کے لیے یہ محض طریق کار کی تبدیلی ہے اس سے کوئی حکم معطل نہیں ہوتا [ص ۱۴۷ مقامات] غامدی صاحب کی یہ رائے تمدن کی تبدیلی کو الحق الخیر تسلیم کرنے کے باعث خلق ہوئی ہے تمدن ہمیشہ بدلتا ہے اور ہر آنے والا زمانہ پچھلے زمانے سے بہتر ہوتا ہے لہٰذا ہر اگلہ تمدن لازماً پچھلے تمدن سے بہتر ہی ہوتا ہے تاریخ کا سفر اسی طرح جاری رہتا ہے یہ ہیگل کا جدلیاتی نظریۂ تاریخ ہے غامدی صاحب اور عہد جدید کے بیشتر مخلص جدیدیت پسند مفکرین کے یہاں دانستہ یا نادانستہ اسی نقطۂ نظر کی بازگشت ملتی ہے مگر یہ اجتہادی سرگرمی دین کو تخلیقی لہو ولعب بنا کر رکھ دے گی اور دین کا ہر حکم تمدنی تناظر میں طریقہ کار کی تبدیلی کے نام پر قوس وقزح کے رنگ بدلتا رہے گا شوہر کی جانب سے عورت کو جسمانی سزا کی آیات کی تحدید اس میں ترمیم واضافہ غامدی صاحب کے اصول ۸۷ کے منافی ہے جس کے مطابق پیغمبر بھی قرآن کی آیت میں تحدید تخصیص ترمیم کے مجاز نہیں ہیں [میزان ص ۲۵، ۲۰۰۸ء] لیکن تمدن عہد حاضر کا سب سے بڑا خدا ہے جس کی خوشنودی کے لیے نص میں ترمیم تصحیح بھی جائز ہو جاتی ہے عہد حاضر میں میاں بیوی ملازمتوں کے لیے مختلف شہروں اور مختلف ملکوں میں رہنے لگے ہیں چین میں تو کروڑوں میاں بیوی ایک ہی ملک کے مختلف شہروں میں ملازمتوں کے باعث سال میں صرف ایک مرتبہ میل ملاپ کے قابل ہوتے ہیں معاش نے روح کو ہی نہیں جسم کو بھی جدا کر دیا ہے نکاح کا اہم مقصد حفظ فروج اور افزائش نسل بھی ہے لہٰذا غامدی صاحب کے طریقے پر اجتہاد کیا جائے تو عورت مرد حفظ فروج کے لیے وہ دوائیں استعمال کر سکتے ہیں جو جنسی شہوت کو تحلیل کر کے رکھ دے اور افزائش نسل کے لیے وہ ٹسٹ ٹیوب بے بی یا کرایہ کی ماں کی

خدمات حاصل کر سکتے ہیں غامدی صاحب نے ''میزان'' کی تشریح میں رفیع مفتی سے جو کتاب ''سوال جواب'' کے نام سے مرتب کرائی ہے اس میں سروگیٹ مدر کے ذریعے بچے کی ولادت کو جائز قرار دیا ہے مرد اپنا نطفہ دوسری غیر محرم عورت کے رحم میں رکھ کر اولاد حاصل کر لے ظاہر ہے تمدن کی تبدیلی کے باعث شریعت کی جوہر اور روح کو اس کے ڈھانچے سانچے اسالیت، ہیئت کے بغیر انہی طریقوں سے باقی رکھا جا سکتا ہے کاروباری سرگرمیوں میں مشغولیت کے باعث ایک کاروباری مسلمان عورت جو مسلسل دنیا بھر میں سفر میں رہتی ہے اس نے قرآن کے حکم کہ مائیں دو سال تک بچوں کو دودھ پلائیں کی تعمیل کے لیے ایک طیارہ چارٹر کرالیا ہے جو دنیا میں کسی بھی جگہ اس خاتون سے دودھ لے کر بچے کی نانی تک پہنچا دیتا ہے اور نانی یہ قدرتی غذا بچے کے معدے میں منتقل کر دیتی ہے بدلتی ہوئی زندگی کے مسلسل تغیر پذیر مرحلوں اور تمدنی ارتقاء کی نہ ختم ہونے والی دوڑ میں شریعت پر عمل کا یہی راستہ رہ جاتا ہے۔ غامدی صاحب اور ان جیسے بہت سے ذہین مفکرین امت مسلمہ کو انہی سانچوں کے ذریعے اس کے جوہر سے نادانستہ طور پر محروم کررہے ہیں اس افلاس کا سبب یہ ہے کہ ان مخلصین نے مغربی فکر و فلسفے مغربی طرز زندگی سائنس وٹکنالوجی کی ترقی جدید ترقیات، جدید نظام زندگی کو آفاقی سچائی کے طور پر قبول کر لیا ہے اس سے ماوراء ہو کر وہ کچھ سوچ نہیں سکتے لہٰذا جدیدیت کے پیدا کردہ شبہات ابہامات التباسات سوالات کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھنے کے بجائے یہ اسے اسلامی تناظر میں دیکھتے ہیں اور جب مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا تو جدیدیت کے تقاضوں، غلط تمدنی ارتقاء کو رد کرنے کے بجائے اسلام کی تشکیل جدید کے عمل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

[۱۵۱] رسول کی جانب سے اذان و قامت کا حکم کیا ہے؟ رسول اللہ نے لوگوں کو اذان اور اقامت کا حکم دیا [ص ۱۳۷] سوال یہ ہے کہ یہ حکم رسول نے قرآن کی بنیاد پر دیا یا سنت کی بنیاد پر یا شریعت کی بنیاد پر۔ یہ کم وحی جلی کے ذریعے ملا یا وحی خفی کے ذریعے۔ غامدی صاحب نے اس کی کوئی وضاحت نہیں اگر یہ حکم شریعت کا حصہ ہے تو کیا پیغمبر کا ہر قول فعل شریعت کا متبادل ہے لیکن غامدی صاحب کبھی شریعت کو الکتاب کہتے ہیں کبھی نماز کے اعمال اور اذکار کو شریعت لکھتے ہیں [میزان قانون عبادت دیکھیے] تو اذان وامات کس دائرے کے معاملات ہیں عیدین کے تہواروں کے بارے میں انہوں نے بتایا تھا کہ نبیؐ نے اللہ کی ہدایت کے مطابق یہ مسلمانوں کے لیے مقرر فرمائے [ص ۶۴۸ میزان] یعنی وحی خفی کے ذریعے عید

کے دو تہوار طے پائے تو کیا وحی خفی شریعت ہے اگر شریعت ہے تو کیا اذان و اقامت بھی شریعت ہے؟ اگر نہیں ہے تو دین میں اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ کیوں کہ اذان و اقامت پیغمبر نے خود جاری کیں لہٰذا یہ سنت نہیں ہوسکتیں کیونکہ وحی خفی اس بارے میں خاموش ہے پیغمبر تو دین ابراہیمی کی جو روایت تصحیح و اضافے کے بعد اللہ کی اجازت سے جاری کرتے ہیں وہ سنت کہلاتی ہے اس کی تعداد بھی متعین ہوتی ہے اذان اقامت دین تو ابراہیمی کی روایت نہیں ہے تو یہ ہے کیا؟ اسے کس زمرے میں رکھا جائے گا؟ تو کیا اذان و اقامت جیسی اہم رسم رسالت مآب نے اللہ کی ہدایت کے بغیر خود مقرر کر دی۔ سنت کی تعریف کے بارے میں غامدی صاحب نے لکھا تھا کہ سنت قرآن سے مقدم ہے سنت پہلے ہے قرآن بعد میں اور سنت وہ ہے جو انبیاء کرام کی روایت ہے جو عہد ارتقاء کے بعد ابراہیمؑ میں کسی حد تک واضح صورت اختیار کر گئی تھی۔ سنت کے جو چھ اصول غامدی صاحب نے مبادی تدبر سنت میں بیان کیے ہیں اس میں وہ لکھتے ہیں سنت صرف وہی چیز ہوسکتی ہے جو نوعیت کے لحاظ سے دین ہو اللہ کے نبی اس کا دین پہنچانے ہی کے لیے مبعوث ہوئے تھے نبی کی حیثیت سے جو چیز انھیں دی گئی یہ وہ دین اور صرف دین ہے جسے لوگوں تک پہنچانا ہی ان کی اصل ذمہ داری ہے [ص ۵۷] اس کے معانی یہ ہوئے کہ سنت انہیں اللہ کی طرف سے دی گئی تو سوال یہ ہے کہ اگر سنت اللہ نے دی ہے اور وہ اجماع سے منتقل ہوئی ہے تو اللہ کی متعین کردہ سنت غامدی صاحب پندرہ سو سال بعد بھی متعین کرنے میں کیوں ناکام ہیں میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء میں سنت کچھ اور تھی میزان ۲۰۰۲ء میں سنت چالیس امور میں محصور تھی میزان ۲۰۰۸ء میں سنتوں کی تعداد ستائیس تھی میزان ۲۰۱۰ء میں یہ تعداد گھٹ کر ۲۶ ہوگئی میزان ۲۰۱۰ء میں ۲۶ سنتوں کے علاوہ بھی بہت سی سنتیں کتاب میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں مقامات ۲۰۰۶ء، ۲۰۰۸ء میں سنتوں کی الگ فہرست ہے اللہ کا یہ کیسا دین ہے جو اللہ کے ذریعے پیغمبر کو مل رہا ہے مگر اس امت کو پندرہ سو سال کے بعد بھی پورے تیقن کے ساتھ نہیں مل رہا اور غامدی صاحب میزان کے خاتمے میں لکھ رہے ہیں کہ ''یہ اس پورے دین کا بیان ہے جو خدا کے آخری پیغمبر کی وساطت سے دیا گیا ہے اسے بے کم و کاست اور خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے [ص ۶۵۳، میزان ۲۰۰۸ء] جب سنت ہی متغیر ہے تو اس بدلتے ہوئے ماخذ کی بنیاد پر دین کیسے پیش کیا جاسکتا ہے انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ ایک انسان کا کام ہے جو غلطیوں سے مبرا نہیں ہوسکتا کوئی غلطی واضح ہوئی یا مجھ پر واضح کر دی جائے گی تو میں اس کی اصلاح کر دوں گا [ص

۶۵۳]۔یعنی غامدی صاحب مستقبل میں بھی مسلسل اور مستقل دین میں اصلاح ترمیم تغیر ارتقاء کا عزم صمیم رکھتے ہیں ایسے مرغ بادنما دین کو [نعوذ باللہ] جو تحقیق وتنقید کی ہرلہر کے ساتھ اپنا رخ بدل لیتا ہے اور ہر تنقید کے ساتھ اپنا رخ بدلنے پر بخوشی آمادہ ہے اسے دین کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے دوسرے معنوں میں دین کا مطلب ہے غامدی صاحب کا فہم ادراک عقلیت اور نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت۔ چونکہ عقل انسانی تغیر ہے لہٰذا دین بھی اگر غامدی صاحب کے وسیلے سے ملے گا تو متغیر ہی رہے گا اس میں دوام، سکون، استمرار، استحکام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیا عدم استحکام بھی دین کا کوئی وصف کوئی اصول کوئی قانون ہے جو سہو کے باعث میزان میں بیان ہونے سے رہ گیا؟ غامدی صاحب کو اگلی اشاعت میں اس قانون کا بھی اضافہ کرنا چاہیے۔

[۱۵۴]جس طرح قرآن امت کے اجماع سے لیا ہے سنت بھی امت کے اجماع سے لیں گے اجماع کا مطلب ہے کہ پوری امت کا علم اس بات پر متفق ہوتا ہے سنت زیادہ بڑے اجماع سے منتقل ہورہی ہے اس لیے کہ نماز پڑھنے والوں کی تعداد اور قرآن کے حفاظ کی تعداد گن کر دیکھ لیجیے اس لیے سنت کے معاملے میں کسی ادنیٰ تردد کی بھی ضرورت نہیں قرآن کے بارے میں معلوم ہوگیا کہ یہ ۶۶۶۶ آیتوں کا مجموعہ ہے سنت کی تعریف کو نظر میں رکھ کر جب ہم امت کے علمی ذخیرے کا جائزہ لیتے ہیں تو جیسے قرآن بالکل محکم طریقے سے مل جاتا ہے ویسے ہی سنت بھی محکم طور پر مل جاتی ہے یعنی سنت کی فہرست لکھوائی جاسکتی ہے کہ یہ سنت ہے اس فہرست میں صرف چالیس سنتیں شامل ہیں جن پر صحابہ کا اجماع عمل ہے سنت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے سنت میں کیسے اختلاف ہوجائے گا جیسے ہی اختلاف ہوجائے گا وہ چیز سنت ثابت ہوگی اجماع اس کی لازمی شرط ہے [ص ۵۸ ماہنامہ ساحل، مئی ۹۸ کراچی۔ غامدی صاحب کے محاضرات کراچی ۱۹/ مارچ تا ۲۸ مارچ ۱۹۹۸ء دانش سراء کراچی] ۔ غامدی صاحب کے اصول کے تحت جس طرح قرآن کی آیات طے شدہ ہیں ان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی اسی طرح سنتں بھی طے شدہ ہیں ان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی بلکہ سنت قرآن کے مقابلے میں زیادہ بڑے اجماع سے ملی ہے کہ قرآن کے حفاظ کی تعداد کم ہے جبکہ نماز پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اتنے معتبر ذریعے سے ملنے والی سنت کی تعداد غامدی صاحب ۱۹۹۸ء سے ۲۰۱۰ء تک مسلسل تبدیل کررہے ہیں۔ لہٰذا ان کے اپنے اصول کے تحت سنت میں اختلاف نہیں ہوسکتا سنت متعین ومقید ہے غیر متغیر ہے اجماع عملی سے

ثابت ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ غامدی صاحب کی سنتیں غیر متعین ہیں لہٰذا ان کے اصول کے تحت سنت ماخذ دین نہیں ہے کہ وہ ہر لمحے تغیر کی حالت میں ہے۔

لونڈی کے ساتھ جنسی تعلق اس کا مالک رکھا ہی کرتا تھا اسلام نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی البتہ اس تعلق کے حوالے سے لونڈی کو اس کے مالک تک محدود کر دیا ہے عورت غلام کے ساتھ کوئی جنسی تعلق نہیں رکھ سکتی [رفیع مفتی سوال جواب، ص۲۴۴ طبع اول اگست ۲۰۰۸ء، المورد لاہور] کوئی آدمی کتنے غلام لونڈی رکھے اس کا فیصلہ ہمیشہ انسان نے خود ہی کیا ہے اسلام نے اس میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ [ص۲۴۴ محولہ بالا]

[۱۵۳] معراج ایک جسمانی واقعہ نہیں محض رویاء ہے بعض علماء اسے ایک جسمانی واقعہ قرار دیتے ہیں نبی کا رویا محض خواب نہیں ہوتا [ص ۵۸، سوال جواب]

------

[۱۵۳]

[۱۵۴] رسالت محمدیؐ پر ایمان۔ ایمان کا لازمی تقاضہ نہیں ہے: صرف اللہ آخرت پر ایمان اور عمل صالح نجات کے لیے کافی ہیں: غامدی صاحب کی کتاب میزان سے متعلق کتاب ''سوال جواب'' میں غامدی صاحب کے شاگرد رشید غامدی صاحب کی رہنمائی میں ان کی تائید سے لکھتے ہیں: دونوں [بقرہ آیت ۶۲، مائدہ ۶۹] آیات دراصل، ایک ہی بات بیان کر رہی ہیں اور وہ یہ کہ انسان کے لیے بخشش کا اصل معیار اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح ہے۔ اگر کوئی شخص ان پر پورا اترتا ہے اور اس نے کوئی ایسا جرم بھی نہیں کیا جو اس کے ایمان کے لازمی تقاضے کے خلاف ہو تو پھر اس کی بخشش ہو جائے گی۔ [ص ۶۹، سوال جواب، المورد لاہور ۲۰۰۸ء] قرآن نے یہ بات نہایت غیر مبہم طریقے پر واضح کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی شخص کو فلاح محض اس بنیاد پر حاصل نہ ہوگی کہ وہ یہود و نصاریٰ میں سے ہے یا مسلمانوں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا صابی ہے، بلکہ اس بنیاد پر حاصل ہوگی کہ وہ اللہ کو، اور قیامت کے دن کو فی الواقع مانتا رہا ہے اور اس نے نیک عمل کیے ہیں۔ ہر مذہب کے لوگوں کو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہ ہوگا۔ اللہ اور آخرت پر حقیقی ایمان اور عمل صالح ہی اُس کے لیے نجات کا باعث ہے۔

(جاوید غامدی، ماہنامہ اشراق، نومبر ۱۹۹۹، ۹۔۱۰)

[۱۵۵] رسالت محمدیؐ پر ایمان لانا ضروری ہے: دین پانچ چیزوں سے عبارت ہے اس بات کی شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں [ص ۲۷ میزان ۲۰۰۸ء]

[۱۵۶] اہل کتاب کے لیے رسالت مآبؐ پر ایمان لانا ضروری ہے: صالح اہل کتاب وہ ہیں جو رسول اور قرآن پر ایمان لے آئے: تورات و انجیل کے مطابق رسالت مآبؐ پر ایمان لانا لازم تھا: [۳: ۱۱۲۔۱۱۵] ان آیات میں جن صالح اہلِ کتاب کا ذکر ہے، ظاہر ہے وہ لوگ انہی آیات میں بیان کردہ غیر صالح اہلِ کتاب کے بالکل برعکس ہیں، یعنی نہ یہ لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرنے والے تھے اور نہ یہ اس کے نبیوں کی تکذیب کرنے والے تھے۔ چنانچہ مفسرین نے یہ بات واضح کی ہے کہ ان صالح اہلِ کتاب میں سے بعض نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر علانیہ ایمان لا چکے تھے اور بعض دل سے ایمان لا چکے تھے، لیکن ابھی انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ [ص: ۵۷، سوال جواب] اور ایسا کیوں نہ ہوتا کیونکہ ان کی اپنی کتابوں کے مطابق یہ لازم تھا کہ وہ اس نبی امی پر ایمان لائیں جسے وہ اپنی کتاب میں لکھا ہوا پاتے تھے وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۚ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ، الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ [۷: ۱۵۶۔۱۵۷]۔

اس آیات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ کتاب کے لیے اپنی کتابوں کو ماننا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی لائی ہوئی کتاب پر ایمان لانا ضروری تھا۔ چنانچہ یہ خیال تو باطل محض ہے کہ اہلِ کتاب کے لیے نبی صلہ اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں تھا۔ رہا سورۃ بقرہ کی آیت ۶۲ کا معاملہ تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں تھا یا آج نہیں ہے، کیونکہ یہ مفہوم تو بنی اسرائیل کے بارے میں قرآن کی اس ساری دعوت کے خلاف ہوگا جس سے متعلق بعض آیات کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا ہے۔ [ص: ۶۷ محولہ بالا]

[۱۵۷] رسالت محمدیؐ پر ایمان لانا اب پوری دنیا کے لیے حجت ہے: صریح عذر کی بنیاد پر پیغمبر کی دعوت قبول کرنے سے محرومی قابل معافی ہے: ایمان بالرسالت ایک غیر ضروری چیز نہیں ہے: سورۂ بقرہ آیت

۱۳۵ تا ۱۳۷ میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ اگر مسلمانوں کی طرح محمدؐ پر ایمان لائیں گے تبھی راہ یاب ہوں گے ورنہ نہیں۔لہٰذا سورۂ مائدہ کی آیت ۶۹ سے یہ معنی لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ ایمان بالرسالت ایک غیر ضروری چیز ہے۔کسی بھی نبی کے دور میں اس پر ایمان سے محرومی، کسی صریح عذر ہی کی بنا پر قابل معافی ہوسکتی ہے۔تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا اِنۙ

[الفرقان ۲۵:۱]''بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دینے والی کتاب اتاری تا کہ وہ جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والا بنے''۔اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود، آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کی برپا کی ہوئی دینونت، اب پوری دنیا کے لیے آپ کی جانب سے بالفعل حجت بن چکی ہے۔بس اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اب انسانوں کی طرف سے ہونے والی جدوجہد ہی باقی ہے اور وہ ظاہر ہے کہ انہی کے ذمے ہے۔[ص:۸۵،سوال و جواب،المورد،لاہور]

[۱۵۸] اصل دین وہ نہیں ہے جو غامدی صاحب نے میزان میں بیان کیا ہے اصل دین وہ ہے جس پر امت بحیثیت مجموعی عمل کر رہی ہے: غامدی صاحب کے دین اور امت کی اکثریت کے دین میں کوئی اختلاف نہیں ہے: معتزلی، خارجی، اباضی، قادیانی، پرویزی، اسماعیلی، دروزی، اہل قرآن، کے کسی بھی عالم سے رجوع کرنے میں کوئی ہرج نہیں: غامدی صاحب کی سنت کی تعریف نہ دین ہے نہ حجت جو چاہے قبول کرے یا نہ کرے دین پر اثر نہیں پڑتا: غامدی صاحب کے ادارے المورد کی کتاب ''سوال جواب'' کے مطابق: اصل دین میں کوئی اختلاف نہیں ہے، یعنی اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ خدا ایک ہے، رسالت برحق ہے، آخرت یقینی ہے، خدا نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔چنانچہ انسان کو خدا کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت کرنی ہے، اپنے معاملات سیدھے اور صاف رکھنے ہیں اور اچھے اخلاق کو اپنانا ہے، لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔البتہ، فروعی مسائل اور اجتہادی آراء میں ضرور اختلاف ہے۔ان اختلافات کو آپ اسی طرح حل کریں، جیسے آپ اپنی بیماری کے معاملے میں کئی ڈاکٹروں کی مختلف آرا میں سے کسی ایک کو اختیار کرتے ہیں، حالانکہ آپ ڈاکٹر نہیں ہوتے اور نہ آپ کے پاس مختلف ڈاکٹروں کے استدلال کا جواب ہوتا ہے۔[ص:۹۶] غامدی صاحب کی ہدایت پر ان کے شاگرد کی جانب سے یہ جواب اس سوال پر دیا گیا ہے کہ ہمارے سامنے آیات و احادیث کی مختلف تفسیریں اور

تعبیریں آتی ہیں انھیں پیش کرنے والے علماء اپنے اپنے دلائل دیتے ہیں آپ یہ بتائیں کہ ہم ان میں سے کس کی بات مانیں[ص ۹۶ سوال و جواب ۲۰۰۸ء]

[۱۵۹] زکوٰۃ کی شرح اللہ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے مقرر کی ہے: زکوٰۃ کی شرح غامدی صاحب کی سنت میں شامل نہیں ہے۔ تنخواہ دار طبقہ ہر ماہ تنخواہ پر دس فی صد زکوٰۃ دے گا زکوٰۃ بچت پر نہیں آمدنی پر ہے: سالانہ بچت پر نہیں ہر ماہ کی آمدنی پر ہے ہر ماہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے باوجود سال کے آخر میں جمع شدہ مال اگر نصاب سے زیادہ ہوگا تو اس پر مال کی زکوٰۃ بھی لگے گی: زکوٰۃ عبادت ہے ٹیکس نہیں ہے: حکومت نے جو ٹیکس آپ کی تنخواہ سے لے لیا اسے زکوٰۃ سے منہا کرلیا جائے گا: ریاست زکوٰۃ کی شرح میں کمی و اضافہ کرسکتی ہے: زکوٰۃ کی شرح کا تعین خدا رسول کا حکم نہیں اسلامی ریاست کے سربراہ کا اجتہاد ہے: غامدی صاحب زکوٰۃ کے بارے میں متنوع رائے کا اظہار فرماتے ہیں زکوٰۃ کے بارے میں لکھتے ہیں زکوٰۃ سنت ہے[ص ۱۴ میزان]۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ دینی فرائض ہیں[ص ۴۸۹] پہلے زکوٰۃ سنت تھی اب فرض ہوگئی زکوٰۃ اللہ کو قرض ہے[ص ۳۴۵]۔ زکوٰۃ عبادت ہے[ص ۳۴۵] نظم اجتماعی کی ضرورتوں کے لیے زکوٰۃ کا مال ارباب حل وعقد کے سپرد کیا جائے[ص ۳۴۵ میزان] زکوٰۃ ہمیشہ فقراء و مساکین اور نظم اجتماعی کی ضرورتوں ہی کے لیے خرچ کی جاتی تھی[ص ۳۵۱] ریاست کے تمام ملازمین در حقیقت العاملین علی اخذ الضرائب وردھا الی المصارف ہی ہوتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ لوگ بالعموم اسے سمجھنے سے قاصر رہے ہیں[ص ۳۵۱] امت کا تواتر و تعامل غامدی صاحب کے خلاف رہا ہے لہٰذا زکوٰۃ کے معاملے میں سنت تو[امت کا تعامل و تواتر] یہ ہے کہ اس سے ریاست کے ملازمتیں تنخواہ نہیں لیں گے مگر غامدی صاحب اپنے اصول کو خود تسلیم نہیں کرتے زکوٰۃ سنت ہے فرض ہے مگر اس کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ حکومت اپنے حاجت مند شہریوں کی ضرورتیں ان کی فریاد سے پہلے ان کے دروازے پر پہنچ کر پوری کرنے کی کوشش کرے گی[ص ۴۸۹، میزان] سنتوں کی فہرست میں یہ سنت نہیں ہے۔ زکوٰۃ شریعت میں ہے[۳۵۰] میزان حکمران کا حکم شریعت ہے ریاست نصاب زکوٰۃ شرح تبدیل کرسکتی ہے[ص ۳۵۳، میزان] ریاست اگر چاہے تو حالات کی رعایت سے کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنٰی قرار دے سکتی ہے اور جن چیزوں سے زکوٰۃ وصول کرے ان کے لیے عام دستور کے مطابق کوئی نصاب بھی مقرر کرسکتی ہے رسول اللہ نے اسی لیے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ نہیں لی[ص ۳۵۳] اسی میزان میں ایک جگہ تحریر ہے کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے لیے گھوڑے اور غلام کی زکوٰۃ معاف کر دی [ص ۳۵۳، میزان ۲۰۰۸ء] ظاہر ہے اگر زکوٰۃ کی شرح اللہ یا رسول کا حکم ہوتا تو رسول غامدی صاحب کے اصول کے تحت اللہ کے حکم کی تحدید نہیں کر سکتا نہ توسیع و ترمیم اسی لیے قرآن کی کسی صراحت کے بغیر رسول اللہؐ نے اپنے اور اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ لینے کی ممانعت فرمائی [ص ۳۵۳] اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ تھی کہ اموال...... میں سے ایک حصہ آپ کی اور آپ کے اعزہ و اقرباء کی ضرورتوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا [ص ۳۵۳] سوال یہ ہے کہ جب زکوٰۃ غامدی صاحب کے اصول کے تحت عمال حکومت کی تنخواہوں کے لیے ہے اور پیغمبر بحیثیت حاکم عامل حکومت ہے اور قرآن نے عمال کو تنخواہ لینے کی اجازت دی ہے تو رسولؐ نے زکوٰۃ سے تنخواہ کیوں نہ لی۔ خمس سے مالی مصارف کیوں پورے کیے قرآن نے رسول اور ان کے خاندان پر زکوٰۃ استعمال کرنے کی تحدید عائد نہیں کی تو خود یہ تحدید کیوں عائد کی گئی جو آج سادات کے لیے سخت مشکلات کا سبب ہے کہ لوگ انھیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ زکوٰۃ لے نہیں سکتے رسالت مآبؐ رسول رحمت تھے پوری دنیا کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ سادات کے لیے زحمت بن سکتے نعوذ باللہ غامدی صاحب ایک جانب زکوٰۃ کی شرح کو غیر متعین قرار دے رہے ہیں اسے حاکم کے اجتہاد سے مشروط کر رہے ہیں مگر دوسری جانب قانون معیشت میں ان کا شرح زکوٰۃ کے بارے میں بالکل دوسرا نقطۂ نظر ہے وہ لکھتے ہیں فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [۹:۵] چنانچہ اس آیت کی رو سے حکومت زکوٰۃ کے علاوہ جس کی شرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے مختلف اموال میں مقرر کر دی ہے اپنے مسلمان شہریوں پر ان کی رضامندی کے بغیر کسی نوعیت کا ٹیکس عائد نہیں کر سکتی [ص ۵۰۱ میزان ۲۰۰۸ء] ریاست نماز، زکوٰۃ کے علاوہ کسی چیز کو بھی قانون کی طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتی [وہ روزے، حج، جہاد کا حکم دے کر یہ عبادات ادا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی [ص ۴۹۲ میزان]۔

زکوٰۃ کا نصاب نبیؐ نے اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ عرب کی ریاست کا فرماں روا ہونے کی حیثیت سے مقرر فرمایا تھا لہٰذا ریاست نصاب زکوٰۃ میں تبدیلی کر سکتی ہے: زکوٰۃ کی شرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے مختلف اموال میں مقرر کر دی ہے: زکوٰۃ کی شرح چونکہ پیغمبروں کی وساطت

سے متعین ہوئی لٰہذا یہ سنت ہے جسے رسالت مآب ؐ نے جاری رکھا: غامدی صاحب کی سنتوں کی فہرست میں زکوٰۃ تو ہے مگر زکوٰۃ کی شرح نہیں ہے: جواب: زکوٰۃ مجموعی تنخواہ پر عائد ہوگی۔ رہا یہ معاملہ کہ کتنی تنخواہ ہو تو اس پر پیداوار کی زکوٰۃ کا اطلاق ہوگا تو اس سلسلے میں اصلاً حکومت ہی کو قانون سازی کرنا ہوگی، جب تک حکومت اس ضمن میں کوئی قانون سازی نہیں کرتی، ہمارے خیال میں اگر کسی کی آمدنی اس کی بنیادی ضروریات سے اتنی زیادہ ہے کہ وہ قرض لیے بغیر دس فی صد زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے تو اس پر زکوٰۃ لگے گی۔ [ص۔۱۱۱] جواب: جمہور علماء تنخواہ پر اس زکوٰۃ کے قائل نہیں ہیں، کیونکہ انہوں نے 'Services Produce' کرنے کو پیداوار سے ملحق نہیں کیا، یعنی انہوں نے اس معاملے میں نئی صورتِ حال کو مدِّنظر رکھتے ہوئے تا حال کوئی اجتہاد نہیں کیا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں نہ تنخواہ دار طبقہ اتنی بڑی تعداد میں موجود تھا اور نہ اس وقت تنخواہوں کے حوالے سے ایسی قانون سازی کرنا کسی فقیہ کے لیے ممکن تھا۔ [ص:۱۱۲] جواب: ادا شدہ ٹیکس کی رقم زکوٰۃ سے منہا کر کے زکوٰۃ دی جائے گی۔ پیداوار کی زکوٰۃ الگ ہے اور مال کی زکوٰۃ الگ۔ اگر سال کے آخر پر جمع شدہ مال نصاب سے زیادہ ہوگا تو اس پر مال کی زکوٰۃ الگ سے عائد ہوگی۔ [ص:۱۱۲]

جواب: غامدی صاحب کی رائے یہ ہے کہ تنخواہ پیداوار کے ضمن میں آتی ہے اور اس پر پیداوار کی زکوٰۃ کی شرح لگائی جائے گی۔ چنانچہ ہر اس آدمی کو جس کی تنخواہ نصاب تک پہنچتی ہو، اپنی تنخواہ کا دس فی صد زکوٰۃ کے طور پر دینا ہوگا۔ اس زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے۔ یعنی تنخواہ کی کتنی مقدار ہو تو اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی، یہ بات مسلمانوں کی حکومت کو طے کرنا ہوگی، لیکن جب تک وہ یہ طے نہیں کرتی، اس وقت تک غامدی صاحب کے نزدیک اگر کسی آدمی کی آمدنی اس کی بنیادی ضروریات کی حد سے اتنی زیادہ ہوئی کہ زکوٰۃ نِکال کر باقی رقم سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جاتی ہوں تو اس پر یہ زکوٰۃ اپنی شرح کے مطابق عائد ہوگی۔ [ص:۱۲۶۔۱۲۷]

جو مکان کرائے پر اُٹھے ہیں تو ان کے کرایے کا دس فی صد زکوٰۃ دینا ہوگا اور اگر وہ محض جائداد کی صورت میں قیمت بڑھنے پر بیچنے کے لیے روکے ہوئے ہیں تو پھر ہر سال ان کی حاضر مالیت کا ڈھائی فی صد دینا ہوگا۔ [ص:۱۲۸]

زیورات پر مال کی زکوٰۃ 'حاضر مالیت کا ڈھائی فی صد) لگے گی۔ اپنے کاروبار سے (جس

میں آپ کا سرمایہ اور آپ کی محنت، دونوں صرف ہوتے ہیں، اس سے) ہونے والی آمدنی اگر آپ کی حقیقی ضروریات کے بقدر رقم سے زیادہ ہے تو پھر کُل آمدنی کا پانچ فی صد آپ کو دینا ہوگا۔[ص:۱۲۹]

جواب: معیشت کی دنیا میں محنت کرنے والے تنخواہ دار کو 'Services Produce' کرنے والا قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جو سروسز اس کی پیداوار ہیں، ان کے دس فی صد پر زکوٰۃ ہونی چاہیئے۔[ص:۱۳۸]

جواب: استادِ محترم غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق زکوٰۃ کے نصاب میں ریاست اجتہاد کرسکتی ہے۔لہٰذا ریاست جو نصاب بھی طے کردے گی، اس سے کم مال یا پیداوار پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ وہ اپنی کتاب ''میزان'' کے باب ''قانون عبادات'' کے حوالے سے لکھتے ہیں[ص۳۵۳، میزان]:[ص: ۱۳۸]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ واضح طور پر یہ بتا رہے ہیں کہ یہ نصاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ عرب کی ریاست کا فرماں روا ہونے کی حیثیت سے مقرر فرمایا تھا، چنانچہ اگر ریاست محسوس کرے تو وہ اس میں تبدیلی کرسکتی ہے۔[ص:۱۳۹]

سوال: کیا بنک کی ملازمت جائز ہے؟ (عقیل شاہد) جواب: بنک ایک سودی ادارہ ہے۔ اس ادارے کے ملازمین دراصل اس کے سودی نظام ہی کے ایجنٹ یا کارندے کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دیتے اور اس کا معاوضہ لیتے ہیں۔ اسلام میں سود کھانا اور کھلانا صریحاً حرام ہے۔ چنانچہ سودی ادارے کی خدمات بھی ناجائز کام ہیں اور ان کا معاوضہ بھی حرام ہے۔ کسی بڑے عذر اور مجبوری کے تحت تو ایسا ہوسکتا ہے کہ آدمی کچھ دیر کے لیے بنک میں ملازمت کرلے، لیکن یہ ملازمت اصلاً جائز نہیں ہے۔[ص:۱۴۰]۔ایسا شخص جو صاحب نصاب ہے لیکن اسے خود بھی زکوٰۃ کی ضرورت ہے تو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے[ص۱۱۳] زکوٰۃ لے سکتا ہے[ص۱۱۳] زکوٰۃ اپنی حقیقت میں عبادت ہے لہٰذا اسے ٹیکس کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے [ص۱۱۳] پیداوار اگر اصلاً محنت یا اصلاً سرمایے سے وجود میں آئے تو حد نصاب تک پیداوار پر کل پیداوار کا دس فی صد زکوۃ دینا ہوگا اگر محنت اور سرمایہ دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے تو صرف پانچ فیصد زکوٰۃ ہوگی[ص۱۱۳]

[۱۶۰] جمعہ کا خطبہ سننا فرض ہے: جمعہ کا خطبہ فرض نہیں ہے: جمعہ کی نماز لازم ہے اذان ہوتے ہی صف تمام

مسلمان مردوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس اگر کوئی عذر نہ ہو تو اپنی مصروفیات چھوڑ کر نماز کے لیے حاضر ہو جائیں: جواب: اذان کے بعد پڑھی جانے والی دعا ہاتھ اُٹھانے ضروری نہیں ہیں۔ جمعہ کی دوسری اذان کے فوراً بعد خطبہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس خطبے کا سننا فرض ہے۔ لہٰذا خطبہ شروع ہونے کے بعد کوئی دعا نہیں پڑھی جاسکتی۔ [ص: ۱۱۹، سوال و جواب، المورد، لاہور] میزان میں غامدی صاحب نے جمعہ کی نماز کے عنوان کے تحت جمعہ کی نماز صرف مردوں پر لازم کی ہے عورتوں پر نہیں اور جمعہ کے خطبے کو فرض قرار نہیں دیا تفصیلات کے لیے میزان ۲۰۰۸ء کا ص ۳۳۲ ملاحظہ کیجیے۔

[۱۶۱] بنک صرف سودی ادارہ ہے جو نفع نقصان کی شرائط پر لوگوں سے کاروبار نہیں کرتا سود لیتا اور دیتا ہے: بینک ایسا ادارہ ہے جو اصلاً سودی کاروبار کرتا ہے: بینک کے حصص بھی حرام ہیں: بنک سود کی کم شرح پر رقم لے کر دوسروں کو وہی رقم زیادہ شرح سود پر دیتا ہے اسی سے منافع کماتا ہے اس کی کمائی حرام اس کا حصہ دار بننا بھی حرام: اسلام میں سود کھانا اور کھلانا حرام ہے: بینک کی نوکری مجبوری میں کی جاسکتی ہے لیکن اصلاً یہ ناجائز ہے: حکومت کی نیشنل سیونگ اسکیمیں سودی نہیں ہیں کیونکہ حکومت ان پر سود کم زیادہ کر سکتی ہے: بینک کا سود لینا حرام ہے مگر سودی کھاتے میں بنک جو سود منافع کے طور پر دیتا ہے اس میں سے [inflation] افراطِ زر کا حساب لگا کر رقم لے لینا حلال ہے تاکہ اصل زر میں جو کمی ہوئی ہے اس کی تلافی ہو جائے: بینک سے سود لینا ناجائز ہے مگر بینک سے قرض لینا جائز ہے: بینک سے سود لینا حرام ہے مگر بینک کے قرض پر سود دینا حلال ہے: بینک سے سود کا حرام قرضہ لینا حلال ہے مگر اپنے حلال مال کے قرضے پر سود لینا حرام ہے مگر بینک کے حرام مال کے قرضے پر سود دینا حلال ہے۔ شریعت نے سود کھانے سے منع کیا ہے کھلانے سے منع نہیں کیا: بینک سے قرض لینا اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا نہیں ہے: سود پر قرض لینے کے لیے اضطرار کی کوئی شرط نہیں آدمی اپنی ضرورت کے لیے بغیر کسی شرط کے بینک سے قرض لے سکتا ہے اسے عام اجازت ہے: حرام لینا حرام حرام دینا حلال ہے۔ غامدی صاحب کی میزان کی شرح سوال جواب کے مطابق۔ بنک بہر حال، سودی نظام پر مبنی ادارہ ہے، اسے معلوم ہے کہ نفع ونقصان میں شراکت کیا ہوتی ہے وہ نفع ونقصان کی شرائط پر لوگوں کو اپنے ساتھ شریک نہیں کرتا، بلکہ سود کے اُصول پر ان سے رقوم لیتا اور انہیں دیتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کی باتوں سے خود کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ [ص: ۱۳۵]۔ سوال: ہمارے ملک میں جو کاروبار بھی کیا جائے، اس کے لیے بنک سے سود پر

قرض لینا پڑتا ہے۔ کیا سود دینا بھی اسلام میں اسی طرح ممنوع ہے، جیسا کہ سود لینا؟ (سلیمان) جواب: بنک وغیرہ سے سود پر قرض لینا جائز ہے۔ اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ شریعت نے سود کھانے، یعنی سود لینے سے منع کیا ہے، سود دینے سے نہیں [ص:۱۳۶]۔ جواب: بنک ایک ایسا ادارہ ہے جو اصلاً سودی کاروبار کرتا ہے، یعنی وہ کچھ لوگوں سے سود کی کم شرح پر رقم لیتا اور دوسرے لوگوں کو وہی رقمیں سود کی زیادہ شرح پر دیتا ہے۔ یہی اس کا اصل کاروبار ہے اور اسی سے وہ اپنا منافع کماتا ہے۔ لہٰذا اس کی کمائی بھی حرام ہے اور اس میں حصہ دار بننا بھی حرام ہے [ص:۱۳۷]۔ جب آپ کسی بنک کے شیئر ہولڈر بنتے ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ اس کے مالکان میں سے ایک فرد ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مارکیٹ میں بنک کے شیئرز کی قیمت بھی کم ہوتی ہے اور کبھی زیادہ اور ان شیئرز پر جو منافع ہوتا ہے، وہ بھی یکساں نہیں رہتا۔ بہر حال، یہ شیئرز ہولڈر بنک کے مالکان میں سے ہے اور وہ اپنے سودی ادارے سے اپنا نفع حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا ہمارے خیال میں بنک کے شیئرز لینے سے لازماً بچنا چاہیئے کیوں کہ ان کی تجارت حرام ہے۔ [ص:۱۳۷]

B

جواب: بنک کی ملازمت کرنا دراصل، ایک سودی ادارے کو اپنی خدمات پیش کرنا ہے۔ چنانچہ یہ انتہائی مجبوری کے سوا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔ [ص:۱۴۳]

جواب: اس کام میں آپ بنک کو سودی کاروبار مہیا کر کے اس سے اپنا معاوضہ نہیں لیں گے، یہ کام سود خوری میں بنک کی واضح معاونت ہے، لہٰذا یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ [ص:۱۴۳]

بینک لوگوں کو نفع ونقصان کی شرائط پر اپنے ساتھ شریک نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے پورے علم اور پوری سمجھ کے ساتھ سود کے اصول پر ان سے رقوم لیتا اور انہیں دیتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کی باتوں سے خود کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ [ص:۱۴۴]

جواب: وہ نیشنل سیونگ اسکیمیں جو حکومت نے ریٹائرڈ افراد کا سہولت فراہم کرنے کے لیے جاری کی ہیں، وہ ان کے لیے جائز ہیں، کیونکہ اس میں اصلاً سود دینا حکومت کے پیش نظر نہیں ہوتا، بلکہ اپنے ریٹائرڈ افراد کو ایک سہولت فراہم کرنا، اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور پھر اس میں حکومت ان کے ساتھ کوئی ایسا طے شدہ معاہدہ بھی نہیں کرتی، جس کے مطابق وہ انہیں سود کی کوئی خاص رقم دینے پر مجبور ہو، یعنی

وہ اپنے حالات کے مطابق جب چاہے سود کی شرح کم یا زیادہ کر سکتی ہے۔[ص:۱۴۵]

حقیقت یہ ہے کہ بنک جب کسی سے سود لیتا ہے تو وہ پورے شعور کے ساتھ اللہ کا حرام ٹھہرایا ہوا سودی اضافہ ہی لیتا ہے اور جب کسی کو سود دیتا ہے تو وہ اپنی طرف سے وہی اللہ کا حرام ٹھہرایا ہوا اضافہ ہی اس کو دیتا ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ ہمارے ہاں بنک جو سود دیتا ہے ، اس کی شرح، چونکہ 'inflation' کی شرح کے قریب ہوتی ہے، لہٰذا کیا وہ سود ہمارے لیے جائز نہیں ہے؟ تو اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اگر بنک اور کسٹمر دونوں کی نیت اور ارادہ واقعتاً جمع شدہ روپے کو 'inflation' سے پیدا ہونے والے نقصان سے بچانا ہے اور سال کے آخر پر باقاعدہ متعین ہونے والی 'inflation' کے حساب ہی سے رقم میں اضافہ کرنا ہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ گویا آپ نے ڈالرز کی شکل میں جتنا قرض دیا تھا، بالکل اتنا ہی ڈالرز کی شکل میں واپس لے لیا۔ چنانچہ یہ بالکل جائز ہوگا۔[ص:۱۴۶]

یہ ذہن میں رہے کہ سود تو ہر صورت میں حرام ہے، لیکن اگر کوئی شخص بنک سے حاصل ہونے والے اضافی روپے میں سے 'inflation' کے مطابق حساب لگا کر رقم رکھ لیتا اور باقی رقم کی ایک ایک پائی بنک کو واپس کر دیتا یا بغیر ثواب کی نیت کے غربا میں تقسیم کر دیتا ہے تو اس کی نیت چونکہ سود لینے کی نہیں، بلکہ محض 'inflation cover' کرنے کی ہے، لہٰذا ایسا شخص بالکل صحیح ہوگا اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔[ص:۱۴۶]

جواب: سود تو ہر صورت میں حرام ہے، لیکن اگر کوئی شخص بنک سے حاصل ہونے والی اضافی روپے میں سے 'inflation' (افراطِ زر) کی شرح کے مطابق حساب لگا کر رقم رکھ لیتا اور باقی رقم کی ایک ایک پائی بنک کو واپس کر دیتا یا بغیر ثواب کی نیت سے غربا میں تقسیم کر دیتا ہے تو اس کی نیت چونکہ سود لینے کی نہیں، بلکہ محض 'inflation cover' کرنے کی ہے، لہٰذا ایسا شخص بالکل صحیح ہوگا اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔[ص:۱۴۷]

جواب: پراویڈنٹ فنڈ میں یہ سودی اضافہ اگر نفع ونقصان کے اُصول پر تبدیل ہوتا ہے تو پھر یہ درست ہے اور اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ دیئے جانے والے سود کو ہر سال محض حلال بنانے کے لیے کچھ کم کچھ زیادہ کر دیا جاتا ہے تو پھر یہ سود ہی ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔[ص:۱۴۸]

جواب: سود لینے اور سود دینے میں فرق ہے۔ سود لینا حرام ہے، لیکن سود پر قرض لینا حرام نہیں ہے، چنانچہ غامدی صاحب کی رائے کے مطابق آپ ٹریکٹر خریدنے کے لیے زرعی بنک سے سود پر قرض لے سکتے ہیں۔ [ص:۱۴۹]

[۱۶۲] ایک مسلمان عورت چہرے کی زینت کو بھی جان بوجھ کر ظاہر نہیں کرسکتی: مسلمان عورت ایسا لباس اور چادر پہنے گی جس سے اس کی زینتیں ہرگز ظاہر نہ ہوں: ہاتھ پاؤں چہرے کا بناؤ سنگھار اور زیورات پردے سے مستثنیٰ ہیں: ان تین اعضاء کے سوا باقی ہر جگہ کی زیبائش عورتوں کو چھپا کر رکھنی چاہیے: چنانچہ ایک مسلمان خاتون نامحرموں کے سامنے اپنا چہرہ اور ہاتھ پاؤں کُھلے رکھ سکتی ہے، اس کے علاوہ وہ ایسا لباس اور چادر وغیرہ پہنے گی جس سے اس کی زینتیں ہرگز ظاہر نہ ہوں۔ چہرہ کُھلا رکھنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ عورت کو چہرے کی زینتیں جان بوجھ کر نمایاں کرنے اور دِکھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ نہیں، بلکہ جس چیز کی اجازت دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ چہرے اور ہاتھوں وغیرہ کی حد تک جو زینت عام طور پر ظاہر ہو جایا کرتی ہے، اسلام میں اس کو روا رکھا گیا ہے۔ چنانچہ کوئی عورت چہرے کی زینت کو بھی جان بوجھ کر ظاہر نہیں کرسکتی۔ [ص:۱۹۱، سوال جواب] اس سے زیبائش کی وہ چیزیں البتہ مستثنیٰ ہیں جو عادتاً کھلی ہوتی ہیں یعنی ہاتھ پاؤں چہرے کا بناؤ سنگھار اور زیورات وغیرہ اس کے لیے اصل الفاظ آئے ہیں الا ماظھر منھا عربیت کی رو سے اس کا صحیح مفہوم وہی ہے جسے زمخشری نے بیان کیا ہے یعنی وہ اعضاء جنھیں انسان عادتاً اور جبلی طور پر چھپایا نہیں کرتے اور وہ اصلاً کھلے ہی ہوتے ہیں لہٰذا ان اعضاء کے سوا باقی ہر جگہ کی زیبائش عورتوں کو چھپا کر رکھنی چاہیے [میزان ص ۴۶۶، ۴۶۵، ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب یہ اصول بیان کرتے ہوئے بھول گئے کہ اگر چہرے کی زینت دکھائی جاسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ میں صحابیات چہرے کا پردہ نہیں کرتی ہوں گی کیونکہ یہ حکم انھیں معلوم ہوگا تو کیا اللہ اور رسول اللہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عورتیں چہروں کو نہیں چھپاتیں یا چہرہ چھپاتی ہیں اسی لیے حج کے موقع پر ان کو غامدی صاحب نے خود حکم دیا ہے عورتوں کے لیے صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہیں [ص ۳۸۸، میزان] ایک جانب غامدی صاحب کہہ رہے ہیں کہ چہرے کی زینت چھپانا ضروری ہے دوسری جانب کہہ رہے ہیں کہ چہرے کی زینت دکھائی جاسکتی ہے۔

سورہء احزاب میں منافقین سے بچنے کی غرض سے مسلمان عورتوں کو باہر نکلتے ہوئے اپنے

اوپر بڑی چادر لینے کا حکم دیا گیا ہے۔سورہ کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ یہ حکم اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے ایک حل کے طور پر دیا گیا تھا۔اسے سورۂ نور میں موجود احکام کی طرح شریعت کا مستقل حصّہ نہیں بنایا گیا تھا۔پردے کے معاملے میں علمائے امت میں اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ انہوں نے ان سب احکام کو بالواسطہ طور پر پوری امت سے متعلق سمجھایا ہے۔[ص:۱۹۱] سورۂ حزاب میں عورتوں کو کہا گیا ہے کہ وہ اپنی چادر کے پلو لٹکا لیں اس حکم کا تعلق بھی کیا ازواج مطہرات سے ہے یہ حکم تو مومن عورتوں کے لیے بھی عام ہے اگر احزاب کی آیت کو چھوڑ دیں تو سورۂ نور کی آیت کا کیا ہوگا؟ احزاب میں چادر لینے کا حکم شریعت کا مستقل حصہ کیوں نہیں ہے قرآن کی اس آیت کی تحدید تخصیص کا اختیار پیغمبر کو بھی نہیں تو غامدی صاحب کو کیسے مل گیا؟ یہ غامدی صاحب کے اصول ومبادی کے منافی ہے۔

[۱۶۳] حلال کا مقدمہ حرام ہوسکتا ہے: مقدمہ حرام ہونے سے نتیجہ حرام ہونا ضروری نہیں: حرام طریقے سے غیر ملک میں جا کر حلال رزق کمایا جاسکتا ہے: حرام طریقے سے غیر ملک جا کر مقیم شخص جو وہاں حلال رزق کمار ہا ہے اس ملک سے مراعات نہیں لے سکتا نہ بیروزگاری الاؤنس یہ سب حرام ہے مگر اپنی محنت سے وہاں رزق کمائے تو وہ حلال ہے۔حلال اور حرام توام ہیں۔

میزان کی شرح سوال جواب میں لکھا ہے: جواب: جعلی کاغذات بنوانا بھی غلط ہے اور انہیں استعمال کر کے کسی ملک میں جانا اور وہاں رہنا بھی غلط ہے، لیکن اس غلطی کے نتیجے میں وہاں ملازمت یا مزدوری کر کے کمایا ہوا حلال رزق، حرام نہیں ہو جائے گا۔البتہ اگر یہ شخص اس ملک کی حکومت سے اپنے لیے کچھ مراعات لیتا ہے ٹھہرتے ہیں کہ وہ حصہ بدلنے کے قائل ہیں تو وہ اس کے لیے جائز نہ ہوں گی اگر یہ اس حکومت سے بیروزگاری الاؤنس لیتا ہے تو وہ اس کے لیے حرام ہوگا۔[ص:۱۹۶]

[۱۶۴] میزان کی شرح سوال جواب کے اصول کے تحت میراث کے حصے بدلنے والا انہیں پامال کرنے والا ہمیشہ آگ میں رہے گا اس کے لیے عذاب ہے غامدی صاحب میزان میں اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے: میزان کی شرح میں لکھا ہے بہر حال، لڑکیوں کو میراث سے ان کے بھائی محروم رکھنا چاہیں یا ان کے والدین اپنی زندگی ہی میں اس کا کوئی حیلہ اختیار کریں، دونوں صورتوں میں یہ سرتا سر ظلم ہے اور خدا کے ہاں اس کی جواب دہی ہوگی۔والدین کی میراث میں خدا نے جیسے بیٹوں کا حصّہ رکھا ہے، اسی طرح بیٹیوں کا حصّہ بھی رکھا ہے۔حصّہ کی مقدار کا فرق تو ضرور ہے، لیکن حصّہ دار ہونے میں دونوں کو ایک جیسی

حیثیت حاصل ہے۔ جو شخص کسی وارث کی اس حیثیت کو عملاً بدلتا ہے، وہ خدا کے فیصلے کو ناپسند کرتا اور اسے بدلتا ہے اور یہ چیز بہت بڑا جرم ہے۔ سورۂ نساء میں میراث کے سارے حصّے بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ خدا کی طرف سے میراث کے یہ طے شدہ حصّے خدا کی حدیں ہیں۔ ان حصّوں کو بدلنا یا انہیں پامال کرنا خدا کی حدوں کو توڑنا ہے اور جو خدا کی حدوں کو توڑے گا، اس کے لیے ایسی آگ ہوگی جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب ہوگا۔[ص:۱۹۷۔۱۹۸] جواب: آدمی اگر اپنی زندگی ہی میں اپنی جائداد اپنے بچوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو وہ جیسے چاہے کر سکتا ہے۔ اس پر شریعت کی طرف سے اس ضمن میں کوئی خصوصی قدغن نہیں ہے، البتہ یہ ذہن میں رہے کہ اگر وہ اس معاملے میں بچوں کے درمیان کوئی بے انصافی کرے گا تو یہ بالکل غلط ہوگا اور وہ اس کے لیے خدا کے ہاں مسؤل ہوگا۔ عدل کو قائم رکھتے ہوئے، وہ اگر اپنے کسی غریب بیٹے کو زیادہ اور امیر کو کم دیتا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور ایسا کرنا درست ہوگا، لیکن اگر وہ خواہ مخواہ اپنے کچھ بچوں کو کم اور کچھ کو زیادہ دیتا ہے تو یہ بے انصافی ہوگی یا وہ بغیر کسی وجہ کے لڑکیوں کو دیتا ہی نہیں اور سارا مال لڑکوں ہی کو دے دیتا ہے تو یہ بھی خلاف عدل ہوگا۔[ص:۱۴۲] جواب: والدین سے پائی ہوئی جائداد کا کوئی خاص معاملہ نہیں ہے، یہ بھی آدمی کی اسی طرح ملکیت ہوتی ہے، جیسے اس کا اپنا کمایا ہوا مال۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد یہ بھی اس کے ورثا میں عام جائداد کی طرح ہی تقسیم ہوگی۔ البتہ، اگر وہ اپنی زندگی میں اسے اپنے بچوں کے درمیان تقسیم کرنا چاہتا ہے تو وہ جیسے چاہے کرے، بس شرط یہ ہے کہ وہ بے انصافی نہ کرے۔[ص:۱۴۲]

[۱۶۵] احزاب میں پردے کے احکامات عام عورتوں کے لیے بھی ہیں کہ ماں اپنی بیٹی کے لیے نمونہ ہوتی ہے چنانچہ یہ نقطۂ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا: [احزاب کی] ان آیات کی تعمیم کرنے والوں کے ہاں تعمیم کی وجہ یہ رہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات عام مسلمان عورتوں کے لیے نمونہ ہیں، لہٰذا جو حکم انہیں دیا جا رہا ہے، وہ ان کے واسطے سے عام مسلمان عورتوں تک ممتد ہوتا ہے۔ یہ بات کوئی ایسی غلط نہیں، کیوں کہ وہ امت کی مائیں ہیں اور ماں اگر اپنی بیٹیوں کے لیے نمونہ نہیں ہوگی تو اور کون ہوگا۔ چنانچہ ان کے نقطۂ نظر کو بالکل بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔[ص:۲۲۳، شرح میزان سوال جواب]

[۱۶۶] داڑھی سنت نہیں ہے دین کا حکم ہے اس لیے واجب ہے: داڑھی دین کا حکم نہیں ہے اس لیے فرض

و واجب نہیں ہے: داڑھی نہ رکھنا حرام یا ممنوع فعل نہیں ہے: داڑھی مرد رکھتے رہے ہیں: جواب: حدیث میں ڈاڑھی کے حوالے سے جو الفاظ آئے ہیں، وہ فعل امر کے صیغے میں آئے ہیں، جیسا کہ 'اُعْفُوا اللِّحٰی' (ڈاڑھی بڑھاؤ)، وَوَفِّرُوا اللِّحٰی، (ڈاڑھی بڑھاؤ)، اِوْفُوا اللِّحٰی، (ڈاڑھی بڑھاؤ)، اُرْخُوا اللِّحٰی، (ڈاڑھی لمبی چھوڑ دو)، یہ سب فعل امر کے صیغے ہیں۔ فعل امر سے جو حکم دیا جاتا ہے، اسے فقہا نے عموماً واجب قرار دیا ہے، بلکہ یہ اُصول بیان کیا ہے کہ 'اَلْاَمْرُ لِلْوُجُوْبِ' یعنی صیغۂ امر وجوب کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے، الا یہ کہ قرائن سے کچھ اور ثابت ہو جائے۔ چنانچہ اس اعتبار سے اگر دیکھیں تو ان لوگوں کی بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ ڈاڑھی رکھنا واجب ہے۔ لیکن ان احادیث کے بارے مین استادِ محترم غامدی صاحب کہتے ہیں کہ یہ ڈاڑھی سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی مستقل حکم کو بیان نہیں کر رہیں، یعنی یہ احادیث ہمیں یہ نہیں بتاتیں کہ آپ نے ڈاڑھی کو ایک سنت کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ [ص:۲۲۴۔۲۲۵] غامدی صاحب مقامات میں لکھتے ہیں داڑھی مرد رکھتے رہے ہیں لیکن یہ دین کا کوئی حکم نہیں ہے کوئی داڑھی نہیں رکھتا تو وہ نہ کسی فرض و واجب کا تارک ہے یا اس نے کسی حرام یا ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہے [ص ۱۳۶، مقامات ۲۰۰۸ء]

[۱۶۷] سورہ نور میں سر کی اوڑھنی سے گریبان کو ڈھانکنے کا حکم ہے: سورۂ احزاب میں اپنی چادر کے پلو لٹکانے کا حکم ہے۔ جواب: سورۂ نور میں مسلمان عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سر کی اوڑھنیوں سے اپنے گریبانوں کو ڈھانکیں۔ ان الفاظ سے گریبانوں کو ڈھانکنے کا حکم تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ بات صریح طور پر معلوم نہیں ہوتی کہ سر کی اوڑھنی سر پر لینا لازم ہے، مستحب ہے یا یہ محض عرب خواتین کا ایک رواج تھا۔ [شرح میزان، سوال جواب، ص:۲۳۴] البتہ ابوداؤد کی ایک حدیث سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں عورت کے لیے سر کی اوڑھنی ضروری ہے۔ ''بالغ عورتیں سر کی اوڑھنی لیے بغیر نماز پڑھیں تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کرتے''۔ (ابوداؤد، رقم ۶۴۱) [ص:۲۳۵] غامدی صاحب اور ان کے ترجمان یہ نہیں بتاسکتے کہ سر کی اوڑھنی سینے پر سر سے آئے گی یا پہلے وہ سر سے اتر کر جائے گی وہاں سے کندھے پر آجائے گی اور پھر کندھے سے سینے پر جائے گی یہ عجیب اوڑھنی ہے جو ترجمے کے مطابق ہے تو سر ہی کے لیے مگر قرآن کے الفاظ اتنے مبہم ہیں کہ اس سے پتہ ہی نہیں چل رہا کہ سر کی اوڑھنی سر پر رکھی جائے گی یا نہیں البتہ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ سر کی اوڑھنی سر پر رکھنا فرض نہیں مگر اس اوڑھنی سے

سینہ ڈھانپنا فرض ہے یہ وہ قرآن ہے جس کے لفظ قطعی الدلالۃ ہوتے ہیں۔ جن کے لفظ و معنی کا سفر قطعی ہے اس کے فہم میں کوئی ابہام رکاوٹ نہیں ہے۔

[۱۶۸] لونڈی کے ساتھ جنسی تعلق پر اسلام نے کوئی پابندی نہیں لگائی نکاح کے بغیر یہ تعلق قائم ہوسکتا ہے: عورت غلام سے جنسی تعلق نہیں رکھ سکتی: عورتوں سے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ اللہ کے نزدیک جائز ہے اور وہ نکاح ہے: شرح میزان میں لکھا ہے کوئی آدمی کتنے غلام اور کتنی لونڈیاں رکھے، اس کا فیصلہ ہمیشہ سے انسان نے خود ہی کیا ہے، اسلام نے اس میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ اس نے بس ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی ہے، انہیں آزاد کرنا ایک بڑی نیکی قرار دیا ہے اور اس حوالے سے کچھ اقدامات بھی کیے ہیں۔ [ص: ۲۴۴]

لونڈی کے ساتھ جنسی تعلق اس کا مالک رکھا ہی کرتا تھا، اسلام نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ البتہ، اس تعلق کے حوالے سے لونڈی کو اس کے مالک تک محدود کر دیا ہے۔ [ص: ۲۴۵] کوئی عورت جتنے چاہے غلام رکھ سکتی، لیکن وہ ان کے ساتھ کوئی جنسی تعلق نہیں رکھ سکتی۔ یہ اسلام میں ممنوع ہے۔ [ص: ۲۴۵] غامدی صاحب لکھتے ہیں سورہ نور کی آیت ۳۳، ۳۲ میں یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ واضح کی گئی ہے کہ عورتوں سے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ جائز ہے اور وہ نکاح ہے [ص ۴۱۰، میزان ۲۰۰۸ء]

[۱۶۹] عورت اپنے رحم کو مکان دکان زمین کی طرح کرائے پر دے کر کسی بھی غیر محرم مرد کے نطفے سے ہونے والے بچے کو اس مکان میں پال سکتی ہے یہ حلال کام ہے: مرد اپنا نطفہ غیر منکوحہ عورت کے رحم میں ڈلوا کر بچہ پیدا کرا سکتا ہے کرایے کی ماں کا استعمال اسلام میں جائز ہے: نطفہ غیر محرم عورت کے رحم میں ڈال کر اس کا کرایہ دیا جا سکتا ہے غیر محرم عورت کا غیر محرم باپ کے معصوم بچے کو دودھ پلانا اور غیر محرم مرد کا سائنسی طریقے سے غیر محرم عورت کے رحم میں نطفہ داخل کرنا ایک ہی طرح کے کام ہیں۔ شرح میزان میں درج ہے سوال: میری بیوی اولاد پیدا نہیں کر سکتی تو کیا اس صورت میں ''سروگیٹ مدر'' کے ذریعے اپنے اور اپنی بیوی کے لیے اولاد حاصل کر سکتا ہوں؟ (عبداللہ خان) جواب: اس کے بارے میں غامدی صاحب کی رائے یہ ہے کہ ''سروگیٹ مدر'' سے اولاد حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسے رضاعت ہی پر قیاس کرنا چاہیے۔ جیسے کوئی عورت کسی میاں بیوی کی اولاد کو دودھ پلا سکتی ہے،

اسی طرح کوئی عورت ان کے لیے اولاد کو جنم بھی دے سکتی ہے۔[ص:۲۵۰]واضح رہے کہ سروگیٹ مدر کرائے کی ماں ہے نامحرم عورت ہے اسے کرائے پر لے کر سائنسی طریقے سے اس کے رحم میں غیر محرم مرد اپنے نطفے کو داخل کرا کر بچے کی پرورش کراتا ہے اور اس کا معاوضہ عورت کو ادا کرتا ہے عورت اپنا بچہ اپنے رحم میں پالنے کے بجائے اجنبی مرد کے بچے کے لیے اپنے رحم کو مکان دکان زمین کی طرح کرایے پر دے دیتی ہے غامدی صاحب اسے جائز قرار دیتے ہیں۔

[۱۷۰]حکم شریعت سے ثابت ہو یا فطرت سے مسلمان کے لیے واجب الاتباع ہے: انکار نبوت اور نماز میں کوتاہی شریعت کے تحت قابل سزا جرائم نہیں ہیں: ریاست لوگوں سے تقاضہ کرے گی کہ مسلمان اپنے ایمان واسلام کی شہادت کے طور پر نماز ادا کریں[۴۸۹: میزان] اسلامی ریاست نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کسی چیز کو بھی قانون کی طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کرسکتی[ص۴۹۲ میزان] میزان کی شرح میں لکھا ہے جواب: گناہ خدا کے حکم کو نہ ماننا ہے۔خواہ یہ حکم کسی کام کو سرانجام دینے کا ہو یا کسی کام سے رُکنے کا ہو اور خواہ یہ حکم شریعت سے ثابت ہو یا فطرت سے مثلاً، انکارِ نبوت، نماز میں کوتاہی، ماں باپ سے بدسلوکی، وعدہ خلافی اور جھوٹ بولنا وغیرہ[ص:۲۵۵] جرم کا لفظ جب قانون وفقہ کے زاویے سے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ گناہ ہیں جن پر شریعت نے دنیا میں سزا دی ہے، مثلاً قتل، چوری، قذف اور زنا وغیرہ[ص: ۲۵۶]غامدی صاحب نے شرح میں یہ نہیں بتایا کہ اگر انسانوں کی فطرت میں اختلاف ہو جائے تو حکم کون ہوگا؟ اس اختلاف کو رفع کرنے کا منہاج کیا ہوگا؟ اخلاف کو اتفاق بلکہ اجماع میں تبدیل کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا تاکہ فطرت کے حکم پر عمل کیا جاسکے اور لوگ فطرت کی آڑ میں خواہش نفس کی پیروی نہ کرسکیں غامدی صاحب میزان میں فرما رہے ہیں کہ ریاست جبراً لوگوں کو نماز پڑھائے گی مگر سوال جواب میں فرمارہے ہیں کہ نماز میں کوتاہی گناہ ہے مگر یہ جرم نہیں اس کی کوئی سزا فقہ و قانون میں نہیں دونوں بیان متضاد ہیں۔

[۱۷۱]لوگ اور قوم کی اجازت سے رشوت کھائی جاسکتی ہے: رشوت لینا حرام ہے دینا حرام نہیں ہے سود لینا حرام ہے دینا حرام نہیں ہے شرح میزان میں درج ہے: اس رشوت لینے کو کسی جاں بلب بھوکے شخص کو حرام غذا کھانے کی اجازت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ حرام جانور نہ کھانا خدا کا حق ہے جسے وہ (اللہ) بھوکے شخص کے لیے چھوڑ دیتا ہے، جب کہ رشوت لینا لوگوں کے یا قوم کے حقوق سے بچنا ہے، اس کی

اجازت اس وقت تک نہیں ہوسکتی، جب تک وہ لوگ یا قوم اجازت نہ دے۔[ص:۲۶۰] غامدی صاحب فرما چکے ہیں کہ سود لینا حرام ہے دینا حلال ہے حرام لینا حرام حرام دینا حلال ہے۔اس اصول کے مطابق رشوت لینا حرام ہے دینا حرام نہیں ہے۔

[۱۷۲] ہمارے خیال میں غامدی صاحب کے اس بھٹکنے کے پیچھے خدا کے ساتھ انتہائی محبت ہی کا جذبہ کارفرما ہے، جیسا کہ عیسائیوں کے ہاں رہبانیت اختیار کرنے کے پیچھے خدا کی رضا کے حصول کا جذبہ کار فرما رہا ہے۔[ص:۲۲۶]

☆ قرآن کے سب سے بڑے عارف حمید الدین فراہی کے بعد اس عہد کے سب سے بڑے عارف قرآن غامدی صاحب کے امام امین احسن اصلاحی قرآن کی بعض آیات کا مطلب کچھ اور بتاتے ہیں اور ان کے مقلد جاوید غامدی صاحب انہی آیات کا کچھ اور مطلب ہوتے ہیں لیکن دونوں کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کی ایک آیت کی تاویل میں ایک ہی قول ہوسکتا ہے دو مختلف اقوال ممکن ہی نہیں۔(۱) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۳ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِیِّہٖ سُلۡطٰنًا فَلَا یُسۡرِفۡ فِّی الۡقَتۡلِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مَنۡصُوۡرًا [۱۷:۳۳] کے بارے میں اصلاحی صاحب لکھتے ہیں حق پر سے مراد ہے قانونی جواز کے ساتھ مثلاً قصاص میں اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی حکومت اولیائے مقتول کی مرضی نافذ کرائے گی وہ چاہیں تو قاتل سے قصاص لیں چاہیں تو خون بہا لے لیں چاہیں تو معاف کر دیں [قرآن حکیم ترجمہ امین احسن اصلاحی، اخذ و تلخیص خالد مسعود، ص ۴۴۷۔۴۴۸ طبع دوم، اکتوبر ۲۰۰۳ء، فاران فاؤنڈیشن، لاہور] اسی آیت ۳۳ کے بارے میں غامدی صاحب میزان ۲۰۰۲ء میں لکھتے ہیں ــــــ اسی آیت ۳۳ کے بارے میں میزان ۲۰۱۰ء میں لکھتے ہیں مسلمانوں کی کوئی کوی باقاعدہ حکومت اگر کسی جگہ قائم نہ ہو اور قصاص کا معاملہ مقتول کے اولیاء ہی سے متعلق ہو جائے تو وہ اپنی اس حیثیت میں حدود سے تجاوز نہ کریں۔ چنانچہ رسول اللہ جب مکہ میں تھے اور یثرب میں آپ کی حکومت ابھی قائم نہیں

ہوئی تھی تو اللہ نے فرمایا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا [۱۷:۳۳] اس قانون کا مقصد جیسا کہ زیر بحث آیتوں میں بیان ہوا ہے زمین پر زندگی کی حفاظت ہے [ص ۶۲۰، میزان ۲۰۱۰ء]۔ (۲) امین احسن اصلاحی الانفال کی آیت ۵۰ اور ۵۱ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ، ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ [۸:۵۰-۵۱] کی تشریح میں لکھتے ہیں یعنی قریش کو بدر میں جو مار پڑی وہ تو معمولی تھی اصل مار تو وہ ہے جو فرشتوں کے ہاتھوں ان کی موت کے وقت کفار پر پڑتی ہے [ص ۴۹۴، ترجمہ قرآن اصلاحی ۲۰۰۳ء] اصلاحی صاحب نے اس آیت کو غزوہ بدر کے کفار تک محدود کیا غامدی صاحب اس میں وسعت و تحدید کا اطلاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''انبیاءؑ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد ان کے منکرین کی روحیں فرشتے انھیں مارتے ہوئے قبض کرتے ہیں اور موت کے وقت ہی بتا دیتے ہیں کہ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے اب ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ، ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ [۸:۵۰-۵۱] [میزان ص ۱۸۳، ۲۰۰۸ء] وسعت یہ ہے کہ اس آیت کو اتمام حجت سے مشروط کر کے تمام انبیاء تک اس کا دائرہ وسیع کر دیا گیا تحدید یہ ہے کہ وہ کفار جن پر اتمام حجت نہیں ہوا ان کو اس عذاب دنیا سے محفوظ کر دیا گیا۔ (۳) امین احسن اصلاحی صاحب سورۂ نور کی آیت وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ [۲۴:۳۱] کی تشریح میں لکھتے ہیں: یہ گھر کے اندر کا پردہ ہے زینت کی چیزوں میں لباس بھی داخل ہے اور زیورات بھی اس زینت کو چھپانے کا حکم ہوا ہے جس کے چھپانے میں زیادہ زحمت نہیں ہے نیز گھر کی عورتوں کو پابند کیا ہے کہ غیر محرموں کی موجودگی میں دوپٹہ یا اوڑھنی سے اپنے سر اور کمر کے ساتھ ساتھ اپنے گریبانوں کو بھی چھپائیں [ص ۵۶۰، ترجمہ اصلاحی ۲۰۰۳ء محولہ بالا] غامدی صاحب اسی آیت کی تشریح میں لکھتے ہوئے اسے گھر کے اندر

پردے کی آیت تسلیم نہیں کرتے ویسے بھی ان کا دعویٰ ہے کہ پردہ تو کوئی چیز نہیں ہے وہ لکھتے ہیں: یہ اختلاط مرد وزن کے آداب ہیں [ص ۴۶۳، میزان] اس سے زیبائش کی وہ چیزیں البتہ مستثنیٰ ہیں جو عادتاً کھلی ہوتی ہیں یعنی ہاتھ، پاؤں اور چہرے کا بناؤ سنگھار اور زیورات وغیرہ اصل میں الفاظ الا ماظھر منھا آئے ہیں یعنی وہ اعضاء جنھیں انسان عادتاً اور جبلی طور پر چھپایا نہیں کرتے اور وہ اصلاً کھلے ہوتے ہیں [ص ۴۶۵، ۴۶۶، میزان ۲۰۰۸ء]۔ (۴) سورۂ احزاب میں پردے کی آیت وَالَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ بِغَیۡرِ مَا اکۡتَسَبُوۡا فَقَدِ احۡتَمَلُوۡا بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا، یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ وَ نِسَآءِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡہِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِہِنَّ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ یُّعۡرَفۡنَ فَلَا یُؤۡذَیۡنَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا، لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ لَنُغۡرِیَنَّکَ بِہِمۡ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوۡنَکَ فِیۡہَاۤ اِلَّا قَلِیۡلًا، مَّلۡعُوۡنِیۡنَ ۚۛ اَیۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا وَ قُتِّلُوۡا تَقۡتِیۡلًا [۳۳: ۵۸ تا ۶۱] میں آیت ۵۹ کا ترجمہ کرتے ہوئے اصلاحی صاحب لکھتے ہیں: اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگھٹ لٹکا لیا کریں [ص ۶۰۸، ترجمہ اصلاحی ۲۰۰۳ء] آیت پردہ کی وضاحت میں اصلاحی صاحب لکھتے ہیں یہ سورہ نور میں بیان شدہ پردے کے احکام کی وضاحت ہے [ص ۶۷۸ محولہ بالا] آیت حجاب کی تشریح میں غامدی صاحب کے بقول اس صدی کے قرآن کے سب سے بڑے عارف امام اصلاحی لکھتے ہیں مسلمان خواتین کے لیے ضروری قرار دیا کہ گھروں سے باہر نکلیں تو جسم کو ایک بڑی چادر میں لپیٹ لیں اور اس کے ایک حصہ کو چہرہ پر لٹکا لیں اس چادر نے زمانہ کی ترقی کے ساتھ برقع کی شکل اختیار کر لی چادر اوڑھنے کا حکم کوئی وقتی حکم نہیں تھا احکام بعض اسباب و محرکات کے تحت نازل ہوئے لیکن نازل ہونے کے بعد اسلامی شریعت کا جزو بن گئے لہٰذا مسلمان خواتین کے لیے ضروری ہے کہ گھروں سے باہر نکلیں تو پردہ کریں [ص ۶۰۸، ترجمہ اصلاحی] غامدی صاحب احزاب کی آیت ۵۸ تا ۶۱ میں آیت ۵۹ کا ترجمہ اصلاحی صاحب سے بالکل الگ کرتے ہیں تاکہ قرآن کی آیت کی دوسری تاویل کریں وہ لکھتے ہیں اے نبی ہدایت کر دو کہ [باہر نکلیں تو] اپنی کوئی چادر اپنے اوپر ڈال لیا کریں [ص ۴۷۰، میزان ۲۰۰۸ء] کوئی چادر اور بڑی چادر۔ متبادل مترادف الفاظ نہیں اپنے اوپر ڈال لیا کریں اور اصلاحی صاحب کے الفاظ میں جسم کو چادر میں لپیٹ لیں اور اس کے حصے کو چہرہ پر لٹکا لیں۔ یہ دو مترادف متبادل ترجمے نہیں بلکہ مختلف ترجمے ہیں جبکہ غامدی صاحب کے میزان میں اصول و مبادی کے تحت قرآن کی

ایک آیت کی صرف اور صرف ایک ہی تاویل ہوسکتی ہے۔ وہ آیت کی تشریح میں پردہ کا لفظ حذف کرتے ہیں اصلاحی صاحب بار بار پردے کا لفظ استعمال کرتے ہیں غامدی صاحب چادر لٹکانے کے حکم کے بارے میں لکھتے ہیں ''الفاظ اور ان کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہ کوئی پردے کا حکم نہ تھا بلکہ مسلمان عورتوں کے لیے الگ شناخت قائم کردینے کی ایک وقتی تدبیر تھی [ص ۴۷۰ میزان] اب اس اختلاف میں ہم قرآن کے عارف کی تشریح تسلیم کریں یا اس عارف کے منکر کی تفسیر قبول کریں۔

سورۂ محمد فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ [۴۷:۴] میں مَنًّا یہاں محذوف کا مصدر ہے اور قتل کے مقابلے میں نہیں بلکہ...... کے مقابلے میں آیا ہے اس لیے یہ بات قطعی ہے کہ اس کے معنیٰ بلا معاوضہ رہا کردینے ہی کے ہیں [ص ۶۰۴، میزان] سورۂ محمد، سورۂ حج کے بعد نازل ہوئی ہے سورۂ حج میں جنگ کی اجازت دی گئی تھی سورۂ محمدؐ میں میدان جنگ میں لڑنے کا طریقہ اور کفار پر ضرب لگانے کا قرینہ بتایا جارہا ہے۔ غامدی صاحب کے مطابق سورۂ محمد میں قطعی طور پر اللہ نے حکم دے دیا کہ قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کردو اگر یہ حکم قطعی تھا تو پھر سورۂ نور میں جو بہت بعد میں نازل ہوئی غلامی سے متعلق آخری حکم کیوں نازل کیا گیا جب مسلمانوں پر جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کرنا لازم تھا تو مکاتیب کی گنجائش کیوں پیدا کی گئی غامدی صاحب خود لکھتے ہیں '' وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [۲۴:۳۳] اس طرح کے حالات میں اگر یہ حکم دیا جاتا کہ تمام غلام لونڈیاں آزاد ہیں تو ان کی ایک بڑی تعداد کے لیے جینے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ مرد بھیک مانگیں عورتیں جسم فروشی کریں یہ مصلحت تھی جس کی وجہ سے قرآن نے تدریج کا طریقہ اختیار کیا اور اس سلسلے کے کئی اقدامات کے بعد بالاخر یہ قانون نازل فرمایا اس میں مکاتیب کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ اس بات کا اعلان تھا کہ لوح تقدیر اب غلاموں کے ہاتھ میں ہے غلامی سے متعلق یہ آخری حکم ہے [ص ۶۷۹، میزان ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب

فرماتے ہیں کہ سورۂ محمد میں منًّا کے معنی بلا معاوضہ رہا کر دینے ہی کے ہیں [ص ۶۰۴، میزان] اس کے بعد اس آیت کی تشریح میں مزید لکھتے ہیں کہ "انھیں قتل کرنے یا لونڈی غلام بنا کر رکھ لینے کی گنجائش اس حکم کے بعد ان کے لیے باقی نہیں رہی [ص ۶۰۴ میزان] اگر ان کا یہ دعویٰ درست ہے تو نعوذ باللہ رسول اللہ نے اس حکم کی قطعی خلاف ورزی کی اور قطعی حکم کے باوجود ماریہ قطبیہ کو لونڈی بنا کر رکھا غامدی صاحب لکھتے ہیں: سیدہ ماریہ کے ساتھ آپ نکاح نہیں کر سکے اور وہ ملک یمین ہی کے طریقے پر آپ کے گھر میں رہیں [میزان، ص ۴۳۱، ۲۰۰۸ء] ایک جانب وہ سورۂ محمدؐ کی تشریح میں لکھ رہے ہیں کہ اس کے معنی بلا معاوضہ رہا کر دینے کے ہیں [ص ۶۰۴] مگر آیت کے قطعی مطلب کو بیان کرنے کے بعد اگلی سانس میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اس سے واضح ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو مسلمان چھوڑ بھی سکتے تھے فدیہ بھی لے سکتے تھے اور جب تک وہ قید میں رہتے قرآن کی رو سے ملک یمین کی بناء پر ان سے کوئی فائدہ بھی اٹھا سکتے تھے [ص ۶۰۴] یہ عجیب قرآن ہے کہ اس کی ایک ہی آیت سے قطعی طور پر جنگی قیدیوں کا معاوضہ رہا کرنا ثابت ہے اسی آیت سے ان کو معاوضۃ لے کر فدیہ دے کر رہا کرنا بھی ثابت ہے اسی آیت سے جنگی عورتوں سے تمتع کرنا بھی حلال ہے واضح رہے کہ اسی میزان میں وہ سورۂ نور کی آیت ۳۲، ۳۳ کے بارے میں لکھتے ہیں "آیات میں یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ واضح کی گئی ہے کہ عورتوں سے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ اللہ کے نزدیک جائز ہے اور وہ نکاح ہے" [ص ۴۱۰، میزان] سوال یہ ہے کہ اس آیت کی قطعیت کے بعد رسالت مآب ماریہ قطبیہ سے نکاح کے بغیر کیوں تمتع فرما رہے تھے؟ یہ بات بھی عجیب ہے کہ سورۂ محمد میں بلا معاوضہ قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم ہے مگر اس سورۃ کے بہت بعد جو آخری سورت سورۂ توبہ نازل ہوئی اس میں زکوٰۃ کے مصارف میں مستقل مدنی الرقاب رکھی گئی تا کہ غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی اس مہم کو بیت المال سے بھی تقویت پہنچائی جائے [میزان، ص ۴۸۲، ۲۰۰۸ء] جب سورۂ محمد میں اللہ نے قطعی حکم دے دیا کہ مفت میں سب کو رہا کر دو تو کئی سال بعد سورۂ توبہ میں غلاموں کی رہائی کے لیے زکوٰۃ میں رقوم کیوں مختص کی جا رہی ہیں نعوذ باللہ کیا صحابہ کرام نے قرآن کا حکم تسلیم نہیں کیا اس پر عمل نہیں کیا فدیے معاوضہ کا انتظار کرتے رہے جس کے بعد اللہ نے ان کی خواہش کے مطابق بیت المال سے ان کو مال دلوانے کا انتظام کر کے آزادی کی اس مہم کو سرکاری سرپرستی میں انجام تک پہنچایا؟

☆ غامدی صاحب میزان کے قانون معاشرت اور قانون جہاد میں ثابت کرتے ہیں کہ لونڈی اور غلام کا ادارہ اسلام نہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تفصیلات کے لیے میزان کا ص ۴۱۰، ۴۷۹، ۴۳۱، ۴۸۲، ۶۰۴، ۶۰۷ وغیرہ ملاحظہ کریں۔ مگر اسی میزان میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی کوئی باقاعدہ حکومت اگر کسی جگہ قائم نہ ہو اور قصاص کا معاملہ مقتول کے اولیاء ہی سے متعلق ہو جائے تو وہ حدود سے تجاوز نہ کریں [ص ۲۲۹، میزان ۲۰۰۸ء] ظاہر ہے یہ صورت ۱۹۲۴ء تک عالم اسلام میں موجود نہ تھی کیونکہ ۱۹۲۴ء تک خلافت عثمانیہ، اس سے پہلے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں مغلیہ مسلمان سلطنت اور اس سے متصل ایران میں صفوی شیعہ اسلامی ریاست بھی موجود تھی لہٰذا غامدی صاحب صاحب کا یہ استثناء مستقبل سے متعلق ہے جب مسلمانوں کی کوئی ریاست ہی نہ ہو ایسے حالات میں قصاص کی شرائط کا تعین کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''جوش انتقام میں قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرنے کی کوشش کریں یا اپنی شرافت و نجابت کے زعم میں اپنے غلام کے بدلے میں مرد کے قتل ک مطالبہ کریں [ص ۲۲۹] اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام صرف عہد رسالت میں نہیں تھے بعد کے ادوار میں بھی غلامی کا امکان ہے اور غامدی صاحب نے اس کی تائید توثیق فرما دی ہے جبکہ پہلے وہ غلامی کو سورۂ محمد کی روشنی میں ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا اعلان کر چکے تھے۔

شریعت قرآن وسنت ہے: اللہ کی شریعت اور قانون اتمام حجت الگ لگ ہیں: قانون اتمام حجت عارضی غیر قطعی تھا اور منسوخ ہو گیا: تمام قوموں تک ذریت ابراہیم کا دعوت حق قطعیت سے پہچانا اتمام حجت کا قائم مقام ہے کیونکہ للہ پھر انھیں غلبہ غلبہ عطا فرما دیتے ہیں: قرآن وسنت میں خدا کی ابدی شریعت بیان ہوئی ہے [ص ۴۰۹ میزان] ذریت ابراہیم اگر حق بے کم و کاست پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتی رہے تو ان کے نہ ماننے کی صورت میں اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اسے غلبہ عطا فرماتے ہیں [ص ۵۵۰ میزان] اس مقصد کے لیے نبیؐ اور صحابہ نے جو اقدامات کیے اور انھیں قتال کا جو حکم دیا گیا اس کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے [ص ۵۹۷] قانون اتمام حجت جو قرآن میں آیا ہے اگر وہ شریعت نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ غامدی صاحب نے اس قانون کی جو تحدید و تخصیص کی ہے اس کی اجازت انہیں کس نص کے تحت ملی ہے ان کے اپنے اصول کے مطابق پیغمبر بھی کسی نص کی تحدید و تخصیص نہیں کر سکتا [ص ۲۵ میزان ۲۰۰۸ء]

☆ قرآن نے اہل کتاب کو جزیہ دے کر ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے کا حکم دیا تھا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا

يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوۡنَ مَاحَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ وَلَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ[۹:۲۹] مگر حضرت عمر نے خیبر کے یہود اور نجران کے نصاریٰ دونوں جزیرہ نمائے عرب سے جلا وطن کر دیا [میزان، ص ۵۹۹] غامدی صاحب نے اس عمل کی توہین فرمائی ہے مگر یہ تو قرآن کے نص کی توسیع ہے جس کا اختیار پیغمبر کو بھی نہیں ہے غامدی صاحب نے اس کی تشریح میں وَلَوۡلَاۤ اَنۡ كَتَبَ اللّٰہُ عَلَيۡهِمُ الۡجَلَاۤءَ لَعَذَّبَهُمۡ فِى الدُّنۡيَا ‌ؕ وَلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ [۵۹:۳] سورۂ حشر کی آیت پیش کی ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ آیت تو رسالت مآب کی زندگی میں نازل ہوئی تو آپ نے قرآن کے احکامات کو اپنی زندگی میں کیوں نافذ نہیں کیا اور ان آیات کے اطلاق کے لیے طویل عرصہ کیوں انتظار کیا گیا۔ رسالت مآب نے تو ان آیات کے تحت ان پر جلاوطنی کی سزا نافذ کر کے انھیں خیبر جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن حضرت عمرؓ نے انھیں خیبر سے بھی نکال دیا۔ یہ حکم رسول میں توسیع اور آیت قرآن میں اضافہ ہے جو غامدی صاحب کے اصول ۸۷ کے منافی ہے۔

☆ اگر قرآن کسی مسئلے معاملے میں خاموش ہے تو میں ضرور بولوں گا: غامدی صاحب سورۂ نساء کی آیت اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡۤءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓـئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ‏، وَلَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ‌ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـــٰٔنَ وَلَا الَّذِيۡنَ يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ‌ ؕ اُولٰٓـئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا[۴:۱۷،۱۸] کی تشریح میں لکھتے ہیں ”اس کے لیے ضروری ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو توبہ کر لی جائے اللہ کے اوپر صرف انھیں لوگوں کی توبہ کا حق قائم ہوتا ہے جو فوراً توبہ کر لیتے ہیں جو زندگی بھر گناہوں میں ڈوبے رہتے ہیں موت دیکھ کر توبہ کا وظیفہ پڑھنے لگتے ہیں ان کی توبہ توبہ نہیں [ص ۲۳۹، میزان] توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کی یہ دو صورتیں قرآن نے بالکل متعین کر دی ہیں اس کے بعد ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی شخص گناہ کے بعد جلد توبہ کی سعادت حاصل نہیں کر سکا لیکن اس نے اتنی دیر بھی نہیں کی کہ موت کا وقت آن پہنچا ہو اس صورت کے بارے میں قرآن خاموش ہے [ص ۲۴۰] لیکن ظاہر ہے اس صورت میں غامدی صاحب بالکل خاموش نہیں رہیں گے کیونکہ امت پہلی مرتبہ ہر آیت کا مفہوم غامدی صاحب کے ذریعے سمجھ رہی ہے لہٰذا لکھتے ہیں ذہن کبھی کبھی اس طرف جاتا ہے کہ اس امت کے اس طرح کے لوگ امید ہے کہ نبیؐ کی شفاعت سے

نجات پا جائیں گے [ص ۲۴۰، میزان] جب اللہ رب العزت خاموش ہے تو بندہ کی کیا مجال ہے کہ وہ اس سکوت کے مقابلے پر ہمکلام ہو بندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ بھی خاموش رہے جو شخص اپنے رب کی تقلید پر آمادہ نہیں ہے وہ امت کے کسی اور شخص کی تقلید پر کیوں کر آمادہ ہو سکتا ہے؟

☆ الحق کی پہچان انسان کی خلقت کا حصہ ہے: الحق کی پہچان اس کی فطرت میں ودیعت ہے: علم اور عقل اس پہچان کی شہادت دیتے ہیں: اتمام حجت کے لیے انبیاء کے ذریعے ایک دوسری شہادت پیش کی جاتی ہے: غامدی صاحب کے ذرائع علم خلق انسانی، فطرت: علم: عقل: انبیاء کے ذریعے اتمام حجت

غامدی صاحب کے ان ذرائع عم کی تفصیل میزان کے ص ۱۳۲۸ اور ص ۱۲۹ پر پڑھی جا سکتی ہے۔

☆ دین کا اصل ماخذ خود شناسی ضمیر، نفس لوامہ، خلش گناہ، باطنی عدالت احتساب، فطرت ہے: انسان خود کو پہچان لے تو خدا اور آخرت کو پیغمبر کے بغیر بھی پہچان لیتا ہے انسان وحی، رسالت اور پیغام ہدایت کے بغیر خود شناسی سے دین کو پہچان سکتا ہے وہ خود ہدایت کے لیے ہے۔

غامدی صاحب کے اس اصول کی تفسیر میزان کے ص ۱۵۸ تا ۱۵۹ پر پڑھی جا سکتی ہیں وہ لکھتے ہیں یہی حقیقت حکماء اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک عالم اصغر ہے جس کے اندر اس عالم اکبر کا پورا عکس موجود ہے اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخر سب کو پچان لے [ص ۱۵۹، میزان]

☆ ایمان اور عمل صالح اصل دین میں رسالت پر ایمان لازمی نہیں: ایمان اور عمل صالح اصل دین ہیں جو شخص ان دونوں کے ساتھ اللہ کے حضور میں آئے گا اس کے لیے جنت ہے اور اس میں وہ ہمیشہ رہے گا [۱۹۷ میزان]

☆ خیر و شر میں فرق صرف وحی کے ذریعے نہیں ہوتا: خیر و شر کا امتیاز و احساس تخلیق انسانی کے وقت دل و دماغ پر الہام کر دیا گیا وحی کے بغیر بھی یہ فرق واضح ہو سکتا ہے منکر کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں۔

غامدی صاحب لکھتے ہیں انسان محض حیوانی عقلی وجودی نہیں ہے اس کے ساتھ ایک اخلاقی وجود بھی ہے خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کے دل و دماغ میں الہام کر دیا گیا ہے [ص ۱۹۸ میزان ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں منکر معروف کا ضد ہے یعنی وہ برائیاں جنھیں انسان بالعموم برا جانتا ہے ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور جن کی برائی ایسی کھلی ہوئی

ہے کہ اس کے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی مذہب وملت تہذیب وتمدن کی ہر اچھی روایت میں انہیں برا ہی سمجھا جاتا ہے۔[ص ۲۰۳۔، میزان ۲۰۰۸ء]

عمار ناصر خان اپنی کتاب حدود وتعزیرات میں خیر وشر کے الہام کو تسلیم نہیں کرتے وہ حضرت علیؓ کے حوالے سے غامدی صاحب کے اس اصول کا رد کرتے ہیں۔عبدالرحمان حاطب کے شوہر دیدہ لونڈی آزاد ہو چکی تھی حاملہ ہوگئی تو سیدنا عمر کے سامنے پیش کیا گیا اس سے پوچھا گیا تو اس نے بے تکلف انداز میں بتایا کہ ہاں میں نے مرغوش نامی شخص سے دو درہم لے کر زنا کیا تھا سیدنا عمر نے اسے سزا دینا چاہی تو علیؓ نے کہا یہ جس انداز میں بے جھجک زنا کا ذکر کر رہی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اس کی حرمت اور شناعت سے واقف نہیں جبکہ حد اسی شخص پر نافذ کی جاسکتی ہے جو اس فعل کی حرمت سے واقف ہو[ص ۵۳، عمار خان ناصر، حدود وتعزیرات، جولائی ۲۰۰۸ء، طبع اول، المورد لاہور] غامدی صاحب کے شاگرد رشید کا استدلال اپنے استاد محترم کے اصول کی نفی کرتا ہے ویسے بھی حضرت علیؓ کے مقابلے میں غامدی صاحب کی دلیل یا اصول کی کوئی حیثیت نہیں۔قرآن نے غافلات کی اصطلاح ایسی عورتوں کے لیے استعمال کی ہے جو بہت سے امور کے بارے میں جانتی ہی نہیں کجا کہ وہ زنا جیسے فعل قبیح کے ارتکاب کا تصور کریں۔وہ ایسی پاکیزہ عورتیں ہیں جنھیں آفتاب ومہتاب کی کرنوں کے سوا کسی غیر محرم آنکھ نے نہیں دیکھا بہت سی خواتین تعلقات زن وشو سے لاعلم ہوتی ہیں اور نکاح کے باوجود ان تعلقات کو قائم کرنے میں ان کی حیاء، مانع ہوتی ہے وہ شوہر سے اس تعلق کو شر تصور کرتی ہیں میری بہن کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا جب میرے بہنوئی نے شکایت کی کہ وہ تعلقات زن وشو کے لیے آمادہ نہیں ہے اسے غلط کام تصور کرتی ہے۔

☆ نبی ہر قوم میں اور صدیوں تک آتے رہے ہیں ان کی بعثت کا مقصد اتمام حجت تھا[ص ۱۴۹، میزان ۲۰۰۸ء]

☆ کچھ پیغمبر محض اتمام حجت کے لیے آتے ہیں جیسے سیدنا مسیح اور سینا یحییٰ[ص ۱۳۸، میزان] اتمام حجت اور محض اتمام حجت میں کیا فرق ہے؟ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں اس لحاظ سے اب اللہ تعالیٰ کے دو قوانین ہونے چاہئیں قانون اتمام حجت اور قانون محض اتمام حجت۔

☆ نبی کی فطرت انسان کامل کی فطرت ہوتی ہے[ص ۱۳۷] نبی انسان ہی ہوتے ہیں جس طرح تمام انسان ہوتے ہیں[ص ۱۳۵] ان میں سے کوئی بھی خدا، خدا کا اوتار دیوتا ی فرشتہ نہیں ہوتا[ص ۱۳۵]

خلقت کے اعتبار سے ان میں اور عام انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔[۱۳۵] آپ کو ہدایت کی گئی کہ صاف صاف بتا دیں کہ آپ انسان ہی ہیں کوئی فوق بشر ہستی نہیں[ص ۱۳۵]۔

☆ سیدنا یحییٰ سیدنا مسیح اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ فرشتوں کے زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں لہٰذا لوگوں نے ان سے فائدہ بھی کم ہی اٹھایا ہے[ص ۱۳۸ میزان] یعنی انبیاء فرشتہ صفت نہیں ہوتے صرف دو انبیاء فرشتہ صفت تھے اسی لیے لوگس نے ان سے فیض نہیں اٹھایا وہ نبی جو فرشتہ صفت [نعوذ باللہ] نہیں تھے ان سے کیا فیض اٹھایا گیا مثلاً حضرت نوحؑ۔ نبی بشر تھے اب وہ فرشتے ہوگئے یا ان کے قریب ہوگئے، سیدنا مسیح نے رہبانیت کی حد تک زہد و تجرد اختیار کیے رکھا اس لیے کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ وہ اس قوم پر اتمام حجت کی جدوجہد میں صرف کرنا چاہتے تھے[ص ۱۴۱] کیا رسول تجرد کی زندگی گزارتے ہیں یہ دعویٰ خود رآن کے نص کے خلاف ہے قرآن بتاتا ہے کہ تمام رسول...... زندگی گزارتے ہیں وہ جو اولاد سے محروم رہتے ہیں وہ اولاد کی دعا کرتے ہیں تا کہ ان کے دین کا کام ان کی امامت میں جاری رہے جیسے حضرت زکریا اور حضرت ابراہیم اور اللہ تعالیٰ پیغمبروں کی دعا قبول فرماتے ہیں اگر حضرت عیسیٰ نے تجرد کی زندگی بسر کرتے تو عیسائی لازماً رہبانیت کو اپنے پیغمبر کی اتباع میں قبول کرتے مگر قرآن نے واضح کر دیا کہ انھوں نے رہبانیت حضرتِ عیسیٰ کے اتباع میں نہیں اپنی مرضی سے خود اختیار کی لیکن اس سخت طرز زندگی کا حق ادا نہ کر سکے ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ [۵۷:۲۷] پیغمبر فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنی امت کے لیے ایک نمونہ ہدایت ہوتے ہیں وہ غیر فطری زندگی بسر نہیں کرتے۔ قرآن حضرت عیسیٰ کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کھانا کھاتے تھے فرشتے کھانا نہیں کھاتے مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ [۵:۷۵]

☆ زندگی کے تمام معاملات میں نبی کی ہدایت کے بے چون و چرا تعمیل لازم ہے کیونکہ اللہ اپنی ہدایت براہ راست بندوں کو نہیں دیتا بلکہ ہدایت نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے دیتا ہے: نبی کی اطاعت رسمی نہیں قلبی چیز ہے: رسول کے ایک ایک نقش کی تلاش کر کے اس کی پیروی کرنا خدا کی محبت کا تقاضہ ہے: اس

محبت کے صلے میں انسان خدا کے محبوب ہوتا ہے۔

نبی کو نبی مان لینے کا لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنی کتاب میں خود واضح فرما دی ہے کہ نبی صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں، بلکہ اطاعت کا مکرز بھی ہوتا ہے۔ وہ اس لیے ہیں آتا کہ لوگ اس کو نبی اور رسول مان کر فارغ ہو جائیں۔ اس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح کی نہیں، بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جو ہدایت وہ دے اس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ [النساء۴:۶۴] ''اور ہم نے جو رسول بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہ راست معاملہ نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہدایت اور رسولوں کی وساطت سے دیتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اصلی مقصود تو خدا کی اطاعت ہے، مگر اس کا طریقہ ہی یہ ہے کہ اس کے نبیوں کی اطاعت کی جائے۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ [النساء۴:۸۰] ''جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی ہے'' [ص ۱۴۴، میزان ۲۰۰۸ء]۔

''......اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے، جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والی تمام نزاعات میں تمہی کو حکم نہ مانیں اور پھر ساتھ ہی ان کے اندر یہ ذہنی تبدیلی نہ واقع ہو جائے کہ وہ تمہارے فیصلے کو بے چون و چرا پورے اطمینان قلب کے ساتھ مانیں اور اپنے آپ کو بلا کسی استثناء و تحفظ کے تمہارے حوالے کر دیں۔ لہٰذا یہ اطاعت کوئی رسمی چیز نہیں ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ یہ اتباع کے جذبے سے اور پورے اخلاص، پوری محبت اور انتہائی عقیدت و احترام سے ہونی چاہیے۔ انسان کو خدا کی محبت اسی اطاعت اور اسی اتباع سے حاصل ہوتی ہے: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [آل عمران۳:۳۱] ''ان سے کہہ دو کہ اگر تم سے اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور [یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ] اللہ بخشنے والا ہے، اس کی شفقت ابدی ہے''۔ [ص ۱۴۵، میزان]

لہٰذا ہدایت کی گئی ہے کہ تسلیم و رضا کے اس مرتبے تک پہنچنے کے لیے لوگ ان ہستیوں کی اتباع کریں جنھیں اللہ نے ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ

فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [آل عمران۳:۳۱] ''ان سے کہہ دو کہ اگر تم سے اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور [یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ] اللہ بخشنے والا ہے، اس کی شفقت ابدی ہے''۔

''یہ اتباع اس لیے ضروری ہے کہ رسول خدا کی معرفت کا مظہر کامل ہوتا ہے اور اس کی ایک ایک ادا معرفت الٰہی کا نشان ہوتی ہے، اس وجہ سے جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں، وہ رسول کی ایک ایک ادا سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ رسول کے اندر وہ علم دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے، وہ عمل دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے پیدا ہوت ہے، وہ عادات دیکھتے ہیں، جو خدا کو پسند ہیں، وہ صفات دیکھت ہیں جو خدا کو محبوب ہیں، وہ جمال دیکھتے ہیں جس پر جمال خداوندی کا پرتو ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ رسول کے ایک ایک نقش کو تلاش کر کر کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور چونکہ یہ سب کچھ خدا کی محبت میں کرتے ہیں، اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا صلہ یہ پاتے ہیں کہ وہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں۔[ص۲۴۲، میزان]

☆☆☆☆☆

[۴۰] المورد کے زیر اہتمام دانش سرا کے صدر ڈاکٹر فاروق خان کی کتاب ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی غامدی صاحب کی سرپرستی میں ان کے ادارے سے شائع ہوئی تو غامدی صاحب کے مکتب فکر کے ماخذات دین اس کتاب میں شائع کیے گئے آپ بھی پڑھیے: اس دور کے غامدی صاحب کے ماخذات دین درج ذیل ہیں:

[۱] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ قرآن مجید میزان اور فرقان، یعنی کسوٹی ہے ــــ [۲] قرآن کے بعد حضورؐ سے یہ دین ہمیں سنت ثابتہ کی شکل میں بھی ملا ہے۔ سنت ثابتہ حضورؐ کا وہ عمل ہے جو انہوں نے التزام کے ساتھ امت میں جاری فرمایا پھر یہ عمل صحابہ کرام کے متواتر عمل اور اجماع کے ذریعے سے اس امت کو منتقل ہوا۔ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں، قرآن قولی تواتر کے ساتھ ہمیں منتقل ہوا ہے اور سنت ثابتہ عملی تواتر کے ساتھ ہمیں منتقل ہوئی ہے ــــ [۳] حدیث، رسول اللہؐ کے قول، فعل اور تائید کو کہتے ہیں، جو ہمیں مختلف واسطوں سے ملی ہے۔ کسی روایت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تسلیم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بات قرآن مجید، سنت ثابتہ، اور عقل و فطرت کی پختہ بنیاد پر قائم ہو اور کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہو اور قابل اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچے۔ جو روایت اس معیار پر پوری اترے وہ بھی ہر مسلمان کے لیے حجت ہے ــــ [۴] اجتہاد قرآن و سنت سے ماورا کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہے ــــ جس اجتہاد کو امت مسلمہ کا ضمیر قبول کرے، وہ اپنی انفرادی زندگیوں میں اس کی پیروی شروع کر دیں اور اپنی حقیقی مجالس قانون ساز [پارلیمنٹ] کے ذریعے سے اس کو اپنی اجتماعی زندگیوں پر نافذ کریں، وہی اجتہاد دراصل قانون ہے اور اس سے مختلف اجتہادات کی حیثیت ایک فتوے یا رائے کی سی ہے ــــ [۵] اجماع ــــ جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، جس میں ایک لفظ کی کمی بیشی خارج از امکان ہے، تو اس دعویٰ کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ صحابہ کرام نے بیک زبان یہ متفقہ شہادت دی کہ یہی قرآن انہوں نے حرف بحرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ گویا، قرآن جس پر ہمارے دین کی بنیاد ہے، ہمیں صحابہ کرام کے اجماع سے ملا ہے۔ اسی طرح سنت کو ہم اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام نے متفقہ طور پر اپنے بعد میں آنے والوں کے سامنے یہ گواہی دی کہ انھوں نے ساری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

یہی طرزِ عمل اپناتے دیکھا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اسی کا حکم دیا ہے۔ گویا، سنت بھی ہمیں صحابہ کرام کے اجماع سے ملی ہے —— چنانچہ جب کہا جاتا ہے کہ اجماع حجت ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن وسنت ہمیں اجماع صحابہ سے ملے ہیں، اس لیے یہ حجت ہیں۔ سلف کے ہاں اجماع کا یہی مفہوم تھا۔ ظاہر ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے اجماع یقیناً حجت ہے اور اسی پر دین کا دارومدار ہے —— لیکن بعد میں خلف کے ہاں اجماع کو کچھ اور معنوں میں بھی استعمال کیا جانے لگا، جس کے معنی یہ تھے کہ اگر کسی معاملے میں کسی ایک تعبیر پر ایک خاص وقت میں تمام اہل علم متفق ہو جائیں تو وہ اجماع بن جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا لفظ ''جمہور'' کا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں اہل علم کی اکثریت ایک خاص رائے پر متفق ہوتی تھی، تو اسے جمہور کی رائے کہا جاتا تھا —— اجماع کے اس مفہوم کو ہم نے بہت سادہ انداز میں بیان کر دیا ہے، ورنہ اجماع کی تعریف میں بہت زیادہ اختلاف واقع ہوا ہے۔ اسی لیے اس مسئلے میں ہمیں فقہ کی کتابوں میں بہت سی اصطلاحات ملتی ہیں، مثلاً اجماع واقعی، اجماع ذاتی، اجماع عقلی، اجماع اجتہادی، اجماع قولی، اجماع سکوتی وغیرہ۔ [ڈاکٹر محمد فاروق خان، صدر دانش سرا پاکستان نائب صدر المورد جناب غامدی صاحب کے معتمد خاص جو دانش سرا کے ذریعے فکر غامدی کی تبلیغ و تشہیر کے ذمہ دار تھے یہ اقتباسات ان کی کتاب اکیسویں صدی اور پاکستان، ص ۲۵۴ تا ۲۶۱، سن ۱۹۹۶ء، المورد، لاہور سے لیے گئے ہیں واضح رہے کہ یہ کتاب پہلے محمد صلاح الدین مدیر تکبیر نے مطبوعات تکبیر کے تحت شائع کی تھی کتاب میں اس کا حوالہ درج نہیں ہے اسے اشاعت اول ظاہر کیا گیا ہے میزان کی اشاعت سے پہلے غامدی صاحب کی فکر اسلام کیا ہے؟ کے نام سے پیش کی گئی تھی میزان اسی کا چربہ ہے اس کے مرتب ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب تھے] —— [۴۱] مغرب کی تہذیب مسیحی علم کلام کا ثمر ہے ۱۱/ اکتوبر ۱۹۹۸ء کے زندگی میں غامدی صاحب کا انٹرویو شائع ہوا جو بعد میں افضال ریحان کی کتاب مغربی تہذیب بمقابلہ اسلامی تہذیب ۲۰۰۴ء دار التذکیر میں ص ۳۱ تا ۶۹ پر شائع ہوا اس انٹرویو میں مغرب اور اس ثمرات اور اس سے معاملات کے حوالے سے غامدی صاحب کے خیالات درج ذیل ہیں:

مغربی تہذیب اپنی اخلاقی اساسات کے لحاظ سے مسیحی علم الکلام سے پیدا ہوئی ہے یہ سچا علم کلام ہے۔ ہمیں موحد بن کر مغرب سے بات کرنی چاہیے یعنی جو چیز ہمارے اور ان کے درمیان مشترک

ہے [ص ۳۱] اہل مغرب خدا، پیغمبروں، آخرت اور مذہب کو ماننے والے لوگ ہیں اس فکر پر اب ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ [ص ۳۲] آزادی وہاں بحثیت قدر کے مانی جا چکی ہے [ص ۳۳] مسلمانوں نے ہزار برس تک جو کچھ کیا ہے مغرب اس کو ابھی تک چھو بھی نہیں سکا ہے [ص ۴۶] عدل کرو یہ تقویٰ کے قریب ہے یہ ہے ہمارا بین الاقوامی قانون جو ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے بالعموم اس کی پابندی کی [ص ۴۸] مغرب جو باتیں آج کہہ رہا ہے وہ ہم نے چودہ سو برس پہلے کہہ دیں عمل کی دنیا میں مغرب بہت بلند ہے اور ہم بہت پست [ص ۴۹] قرآن انسانی آزادی اور فلاح کے لیے آیا ہے [ص ۵۲] ویزہ، پاسپورٹ ہم نے نہیں مغرب نے پیدا کیا [ص ۶۱] مغرب نے نیشنل ازم کی مذمت نہیں کی [ص ۶۲] مغربی تہذیب انسانی تمدن کے ارتقاء ہی کی ایک منزل ہے انسانی تمدن کے مسائل کے حل کے لیے مغربی تہذیب نے بہت کچھ اثاثہ جمع کر لیا ہے۔ [ص ۶۲] ہر وہ تہذیب اسلامی ہے جو وحدت الٰہ وحدت آدم اور عمل سے ابدی امکانات کی قائل ہو [ص ۶۴] مغرب سے ہمارا تعلق داعی اور مدعو کا ہونا چاہیے [ص ۶۸] اس انٹرویو کے بعد حضرت والا کا ارتقاء ہو گیا لہٰذا اب مغرب کے بارے میں ان کے خیالات مقامات ۲۰۰۶ء میں پڑھیے:

[۴۲] مغرب یاجوج ماجوج ہے: ۲۰۰۶ء تک غامدی صاحب کا مغرب کے بارے میں اصولی نقطۂ نظر یہ تھا کہ مغرب یاجوج ماجوج ہے دیوار برلن ٹوٹ گئی غامدی صاحب نے صحف سماوی اور تاریخ سے اس مضمون میں ثابت کیا ہے کہ اب امریکہ روس میں ہے اور روس امریکہ میں ــــ یاجوج ماجوج نوح کے تیسرے بیٹے یافث کی اولاد ہیں ــــ ان کا وطن سوادروس ہے قدیم زمانے میں یہی لوگ یوروپ میں آباد ہوئے پھر امریکا آسٹریلیا پہنچے اور اب دنیا کے سارے پھاٹک ان کے قبضے میں ہیں ــــ مغرب فیضان ابلیس ہے وہ تہذیب جو اس سورج سے نمایاں ہوئی ایک آنکھ سے اندھی ہے یہ دجال ہے اس کے پاس دھواں اور دابۃ الارض ہے اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے کہ وہ کافر ہے سو وقت قریب آ لگا ہے اٹھو اپنے رب کی طرف دوڑو دجال شہر عزیز میں پہنچ رہا ہے یہ شاید تمہاری آخری جنگ ہے جو تمہیں اس جنت کے لیے زمین پر لڑنی ہے اٹھو اور اس کے لیے تیار ہو جاؤ سوچو کہ تمہیں اس جنگ میں کھونا ہی کیا ہے بس یہ دنیا جس کے کھو دینے سے ہی تمہیں وہ دنیا [جنت] ملے گی۔ [مقامات، ۲۰۰۶ء، ص ۹۳، ۹۴] ــــ مغرب کے فساد ذہن وقلب کے بارے میں غامدی صاحب لکھتے ہیں ''اس عالم کا عقدہ کسی مابعد الطبیعیاتی اساس کے بغیر

بھی کھل سکتا ہے اور انسان کا مسئلہ خود اس کے بنانے والے کی رہنمائی کے بغیر بھی حل ہوسکتا ہے یہی اصول ہے جس پر مغرب میں فلسفہ سائنس دوسرے علوم وفنون کا ارتقاء پچھلی دو صدیوں میں ہوا ہے اور جسے ابھی تک مغربی فکر میں اصل اصول کی حیثیت حاصل ہے مغرب کی فکر کا بنیادی مقدمہ اس انکار پر ہی استوار ہے یہ کارخانہ عالم بغیر کسی خالق کے وجود میں آتا ہے انسان اس میں اپنی تقدیر خود بناتا خود بگاڑتا ہے انسان کی تاریخ اس میں انسان سے شروع ہوتی اور انسان ہی پر ختم ہوتی ہے ذات خداوندی کے لیے اس میں نہ ابتداء میں کوئی جگہ ہے نہ انتہا میں انسان ہی ابتداء وہی انتہا اور وہی ظاہر و باطن ہے [مقامات ۲۰۰۶ء، ۱۴۱، ۱۴۲، محولہ بالا] اس کے بعد حضرت والا کا پھر ارتقاء ہوگیا اور مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء سے یاجوج ماجوج کا مضمون ہی خارج کر دیا گیا کیونکہ اب یاجوج ماجوج سے مصالحت مفاہمت اشتراک عمل اور محبت وتعلق کا عہد شروع ہوگیا ہے —— پہلے مغرب کو دعوت دینے کا حکم دیا جارہا تھا اب امت مسلمہ کو مغرب سے آخری جنگ لڑنے اس کو کافر سمجھ کر اس سے ٹکرانے اور اس دنیا کی زندگی کو کھو کر شہادت حاصل کر کے اُس دنیا [آخرت] کی زندگی کے حصول کا حکم دیا جارہا ہے اور دونوں موقف درست بھی ہیں یہ کیسے ممکن ہے؟ —— عزل ونصب کے عنوان سے میزان ۲۰۰۸ء میں غامدی صاحب کا تازہ موقف یہ ہے ''تاریخ بتاتی ہے کہ پہلے حام اور سام کی اولاد اس کے لیے منتخب کی گئی اور پچھلے پانچ سو سال سے اب یافث کی اولاد منتخب کی گئی ہے یہ آخری اقوام ہیں جن پر تاریخ کا خاتمہ ہورہا ہے قرآن کا ارشاد ہے کہ اس کے بعد قیامت برپا ہوجائے گی وَاِنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا نَحۡنُ مُهۡلِكُوۡهَا قَبۡلَ يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ اَوۡ مُعَذِّبُوۡهَا عَذَابًا شَدِيۡدًا كَانَ ذٰلِكَ فِى الۡكِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا [۱۷:۵۸] غامدی صاحب کی یہ دلیل کسی نص کے بغیر ہے آخری اقوام کی تعریف کیا ہے؟ تاریخ کے خاتمے کی اطلاع کس نص سے مل رہی ہے؟ وقت قیامت انبیاء کو معلوم نہیں تو ایک امتی قیامت کا وقت کیسے متعین کرسکتا ہے؟ وہ میزان میں مسلم کی حدیث ان تلد الامۃ ربتھا وان تری الحفاۃ العراۃ العالہ کے حوالے سے لکھتے ہیں ''ان میں سے دوسری علامت تو بالکل واضح ہے پہلی علامت سے مراد ایک ادارے کی حیثیت سے غلامی کا خاتمہ ہے یہ دونوں واقعات ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں اس لحاظ سے یہ پیشن گوئی قرب قیامت کا زمانہ بالکل متعین کردیتی ہے [ص ۱۷۶، میزان ۲۰۰۸ء] غلامی ختم ہوئی ہے یا سرمایہ داری نے کارپوریٹ غلامی [corporate slavry] کی بدترین شکل ایجاد کرلی ہے ہر انسان ہر وقت سرمایے کا غلام ہے سرمایہ کی پرستش کررہا ہے سرمایہ کے بازار سے چوبیس

گھنٹے رابطے میں ہے اس کی زندگی کا ہر حصہ موبائل، انٹرنیٹ، ذرائع ابلاغیات و برقیات اور ٹی وی کے ذریعے چوبیس گھنٹے مارکیٹ کے دائرے میں ہے وہ اپنی خوابگاہ میں بھی اشتہارات کے ذریعے مارکیٹ سے منسلک ہے وہ مارکیٹ سرمائے نوکری اور خواہشات کی خدائی کے لیے شب و روز سرمائے کی دائمی غلامی میں مشغول ہے اسے آزادی سمجھنا غامدی صاحب کا مغربی فلسفے اور سرمایہ دارانہ نظام سے عدم واقفیت کا ثبوت ہے یہ درست ہے کہ انسان بہ ظاہر زنجیروں میں جکڑا ہوا نہیں ہے لیکن مغرب نے انسان کو خواہشوں اور سرمایہ کی ایسی غیر مرئی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے جو انسان کو نظر نہیں آتیں مغرب نے ابلاغی انقلاب کے ذریعے ایک ایسا طلسم کدہ عجائبات تیار کر دیا ہے کہ انسان سرمایہ کی غلامی کی زنجیریں خود پہننے پر آمادا ہے آزادی کے نام پر انسان کی زندگی کے ہر دائرے کو غلامی میں داخل کر دیا گیا ہے سٹلائٹ، انٹر نیٹ، کیمرے، خفیہ کیمرے، خفیہ Chips، کے ذریعے شب و روز انسانوں کی نگرانی کی جارہی ہے انسان اپنی خوابگاہ میں بھی آزاد نہیں ہے Penoptikon Society ایجاد کر دی گئی ہے اس معاشرے کا جبر اس کی غلامی اس کا تسلط اس قدر زبردست ہے کہ انسان اس سے اوپر نہیں اٹھ سکتا اسے محسوس بھی نہیں کر سکتا اس جبر سے آزاد ہونے کا تصور کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا اس جبر کی تفصیل فوکالٹ کی کتاب Discipline and punishment میں پڑھی جا سکتی ہے — چونکہ دائمی غلامی کی بدترین شکل وجود میں آ گئی لہٰذا قیامت کے فوراً آنے کا امکان غامدی صاحب کے اصول کی روشنی میں موخر ہو سکتا ہے — قرآن بتاتا ہے کہ قیامت کا زمانہ کوئی متعین نہیں کر سکتا غامدی صاحب کا کمال ہے کہ اسے بھی اپنے فہم سے متعین فرما دیا ہے اس کی مزید دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلم کی حدیث ان الساعۃ لاتکون حتیٰ تکون عشر آیات میں جن دس نشانیوں کا ذکر ہے اس میں والدخان دھواں سے مراد کوئی بڑا ایٹمی انفجار ہو سکتا ہے یاجوج ماجوج کا خروج یہ شروع ہو چکا ہے اور اب بتدریج نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہا ہے [ص ۱۷۷، میزان ۲۰۰۸ء] اگر قیامت سر پر آ چکی ہے تو مغرب سے مکالمے اور دعوت کا وقت تو گزر چکا اگر مغرب یاجوج ماجوج ہے اور وہ بتدریج عروج کی طرف بڑھ رہا ہے تو اب شرعی فریضہ کیا ہے؟ قیامت سر پر کھڑی ہے تو مغرب کو خوش کرنے کے لیے دین کی نئی تشریح و تشکیل وجدید کی کیا ضرورت ہے قیامت کبریٰ سے پہلے امت پر قیامت صغریٰ وارد کرنے کی جلدی کیوں ہے؟ مغرب اگر یاجوج ماجوج ہے اور آپ پر واضح ہو چکا ہے تو آپ مغرب کے خلاف جہاد کرنے کے

بجائے اس امت کی علمی روایت، اس کی تاریخ کے خلاف جہاد کیوں کر رہے ہیں جب قیامت آ ہی گئی ہے تو آیات جہاد آیات استخلاف فی الارض اور غلبہ دین کی حکمت عملی کی توضیح وتشریح کی کیا ضرورت ہے؟ اگر امت ان اصطلاحات کی غلط سلط تشریح کرتی رہی تو کرنے دیجیے ان کی صحیح تشریح کرنے کے باوجود اب دعوت کا وقت تو ختم ہو گیا ہے قرآن وسنت سے یاجوج و ماجوج کو دعوت دینے کا حکم کہیں نہیں ملتا تو پھر غامدی صاحب بار بار مغرب کو دعوت دینے کی دعوت امت کو کیوں دے رہے ہیں؟ اس دعوت کا اصل راز کیا ہے؟

میرے محترم جناب غامدی صاحب کی خدمت میں ان دلائل کے بعد ان کی ہی ایک عبارت ادب کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

''لیکن حق بہرحال حق ہے اور اس کی حمیت کا تقاضا یہی ہے کہ اسے ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا کیے بغیر برملا ظاہر کر دیا جائے۔ ہم میں سے ہر شخص کو ایک دن اس عدالت میں پیش ہونا ہے جہاں ہمارے وجود کا باطن ہمارے ظاہر سے زیادہ برہنہ ہو گا اور خود ہمارا وجود بھی صاف انکار کر دے گا کہ وہ اسے چھپائے۔ ہماری زبان اس روز بھی معنی ومفہوم کو لفظوں کا جامہ پہنا سکے گی، لیکن اس دن یہ جامہ کسی معنی کو چھپانے کی صلاحیت سے محروم ہو جائے گا۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں اس روز بھی ہمارے وجود کا حصہ ہوں گے، لیکن ہمارے ہر حکم کی تعمیل سے قاصر ہو جائیں گے۔ حقیقت اپنی آخری حد تک بے نقاب ہو جائے گی اور ہم میں سے کوئی شخص اس روز اسے کسی تاویل اور توجیہ کے پردوں میں چھپا نہ سکے گا۔ اس سے پہلے کہ انتہائی عجز اور انتہائی بے بسی کا یہ عالم ہمارے لیے پیدا ہو جائے، بہتر یہی ہے کہ ہم حق اور صرف حق کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیں۔ وما توفیقنا الا باللّٰہ''۔ [ص ۳۳، برہان ۱۹۹۲ء] —

غامدی صاحب دین کے بارے میں ۱۹۶۶ء سے غور وفکر میں مصروف ہیں۔ ان کی کتاب مقامات کے مطابق — تفقہ فی الدین کے اس رویے کو امت میں عام کرنے کے لیے انہوں نے نومبر ۱۹۷۰ء میں منڈی مرید کے میں ''دارالاشراق'' کے نام سے ایک اکیڈمی قائم کی جو ۱۹۷۸ء میں وسائل کی عدم فراہمی کے باعث بند ہو گئی [ص ۳۶، ۳۷، مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء] اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے انہوں نے دائرۃ الفکر کے نام سے ادارہ قائم کیا [ص ۲۹، مقامات، محولہ بالا] — ماہنامہ ''خیال'' شائع کرنے کا ارادہ کیا [ص ۲۹ محولہ بالا] — اسلامی انقلاب کے لیے دارالعلوم الحمراء کے قیام کا ارادہ کیا

تا کہ جماعت اسلامی میں جو خامی رہ گئی اسے دور کیا جائے اس دار العلوم سے نکلنے والے تحریک کی قیادت سنبھالیں [ص ۳۰ محولہ بالا] مجلّہ ''الحمراء'' شائع کیا جو اغلاط کے باعث ضائع کر دیا گیا [ص ۳۰، ۳۱ محولہ بالا] —— ۱۹۷۱ء میں چودھری محمد انور اور سید بدر بخاری کے تعاون سے ۷ جولائی کو حلقہ درس قائم کر کے تحریک کا باقاعدہ نظم بدر بخاری کی امارت میں قائم کر دیا گیا لیکن چند مہینوں کے اندر یہ نظم اور تنظیم ختم کر دی گئی [ص ۳۱، ۳۲ محولہ بالا] —— مارچ ۱۹۷۳ء میں دار الفکر سے ایک مجلّہ اشرق کے نام سے چھاپا [ص ۳۲ محولہ بالا] —— بعض دوستوں کو دائرۃ الفکر کا نام پسند نہیں آیا تو اس ادارے کے لیے ''دار الاشراق'' کا نام اختیار کیا گیا [ص ۳۳ محولہ بالا] —— واضح رہے کہ اسی کتاب کے ص ۳۶ پر درج ہے کہ ۱۹۷۰ء میں منڈی مرید کے میں دار الاشراق کے نام سے اکیڈیمی قائم کی گئی جو ۱۹۷۸ء تک چلتی رہی —— ۱۹۷۳ء میں ہی مولانا مودودی کی خدمت میں غامدی صاحب اکثر استفادے کے لیے حاضر ہوتے [ص ۳۳ محولہ بالا] —— ایک ملاقات میں اپنے کام کا ذکر ہوا ان سے سرپرستی کی درخواست کی ازراہ عنایت مولانا نے غامدی صاحب کی درخواست قبول کر لی [ص ۳۳ محولہ بالا] —— مودودی صاحب کی ہدایت کے مطابق مجوزہ ادارے کے لیے غامدی صاحب اور مولانا کے نام سے مشترک اکاؤنٹ اچھرہ حبیب بینک میں کھولا گیا مولانا اپنی جیب سے ایک ہزار روپے ماہانہ جمع کراتے تھے مولانا کے گھر کے پاس انہی کی دی ہوئی عمارت اب ا۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ میں ہم منتقل ہو گئے [ص ۳۳ محولہ بالا] —— مولانا کے ایما سے میں جماعت اسلامی کا رکن بن چکا تھا [ص ۳۴ محولہ بالا] جماعت سے اختلافات اور گھر خالی کرانے کے حکم کے بعد چودھری الیاس کی دعوت پر لاہور کے قریب ان کے گاؤ مرید کے میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا ۱۹۷۶ء کے آخر میں ہم یہاں پہنچے [ص ۳۴ محولہ بالا] مقامات کے ص ۳۶، ۳۷ پر درج ہے کہ نومبر ۱۹۷۰ء میں منڈی مرید کے میں دار الاشراق کے نام سے غامدی صاحب کی ادارت میں اکیڈیمی قائم ہو چکی تھی —— [ص ۳۶، ۳۷، مقامات ۲۰۰۸ء] ۱۹۷۹ء میں اشراق کا ڈیکلریشن مستنصر میر کے نام پر مل گیا اور اشراق نکلنے لگا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۷۹ء کو شائع ہوا [ص ۳۶، ۳۹ محولہ بالا] اشراق دو شماروں کے بعد مستنصر میر سے اختلاف کے باعث بند کرنا پڑا [ص ۳۹ محولہ بالا] فرخ فاؤنڈیشن کے نام سے ایک ادارہ بنا دیا گیا۔ مجلّہ ''الاعلام'' کے شائع کرنے کا فیصلہ ہوا [ص ۴۰ محولہ بالا] لیکن یہ رسالہ بھی زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا [اس رسالے میں شائع ہونے والے مضامین میزان حصہ اول کے نام سے ۱۹۸۵ء

میں شائع ہو گئے تھے اس کتاب میں غامدی صاحب نے استاذ امام اصلاحی کو اپنے دلائل اور موقف کے حق میں اپنے مضامین کی کسی سطر میں حوالے کے طور پر پیش نہیں کیا — استاد فراہی کا ذکر بھی کہیں نہیں ہے ہر مضمون غامدی صاحب کے اپنے ہی دلائل سے مزین ہے حتیٰ کہ رجم کی بحث میں بھی امام اصلاحی کا ذکر نہیں ہے رجم کی سزا پر غامدی صاحب کچھ نہیں لکھ سکے تو امام اصلاحی کی تفسیر تدبر سے ایک مضمون رجم کی سزا، اہم مباحث کے عنوان سے ص ۱۰۷ پر درج کر کے لکھ دیا ''مجھے اس سے پورا اتفاق ہے'' دیت اور شہادت کے مضمون میں ''معروف بحیثیت ماخذ قانون'' کی بحث صفحہ ۲۱۶ پر آئی تو امام اصلاحی کی کتاب اسلامی قانون کا اقتباس پیش فرما دیا اس کے سوا پوری کتاب حضرت والا کے داخل سے مسلسل پھوٹتے ہوئے تخلیقی سوتوں کی نشان دہی کرتی ہے علم انہی سے شروع ہوتا ہے اور انہی پر ختم ہوتا ہے لیکن بعد میں میزان ۲۰۰۲ء اور میزان ۲۰۰۸ء میں ہر دو صفحات کے بعد امام اصلاحی کے حوالوں سے طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے کسی علمی کتاب میں اس طرح کے اور ایک ہی فرد کے طویل اور مسلسل حوالوں کی کوئی روایت نہیں ملتی] — میزان حصہ اول میں رجم کی سزا اہم مباحث کے زیر عنوان تین مضامین غامدی صاحب کے قلم سے ہیں — غامدی صاحب کے قلم سے یہ مضامین ''اعلام'' میں شائع ہوئے تو علماء نے ان پر اعتراض کیا جس پر محمد صدیق صاحب نے خط لکھ کر غامدی صاحب کو متوجہ کیا ان کا خط ص ۶۷ پر درج ہے سوال: رجم کی سزا کے بارے میں آپ کے جو مضامین ''الاعلام'' میں شائع ہوئے ہیں ان میں 'محصنات' کے معنی سے متعلق آپ کے مباحث پر کوئی تبصرہ تو علمائے کرام ہی فرما سکتے ہیں؛ تاہم آپ کے ان مضامین سے یہ بات واضح ہے کہ آپ کو رجم کے بارے میں فقہاء کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ یہ محض شادی شدہ زانی کی سزا ہے، آپ کے اس نقطۂ نظر کی تردید میں بہت سی تحریریں شائع ہوئی ہیں جن میں جناب حافظ صلاح الدین یوسف مدیر الاعتصام کی کتاب حد رجم کی شرعی حیثیت، بالخصوص قابل ذکر ہے، آپ نے اگر 'محصنات' کے بارے میں بعض لوگوں کے استدلال کی تنقید سے بحث کا آغاز کر ہی دیا ہے تو اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں علماء کے ان اعتراضات کا جواب بھی آپ کو دینا چاہیے جو ان تحریروں میں بیان ہوئے ہیں جن کا حوالہ میں نے اوپر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مناسب ہوگا کہ پہلے آپ اس بحث کو واضح کریں کہ سنت اور قرآن کا باہمی تعلق کیا ہے اور سنت کیا قرآنِ مجید کے احکام میں کوئی تبدیلی کر سکتی ہے ؟ [جاوید غامدی، ص ۶۷، میزان، حصہ اول، ۱۹۸۵ء] — ان مضامین کا امام اصلاحی کے دفاع سے کوئی

تعلق نہیں ان مضامین میں کہیں امام اصلاحی کا ایک سطری حوالہ بھی نہیں ہے تینوں مضامین الاعتصام لاہور مولوی رفیق چودھری کی کتاب ''حد رجم'' اور ابو شعیب صفدر اور احمد سعید کاظمی کے اعتراضات کے جواب میں لکھے گئے تھے ان کا اصلاحی صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے ایک مضمون میں ضمناً احمد سعید کاظمی صاحب نے اصلاحی صاحب پر ایک سطری اعتراض کیا ہے تو اس کا دو سطری جواب غامدی صاحب نے دیا ہے لیکن مضامین کے متن میں اصلاحی صاحب کا کہیں ذکر تک نہیں ہے ـــــ

اس خط کے جواب میں انہوں نے جو تین مضامین حد رجم کے تحت لکھے وہ مباحث پہلے الاعلام پھر میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء اور اب برہان ۲۰۰۶ء میں یہی مضامین میزان حصہ اول سے لے کر شائع کر دیے گئے ہیں لیکن اب ''برہان ۲۰۰۶ء'' میں ان مضامین کے شروع میں لکھا گیا ہے ''یہ مضامین ان تنقیدوں کے جواب میں لکھے گئے ہیں جو رجم کی سزا کے بارے میں استاد امام اصلاحی کے اس موقف پر ہوئی ہیں جو انہوں نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں بیان کیا ہے [برہان ص ۳۵، ۲۰۰۶ء، المورد، لاہور] یہ صریحاً کذب بیانی ہے ان مضامین کا اصلاحی صاحب کے دفاع سے کوئی تعلق نہیں ـــــ

یہ غامدی صاحب کے علمی سفر کی وہ سرگزشت ہے جو ان کے اپنے قلم سے ہے اس میں ہر لفظ ہر تاریخ اور ہر بیان ان کا اپنا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ۲۰ سال کی عمر میں وہ مرید کے میں اکیڈیمی قائم کر چکے تھے واضح رہے کہ ۱۹۹۰ء میں ان کی عمر چالیس سال ہو رہی تھی [ص ۲۷ مقامات محولہ بالا] لہٰذا اس بیان کی روشنی میں ان کی عمر ۱۹۷۰ء میں خود بیس سال متعین ہو جاتی ہیں حالانکہ مقامات کی بعض عبارتوں کی روشنی میں ان کی عمر ۱۹۷۰ء میں ۱۴ سال، ۱۶ سال اور ۱۷ سال بھی متعین ہوتی ہے ـــــ اسی کتاب میں ''ذوق و شوق'' کے عنوان سے وہ ایک بالکل نیا نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں جو اوپر بیان کردہ خیالات کی کامل تردید کرتا ہے۔ ''ڈاکٹر اسرار کے توسط سے اصلاحی صاحب کی لاہور آمد کی اطلاع ملی یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے میری طالب علمی کا دوسرا اسی سے شروع ہوا۔ یہ ۱۹۷۳ء کی ایک شام تھی اسی کے بعد یہ سلسلہ کم و بیش دس سال تک جاری رہا اس دوران اصلاحی صاحب نے خود بھی پڑھایا'' [ص ۲۵ مقامات] ـــــ اصلاحی صاحب سے ملاقات کے لیے روزانہ حاضر ہوتا پہلی مرتبہ شرح صدر ہوا کہ دین محض مان لینے کی چیز نہیں ہے اسے سمجھا اور سمجھایا بھی جا سکتا ہے یہ میرے لیے نئے قرآن کی دریافت تھی۔ میں نے عرض کیا میں آپ کے طریقے پر قرآن کا طالب علم بننا چاہتا ہوں [ص ۲۴، ۲۵ مقامات] ـــــ مولانا [اصلاحی] نے

فرمایا اس طریقے سے پڑھنا چاہتے ہو تو لیڈری کے خیالات ذہن سے نکال کر علم ونظر اور فکر و تدبر کے لیے گوشہ گیر ہونا پڑے گا [ص ۲۵ مقامات] ــــ ان کا ارشاد تھا کہ قلم اس وقت اٹھائیے جب کوئی نئی حقیقت سامنے آئے چنانچہ طالب علمی کے اس دور میں لکھنے کی ہمت کم ہی ہوئی [ص ۲۶، مقامات] ۷۳ سے ۸۳ تک غامدی صاحب کا طالب علمی کا دور ہے مگر اسی دور میں دارالعلوم الحمرا، مجلّہ خیال، اسلامی انقلاب کی قیادت کا خواب دیکھا جا رہا ہے اشراق، اعلام شائع ہو رہے ہیں، دارالاشراق، دارالفکر، دارالاشراق اکیڈیمی، سب قائم ہو رہے ہیں قلم مسلسل چل رہا ہے روزانہ نئی نئی حقیقتیں سامنے آ رہی ہیں لہٰذا قلم مسلسل حرکت میں ہے اشراق اعلام ۱۹۸۰ء سے پہلے یعنی اصلاحی صاحب کے یہاں دور طالب علمی کے اختتام سے پہلے ہی نکل رہے تھے جس لیڈری سے استاذ اصلاحیؒ نے منع فرمایا وہ بھی بحمد للہ جاری و ساری ہے ۔کیا یہ استاد امام کی ہدایت کی پیروی ہے ان کے حکم سے انحراف یا اس کا انکار یا حضرت والا کا تفرد یا اجتہاد یا خطاء وہ لکھتے ہیں ــــ ۱۹۸۳ء میں تعلیم کا یہ مرحلہ ختم ہوا تو میرے معتقدات کی دنیا میں اضطراب پیدا ہو چکا تھا دین کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ [ص ۲۶] ــــ اس زمانے میں اگر کچھ لکھا بھی تو کسی ضرورت کے تحت [ص ۲۷ محولہ بالا] ــــ یہ دور اسی طرح گزر گیا یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء میں جا کر وہ زمین کہیں ہموار ہوئی جہاں نئی تعمیر کے لیے نیو ڈالی جائے زندگی کے چالیس سال پورے ہونے کو تھے فکر و خیال میں بڑی حد تک وضوح پیدا ہو چکا تھا اور نقشہ کار بھی واضح تھا [ص ۲۷ مقامات] ــــ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۳ء تک ان کا طالب علمی اور ۸۳ سے نوے تک تدبر و تفکر کا دور تھا لیکن اس سے پہلے حضرت والا جو کچھ کرتے رہے اسے کس شمار میں رکھا جائے ان فتوحات علمیہ کی حیثیت کیا سمجھی جائے؟ امین احسن اصلاحی کے بارے میں غامدی صاحب لکھتے ہیں میں نے امین احسن کو سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں دیکھا اور پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا میرے لیے اس وقت ان کا دروازہ درنکشودہ تھا لیکن میں نے ہمت کی اور اسی بند دروازے پر بیٹھ گیا پھر وہ دروازہ کھلا اور اس طرح کھلا کہ گویا اپنے ہی گھر کا دروازہ بن گیا [ص ۱۰۰ مقامات] لیکن ۱۹۷۳ء میں وہ مولانا مودودی سے بھی مستفید ہو رہے تھے ان کے ادارے معارف اسلامی میں مقیم تھے ایک ہزار ماہانہ وصول کر رہے تھے جماعت اسلامی کی رکنیت بھی قبول کر چکے تھے اگر اصلاحی صاحب کا دروازہ دیکھنے کے بعد انہوں نے کسی اور طرف دیکھنا پسند نہیں کیا تو ۱۹۷۳ء میں مولانا مودودی کے یہاں ۱-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور میں غامدی صاحب قیام فرما کیوں تھے؟ اور مولانا مودودی سے ۱۹۷۳ء تا

۱۹۷۶ء تک ایک ہزار روپے ماہانہ کیوں وصول کر رہے تھے اصلاحی صاحب اور مولانا مودودی میں بعد المشرقین تھا ایک آگ ایک پانی غامدی صاحب ان دونوں سے بیک وقت علمی استفادہ کیسے کر رہے تھے مقامات میں مودودی صاحب کی حکایت لذیذ کی حقیقت کیا ہے؟ یہ غامدی صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ عالم، مصلح اور داعی کو صاف گو اور دیانت دار ہونا چاہیے یہ اس کے منصب کا بنیادی تقاضہ ہے رسالت مآب کے علم کے جانشین کے لیے لازم ہے کہ وہ صادق و امین بھی ہو ہم نہایت ادب سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مقامات کے اکثر مباحث اور حوالے غامدی صاحب کی امانت و دیانت پر ہمارے یقین کو قدم قدم پر مجروح کرتے ہیں اگر اس جراحت کا کوئی دفاع وہ پیش کر سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

....

☆

یہ وہ خرابیاں ہیں جن کی اصلاح کے بغیر جمہوری نظام اگر اس ملک میں قائم ہو تو اس کے ایوان اقتدار میں ہر چیز داخل ہو سکتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اللہ کا دین کبھی داخل نہیں ہو سکتا چنانچہ غلبہ دین کے لیے اس نظام کی اصلاح بھی از بس ضروری [جاوید غامدی برہان، ص ۱۰۴، برہان ۱۹۹۲ء، دارالاشراق ،لاہور، تحریر، مارچ ۱۹۸۸ء]

ریاست کا نظام صرف ان مسلمانوں کی رائے و مشورے سے چلایا جائے جو نماز پر قائم رہیں [ص ۱۰۵، برہان ۱۹۹۲ء]

غامدی صاحب کی یہ آراء برہان ۱۹۹۲ء کے مضمون پس چہ باید کرد میں درج ہیں یہ مضمون مارچ ۱۹۸۸ء میں تحریر کیا گیا تھا مارچ ۱۹۹۳ء میں ان کا کتابچہ سیاست و معیشت کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں ''قانون سیاست'' کے تحت ان کا مضمون جو ۱۹۷۹ء کا تحریر کردہ ہے درج ہے یہ مضمون اب میزان میں قانون سیاست کے تحت شامل ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

ان اوصاف سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام حکومت اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک اعیانی نظام [ارسٹوکریسی] ہے جس کی اساس علم و تقویٰ اور تدبیر و سیاست کی صلاحیت پر قائم کی گئی

ہے۔[جاوید غامدی سیاست و معیشت، ص ۳۶۔۱۹۹۳ء دارالاشراق، لاہور]

طلباء کو جہاد و قتال کی تربیت دی جائے: مخلوط تعلیم کا سلسلہ بالکل بند کر دیا جائے اور طالب علموں کو ہمہ وقت مشغول تن رہنے کے مواقع فراہم کرنے کے بجائے جہاد و قتال کے لیے ضروری تربیت دی جائے۔[جاوید غامدی، برہان، ص ۸۳، ۱۹۹۲ء، لاہور]

نبیؐ اللہ کے رسول تھے قرآن مجید کا بیان ہے کہ آپ اپنی قوم یعنی بنی اسمٰعیل پر بہرحال غالب ہوں گے وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا، سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا [سورۂ فتح ۴۸:۲۲،۲۳] یا وہ اسلام قبول کریں گے یا ان سے جنگ ہوگی [۴۸:۱۶]، [۸:۳۹] ان سے وعدہ کیا گیا کہ اس جنگ کے نتیجے میں سرزمین عرب میں انہیں لازماً غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائے گا وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [سورۂ نور ۲۴:۵۵] یہ وعدہ اللہ نے نبیؐ کی زندگی میں ہی پورا کر دیا اور دین حق سرزمین عرب کے تمام ادیان پر غالب آ گیا۔[برہان ص ۱۱، ۱۹۹۲ء، محولہ بالا]

امیر کو اقتدار کے حصول کے بعد سمع و طاعت کی بیعت لینی چاہیے آپؐ کی سنت یہی ہے [۲۸، برہان ۱۹۹۲ء، محولہ بالا] لیکن لفظ جب جملہ بنتا ہے اور جملہ جب کسی کلام کا حصہ قرار پاتا اس کے لیے ایک سیاق و سباق وجود میں آ جاتا ہے تو اس میں ایک سے زیادہ معنیٰ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی [ص ۳۲، برہان ۱۹۹۲ء]

یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی جگہ ایک سے زیادہ مفاہیم کا کوئی احتمال باقی رہ جائے گا آدمی کی عربی خام ہو ادبی ذوق پست ہو تو یہ البتہ ممکن ہے۔[ص ۴۶، برہان ۱۹۹۲ء]

سنت صرف اس طریقے کو ہی نہیں کہتے جس کی ابتداء کوئی نبی کرے بلکہ نبی کی تصویب و تقریر کے نتیجے میں بھی سنت قائم ہوتی ہے اور اسلام نے اس طرح کے دوسرے طریقوں کو بھی اسی حیثیت سے باقی رکھا ہے [ص ۵۷، برہان ۱۹۹۲ء] اگر یہ دلیل درست ہے تو تمام انبیاء کی سنتوں کو صرف سنت ابراہیمی

کیوں کہا جائے انہیں سنن انبیاء سے کیوں موسوم نہ کیا جائے قرآن نے انبیاء کی سنن کو حضرت ابراہیم سے مختص نہیں کیا۔

اس دین کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے قرآن مجید کے بعد دوسرا ماخذ حدیث وسنت ہے یہ حصہ تواتر عملی سے ملا ہے دین میں یہی دو چیزیں اصل حجت ہیں [ص ۴۷، برہان ۱۹۹۲ء]

قرآن کے مطابق نماز فرض ہے روزہ حج اور زکوٰۃ فرض ہے سنت کی فہرست میں عبادات کے تحت زکوٰۃ، حج، روزہ اور نماز شامل ہے یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج سنت ہے [ص ۱۴ میزان ۲۰۰۸ء] سنت رسوم و آداب کا بھی نام ہے [ص ۶۴۱، میزان ۲۰۰۸ء] سنت کی ایک قسم سنن فطرت بھی ہے۔ [ص ۶۴۳، میزان ۲۰۰۸ء] سنت تہوار بھی ہیں کیونکہ عید الفطر اور عید الضحیٰ تہوار ہیں نماز عیدین تہوار ہے۔ [ص ۶۴۸، میزان ۲۰۰۸ء] رسوم و آداب کا مقصد تزکیہ ہے [میزان، ص ۶۴۱، ۲۰۰۸ء]

....

..............................File:Bushra/Khalid Bhai.inp ....

[۱] جہاد و قتال کی تربیت تعلیمی اداروں میں دی جائے: مخلوط تعلیم کا سلسلہ بالکل بند کر دیا جائے اور طالب علموں کو ہمہ وقت مشغول تن رہنے کے مواقع فراہم کرنے کے بجائے جہاد و قتال کے لیے ضروری تربیت دی جائے [برہان ص ۱۹۹۲۸۳ء دارالاشراق لاہور] مسجدوں کی اصلاح کا طریقہ سنت کا دائرہ ہے: مسجدوں کے بگاڑ کی اصلاح یقیناً اس سنت کے زندہ کرنے سے ہی ہوسکتی ہے کہ نماز جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت امیر ریاست اور اس کے عمال ہی کریں گے دوسرا شخص اس مقصد کے لیے منبر پر کھڑا ہوگا تو ان کی اجازت سے ان کے قائم مقام کی حیثیت سے کھڑا ہوگا حکمران اپنے اعمال کی وجہ سے لوگوں کے روبرو کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے تو انہوں نے مسجد کا منبر کو خود علماء کے سپرد کر دیا اس کے نتیجے میں مذہب اپنے جلال اور سیاست اپنے جمال سے محروم ہوگئی [ص ۸۳۔۸۴ برہان ۱۹۹۲ محولہ بالا] —— ذرائع ابلاغ بھی سنت کے دائرے میں آتے ہیں: حقائق، دعوت، علم، خبر، تخلیقی صلاحیت اور فنی مہارت یہی وہ چیزیں ہیں جن کو ایک دوسرے تک پہنچانے کا اہتمام بنی آدمؑ نے ہمیشہ کیا۔ اس زمانے میں بھی ہمارے اخبارات، رسائل، ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن شب و روز اسی اہتمام میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر

چیز کسی نہ کسی پہلو سے انسان کی ضرورت ہے اور قرآن وسنت نے بھی ان میں سے کسی چیز کو علی الاطلاق ناجائز قرار نہیں دیا بلکہ ان میں بعض چیزوں کا ابلاغ تو ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے قرآن وسنت نے اس معاملے میں مرد و عورت میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی اگر صرف قرآن وسنت کو فقہی لٹریچر سے قطع نظر کر کے پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان میں کوئی چیز اس ابلاغ میں کسی طرح مانع نہیں [برہان ص ۹۲ ۔ ۱۹۹۲ء دار الاشراق لاہور]—— سر پر اوڑھنی لینا قرآن کا صریح حکم ہے: وہ قرآن مجید کی صریح ہدایت کے مطابق سر کی اوڑھنی سے اپنا سینہ ڈھانپ کر اور زیب و زینت کی نمائش کیے بغیر کم کم ہی سامنے آتی ہے [برہان ص ۹۳ محولہ بالا] تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت جو سیاسی جماعتیں ہمارے اس ملک میں موجود ہیں ان میں سے بیشتر کے لیے اسلامی ریاست کے نظام میں فی الواقع کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی [برہان ص ۹۸ محولہ بالا] حقیقت خواہ اسے عقل نے دریافت کیا ہو یا وحی والہام کے ذریعے سے انسان کو ملی ہو ہر حال میں اور ہر شخص کے لیے حقیقت ہے [برہان ص ۹۸ محولہ بالا]—— جمہوریت بھی سنت کے دائرے میں آتی ہے: قرآن وسنت کے ان ضوابط سے یہ بات صاف ثابت ہوتی ہے کہ جمہوریت کا اصل جوہر اسلام میں یقیناً موجود ہے [برہان ص ۱۰۲ محولہ بالا]—— غلبۂ دین مسلمانوں کی ذمہ داری ہے: خرابیوں کی اصلاح کے بغیر جمہوری نظام اگر اس ملک میں قائم ہو تو اس کے ایوان اقتدار میں ہر چیز داخل ہو سکتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اللہ کا دین کبھی داخل نہیں ہو سکتا چنانچہ غلبۂ دین کے لیے اس نظام کی اصلاح ضروری ہے [برہان ص ۱۰۴ محولہ بالا]—— قرآن اور سنت کا منشاء فرد واحد متعین نہیں کر سکتا: قرآن وسنت کی تعبیر کے لیے دینی علوم کے ماہرین کی مجلس قائم کی جائے جو ہماری حیات اجتماعی کے تمام معاملات کے بارے میں نہ صرف قرآن وسنت کا منشاء متعین کرے بنیادی اصول وضع کرے اور وہ حدود متعین کر دے جن سے ہم ایک مسلمان کی حیثیت سے کبھی باہر نہیں نکل سکتے [برہان ص ۱۰۴ محولہ بالا]

صرف پنج وقتہ نمازی اور زکوٰۃ دینے والا ووٹ دے سکتا ہے: ریاست کا نظام صرف ان مسلمانوں کی رائے اور مشورے سے چلایا جائے جو نماز پر قائم رہیں زکوٰۃ ادا کریں [برہان ص ۱۰۵ محولہ بالا]—— غامدی صاحب کی یہ دلیل سورۂ توبہ کی آیت پانچ پر مبنی ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَ

اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [۹:۵] تو یہ نماز زکوۃ کا اہتمام کرنے والوں کا راستہ چھوڑ دو ریاست اسلامی شہرت کے یہ دو بنیادی لوازم ہیں لیکن میزان ۲۰۰۸ء میں غامدی صاحب کا ارتقاء ہوگیا امیر کی امارت مشورے سے منعقد ہو مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں، ہر شخص کی رائے اس کے وجود کا جزو بنے اجتماعی معاملات میں حاکم مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی رائے کو رد کرنے کا اختیار نہیں رکھتا [ص ۴۹۵، میزان، ۲۰۰۸ء] اسلامی ریاست میں کفار یہود عیسائی بھی برابر کے شہری ہوں گے کیوں کہ ''اس باب میں ہمارے لیے بہترین نمونہ وہ عہد ہے جو میثاق مدینہ کے نام سے معروف ہے مدینہ میں رسولؐ کا اقتدار تسلیم کرنے کے بعد یہود مسلمانوں ہی کی طرح کا ایک مستقل گروہ ہیں لہٰذا ان کے حقوق اب وہی ہوں گے جو یثرت کی اس ریاست میں اس کے مسلمان شہریوں کو حاصل ہیں۔ [ص ۴۹۳، میزان، ۲۰۰۸ء] پہلے صرف نمازی زکاتی ووٹ دیتے، رائے دینے کا حقدار تھا اب غیر نمازی، غیر مسلم، کافر، اہل کتاب سب ووٹ دینے کے اہل ہوگئے پہلی رائے بھی قرآن سے مستنبط تھی اب موجودہ رائے بھی قرآن سے مستفاد ہے 'چت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی' قانون سیاست کے تحت میزان میں غامدی صاحب لکھتے ہیں جہاد وقتال کے لیے جبری بھرتی کا قانون ریاست نہیں بنا سکتی [ص ۴۹۳] اس کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ہے جس کے حصول کا جذبہ ہر شخص میں ہونا چاہیے لیکن اس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے یہ ان فرائض میں سے نہیں ہے جنھیں پورا نہ کیا جائے تو آدمی مجرم قرار پائے [ص ۵۸۶، میزان، ۲۰۰۸ء] مگر قانون جہاد کی بحث میں حضرت والا کا حسب معمول ارتقاء ہوگیا۔'' جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا صرف اس صورت میں جرم ہے جب کوئی مسلمان کفیر عام کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے یعنی ارباب حل وعقد ہر مسلمان کو جہاد کے لیے طلب کرلیں [ص ۵۸۶، میزان، قانون جہاد، ۲۰۰۸ء] ریاست کا سربراہ کیا مسلمان ہے جب روزہ حج اور جہاد جیسی عبادت کے لیے ریاست کا حاکم کسی فرد کو مجبور نہیں کرسکتا تو حکمران کو عام آدمی کے معیار زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنے کا اصول کس نص سے اخذ کیا گیا ہے کیا حکمران کی زندگی روزہ حج اور جہاد سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے؟

حکمران کا معیار زندگی عام آدمی کے برابر ہو: ارباب اقتدار کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ اپنے رہن سہن کا معیار ایک عام شہری سے بڑھ کر نہ رکھیں [برہان ص ۱۰۵] میزان میں فرماتے ہیں کہ

ریاست کسی فرد پر نماز اور زکوٰۃ کے سوا کسی دینی معاملے میں جبر نہیں کر سکتی — ریاست کا ہر فرد نماز اور زکوٰۃ کے سوا مذہبی امور میں آزاد ہے چاہے تو کرے چاہے تو نہ کرے۔ حتیٰ کہ روزہ، حج جہاد کے لیے بھی حکومت مجبور نہیں کر سکتی مگر حکمران کو شریعت مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنے رہن سہن کا معیار ایک عام شہری سے بڑھ کر نہ رکھے مامور مجبور ہے اور مخلوق آمر ہے یہ شریعت کی عجیب توجیہہ ہے۔ غامدی صاحب کے اصل الفاظ پڑھیے۔

ریاست نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کسی چیز کو بھی قانون کی طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتی، روزہ رکھنے کا حکم نہیں دے سکتی صاحبِ استطاعت کو حج پر مجبور نہیں کر سکتی، جہاد و قتال کے لیے جبری بھرتی کا قانون نہیں بنا سکتی۔ ان سب امور میں وہ ترغیب تلقین، تبلیغ و تعلیم کے ذریعہ اصلاح کی جدوجہد کر سکتی ہے یہ مسلمانوں کے حقوق ہیں [۵ میزان ص۴۹۲۔۴۹۳، طبع ہو۲۰۰] ریاست کا سربراہ کیا مسلمان نہیں ہے جب روزہ حج اور جہاد جیسی عبادت کے لیے ریاست کا حاکم کسی فرد کو مجبور نہیں کر سکتا تو حکمران کو عام آدمی کے معیار زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنے کا اصول کس نص سے اخذ کیا گیا ہے کیا حکمران کی زندگی روزہ حج اور جہاد سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے؟

ریاست کے تمام فیصلے اجماع و اتفاق یا اکثریت کی رائے سے طے پائیں گے امیر ریاست اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی رائے کو رد نہیں کر سکتا [میزان، ص۴۹۵۔ ۲۰۰۸] کیا اجماع، اتفاق اور کثرت رائے مترادف اصطلاحات ہیں؟ اسلام کی اصطلاح میں اجماع علماء کا ہوتا ہے عوام کا نہیں۔

انسانوں کی اکثریت فطرت کے مطابق چلتی ہے اسی لیے قرآن نے حلال و حرام کی جامع فہرست مرتب نہیں کی یہ غامدی صاحب کی میزان میں دلیل ہے — تو سوال یہ ہے کہ سورہ نساء کی آیات ۲۳۔۲۴ میں عورتوں کی حلت و حرمت کی تفصیلی فہرست کیوں پیش کی گئی ہے؟ خود غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ جن عورتوں سے نکاح ممنوع قرار دیا گیا ہے ان کے بارے میں فطرتِ انسانی کا فتویٰ ازل سے یہی ہے کہ ان کے ساتھ زن و شوہر کا تعلق صریح بے حیائی ہے۔ وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ‌ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقۡتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا [۴:۲۲] کلام کی تمہید علت حکم کا یہ بیان علت جامعہ کی حیثیت سے ہوا ہے [میزان، حصہ اول، ص ۱۱۵ ۱۹۸۵ء، دارالاشراق، ۱۷۹، بی، ابوبکر بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور]

میاں بیوی ایک دوسرے کے ماں باپ سے رشتۂ مناکحت قائم نہیں کر سکتے یہ حرام ہے خواہ بیوی مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ — زوجین میں نکاح کا تعلق قائم رہے یا کسی وجہ سے ٹوٹ جائے صہری رشتوں میں یہ حرمت تقدیر ابدی ہے — بیٹے کے لیے باپ کی منکوحہ سوتیلی ماں حرام ہے خواہ محض عقد ہی ہوا ہو۔ لیکن بیٹی کے لیے ماں کا شوہر اتنے تقدس کا حامل نہیں قرآن مجید نے اسی فرق کی بناء پر غیر مدخولہ کی بیٹی سے اس کی ماں سے علیحدگی کے بعد نکاح کر لینے کی اجازت دی ہے اس ایک استثناء کے سوا زوجین کی اولاد کی حرمت بھی ان کے ماں باپ کی طرح بہر حال ابدی ہے۔ بیوی اپنے شوہر اور شوہر اپنی بیوی کی اولاد سے کسی صورت میں نکاح نہیں کر سکتا۔ [میزان حصّہ اوّل ص ۱۱۸ ۱۹۸۵ء] اگر فطرت انسانی حلال وحرام عورتوں میں فرق کر سکتی تھی تو ایران میں بہن کے ساتھ نکاح کیوں حلال تھا؟ محرمات کے ساتھ نکاح بہت سے ملکوں میں ہوتے تھے مغرب میں Incest Relations عصر حاضر میں عام بات ہے آخری کیوں؟

مصاہرت کے رشتوں کا تقدس بھی فطرت انسانی کے لیے واضح ہے اس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں باپ کے لیے بہو، شوہر کے لیے بیوی کی ماں، بیٹی، خالہ، پھوپھی۔ بھانجی اور بھتیجی سب حرام ہیں۔ تاہم یہ رشتے چونکہ بیوی اور شوہر کی وساطت سے قائم ہوتے ہیں۔ اور اس سے ایک نوعیت کا ضعف ان میں پیدا ہو جاتا ہے اس لیے قرآن نے یہ تین شرطیں ان پر عائد کر دی ہیں ۱— بیٹی صرف اس بیوی کی حرام ہے جس سے خلوت ہو جائے ۲— بیوی کی حرمت کے لیے بیٹے کا صلبی ہونا ضروری ہے ۳— بہو کی بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی کی حرمت اس حالت کے ساتھ خاص ہے جب میاں بیوی میں نکاح کا رشتہ قائم ہو — [مصاہرت میزان ۴۱۴۔ ۴۱۵، ۲۰۰۸ء] سوال یہ ہے کہ بیوی کی بہن، خالہ، بھانجی، بھتیجی سے نکاح بیوی کو طلاق دینے کے بعد کیا جا سکتا ہے تو بیوی کی ماں سے نکاح طلاق کے بعد بھی کیوں ناجائز ہے؟ بیوی کو خلوت سے پہلے طلاق دے دی جائے تو اس کی بیٹی سے نکاح جائز ہو جاتا ہے لیکن خلوت کے بعد طلاق دی جائے تو بیوی اور اس کی بیٹی بھی حرام ہو جاتی ہے — غامدی صاحب نے پہلے میزان حصّہ اوّل ۱۹۸۵ میں اسے استثناء کہا تھا اب میزان ۲۰۰۸ء میں اسے شرط قرار دیا —

بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کی دلیل عقلی کیا ہے ؟ جس امر کی دلیل عقلی میسّر نہیں ہوتی تو اعتراض سے بچنے کے لیے اسے استثناء کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ یہ شارع کا حکم ہے جس کی حکمت غامدی صاحب جیسے منطقی اور فلسفی بھی نہیں سمجھ سکتے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ انسان عقل کے بجائے نقل پر ایمان لائے وہ ایمان جو دلیل عقلی پر منحصر ہے آخر کار وہ ایمان ماہرین علوم، اکابرین فنون کی موشگافیوں کے سپرد ہو جاتا ہے نقل کی بارگاہ میں جب تک عقل سرنگوں نہ ہو اسے ایمان کی دولت، لذت، حلاوت نعمت میسر نہیں آسکتی سورۂ رحمان میں آتا ہے یخرج منھما اللولو والمرجان عام مثال کے کے مطابق موتی صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں لیکن قرآن بالکل صریح ہے کہ یہ دونوں ہی پانیوں سے نکلتے ہیں۔ ایک مفسر قرآن نے دنیا بھر کے ماہرین فنون سے استفادہ کیا تو سب کا مشترکہ جواب یہی تھا کہ کھارے پانی سے ہی ان کی تخلیق مشاہدے میں آئی ہے —— اگر ذہن عقلی منطقی ہو تو پھر عقل کے مقابلے میں نقل کو رد کر کے آیت الٰہی رد کرے گا یا اس کی ایسی تاویل پیش کرے گا جو عقل سے قریب ہو جائے خواہ آیت کا اصل فہم یا روح زخمی ہو جائے یہی عہدِ حاضر کا عمومی علمی مزاج ہے لیکن اس مفسر قرآن نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر موتی خود آ کر مجھے بھی کہیں کہ وہ صرف کھاری پانی سے ہی نکلتے ہیں تو میں ان سے کہہ دوں گا کہ تمہیں اپنی تخلیق میں شبہ ہوا ہے قرآن کا بیان کبھی غلط نہیں ہو سکتا احکمات شرعیہ کی عقلی تعبیر ہمہ وقت پیش کرنا ممکن نہیں شارع کے حکم کے آگے سر جھکانا ایمان کا تقاضہ ہے لہٰذا سپردگی کا مطلب یہی ہے کہ انسان اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے بارگاہِ رب العزت میں سرِ نیاز جھکا دے —— عقلی منطقی دلیلیں کبھی کبھی، کہیں کہیں چل جاتی ہیں لیکن دین کے ہر حکم کو عقلی موشگافیوں سے سلجھانا محال ہے غامدی صاحب فطرت کو ماخذ شریعت قرار دینے کے باعث اس غلطی کا شکار ہوئے ماخذ شریعت فطرت، عقل، منطق فلسفہ نہیں ماخذ شریعت شارع ہے اس نے جو کرنے کا حکم دیا ہے وہ کرنا ہے جس سے منع کر دیا ہے اس سے رک جانا ہی ایمان کا تقاضہ ہے۔ دینی اور فقہی امور میں متعلقہ علوم کے ماہرین فنون سے مشورہ میں کوئی ہرج نہیں لیکن یہ صرف مشورہ ہے —— کسی رائے تک پہنچنے کے لیے تبادلۂ خیالات ہے مشورہ سے کچھ اخذ واستنباط کیا جاسکتا ہے مشورہ قبول بھی ہو سکتا ہے رد بھی —— فقیہ ماہرین علم کے مشورے کو سو فی صد درست ماننے کا مکلّف نہیں لیکن عصرِ حاضر میں بعض راسخ العقیدہ فقہا اور غامدی صاحب جیسے جدیدیت پسند فضلاء متعلقہ شعبوں کے ماہرین علوم کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں ان کی سائنسی آراء کو حتمی تصور کر رہے

ہیں جو خطرناک رجحان ہے جو نقل پر ایمان کو کم زور کر کے عقل پر ایمان کو مستحکم کر دے گا۔ انھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ سائنس کا کوئی نتیجہ حتمی قطعی نہیں ممکنہ سچ Probable Truth ہوتا ہے اور صرف اس وقت تک کے لیے سچ ہوتا ہے جب تک اسے جھوٹا False نہ ثابت کر دیا جائے یعنی اس کا سچ ہونا صرف عارضی ہے اور صرف اس لیے کہ اس کو باطل ثابت نہیں کیا جا سکا ــــ

غامدی صاحب کے امام ــــ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں ''پردے کے متعلق فراہی نے لکھا ہے کہ سورۂ نور میں گھر کا پردہ ہے اور سورۂ احزاب میں باہر کا پردہ مسلسل غور و فکر کے بعد کہیں جا کر اس اشارے کو سمجھا اور پردے کے متعلق اپنی بحث کو اسی بنیاد پر پھیلایا [شرف الدین اصلاحی ذکر فراہی ص ۸۶۸ ۲۰۰۲ دار التذکیر لاہور] غامدی صاحب ۱۹۹۵ تک اصلاحی اور فراہی صاحب کی اتباع میں اس نقطۂ نظر کے قائل تھے مگر ۲۰۰۳ میں اچانک ارتقاء ہو گیا۔ میزان میں سورۂ احزاب کی آیات ۵۸ تا ۶۱ کی شرح میں لکھتے ہیں یہ کوئی پردے کا حکم نہ تھا بلکہ مسلمان عورتوں کے لیے الگ شناخت قائم کر دینے کی ایک وقتی تدبیر تھی یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا، وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا [۳۳:۳۲۔۳۳] سورۂ احزاب کی آیت ازواج مطہرات کے لیے خاص ہیں عام مسلمان مردوں عورتوں سے ان روایات کا اگرچہ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن بعض اہلِ علم چونکہ ان کی تعمیم کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان کی صحیح نوعیت بھی یہاں واضح کر دی جائے [۴۷۰ تا ۴۷۲ میزان ۲۰۰۸] وہ ازواج مطہرات جو امت کی مائیں ہیں جن سے نکاح حرام ہے ان کے لیے مردوں سے اپنے بیٹوں سے پردہ لازم ہے عام عورتوں کو مردوں اور نامحرموں کے سامنے بے حجابی کی کامل آزادی حاصل ہے مدینے سے اوباش، منافق، مشرکین اشرار شر پسند سب سورہ توبہ کے بعد ختم ہو گئے اہلِ کتاب ذمی بن کر رہ گئے اس کے باوجود اُس پاک سرزمین پر صرف نبیؐ کی بیویوں کو یہ حکم عام مستقل بنیاد پر دیا جا رہا ہے کہ وہ کسی مرد سے نرمی و تواضع سے بات نہ کریں اپنے مقام و مرتبہ کی حفاظت کے لیے گھروں میں ٹک کر رہیں زمانہ جاہلیت کی زیب و زینت کی نمائش کرتے ہوئے باہر نکلنا جائز نہیں ہے گھروں میں رہ کر شب و روز نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کریں مجبوری سے باہر نکلنا پڑے تو اسلامی تہذیب کا بہترین نمونہ بن کر نکلیں [میزان ۴۷۳

۲۳۸] لیکن غامدی صاحب کے مطابق یہ تمام احکامات روایات پابندیاں صرف اور صرف ازواج مطہرات کے لیے ہی کیوں ہیں؟ اس کے سوا تمام مسلمان عورتیں [جن سے ہر مسلمان کا نکاح جائز ہے اور حرام نہیں ہے اور نہ وہ ہر مسلمان کی ماں ہیں] زمانہ جاہلیت کی سج دھج دِکھا کر نکل سکتی ہیں مردوں سے تواضع ونرمی سے بات کر سکتی ہیں گھروں میں ٹِک کر رہنے کی پابند نہیں نہ اسلامی تہذیب کا بہترین نمونہ بن کر نکلنے پر مجبور ہیں انہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگنے کی ضرورت نہیں مرد کے سامنے آ کر مانگ سکتی ہیں۔ صرف ازدواج نبی پردے کے پیچھے سے مانگیں یہ دِلوں کی پاکیزگی کے لیے بہتر ہے —ورنہ ان کے دل پاکیزہ نہیں رہیں گے غامدی صاحب کو عام عورتوں کے ایمان وخشیت پر کتنا ایمان و یقین ہے اور ازواج مطہرات کے ایمان ویقین پر کتنی بے یقینی ہے لہٰذا ساری پابندیاں امہات المومنین پر ہیں جوامت کے ہر فرد پر حرام ہیں۔عقل جب مغرب کی منطق، تاریخ وفلسفے کے ذریعے ظہور کرتی تو ایسے ہی اشقلے چھوڑتی ہے۔ غامدی صاحب قانونِ سیاست کے تحت لکھتے ہیں کہ ریاست جہاد وقتال کے لیے جبری بھرتی کا قانون نہیں بنا سکتی [میزان، ص۴۹۲، ۲۰۰۸ء] اس کی نص انہوں نے بخاری کی ایک حدیث سے پیش کی ہے جو خطبہ حجۃ الوداع سے ماخوذ ہے۔''تمہاری جانیں، مال، آبروئیں تم پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح یوم النحر کی حرمت تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں (بخاری رقم ۶۷]— [ص۴۹۳ میزان ۲۰۰۸] لیکن اگر پارلیمنٹ اجماع یا کثرت رائے سے جبری بھرتی کا قانون بنادے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ کیونکہ غامدی صاحب فرماتے ہیں:

مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں حکمران مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی رائے کو رد نہیں کر سکتے [ص ۴۹۵ میزان ۲۰۰۸] اگر ریاست مسلمانوں کی اکثریت کے فیصلے سے ہر جہاد کو فرض کر دے تو کیا یہ شریعت سے تجاوز نہ ہوگا؟ جب رسالت مآبؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں مثبت قانون بنا دیا تو اس کی نفی کرتے ہوئے کیا پارلیمنٹ جہاد کے لیے جبری بھرتی کا قانون شرعاً بنا سکتا ہے۔

قانون جہاد کے تحت وہ ایک نئی رائے پیش فرماتے ہیں:

اوّل یہ کہ ظلم وعدوان کا وجود متحقق بھی ہو تو جہاد اس وقت تک فرض نہیں ہوتا جب تک دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کی حربی قوت ایک خاص حد تک نہ پہنچ جائے۔سابقین اولین کے استھ دوسرے لوگوں کی شمولیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ حد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں دو کے مقابلے میں

ایک مقرر کردی تھی۔ بعد کے زمانوں میں یہ تو متصور نہیں ہوسکتا کہ یہ اس سے زیادہ ہوسکتی ہے، لہٰذا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاد وقتال کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنے اخلاقی وجود کو محکم رکھنے کی کوشش کریں، بلکہ اپنی حربی قوت بھی اس درجے تک لازماً بڑھائیں جس کا حکم قرآن نے زمانۂ رسالت کے مسلمانوں کو اس وقت کی صورت حال کے لحاظ سے دیا تھا وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ [الانفال ۸:۶۰]

دوم یہ کہ جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا صرف اس صورت میں جرم ہے جب کوئی مسلمان نفیر عام [یعنی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ارباب حل وعقد ہر مسلمانوں کو جہاد کے لیے طلب کرلیں] کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے۔ اس وقت یہ بے شک نفاق جیسا بڑا جرم بن جاتا ہے۔ یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ہے جس کے حصول کا جذبہ ہر شخص میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے، یہ ان فرائض میں سے نہیں ہے جنھیں پورا نہ کیا جائے تو آدمی مجرم قرار پائے۔ [میزان، ص ۵۸۶، ۲۰۰۸ء]

غامدی صاحب ۱۹۹۳ء میں برہان میں لکھتے ہیں کہ ''طالب علموں کو جہاد وقتال کی تربیت دی جائے [برہان ص ۸۳۔ ۱۹۹۲ء دارالاشراق لاہور] اب امت کو جہاد وقتال سے روکنے کی دعوت دی جارہی ہے۔

۱۹۹۶ء میں قانون دعوت کے تحت دعوت کی تیسری صورت سورۂ بقرہ کی آیت لتکونو شھدا علی الناس اور سورۂ نساء کی آیت رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا [۴:۱۶۵] کے حوالے سے لکھتے ہیں ''دعوت کی اس صورت کے لیے پیغمبر کی نیابت اس امت کو بحیثیت امت منتقل ہوئی ہے وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ سعلب عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ [۲:۱۴۳]، وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ

اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰہِیۡمَ ہُوَ سَمّٰىکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَ فِیۡ ہٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰہِ ہُوَ مَوۡلٰىکُمۡ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَ نِعۡمَ النَّصِیۡرُ [۲۲:۷۸]، کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ لَوۡ اٰمَنَ اَہۡلُ الۡکِتٰبِ لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ مِنۡہُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ اَکۡثَرُہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ [۳:۱۱۰] یہ صرف امت کے لیے ممکن ہے کہ رسول کے بعد دنیا کی قوموں کے لیے اس کا وجود زمین پر دین کی شہادت بن جائے اس کا طریقہ قرآن مجید نے آیات میں بتایا ہے کہ یہ امت، امت وسط، خیر امت، امت مسلمہ اور ملتِ ابراہیمی بن کر کھڑی ہو جائے اس شہادت کے لیے حکم قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر اس طرح بیان ہوا ہے۔ وَمَنۡ اَحۡسَنُ دِیۡنًا مِّمَّنۡ اَسۡلَمَ وَجۡہَہٗ لِلّٰہِ وَ ہُوَ مُحۡسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا وَ اتَّخَذَ اللّٰہُ اِبۡرٰہِیۡمَ خَلِیۡلًا [۴:۱۲۵]، یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی وَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ [۵:۸] یہ امت اپنے وجود میں اس طرح حق کی گواہی بن کر دنیا کی قوموں

کو اسلام کی دعوت دے یہ درحقیقت ایک فریضۂ رسالت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس امت پر عائد کیا ہے [قانون دعوت ۱۵ تا ۱۸۔ ۱۹۹۶ء المورد لاہور] میزان ۲۰۰۸ء میں امت سے یہ فریضہ ساقط ہو گیا اور ان آیات کا مطلب وہ نہ رہا جو ۱۹۹۶ء میں تھا قرآن کی آیات کے معنی ایک ہی ہوتے ہیں ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے یہ فلسفہ بھی اپنی لحد میں خود ہی اتر گیا — ہمارے ارباب اختیار کو یہ سعادت [ملک کے نظام پر دین حق کو غالب کرنے کی) حاصل ہو گی تو کیا عجب کہ یہ امت اپنے دور اوّل ہی کی طرح ایک مرتبہ پھر اس کرّۂ ارض پر خدائی گواہ بن کر کھڑی ہو جائے اور خدا کی بادشاہی جو آسمان پر قائم ہے وہ ان کے ذریعے سے خدا کی اس زمین پر بھی قائم ہو جائے [البرہان ۱۱۰ محولہ بالا، ۱۹۹۲ء]

میزان ۲۰۰۸ء میں غامدی صاحب مسلم کی حدیث فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

انسان کا یہی دائرۂ اختیار ہے جس کے بارے میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اگر اس میں کوئی منکر دیکھیں تو اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کا ارشاد ہے ترجمہ: ''تم میں سے کوئی شخص [اپنے دائرۂ اختیار میں] کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ ہاتھ سے اس کا ازالہ کرے۔ پھر اگر اس کی

ہمت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے"۔ [مسلم، رقم ۱۷۷]

ان لم یستطع، کے الفاظ یہاں اس استطاعت کے لیے استعمال نہیں ہوئے جو آدمی کو کسی چیز کا مکلّف ٹھہراتی ہے، بلکہ اس حوصلے کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں جو ایمان کی قوت اور کمزوری سے کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کے اختیار میں اس کا پہلا کام یہی ہے کہ خود دین ہی کی کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو قوت سے منکر کو مٹا دے، زبان سے روکنے کا درجہ اس دائرے میں دوسرا ہے اور دل کی نفرت وہ آخری درجہ ہے کہ آدمی اگر اس پر بھی قائم نہ رہا تو اس کے معنی پھر یہی ہیں کہ ایمان کا کوئی ذرہ بھی اس کے دل میں باقی نہیں رہ گیا۔

قرآن کی روشنی میں روایت پر غور کیا جائے تو اس کی صحیح تاویل یہی ہو سکتی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے شوہر، باپ، حکمران سب اس روایت کی رو سے اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں اسی کے مکلّف ہیں کہ منکر کو قوت سے مٹا دیں، اس سے کم کوئی صورت بھی وہ اختیار کریں گے، بے شک، ضعف ایمان کی علامت ہے۔ لیکن اس دائرے سے باہر اس طرح کے اقدام ہیں بلکہ بدترین فساد ہے جس کے لیے دین میں ہرگز کوئی گنجائش ثابت نہیں کی جا سکتی۔ [ص ۵۵۹، میزان ۲۰۰۸ء]

لیکن میزان میں وہ اسلامی ریاست کا فریضہ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [۳:۱۰۴] صرف یہ بتاتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے حکمران کا کام اپنے اندر سے —— "اور چاہیے کہ تمہارے اندر سے کچھ لوگ مقرر ہوں جو نیکی دعوت دیں، بھلائی کی تلقین کریں اور برائی سے روکتے رہیں۔ [تم یہ اہتمام کرو] اور [یاد رکھو کہ جو یہ کریں گے]، وہی فلاح پائیں گے"۔

آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی حیثیت میں نہیں بلکہ اجتماعی حیثیت میں اس کے مخاطب ہیں، لہٰذا یہ حکم ارباب اقتدار سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو اگر کسی خطۂ ارض میں سیاسی خودمختاری حاصل ہو جائے تو اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو اس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائیں، برائی سے روکیں اور بھلائی کی تلقین کریں۔

یہ ذمہ داری، ظاہر ہے کہ بعض معاملات میں تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اور بعض معاملات

میں قانون کی طاقت سے پوری کی جائے گی۔ پہلی صورت کے لیے جمعہ کا منبر ہے جو اسی مقصد سے ارباب حل وعقد کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ دوسری صورت کے لیے پولیس کا محکمہ ہے جو مسلمانوں کی ریاست میں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا جاتا اور اپنے لیے متعین کردہ حدود کے مطابق اس کام کو انجام دینے کے لیے ہمہ وقت سرگرم عمل رہتا ہے۔

ریاست کی دعوت اور معروف ومنکر کے قابلِ اطلاق حصّے کو وہ صرف پولیس کے جبر سے مشروط کرتے ہیں زکوٰۃ اور نماز کے سوا ریاست کسی معاملے میں لوگوں پر کوئی جبر نہیں کرسکتی ریاست کے ذکر میں وہ دانستہ فوج کا ذکر نہیں کرتے ظاہر ہے پولیس فوج کشی نہیں کرسکتی لہٰذا اسلامی ریاست کا کام صرف اپنی جغرافیائی حدود میں صرف اور صرف مسلمانوں کی اصلاح رہ جاتا ہے اور پولیس کے جبر کا استعمال بھی صرف حدود سرقہ میں اور نماز وزکوٰۃ میں کیا جاسکتا ہے۔ اگر نماز وزکوٰۃ کا لوگ انکار کردیں تب بھی ان کے خلاف فوج کشی غامدی صاحب کے مذہب میں جائز نہیں ہے صرف پولیس کے ذریعے گرفتاریوں تک معاملات پہنچائے جاسکتے ہیں پولس فوج کا متبادل نہیں ہوسکتی اگر کوئی گروہ بغاوت کردے نماز زکوٰۃ سے انکار کردے تو ریاست اس بغاوت پر کیسے قابو پائے اس باب میں انہوں نے خاموشی اختیار کی ہے جہاد کے بارے میں ان کی یہ مداہنت، بے پروائی، مجہولیت بلاوجہ نہیں —— اس کے تاریخی اسباب ہیں یہ دین کا وہ تصور ہے جو پروفیسر آرنلڈ کی کتاب ''دی پریچنگ آف اسلام'' کے ذریعے پیدا کیا گیا تھا۔

امین احسن اصلاحی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: امام حمید الدین فراہی آرنلڈ کے شاگرد تھے علی گڑھ کا حلقہ ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب دعوت اسلام کا بڑا مداح تھا لیکن مولانا اس کتاب کے سخت مخالف تھے وہ فرماتے تھے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے اندر روحِ جہاد ختم کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ [امین احسن اصلاحی مصنف کے مختصر حالاتِ زندگی مجموعۂ تفسیر فراہی مترجم امین احسن اصلاحی، ص ۱۳۔ ۱۹۳۷ء انجمن خدام القرآن لاہور] لطف کی بات یہ ہے کہ میزان ۲۰۰۲ء میں وہ قانون سیاست کا تحت فوج کا ذکر کرتے ہیں۔

افسوس کہ میزان اسی روح جہاد کے خاتمے کی عملی تفسیر ہے اور مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ اصلاحی اور فراہی کے خانوادۂ علمی کے روئے ارض پر اب واحد چشم و چراغ ہیں۔

گیارہ اکتوبر ۱۹۹۸ء کے ہفت روزہ زندگی میں غامدی صاحب کا انٹرویو شائع ہوا تو اس میں مغربی اقدار حریت اور آزادی کے حق میں زبردست قسم کے علمی وعقلی دلائل دیے گئے —— اس کے بھی بہت سے فوائد ہیں آزادی اور حریت کو وہاں ایک قدر کی حیثیت حاصل ہورہی ہے آپ اپنے مذہب کو جس طرح چاہیں وہاں پیش کر سکتے ہیں یہ تعصّبات وہاں کم ہوگئے ہیں [ص ۳۲] میں سمجھتا ہوں کہ مغرب میں سائنس اور سائنسی فکر کے فروغ نے حریت اور آزادی کے قدر اختیار کر جانے نے بہت سے لوگوں کے ذہن کھول دیے ہیں اب ہمیں اپنی بات سلیقے سے سمجھانی چاہیے [ص ۳۳] جی ہاں حریت اور آزادی کی اس فضاء میں اب مغرب میں مذہبی جبر اور تشدد کا زمانہ نہیں رہا وہاں کسی آدمی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر کوئی مارنے نہیں دوڑتا [ص ۳۳] سوال یہ ہے کہ محض آزادی اور حریت کے بل پر انسانیت جمع ہوسکتی ہے مغربی تہذیب کے اس پہلو کا میں خود بڑا مداح ہوں اور میں اس کی تعریف بھی کرتا ہوں [ص ۳۶] —— اجتہاد ۵۸ —— معاذ بن جبل والی حدیث پہلے ۱۹۸۵ء اس میزان میں استعمال کی پھر ۱۹۹۸ میں ص ۵۸ پر انٹرویو پھر ۲۰۱۲ مئی کے اشراق میں —— یہاں قرآن وسنت سے کیا مراد ہے؟ سنت تو ۲۷ ہیں ان کا کیا تعلق ہے ان سے کیا جتہاد ہوسکتا ہے جہالت ہے۔

امیر معاویہ کی حکومت سے زیادہ بڑی رفاہی حکومت —— زیادہ بڑی آزادی اور حریت کی علم بردار حکومت میرے علم اور مطالعے کی حد تک نسلِ انسانی آج تک نہیں دیکھ سکی [ص ۴۳] —— یہ حضرت والا کا ارتقاء تھا کیونکہ اس سے پہلے مارچ ۱۹۹۸ء میں وہ کراچی تشریف لائے اور دانش سرا کراچی کے تحت ۱۹/ مارچ ۱۹۹۸ء سے ۲۸/ مارچ تک بہادر آباد کراچی میں دس روزہ محاضرات پیش کیے ان میں سے دو محاضرات ماہنامہ ساحل میں ۱۹۹۸ء شائع ہوچکے ہیں۔ غامدی صاحب کا موقف پڑھیے یہ موقف مارچ کی پہلی نشست میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بیان کیا گیا —— سوال: نظام مغرب نے بنائے اور بہت اچھے بنائے قدروں کے دعویدار ہم ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ بغیر اقدار والے مغرب نے اتنے اچھے نظام بنائے اور کامیاب ہوئے۔

جواب: میں اس امر میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں کہ انہوں نے بغیر قدروں کے نظام بنائے کبھی موقع ملا تو تفصیل سے عرض کروں گا کہ مغربی معاشروں کے بارے میں یہ ایک بالکل غلط تصور ہے کہ وہ اقدار پر مبنی معاشرہ نہیں ہے پہلے مرحلے میں وہاں مسیحی طرزِ فکر کی اقدار ہیں جو اس معاشرے

کے رگ وریشے میں رچی بسی ہیں اگر آپ ہٹلر اور مسولینی جیسے لوگوں کی سوانح پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مسیحی اقدار پر ان کے ایمان کا کیا عالم ہے اس کے بعد پھر وہاں Spritual Socialism کی پوری تحریک چلی۔ اس میں بعض نئی اقدار سامنے آئیں پھر یہ پچھلی ڈیڑھ صدی کے اندر بہت سی اقدار سامنے آئیں مثلاً حریت ہے آزادی ہے، پہلے یہ ایک قدر کے طور پر مستحکم ہوئی پھر یہ نظام کے طور پر سامنے آئی اقدار کے بغیر نظام نہیں بن سکتا۔ وہ لازماً اقدار پر مبنی ہوگا۔ آپ ان اقدار سے اختلاف کر سکتے ہیں مغرب نے کہا کہ بنیادی قدر انسان کے لیے حریت و آزادی ہے۔ اگر آپ اسے بنیادی قدر مان لیں تو اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے کچھ حدود ہیں مغرب نے کہا کہ بس اتنے حدود ہیں جس میں دوسرے کے امور میں مداخلت کا امکان پیدا نہ ہو اب اس سے ایک نقطۂ نظر تشکیل پایا۔ اس نقطۂ نظر کے تشکیل پانے کے نتیجے میں نظام بنانے کا مرحلہ آئے گا حریت کا تقاضا یہ ہے کہ خاندان نہ بننے دیا جائے کیونکہ خاندان حریت پر کچھ پابندیاں لگاتا ہے۔ جب خاندان بنے گا تو کچھ معاملات میں آپ کو باپ کا لحاظ کرنا پڑے گا کچھ امور میں ماں کا لحاظ کرنا پڑے گا۔ بیوی اور شوہر میں تعلقات کی نوعیت بھی طے کرنا پڑے گی کچھ امور میں ماں کا لحاظ کرنا پڑے گا۔ بیوی اور شوہر میں تعلقات کی نوعیت بھی طے کرنا پڑے گی کسی کو ذرا سی برتری دینا پڑے گی کسی کو اس کے ماتحت رکھنا پڑے گا اگر مطلق حریت کی بات کی جائے تو ان تمام چیزوں سے جان چھڑانی پڑے گی تو حریت کی قدر جب وجود میں آئی اور تشکیل پا کر نظام بن گئی تو اس کے ساتھ ہی مغرب میں خاندانی نظام کا انہدام شروع ہوگیا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ بغیر اقدار کے نظام بن جائے۔ حریت ایک قدر ہے مغربی معاشرے کا مطالعہ کریں اور فلسفیانہ طور پر ان سے پوچھیں کہ آپ کا نظام کس قدر پر مبنی ہے تو وہ کہیں گے کہ آزادی یہی وجہ ہے کہ ان کی سمجھ میں آپ کی بہت سی باتیں نہیں آ سکتیں اس لیے کہ وہ ان کی بنیادی قدر Basic Value سے ٹکراتی ہیں۔ اگر آپ بھی حریت کے مغربی تصور کو مان لیں تو آپ کو بہت سی چیزوں سے دستبردار ہونا پڑے گا پھر باپ کو حق نہیں ہونا چاہیے کہ وہ بچے کے بالغ ہونے کے بعد اسے گھر سے باہر جانے سے روک سکے یہ حریت کے اصول کے خلاف ہے

—— مارچ ۱۹۹۸ء کے محاضرے کے مطابق حریت اور آزادی خالص مغربی اقدار تھیں جن سے خاندانی نظام تحلیل ہو رہا تھا اکتوبر ۱۹۹۸ء میں آزادی اور حریت اسلامی اقدار بن گئیں اور حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت حریت اور آزادی کے ضمن میں دنیا کی سب سے بے مثال حکومت قرار پائی اس اختلاف رنگ و بو

کے بارے میں ہم جیسے خدام دین کیا عرض کریں۔

قرآن انسانی آزادی اور فلاح کے لیے آیا ہے [ص۵۲] میرا خیال ہے کہ مغربی تہذیب نے آزادی اور حریت کو اپنی بنیادی اقدار قرار دینے سے یہ سامان کرلیا ہے کہ وہ پوری طرح منہدم ہونے کے بجائے نیا قالب اختیار کرے [ص٦٦] دنیا میں امن سلامتی آزادی حریت اور بنی آدم کی وحدت ہماری اقدار ہیں [٦٧] خوارج کی حرکات کے مقابلے میں حضرت علیؓ کے تحمل صبر وضبط اور درگزر کی مثال دے کر غامدی صاحب کہتے ہیں ''میں نہیں جانتا آزادی اور حریت کی آخری انتہا اس سے آگے کون سی ہوسکتی ہے؟ [ص۴۲] میں تو کہتا ہوں کہ ایک ہزار سال تک [آزادی اور حریت] مسلمانوں کی یہ روایت رہی اس انحراف کی اکا دکا مثالیں ملتی ہیں [ص۴۳]

۵۹ اسلام نے شریعت دی ہے فقہ نہیں دی بہت مختصر قانون دیا ہے اس کے بعد باقی جو کچھ آپ نے کرنا ہے اپنی رائے اور عقل سے کرنا ہے [ص۵۹] جن معاملات کو عقل انسانی پر چھوڑا گیا تھا ان میں ہم اسلام کو لے آئے اور جن معاملات پر وحی کے ذریعے ہدایت دی گئی تھی ان پر عقل کو لے آئے [ص۵۹]—

....

یہ سرخ حصہ Bushra/Khalid Bhai.inp میں آ گیا ہے کریکشن کر کے

بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کی دلیل عقلی کیا ہے؟ دلیل عقلی میسّر نہیں ہوتی تو اسے استثناء کہا جاتا ہے حالانکہ یہ شارع کا حکم ہے جس کی حکمت غامدی صاحب جیسے منطقی اور فلسفی بھی نہیں سمجھ سکتے ایمان کا تقاضا بھی ہے کہ انسان عقل کے بجائے نقل پر ایمان لائے وہ ایمان جو دلیل عقلی پر منحصر ہے پھر وہ ماہرین علوم، اکابرین فنون کی موشگافیوں کے سپرد ہو جاتا ہے نقل کی بارگاہ میں جب تک عقل سرنگوں نہ ہو اسے ایمان کی دولت، لذت، حلاوت نعمت میسر نہیں آسکتی سورۂ رحمان میں آتا ہے یخرج منھما اللولو والمرجان عام مثال کے مطابق موتی صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں لیکن قرآن بالکل صریح ہے کہ یہ دونوں ہی پانیوں سے نکلتے ہیں۔ ایک مفسر قرآن نے دنیا بھر کے ماہرین فنون سے استفادہ کیا تو سب کا

مشترکہ جواب یہی تھا کہ کھارے پانی سے ہی ان کی تخلیق مشاہدے میں آئی ہے ___ اگر ذہین عقل ہو تو پھر نقل کو رد کر کے آیت رد کرے گا یا اس کی ایسی تاویل پیش کرے گا جو عقل سے قریب ہو جائے خواہ آیت کا اصل فہم یا روح زخمی ہو جائے یہی عہدِ حاضر کا عمومی علمی مزاج ہے لیکن اس مفسر قرآن نے جواب دیا کہ خدا کی قسم موتی خود آ کر مجھ سے کہیں کہ وہ صرف کھاری پانی سے ہی نکلتے ہیں تو میں ان سے کہہ دوں گا تمھیں اپنی تخلیق میں شبہ ہوا ہے قرآن کا بیان کبھی غلط نہیں ہو سکتا ___ دینی اور فقہی امور میں متعلقہ علوم کے ماہرین فنون سے مشورہ میں کوئی ہرج نہیں لیکن یہ صرف مشورہ ہے کسی رائے تک پہنچنے کے لیے تبادلۂ خیالات ہے مشورہ سے کچھ اخذ و انسباط کیا جا سکتا ہے مشورہ قبول بھی ہو سکتا ہے رد بھی — فقیہ ماہرین علم کے مشورے کو سو فی صد درست ماننے کا مکلّف نہیں لیکن عصرِ حاضر میں فقہا متعلقہ شعبوں کے ماہرین علوم کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں جو خطرناک رجحان ہے جو نقل پر ایمان کو کم زور کر کے عقل پر ایمان کو مستحکم کر دے گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں ''پردے کے متعلق فراہی نے لکھا ہے کہ سورۂ نور میں گھر کا پردہ ہے اور سورۂ احزاب میں باہر کا پردہ مسلسل غور و فکر کے بعد کہیں جا کر اس اشارے کو سمجھا اور پردے کے متعلق اپنی بحث کو اسی بنیاد پر پھیلایا [شرف الدین اصلاحی ذکر فراہی ص ۸۶۸ ۲۰۰۲ دارالتذکیر لاہور] غامدی صاحب ۱۹۹۵ تک اصلاحی اور فراہی صاحب کی اتباع میں اس نقطۂ نظر کے قائل تھے مگر ۲۰۰۳ اچانک ارتقاء ہو گیا۔ میزان میں سورۂ احزاب کی آیات ۶۱ تا ۳۳/۵۸ کی شرح میں لکھتے ہیں ''یہ کوئی پردے کا حکم نہ تھا بلکہ مسلمان عورتوں کے لیے الگ شناخت قائم کر دینے کی ایک وقتی تدبیر تھی سورۂ احزاب کی آیت ۳۳،۳۲،۳۳/۳۳ عربی لایئے ازواج مطہرات کے لیے خاص ہیں عام مسلمان مردوں عورتوں سے ان روایات کا اگر چہ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن بعض اہلِ علم چونکہ ان کی تقسیم کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان کی صحیح نوعیت بھی یہاں واضح کر دی جائے [۴۷۰ تا ۴۷۲ میزان ۲۰۰۸] وہ ازواج مطہرات جو امت کی مائیں ہیں جن سے نکاح حرام ہے مدینے سے اوباش، منافق، مشرکین اشرار شر پسند سب سورہ توبہ کے بعد ختم ہو گئے اہلِ کتب ذمی بن کر رہ گئے اس پاک سرزمین پر سرف نبی کی بیویوں کو یہ حکم عام مستقل بنیادی پر دیا جا رہا ہے کہ وہ کسی مرد سے نرمی و تواضع سے بات نہ کریں [ص ۴۷۱ میزان] اسے مقام و مرتبہ کی حفاظت کے لیے گھروں میں ٹِک کر رہیں زمانہ جاہلیت کی زیب و زینت کی نمائش

کرتے ہوئے باہر نکلنا جائز نہیں ہے گھروں میں رہ کر شب و روز نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کریں مجبوری سے باہر نکلنا پڑے تو اسلامی تہذیب کا بہترین نمانہ بن کر نکلیں [میزان ۳/۲۳۸۴۷] لیکن غامدی صاحب کے مطابق یہ تمام احکامات روایات پابندیاں صرف اور صرف ازواج مطہرات کے لیے ہیں اس کے سوا تمام مسلمان عورتیں [جن سے ہر مسلمان کا نکاح جائز ہے اور حرام نہیں ہے اور کہ وہ ہر مسلمان کی ماں ہیں] زمانہ جاہلیت کی سج دھج دِکھا کر نکل سکتی ہیں مردوں سے تواضع و نرمی سے بات کر سکتی ہیں گھروں میں ٹِک کر رہنے کی پابند نہیں نہ اسلامی تہذیب کا بہترین نمونہ بن کر نکلنے پر مجبور ہیں انہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگنے کی ضرورت نہیں مرد کے سامنے آ کر مانگ سکتی ہیں۔ بیویوں کی پاکیزگی کے لیے بہتر ہے صرف ازدواج نبی پردے کے پیچھے سے مانگیں۔

اس کے بھی بہت سے فوائد ہیں آزادی اور حریت کو وہاں ایک قدر کی حیثیت حاصل ہو رہی ہے آپ اپنے مذہب کو جس طرح چاہیں وہاں پیش کر سکتے ہیں یہ تعصّبات وہاں کم ہو گئے ہیں [ص ۳۲] میں سمجھتا ہوں کہ مغرب میں سائنس اور سائنسی فکر کے فروغ نے حریت اور آزادی کے قدر اختیار کر جانے نے بہت سے لوگوں کے ذہن کھول دیے ہیں اب ہمیں اپنی بات سلیقے سے سمجھانی چاہیے [ص ۳۳] جی ہاں حریت اور آزادی کی اس فضاء میں اب مغرب میں مذہبی جبر اور تشدد کا زمانہ نہیں رہا وہاں کسی آدمی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر کوئی مارنے نہیں دوڑتا [ص ۳۳] سوال یہ ہے کہ محض آزادی اور حریت کے بل پر انسانیت جمع ہو سکتی ہے مغربی تہذیب کے اس پہلو کا میں خود بڑا مداح ہوں اور میں اس کی تعریف بھی کرتا ہوں [ص ۳٦]

قرآن انسانی آزادی اور فلاح کے لیے آیا ہے [ص ۵۲]

میرا خیال ہے کہ مغربی تہذیب نے آزادی اور حریت کو اپنی بنیادی اقدار قرار دینے سے یہ سامان کر لیا ہے کہ وہ پوری طرح منہدم ہونے کے بجائے نیا قالب اختیار کرے [٦٦] دنیا میں امن سلامتی آزادی حریت اور بنی آدم کی وحدت ہماری اقدار ہیں [٦٧] وہ خوارج کی حرکات کے مقابلے میں حضرت علیؓ کے تحمل صبر و ضبط اور درگزر کی مثال دے کر غامدی صاحب کہتے ہیں ''میں نہیں جانتا آزادی اور حریت کی آخری انتہا اس سے آگے کون سی ہو سکتی ہے؟ [ص ۴۲] میں تو کہتا ہوں کہ ایک ہزار سال تک [آزادی اور حریت] مسلمانوں کی یہ روایت رہی اس انحراف کی اکا دکا مثالیں ملتی ہیں [ص ۴۳]

امیر معاویہ کی حکومت سے زیادہ بڑی رفاہی حکومت زیادہ بڑی آزادی اور حریت کی علم بردار حکومت میرے علم اور مطالعے کی حد تک نسلِ انسانی آج تک نہیں دیکھ سکی [ص ۴۳]

☆

عورت کا مقام گھر ہے ۵۱۶، عورتوں کو سینہ گریبان نہیں کھولنا چاہیے سر کھلا رہے ۴۶۷، پردے کا حکم نہ تھا الگ شناخت کی وقتی تدبیر تھی ۴۷۰، ۴۱۰ سنت قدیم ہوتی ہے، سالم کا واقعہ ۴۱۳، عورت کو جسمانی سزا دی جائے ۴۳۲، پھر...... میں ریاست آ گئی۔

سیاست میں ایک جمہوری معاشرہ نعمت کے طور پر ہے اور یہ میں مانتا ہوں اسلامی تاریخ میں جمہوری قدریں، سوچنے، بولنے، تنقید کرنے کی آزادی، پوری شان کے ساتھ موجود رہی بادشاہت اور جمہوری قدریں الگ چیز ہیں حکومت تبدیل کرنے کا حق عوام کو دیا جائے جمہوریت صرف اسی چیز کا نام نہیں ہے جمہوری اقدار کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو سوچنے کی آزادی ہو اختلافات کرنے کی آزادی ہو اور اپنی فکر پیش کرنے مناظرہ کرنے کی آزادی ہو اپنے مذہب پر قائم رہنے اسے پیش کرنے کی آزادی ہو اسلام میں جو آزادی تھی آزادی اور حریت کی آخری انتہاء اس سے آگے کون سی آزادی ہو سکتی ہے ہم جمہوری قدریں ختم کر بیٹھے غلط ہے دنیا میں سب سے پہلے ایک منظّم سطح پر یہ اصول پیش کرنا کہ لوگوں کی رائے سے حکومت قائم ہوگی یہ پیش کرنے والے ہم ہی تھے [افضال ریحان، اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب، ص ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۲۰۰۴ء دار التذکیر، لاہور]

....

[نسخہ ہائے ناتمام، ساجد حمید، المورد]

دیباچہ:

آپ جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہیں، وہ میرے ان مضامین کا انتخاب ہے، جو ماہنامہ ''اشراق'' میں چھپتے رہے ہیں۔ میں نے اس مجموعہ کا نام ''نسخہ ہائے ناتمام'' رکھا ہے۔ ان میں سے بہت سے مضامین اس دور سے تعلق رکھتے ہیں: جب میں نے دینی علوم کی دنیا میں آنکھ ہی کھولی تھی۔

ہمارے شعبۂ نشر و اشاعت کا خیال تھا کہ جہاں جہاں فکری ارتقاء ہوا ہے، وہاں وہاں حواشی

لکھ دیے جائیں۔ میں نے قصداً اس سے گریز کیا ہے۔ اس لیے کہ فکری ارتقاء آج رک نہیں گیا ہے۔ اگر ارتقاء گئے برسوں میں ہوا ہے تو آیندہ بھی ہوگا، نہ کل کی میری تحریر حرف آخر تھی، نہ آج کی ہوئی ہے۔ آج مضامین پر کچھ حواشی مطلوب ہیں تو کل حواشی پر حواشی کا تقاضا پیدا ہو جائے گا، اس لیے اتنے ہی پر اکتفا کی ہے کہ یہ تحریریں اصل صورت میں دستیاب رہیں: [دیباچہ ص ندارد، نسخہ ہائے نا تمام ۲۰۰۷ء طبع اول، المورد لاہور]

وجلا السیولُ عن الطّول کأنّھا زبرٌ تجِد متونھا أقلاُمھا [ان ٹیلوں پر سے بہتے پانیوں نے (ریت کو صاف کر کے دیار کے آثار کو یوں) نمایاں کر رکھا ہے، جیسے مٹی ہوئی تحریر کے متن کو باقی رکھنے کے لیے دوبارہ قلم پھیر کر تازہ کر دیا جائے۔ معلقہ لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ]

....

[فہم دین، محمد رفیع مفتی، المورد]

دیباچہ:

یہ مجموعہ مضامین گزشتہ سولہ سال میں لکھی گئی تحریروں پر مشتمل ہے۔ اس دوران میں فکری ارتقا کے کئی مراحل طے ہوئے ہیں، ہم نے اس کی روشنی میں ان تحریروں پر نظر ثانی کر دی ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض مقامات ایسے ہو سکتے ہیں جو ہمارے موجودہ موقف سے قدرے مختلف ہوں۔ امید ہے قارئین مطالعہ کرتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھیں گے۔

[ص ۱۸۸]

''قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے اور کسی کو بھی پتا نہیں کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا، اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے'' [لقمان ۳۱: ۳۴] [فہم دین، محمد رفیع مفتی، المورد]

آیت جس سیاق و سباق میں آئی ہے اس میں اصل مسئلہ صرف یہ ہے کہ مخاطبین کو جب قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو وہ جھٹ سے یہ سوال کر دیتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ اگر آپ قیامت کے واقع ہونے کا وقت نہیں بتا سکتے تو گویا آپ کی ساری بات ہی بے کار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وقوع قیامت کے بارے میں یہ بتاتے ہوئے کہ اس کا وقت اللہ ہی جانتا ہے، انسان کی عام زندگی کی کچھ اور چیزیں بھی گنوائی ہیں، جن کا تجربہ اسے روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور ان سے یہ استدلال کیا ہے کہ کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں، جن کے وقوع سے پہلے تمھیں ان کے وقوع کا وقت معلوم نہیں ہوتا۔ کیا تم بارش کے برسنے سے پہلے اس کا وقت جانتے ہو؟ کیا تم ماؤں کے جننے سے پہلے یہ جانتے ہو کہ ان کے رحموں میں کیا ہے؟ کیا تم میں سے کوئی ہے جو یہ جانتا ہو کہ وہ کل کیا کرے گا؟ اور وہ کون ہے، جو یہ بتا سکے کہ وہ کس جگہ مرے گا؟ یقیناً تمھیں ان چیزوں کے وقوع سے پہلے ان کے بارے میں ایسا کوئی علم نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود تم ان سب کو مانتے ہو۔ اس لیے کہ تمھیں کسی چیز کے وقوع کا صحیح وقت معلوم نہ ہونا اس چیز کے وجود کی نفی نہیں کر دیتا۔

اگر انسان کو بارش کا وقت معلوم نہیں ہے تو کیا اسے بارش کے ان واضح آثار ہی کا انکار کر دینا چاہیے؟ اسی طرح اگر واضح آثار بتاتے ہیں کہ کوئی عورت جنے گی، لیکن انسان نہیں جانتا کہ وہ کس وقت جنے گی اور کیا جنے گی؟ تو کیا انسان کے لیے یہ بات درست ہوگی کہ وہ اس کے جننے کا صحیح وقت معلوم نہ ہونے کی بنا پر اس حقیقت ہی کا انکار کر دے؟ کہ وہ مستقبل میں کسی وقت ضرور جنے گی یا وہ اس کے حاملہ ہونے کا انکار کر دے۔ [ص ۱۹۰]

اس آیت میں بیان کردہ چیزوں کے بارے میں یہ اشکال بھی سراسر کم فہمی پر مبنی ہے۔ آثار سے جاننا علم غیب نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ کہ انسان زمانی اور مکانی، دونوں ہی اعتبار سے صرف اپنے سامنے کی چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہ براہ راست مستقبل میں یا پس دیوار جھانکنے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتا۔

وہ بتا سکتا ہے کہ بارش کب ہوگی، لیکن کس طرح؟ مستقبل میں جھانک کر نہیں، حال میں موجود احوال کا مطالعہ کر کے۔ جو قوانین قدرت اس کائنات میں اس وقت جاری و ساری ہیں اور جن کے بارے میں اس کا یہ گمان ہے کہ وہ آیندہ بھی اسی طرح جاری و ساری رہیں گے ان کا مطالعہ کر کے وہ آیندہ کے بارے میں ایک اندازہ لگاتا ہے اور پھر اسے بیان کر دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر یہ سب احوال اسی طرح بر قرار رہے تو جاری و ساری قوانین کی ضرب، تقسیم اور جمع تفریق یہ بتاتی ہے کہ فلاں علاقے میں، فلاں وقت میں بارش ہوگی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ریل گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک شخص اپنے ساتھ والے شخص سے کہتا ہے کہ اگر یہ گاڑی اسی رفتار سے چلتی رہی تو ایک گھنٹے کے بعد یہ فلاں اسٹیشن پر پہنچ جائے گی۔ اس کی

بات چونکہ اس کائنات میں جاری قوانین کے مطابق ہوتی ہے، لہٰذا درست ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے پاس اس بات کا علم ہو کہ فلاں سیارہ کس رفتار سے کس رخ پر جا رہا ہے تو اس کائنات میں موجود ریاضیاتی قوانین کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سیارہ فلاں دن، فلاں وقت پر، اس جگہ ہوگا، اس سیارے کے پاس سے گزر جائے گا اور اس سے ٹکرا جائے گا۔ یہ بات کہنے کے لیے ہم نے کوئی مستقبل میں جھانک کر اس سیارے کو اس سے ٹکراتا ہوا نہیں دیکھا ہوتا، بلکہ ہم حال میں بیٹھ کر اسے اس کی طرف اسی طرح جاتا ہوا دیکھ رہے ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے وہ آدمی جو گاڑی میں بیٹھا ہوا گاڑی کو ایک خاص رفتار سے کسی اسٹیشن کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

چنانچہ ہم مستقبل کے بارے میں جو بات بھی کہتے ہیں، حال میں موجود قوانین قدرت کے بارے میں اپنے علم کی بنا پر کہتے ہیں اور بات خواہ کتنی ہی حتمی کیوں نہ محسوس ہو، اپنی حقیقت میں سراسر ہمارا قیاس ہوتی ہے، نہ کہ ہمارا مشاہدہ۔

رحم مادر میں بچے کی جنس کے بارے میں یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ بھی اب کوئی ایسی علم غیب کی چیز نہیں رہی، جسے خدا کے سوا کوئی جان ہی نہ سکتا ہو۔ جدید سائنس نے انسان کو اس جگہ پہنچا دیا ہے کہ وہ اب آسانی سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کئی ماہ بعد جنم لینے والا وجود لڑکا ہے یا لڑکی۔ غور کیا جائے تو یہ اشکال بھی بس رواروی میں پیدا ہو گیا ہے۔ انسان کے پاس اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ [ص ۱۹۱، ۱۹۲]

اول بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ ماؤں کے رحموں میں کیا ہے، یہ نہیں کہا کہ فلاں ماں کے رحم میں اس وقت لڑکا ہے یا لڑکی۔ انسان نے خواہ مخواہ اس بات کو جنین کی جنس تک محدود کر دیا ہے تفسیر ماثور سے گریز عموماً انسان کو اپنے فہم عقل پر اعتماد عطا کر کے تکبر کے راستے پر لے جاتا ہے لہٰذا عقلی تفسیریں اپنے عہد میں بہت علمی تفسیر نظر آتی ہے مگر وقت گزرنے پر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ے جیسے علامہ طنطاوی کی ''جواہر القرآن''، کیونکہ اکثر انسان تفسیر کرتے ہوئے اپنے زمان و مکان سے ماوراء ہونے کے بجائے اس میں محصور و مقید ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے عہد کے منہاج فکر، اپنے عصر کے سوالات کے تناظر میں کوئی بات کہہ دیتا ہے اور ایسی تشریح پیش کرتا ہے جو اس عہد کی عقلیت یا سائنسی علمیت کے مطابق ہوتی ہے۔ جو بہ ظاہر غلط بھی نظر نہیں آتی اور عقل عام کے لیے قابل قبول ہوتی ہے حالانکہ ایک

جنین صرف نر اور مادہ ہی نہیں ہوتا اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ کافر اور مسلمان بھی ہوتا ہے، عمر اور ابوبکر بھی ہوتا ہے، فرعون اور ابوجہل بھی ہوتا ہے، کسان اور فلسفی بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور نہ جانے کتنے پہلو ہوتے ہیں، جو مستقبل میں رونما ہوتے ہیں۔ خدا ہی ان سب کو جانتا ہے علامہ طنطاوی نے اپنے عہد کے علوم عقلیہ سے ہم آہنگ تفسیر پیش کی مگر دس سال کے عرصے میں عقلی علوم اتنی ترقی کر گئے کہ تمام عقلی دلائل خود ہی تبدیل ہو کر سائنس کے منہاج میں ہی رد ہو گئے لہٰذا کئی جلدوں پر مشتمل تفسیر تاریخ کی زینت بن گئی۔ [فہم دین، محمد رفیع مفتی، المورد]

....

[۲]

قرآن کی اصطلاح میں یہ اللہ پروردگار عالم کی ''نصرت'' ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مدینہ میں اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد اس کی ضرورت پیش آئی اور لوگوں سے جہاد و قتال کا مطالبہ کیا گیا تو قرآن نے ایک موقع پر اس کی دعوت اس طرح لوگوں کو دی۔ [الصّف ۶۱: ۱۰-۱۴] سلف وخلف میں دین کی حفاظت، بقا اور تجدید احیا کے جتنے کام بھی ہوئے ہیں ایمان کے اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہوئے ہیں۔ امت کی تاریخ میں زبان و قلم، تیغ و سناں اور درہم و دینار سے دین کے لیے ہر جدوجہد کا ماخذ یہی ''نصرت'' ہے [جاوید غامدی، دین حق، ستمبر ۲۰۰۶ء، المورد، لاہور] یہ تحریر اب میزان ۲۰۰۸ء میں شامل ہے لیکن اس میں ریاست کو اپنی جان و مال کے ذریعے جہاد و قتال میں حصہ لینے والی عبارت حذف کر دی گئی ہے۔ سورۂ الصّف کی آیات دس تا چودہ کا مفہوم ہی تبدیل ہو گیا۔

نسخ و ترمیم کے اس اختیار کی تردید کے بعد جو سوال خود بخود سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن سے متعلق سنت کو کوئی اختیار کیا حاصل بھی ہے؟ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ قرآن مجید نے سنت کی یہ حیثیت نہایت واضح الفاظ میں بیان کی ہے کہ اس کی تبیین کر سکتی ہے۔ قرآن مجید سے متعلق یہی ایک اختیار ہے جو خود قرآن سے سنت کے لیے ثابت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ [النحل ۱۶: ۴۴] ''اور ہم نے تم پر بھی یہ ذکر اتارا ہے تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو واضح کر دو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے''۔ اس آیت میں یہ بات صاف الفاظ میں فرمائی گئی ہے کہ خالق کائنات نے اپنا یہ فرمان محض اس لیے پیغمبر کی وساطت سے نازل کیا ہے کہ وہ

لوگوں کے لیے اس کی تبیین کرے، گویا تبیین یا بیان پیغمبر کی منصبی ذمہ داری بھی ہے اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر اس کا حق بھی جو اسے خود پروردگار عالم نے دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر مامور من اللہ مبین کتاب ہے۔ پیغمبر اور قرآن کا یہی وہ تعلق ہے جسے فن اصول کی شہرۂ آفاق کتاب الموافقات کے مصنف امام شاطبی نے اس طرح بیان کیا ہے: ''سنت یا تو قرآن کا بیان ہوگی یا اس پر زیادت پس اگر وہ بیان ہے تو اس کا مرتبہ اس چیز کے مقابلے میں ثانوی ہے جس کا وہ بیان ہے اور اگر بیان نہیں ہے تو اس کا اعتبار صرف اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ چیز جو اس میں مذکور ہے قرآن مجید میں نہ پائی جائے''۔ [الموافقات للشاطبی، ج ۴، ص ۵]

شاطبی کے اس بیان سے واضح ہے کہ سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآنِ مجید خاموش ہے بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اگر کوئی چیز قرآن مجید میں مذکور ہے تو سنت صرف اس کی تبیین کر سکتی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اس سے زیادہ کوئی اختیار سنت کو حاصل نہیں ہے [جاوید غامدی، میزان، حصہ اول، ص ۸۲، ۸۳، ۱۹۸۵ء، دارالاشراق، لاہور]

☆

قومیت اسلامی جذبہ ہے: قومی ریاست، قومی شناخت، غیر مسلم اکثریت کی ریاست میں مسلمانوں کا ایک قوم بن کر رہنا — ان میں سے کوئی چیز قرآن وسنت کی رو سے ناجائز نہیں [مقامات، ص ۱۷۵، ۲۰۰۸ء]، میزان طبع سوم، ۲۰۰۸ء میں سنتوں کی فہرست میں قوم، قومیت، قومی ریاست، قومی تشخص، قوم پرستی کے حوالے سے کوئی شق موجود نہیں ہے سنتوں کی فہرست میں نئی سنت کا اضافہ ہو گیا۔

[۱] اسلام کا قانون معیشت ہم مسلمانوں کے لیے قرآن وسنت میں بیان ہوا ہے [جاوید غامدی، سیاست ومعیشت، ص ۸۸، ۱۹۹۳ء، دارالاشراق، لاہور] — [۲] عورت ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے سوا جسم کے کسی حصے کی زیبائش اجنبی مردوں کے سامنے نہیں کھولے گی۔ [مقامات، ص ۱۵۰، طبع اول، ۲۰۰۸ء] — [۳] سر پر دوپٹہ اوڑھنا واجب نہیں ہے محض پسندیدہ بات ہے۔ [مقامات، ص ۱۵۰، طبع اول، ۲۰۰۸ء] — [۴] عورت کا سر [Head] اس کے چہرے [Face] کا حصہ ہے اس لیے ستر میں شامل نہیں۔ غامدی صاحب کے مضمون ''سر کی اوڑھنی سے اخذ شدہ استنباط۔ [مقامات، ص ۱۵۰، طبع اول، ۲۰۰۸ء] — [۵] مشرک، کافر، عیسائی، یہودی، اولاد، مسلمان، والدین کی میراث میں حصہ پا سکتی ہے — لا یرث

المسلم الکافر ولا الکافر المسلم ''نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے — یہ حدیث جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے لیے ہے یعنی اتمام حجت کے بعد جب یہ منکرین حق خدا اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آ گئے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرابت کی منفعت بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ [میزان ۵۲۵، ۲۰۰۸ء] میزان میں غامدی صاحب قانون دعوت، قانون جہاد، قانون سیاست کے تحت لکھ چکے ہیں کہ وہ احکامات جو اتمام حجت کے قانون کے تحت اس زمانے کے مشرکین اور اہل کتاب پر نافذ ہوئے ان کا اطلاق ہمارے زمانے کے مشرکین و اہل کتاب پر نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ بنی اسمٰعیل سے تعلق نہیں رکھتے [ص ۵۲۵، ۵۲۶، میزان ۲۰۰۸ء] — [۶] وارث کے حق میں مورث وصیت کرسکتا ہے قرآن وصیت کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کرتا اس کا حکم آیت میراث میں اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق فرمایا ہے۔ کہ وراثت کی تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی زبان و بیان کے کسی قاعدے کی رو سے اس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ [ص ۱۴۱، مقامات، ۲۰۰۸ء] — [۷] وحدت انسانیت کی تقسیم کا سبب نظریہ قومیت ہے اس قومیت کے تصور نے انسانی تمدن کے وحدت کی طرف بڑھنے کی راہیں مسدود کر رکھی ہیں: افضال ریحان نے قومیت اور مغرب کے حق میں غامدی صاحب سے سوال کیا: [س] میں تو کہتا ہوں کہ دنیا بالفعل وحدت کی طرف آ چکی ہے؟ تو غامدی صاحب نے جواب دیا: آپ اس کے علمبردار بن کر نکلیں اور پھر یہ دیکھیں کہ کیا واقعی دنیا اس طرف آ چکی ہے۔ آپ کا مغالطہ دور ہو جائے گا۔ انسانی وحدت کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور اس ساری زمین پر سب انسانوں کے یکساں حقوق ہیں کسی گورے کو کالے پر کوئی برتری نہیں ہے کیا مغرب اس کو ماننے کے لیے تیار ہے۔ [س] جی بالکل اب وہاں ارتقائی انداز سے بہت بہتری آئی ہے؟ جواب: غامدی صاحب نے فرمایا آپ کہہ رہے ہیں اب بہتری آئی ہے جبکہ ہم نے ایک ہزار سال تک یہاں حکومت کی اور اس میں ہر شخص کو ایسی آزادی تھی وہ جس ملک میں اپنے لیے بہتر سمجھتا بغیر کسی ویزے کی پابندی کے جاسکتا تھا روزگار کما سکتا تھا۔ آج اللہ کے پیدا کیے ہوئے وسائل پر امریکہ نے قبضہ جما رکھا ہے آپ مغرب کی بات کرتے ہیں میں آپ کو مغرب کی غلاظتیں بتاتا ہوں آپ بتائیں ویزہ اور پاسپورٹ کس نے پیدا کیے؟ [س] کیا آپ کے تمام مسلمان ممالک بشمول سعودی عرب اپنے مسلمان بھائی بندوں کے لیے بھی یہ سب

پابندیاں زیادہ سختی کے ساتھ لگائے ہوئے نہیں ہیں؟ غامدی صاحب نے جواب دیا: میں مسلمانوں کی نہیں مغربی تہذیب کی بات کررہا ہوں۔ ہماری حکومت ہزار سال تک رہی اور ہر مسلم و غیر مسلم نے اللہ کے پیدا کردہ وسائل سے فائدہ اٹھایا۔ اب مغرب کو سب سے پہلا قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ ویزہ کی پابندی ختم کرے اور ہر انسان کو اللہ کے پیدا کردہ وسائل سے فائدہ اٹھانے دے۔ [س] آپ کی ہزار سالہ تاریخ میں تب اس طرح کے تقاضے نہیں تھے جو آج کی جدید ریاستوں کو درپیش ہیں؟ غامدی صاحب کہتے ہیں: کیوں نہیں تھے کیا ہمارے پاس دولت نہیں تھی کیا ہمارے پاس وسائل نہیں تھے۔ آج مغربی تہذیب تعصّبات سے بلند ہوکر تمام انسانوں کو ایک نظر سے کیوں نہیں دیکھتی؟ [س] اب مغربی تہذیب کے زیر اثر دنیا میں انسانی سوچ بڑھ رہی ہے گلوبل انسان پیدا ہو رہا ہے؟ غامدی صاحب نے ارشاد کیا: آپ کہہ رہے ہیں گلوبل انسان پیدا ہو رہے ہیں جب پیدا ہوں گے مجھ سے تو بات اس وقت کی کیجیے۔ یہ آپ لوگوں کا بس خواب ہے میں کہتا ہوں زیادہ پابندیاں آنے والی ہیں کیونکہ مغرب نے تو اپنی ابتداء ہی نیشنل ازم سے کی ہے اس باطل نظریے سے انھوں نے لوگوں کو پاسپورٹ اور ویزے کی پابندیاں لگا کر پابند کیا ہے اپنے وسائل سمیٹ کر اپنے قبضے میں کیے ہیں جن ممالک کے پاس وسائل نہیں تھے ان کو قرضوں کے بوجھ تلے دبا کر ان کی معیشت کو تباہ و برباد کر دیا ہے یہ ہیں مغربی تہذیب کے فوائد۔ ترکی کو یورپ کا حصہ ہوتے ہوئے وہ یورپ کا حصہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ [س] نیشنل ازم کی تباہ کاریوں سے ہم سب آگاہ ہیں لیکن ہم مسلمان بھی ماشاءاللہ اس سلسلے میں کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں جبکہ اس تصور کے خلاف ماڈرن دور میں انسانی شعور بڑھ رہا ہے؟ غامدی صاحب نے فرمایا: آپ موجودہ مسلمانوں کی بات مت کریں ہماری ہزار سالہ تاریخ کو دیکھیں باقی وہاں کونسا شعور بڑھ رہا ہے۔ ان کی کس قوم نے نیشنل ازم کی مذمت کی ہے عملی طور پر بھی چھوڑیں کیا یہ باتیں فکری طور پر ہی وہ مان رہے ہیں۔ اقبالؒ نے ہی یہ کہا تھا

مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟— [س] علامہ صاحب! اب ذرا ''تہذیبوں کے تصادم'' کی تھیوری پیش کرنے والوں اور اس کا رد کرنے والوں کے نظریات پر بھی بات ہو جائے۔ پروفیسر ھنٹنگٹن جن کے نظریات کا حوالہ ڈاکٹر ہوفمین نے اپنے مقالہ یں دیتے ہوئے کہا ہے: ''مغرب بے مثال ضرور ہے، عالمگیر نہیں''۔ یعنی مغربی تہذیب انسانی تمدن کے ارتقاء ہی کی ایک منزل ہے۔

اس تناظر میں آپ فرمایئے کہ دور حاضر میں مغربی تہذیب کے عالمگیر غلبے کا امکان کہاں تک ہے؟ غامدی صاحب کہتے ہیں — ذہن مغرب اس کو محسوس کرنے کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ اسے یہ حادثہ درپیش ہے کہ انسان کے باطن اور اس کے اخلاقی وجود کا تعلق، مادی ارتقاء کے ساتھ قائم کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہو رہا ہے — اب مغربی تہذیب کے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں یا وہ انسانی فطرت کے بارے میں اس حقیقت کا اعتراف کر لے یا کسی نئی ٹیکنالوجی سے انسانی فطرت کو تبدیل کر دے — دوسری وجہ یہ ہے کہ عالمگیریت کے لیے کچھ ایسی اساسات کی ضرورت ہوتی ہے جو انسانی تہذیبوں کے تنوع میں وحدت کا کام دے سکیں۔ مغربی تہذیب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس وحدت کے شعور کے باوجود دنیا میں انسانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی تقسیم پر مصر ہے اس کی وجہ اس کا نظریہ قومیت ہے اس قومیت کے تصور نے انسانی تمدن کے وحدت کی طرف بڑھنے کی راہیں مسدود کر رکھی ہیں۔ [افضال ریحان، اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب، جاوید غامدی صاحب کا انٹرویو، ص ۶۰ تا ۶۳، ۲۰۰۴ء، دار التذکیر، لاہور]

اس کے بعد پھر حضرت والا کا حسب معمول ارتقاء ہو گیا — ۲۰۰۸ء کی مقامات میں مسئلہ قومیت کے تحت لکھتے ہیں ''اسلام قومیت کی نفی نہیں کرتا الگ قومی ریاست ناجائز نہیں نہ مسلمان ایک قوم ہیں نہ انھیں ایک قوم ہونا چاہیے قومی شناختوں اور ریاستوں سے دستبردار ہونا ضروری نہیں مسلمان الگ الگ قومی ریاستیں قائم کر سکتے ہیں غیر مسلم اکثریت کی ریاستوں میں شہری کی حیثیت سے اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن کر بھی رہ سکتے ہیں ان میں سے کوئی چیز قرآن و سنت کی رو سے ناجائز نہیں [مقامات ص ۱۷۴، طبع اول ۲۰۰۸ء] — [۸] اسلام قومیت کی نفی نہیں کرتا علم سیاست میں بالعموم موجودہ قومیت کی تمام بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے الگ قومی ریاست قائم کرنے کو بھی ناجائز نہیں کہتا یہ نقطۂ کہ اسلام میں تو قومیت کی بنیاد بھی اسلام ہی ہے کسی طرح درست نہیں نہ مسلمان ایک قوم ہیں نہ انھیں ایک قوم ہونا چاہیے مسلمانوں کا آپس میں رشتہ قومیت کا نہیں اخوت کا ہے مسلمانوں کو اپنی قومی ریاستوں اور قومی شناختوں سے دستبردار ہو کر لازماً ایک قوم ایک ریاست بن جانا دین کا تقاضہ نہیں — مسلمان الگ الگ قومی ریاستیں قائم کر سکتے ہیں اسی طرح دین و شریعت کی آزادی ہو تو غیر مسلم اکثریت کی ریاستوں میں شہری کی حیثیت سے اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن کر بھی رہ سکتے ہیں [مقامات، ص ۱۷۴، ۱۷۵، طبع اول ۲۰۰۸ء]

....

عقل و نقل میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا دین کی بنیاد ہی علم و عقل کے مسلمات پر قائم ہے لہٰذا کوئی چیز اگر ان مسلمات سے مختلف نظر آتی ہے تو اس پر بار بار غور کرنا چاہیے — یہ چیز ظاہر ہے کہ اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب پورے یقین کے ساتھ مانا جائے کہ عقل و نقل میں کوئی منافات نہیں ہوسکتی [ص ۶۵، میزان طبع سوم المورد ۲۰۰۸ء]

انسان اپنی بلند پروازیوں سے اس کے علم کی وسعتوں کو پا سکتا نہ اس کی حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے بندہ مومن کا کام یہی ہے کہ وہ اللہ کے احکام کو سنے اور ان کے سامنے سر جھکا دے کسی بات کی حکمت سمجھ میں آ جائے تو اس کے حضور میں سجدہ شکر بجا لائے سمجھ میں نہ آئے تو اسے اپنی عقل کے نقص پر محمول کرے احکام الٰہی کے باب میں صحیح رویہ یہی ہے [ص ۵۸، میزان حصہ اول، ۱۹۸۵، دارالاشراق، لاہور]

وحی خفی سنت ہے: وحی خفی کے ذریعے سے اگر کوئی چیز پیغمبر کو ملتی ہے تو وہ قرآن کا حصہ نہیں بن جاتی پیغمبر کی حدیث اور پیغمبر کی سنت ہی کہلاتی ہے ۔[ص ۱۳۵، میزان حصہ اول، ۱۹۸۵ء، دارالاشراق لاہور]

رسوم و آداب ایک سنت ہے: نماز رسوم و آداب ہے نماز فرض بھی ہے سنت بھی ہے نماز تہوار بھی ہے اور تہوار بھی سنت ہیں دین اپنے ماننے والوں کو بعض رسوم و آداب کا پابند کرتا ہے یہ قرآن سے پہلے ہیں اور ان کی حیثیت ایک سنت کی ہے جو رسول کی تقریر و تصویب کے بعد صحابہ کے اجماع اور تواتر عملی سے امت کو منتقل ہوئی ہے ان کا ماخذ اب امت کا اجماع ہے۔[ص ۶۴۱، میزان، طبع سوم ۲۰۰۸ء] اگر رسوم و آداب ایک سنت ہے تو پھر خود سنت کیا ہے؟ ۲۷ سنتوں کا نام رسوم و آداب ہے یا ان کا مجموعہ سنت؟ یہ گتھی سلجھانا ضروری ہے۔ غامدی صاحب نے رسوم و آداب کی فہرست میں عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کو بھی شامل کیا ہے [ص ۶۴۸، میزان ۲۰۰۸ء] یہ دونوں تہوار نبیؐ نے اللہ کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کے لیے مقرر فرمائے اللہ نے اپنی آخری شریعت نبی آدم کو دی تو عید کے یہ دو تہوار ٹھہرائے یہ دونوں تہوار ہجرت مدینہ کے بعد مقرر کیے گئے [ص ۶۴۸، میزان ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب کے مطابق نماز عیدین رسوم و آداب ہے اور تہوار ہے اور سنت بھی ہے غامدی صاحب کی طے کردہ سنت کی تعریف کے مطابق عیدین کی نماز کو سنت میں شامل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دین کے یہ رسوم و آداب قرآن سے پہلے ہیں اور ان

کی حیثیت ایک سنت کی ہے [ص ۶۴۱، میزان] لیکن عیدین کا حکم قرآن سے پہلے نہیں تھا یہ حکم ہجرت مدینہ کے بعد رسالت مآبؐ کے ذریعے امت کو ملا لہٰذا یہ سنت نہیں ہوسکتا — غامدی صاحب کے مطابق نماز فرض جو پانچ وقت ادا کی جاتی ہے وہ سنت ہے [ص ۱۴، میزان ۲۰۰۸ء]

....

ص ۲۳A

کسی فکر کا جائزہ لینے کا دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اس بات کو موضوع بحث بنائیں کہ وہ فکر جن اصولوں پر قائم ہے وہ اصول صحیح ہیں یا غلط۔ اگر وہ اصول صحیح ہیں تو پھر ہم اس بات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ نتائج میں غلطی ہوگئی ہو۔ اصول میں اگر ایک آدمی صحیح ہے، اس نے نقطۂ نظر درست قائم کیا ہے تو یہ ممکن ہے کہ جب وہ اپنے اصول کا اطلاق کرتا ہے تو اس میں غلطی کر جاتا ہے۔ کیونکہ وہ پیغمبر نہیں ہوتا۔ اس سے غلطی ہوتی ہے، غلطی ہوسکتی ہے اور ایک دو نہیں دس بیس بھی ہوسکتی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو ہر صاحب علم کے ہاں پائی جاتی ہے اس سے اگر کوئی ہستی مستثنیٰ ہوسکتی ہے تو وہ اللہ کے پیغمبر کی ہوسکتی ہے۔

ص ۲۷B

لیکن اس ساری بحث میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس کا تعلق علم لسانیات سے ہے، زبان کے فہم یا کسی کے کلام پر تدبر سے نہیں، یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ کسی کلام کا متکلم جب اپنا مدعا بیان کرتا یہ تو اس میں کوئی چیز یہ اہمیت نہیں رکھتی کہ جو لفظ اس نے استعمال کیا ہے، اس لفظ کی تاریخ کیا ہے؟ اس میں جو چیز بہت اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ اس نے یہ لفظ جب استعمال کیا اس وقت یہ کس معنی میں بولا جاتا تھا؟ جو محاورہ استعمال کیا گیا اس زمانے اس کا کیا مفہوم تھا؟ یہ چیز بالکل بدیہی ہے۔

ص ۲۷، ۲۸B1

ا۔ ہم اردو زبان میں ایک لفظ کثرت سے بولتے ہیں ''شوربا''۔ آج اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے شوربے کے ساتھ روٹی کھائی ہے تو اس کا ایک مفہوم جو اس زمانے میں جب ہم یہ لفظ بول رہے ہیں، ہر ایک با آسانی سمجھ سکتا ہے۔

ص C۲۸

یعنی وہ ''میں نے شوربے سے روٹی کھائی ہے''۔ کا جملہ سن کر نہ تو ''میں'' کی لسانی تاریخ سے بحث کرتا ہے، نہ ''نے'' کی تحقیق کرتا ہے نہ تو اسے ''روٹی' کا لسانی پس منظر جاننے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی اسے ''کھائی ہے'' کی لغوی تاریخ سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ اگر اردو زبان سے واقف ہے تو ہم جیسے ہی یہ جملہ بولتے ہیں وہ اپنے متعارف علم کی بنیاد پر ہمارا مفہوم سمجھ لیتا ہے۔ یہی بات زبان میں اصل اہمیت رکھتی ہے۔

ص C۱۲۹

لیکن اس کے برخلاف اگر اس نے کہیں سے لسانیات کی کوئی کتاب اٹھالی اور شوربے کی تاریخ پر تحقیق کرنا شروع کر دی اور تحقیق کرنے کے بعد اس نے یہ معلومات حاصل کرلیں کہ ''شور'' اصل میں نمک کو کہتے ہیں اور ''با'' اصل میں پانی کو کہتے ہیں اور پھر اس جملے کا یہ مطلب بیان کر دیا کہ مصنف نے نمکین پانی سے روٹی کھائی ہے تو اصل میں اس نے نہ صرف علم پر ظلم کیا، نہ صرف زبان پر ظلم کیا بلکہ مصنف پر بھی ظلم کیا، وہ یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا۔ یہ اس کا مدعا ہی نہیں تھا۔ اس نے نمکین پانی سے ہرگز روٹی نہیں کھائی بلکہ ایک خاص طرح کے سالن سے روٹی کھائی۔ شارح نے چونکہ لفظ کے استعمال اور رائج مفہوم کو نظر انداز کیا، اس لیے وہ مصنف کی بات کو صحیح طور پر بیان کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔

۲۔ ایک لفظ ہے ''ٹیلی وژن''، لیکن اگر کوئی اس جملے ''میں نے ایک ٹیلی وژن خریدا'' کی لسانی تحقیق شروع کر دے اور یہ کہے کہ لغت کے مطابق ٹیلی کا مطلب ہے انتقال اور وژن کے معنی ہیں منظر، اس لیے اس شخص نے ایک ''انتقالِ منظر'' خریدا، تو لسانیات کی یہ تحقیق صحیح ہونے کے باوجود ایک لغو بات ہے اور کلام کی غلط تفہیم ہے۔ اب ٹیلی وژن کو ٹیلی وژن کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ اس کے لیے لسانیات کی تحقیق کیجیے۔

ص D۲۹

لیکن کسی متکلم کی بات کا مفہوم جاننے کے لیے اس تحقیق کی پرکاہ کے برابر اہمیت نہیں۔ جو آدمی اس طرح کی حرکت کرے گا، اس کے بارے میں دو ہی باتیں کہی جاسکتی ہیں یا تو یہ کہ اس بے چارے کو زبان سے، ادب سے، اسالیب کلام سے کوئی واقفیت نہیں ہے، وہ اس معاملے میں قطعاً لاعلم ہے اور یا یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنی بات متکلم کے منہ میں ڈالنا چاہ رہا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بات لازماً کہنی پڑے گی۔

ص D۳۰

لیکن جو بات متکلم کے کلام سے نکل رہی ہے وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور اس کو وہ مفہوم دینا چاہتا ہے جو اسے پسند ہے تو پھر اس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے مخاطب کو بھول بھلیوں میں الجھا کر، لسانیات کی اس طرح کی غیر متعلق بحثیں کر کے، متکلم کے مدعا کو بدل دے یعنی یا تو وہ بے علم ہے یا وہ اپنے مدعا کو متکلم کے منہ میں ڈالنا چاہتا ہے۔ ان دو باتوں کے علاوہ کوئی تیسری صورت ممکن نہیں۔

ص D1۳۳

قرآن مجید بھی ظاہر ہے کہ ایک زبان میں نازل ہوا ہے، پھر وہ ایک مربوط کلام ہے۔ اس کی تفہیم میں بھی یہ تمام امور پیش نظر رہیں گے۔ یعنی اس میں جتنے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ہم ان کے مادوں کی تحقیق بھی کر سکتے ہیں کہ وہ مختلف ادوار میں ترقی کرتے ہوئے اس مفہوم تک کیسے پہنچے ہیں۔ لیکن یہ تحقیق اگر اس مقصد کے لیے کی جائے کہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ لفظ میں یہ معنی کیسے پیدا ہوئے؟ یہ تو لسانیات کی بڑی اعلیٰ بحث ہوئی اور اگر یہ تحقیق اس مقصد کے لیے کی جائے کہ لفظ کا وہ مفہوم جس میں وہ آج استعمال ہوتا ہے یا اس وقت استعمال ہوتا تھا، اس کو تبدیل کر کے ایک نیا مفہوم اس میں شامل کر دیا جائے تو اس کا وہی نتیجہ نکلے گا جو ہم مثالوں سے واضح کر چکے ہیں۔ یعنی قرآن کی آیات کا صحیح مفہوم ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

ص۳۴، D2

ہم اس بحث کو عربی کی ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ ''لفظ'' عربی زبان کا مصدر ہے۔

ص۳۴ D3

اس کا مطلب ہے ''پھینکی ہوئی چیز'' کسی چیز کو اگر پھینک دیں تو کہیں گے ''لفظ''۔ اب فرض کیجیے کہ اگر کوئی آدمی یہ کہے ''میں نے ایک لفظ بولا'' اور آپ یہ کہیں کہ اس نے ایک پھینکی ہوئی چیز بولی تو اس تحقیق کی کوئی کیا داد دے گا؟

ص۳۴ D4

یہ حرکت جیسا کہ ہم نے عرض کیا ایسا شخص کرسکتا ہے جو زبان سے اور اس کے قواعد اور اسالیب سے بالکل ناواقف ہو اور یا اس صورت میں کرسکتا ہے کہ وہ جانتے بوجھتے ایک بات کو نہیں ماننا چاہتا اور ایک دوسری بات متکلم کے منہ میں ڈالنا چاہتا ہے، اور اب اس نے زبان کے اس پہلو کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

ص۳۵، D5

عربی زبان ہی نہیں اردو زبان کا بھی ایک پہلو ہے جسے عرف کہتے ہیں۔ زبان کے علاوہ یہ عرف نہ صرف یہ کہ ایک معاشرے میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض اوقات ایک شاعر اور ایک ادیب اور ایک محقق اور ایک فلسفی کے کلام میں بھی ہوتا ہے۔

ص۳۵ D6

یعنی لغت میں لفظ کا ایک مفہوم موجود ہے۔ لیکن معاشرے کے عرف نے اس کو بالکل دوسرے مفہوم میں مستعمل کر دیا ہے یہ وہ چند معروف باتیں ہیں جو کسی زبان اور اس میں موجود کلام کی تفہیم میں پیش نظر رہنی چاہییں۔ ان کو نظر انداز کرنے سے ہم کلام کے مفہوم سے دور سے دور تر ہوتے چلے

جاتے ہیں۔

ص D7۳۶

قرآن مجید کے ساتھ پرویز صاحب نے دراصل وہی سلوک کیا ہے جس کو ہم نے گذشتہ صفحات میں بعض مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے قرآن کی زبان کو اس کے استعمال، عرف، ہر چیز سے جدا کر کے لغت سے سمجھنے کی کوشش کی۔ یعنی قرآن مجید کے اس عرف کو جو معاشرے نے پیدا کیا، وہ عرف جو سیاق وسباق نے پیدا کیا، وہ عرف جو متکلم نے پیدا کیا اسے ملحوظ رکھے بغیر اس کے الفاظ کو وہ معانی پہنائے جیسے کوئی علامہ اقبال کے کلام میں خودی کا وہ مفہوم داخل کر دے جو لغت میں لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح سے ایک مقام پر کوئی قرینہ موجود نہیں کہ لفظ کو مجازی مفہوم میں لیا جائے لیکن وہ اس کا مجازی مفہوم ہی لینے پر مصر ہیں۔

[پرویز صاحب کا فہمِ قرآن، خطاب: جاوید احمد غامدی، تلخیصِ وترتیب شکیل عثمانی، دارالتذکیر، لاہور]

☆

غامدی صاحب کے زیر اہتمام ان کے جدید تصور دین کے فروغ، تبلیغ تدریس اور تشہیر کے لیے غامدی صاحب کی شہادت کے مطابق ''المورد الانصار المسلمون اور دانش سرا کا نظم قائم ہوا ان کے سربراہ وصی مظہر ندوی اور ڈاکٹر فاروق خان جیسے زعما تھے'' [ص ۴۲، مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء] غامدی صاحب نے دانش سرا کے دوسرے صدر ڈاکٹر طارق سجاد کا نام دانستہ تحریر نہیں فرمایا جو بددیانتی ہے یہ درست ہے کہ ان کے ساتھ چند تلخ یادیں وابستہ ہوں گی ماہر امراض جلد ڈاکٹر طارق سجاد دانش سرا کراچی کے صدر تھے جنھیں غامدی صاحب نے دانش سرا پاکستان کا صدر بنایا اور انھیں کراچی سے جبراً لاہور لے گئے اس کے بعد ان سے تنظیمی امور پر اختلاف پیدا ہوئے اور دانش سرا ہی بند کر دیا گیا کسی فرد سے اختلافات کی بنیاد پر اس کا ذکر ہی موقوف کر دینا تاریخی اور علمی دیانت کے خلاف ہے۔ غامدی صاحب کے قائم کردہ ان تینوں اداروں کے ذریعے دین کا جو تصور معاشرت اور قانونِ معاشرت پیش کیا گیا اس کی ایک جھلک دانش سراء کے صدر ڈاکٹر محمد فاروق خان کی کتاب اسلام کیا ہے اشاعت ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء میں دیکھتے ہیں یہ کتابیں غامدی صاحب کے قائم کردہ ادارے دارالاشراق اور دانش سرا کی جانب

سے غامدی صاحب کی زیر سرپرستی ان کی اجازت سے شائع کی گئیں اسلام کیا ہے؟، اشاعت ۱۹۹۷ء میں غامدی صاحب ان کے ادارے دانش سرا اس ادارے سے وابستہ تمام زعما کی فکر کا خلاصہ یہ ہے:

ا۔عورت کا اصل مقام گھر کی نگہداشت اور بچوں کی تعلیم و تربیت ہے امہات المومنین — شریف مسلمان عورتوں کے لیے ایک نور روشن کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں پروردگار نے گھروں میں ٹک کر رہنے اور دور جاہلیت کی طرح نمائش نہ کرنے کا حکم دیا ہے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا [الاحزاب ۳۳:۳۳] اسلام نے مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کو روکا ہے اور حیاء کو بحیثیت قدر ترویج دی۔ [ڈاکٹر فاروق خان ،ص ۲۶۱،۲۶۲، اسلام کیا ہے؟ ۱۹۹۷ء، دارالاشراق ، لاہور] اس مقصد کے لیے وہ اپنے سینوں پر بھی دوپٹے ڈالیں [یعنی سر پر تو یقیناً دوپٹہ ہوگا] [ص ۲۶۳، محولہ بالا]

قرآن مجید کی ہدایت ہے کہ گلی بازار اور اس طرح کی غیر محفوظ جگہیں — وہاں خواتین زیادہ احتیاط سے کام لیں اپنے سروں پر بڑی چادر ڈال لیں اور اپنے چہرے پر گھونگھٹ نکال لیں — وہ گھونگھٹ گھونگھٹ تو ہونا ہی چاہیے حالات اور ضروریات کے تحت وہ خود اپنے لیے اس کا تعین کرسکتی ہے مثلاً جانی پہچانی گلی اور انجانی گلی میں بھی فرق ہوتا ہے گلی بازار کے اس حجاب کی حکمت یہ ہے کہ بدقماش آوارہ لوگ خاتون کو تنگ نہ کریں چنانچہ ہر خاتون کو اس موقع پر اس حجاب کے ذریعے سے اپنی حفاظت کرنی چاہیے [ص ۲۶۵ محولہ بالا] مَردوں کو میزبان کے گھر کے زنانہ حصے میں جانے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ [ص ۲۲۶۵، محولہ بالا] — خواتین کے چہرے کا پردہ گھر اور محفوظ مقامات میں نہیں بلکہ گلی بازار اور غیر محفوظ مقامات پر ہے۔ [۲۶۶ محولہ بالا]

غامدی صاحب کے ادارے دانش سرا کے صدر ڈاکٹر فاروق کی کتاب اسلام کیا ہے؟ کی دوسری اشاعت ۱۹۹۹ء میں آئی تو غامدی صاحب کا تصور معاشرت ان الفاظ میں بیان ہوا یہ کتاب غامدی صاحب کے ادارے دانش سرا نے غامدی صاحب کی سرپرستی میں شائع کی تھی مقامات میں لکھا ہے کہ الانصار المسلمون اور دانش سرا کا نظم بھی غامدی صاحب نے قائم کیا وصی مظہر ندوی اور ڈاکٹر محمد فاروق

خان جیسے زعماء ان کی تنظیموں کے سربراہ رہے [ص۴۲، مقامات ۲۰۰۸ء] آیئے غامدی صاحب کی شہادت کے مطابق ڈاکٹر فاروق خان جیسے زعیم ملت کے افکار پڑھتے ہیں جو غامدی صاحب کے افکار ہیں اور دانش سرا ۱۹۹۹ء میں اس کی تبلیغ کرتا تھا۔

[۱] ہمارے دین کا مزاج یہ ہے کہ ایسے تمام تنازعات گھر اور خاندان کے اندر حل کیے جائیں اور انھیں عدالتوں تک نہ لے جایا جائے، مسئلہ حل نہ ہو تو حکم مقرر کیا جائے۔[یہاں میاں بیوی کے خاندانی تنازعات کا ذکر ہے] [ڈاکٹر فاروق خان، ص۲۹۷، ۱۹۹۹ء، دانش سرا لاہور] — [۲] میاں بیوی کا بنیادی کام اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت ہے اس لیے کوئی ایسی شرط نکاح کے معاہدے میں نہیں رکھنی چاہیے جس سے اولاد کی تربیت کے اہم ترین مقصد کو نقصان پہنچے ۔ [الاحقاف ۴۶: ۱۵۔۱۷]، [لقمان ۳۱: ۲۱۔۲۲] — [۳] ایک مسلمان مرد کے لیے مشرک عورت سے شادی کرنا منع ہے کتابیہ سے شادی صرف اس صورت میں کرسکتا ہے کہ وہ عورت ایک اسلامی ریاست کی شہری ہو [البقرہ ۲: ۲۲۱] کتابیہ پاک دامن ہو، ناگزیر حالات کے علاوہ اہل کتاب خواتین سے شادی نہ کی جائے، مسلمان خواتین کے لیے کسی بھی غیر مسلم مرد سے شادی منع ہے خواہ وہ اہل کتاب ہو یا غیر اہل کتاب مسلمان اہل کتاب کے مقابل میں حق پر ہیں وہ کیسے یہ گوارا کرسکتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹی اس قوم کے کسی فرد کو دے دیں جو ان کے نبی ہی کو نہیں مانتی [ص ۲۹۹، ۳۰۰، ۱۹۹۹ء، محولہ بالا] — [۴] حق طلاق عورت کو تفویض کرنے کا تصور قرآن مجید کے تصور نکاح کے منافی ہے مرد نکاح کرتا ہے اور مرد ہی طلاق دے سکتا ہے عورت چاہے تو طلاق لے سکتی ہے نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے ۔ [البقرہ ۲: ۲۳۷] — [ص ۳۱۰، محولہ بالا] — [۵] خاوند سے طلاق حاصل کرنے کے لیے وجہ بتانا بیوی پر لازم نہیں ہے [۳۱۱، محولہ بالا] [۶] عورت کا اصل کام گھر کی نگہداشت اور بچوں کی تعلیم و تربیت ہے امہات المومنین شریف مسلمان عورتوں کے لیے ایک نور روشن کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں پروردگار نے گھروں میں ٹک کر رہنے اور دور جاہلیت کی طرح نمائش نہ کرتے رہنے کا حکم دیا، [الاحزاب ۳۳: ۳۳] تاہم اس اصل دائرہ کار میں کوئی کمی لائے بغیر اگر کوئی خاتون دوسری سرگرمیوں، مشاغل میں حصہ لینا چاہے تو اس سے نہیں روکا گیا مثلاً وہ تعلیم، صحت، تجارت، صنعت، سیاست، صحافت، اور کسی بھی مصروفیت میں حصہ لے سکتی ہے [ص ۳۱۸، محولہ بالا] — [۷] ان آداب میں ایک یہ ہے کہ مرد و عورت کا آزادانہ اختلاط نہ ہو [ص ۳۱۹، محولہ

بالا]—[۸] دوسرے مسلمان کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے سلام کرے، اجازت طلب کرے مل جائے تو پھر اندر جائے[۲۴: ۲۷، ۲۸] تاہم اس موقع پر تخلیہ ممنوع ہے یعنی مرد اکیلی عورت کے ساتھ نہ بیٹھے[ص۳۲۲، محولہ بالا]—[۹] گلی بازار میں ہر خاتون کو اس موقع پر اس حجاب کے ذریعے سے اپنی حفاظت کرنی چاہیے[ص۳۲۲، محولہ بالا]—[۱۰] قرآن مجید کی ہدایت یہ ہے کہ [مردانہ حصے میں عورتوں کے لیے اگر کوئی اجنبی مہمان ہو] ایسے حالات میں مردوں کو میزبان کے گھر کے زنانہ حصے میں جانے کی قطعاً اجازت نہیں ہے اگر وہ کوئی چیز مانگنا چاہتے ہیں تو پردے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر گھر کی خواتین سے مانگیں۔[ص۳۲۲، محولہ بالا]

اسلام کیا ہے؟ کا تیسرا ایڈیشن جناب غامدی صاحب کے ادارے دانش سراء نے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا اس میں بھی حجاب سے متعلق اسلام کا قانون معاشرت یہی تھا جو پہلے بیان ہو چکا ہے یہ موقف جو ڈاکٹر فاروق خان کی کتاب میں درج ہے اصلاً غامدی صاحب کے مختلف خطابات سوالات و جوابات کا خلاصہ ہے جو غامدی صاحب کی رضا سے فاروق خان نے مرتب کر کے شائع کیے تصدیق کے لیے غامدی صاحب کی تقاریر جو ۱۹۹۳ء سے ۲۰۰۲ء کے درمیان ہوئی ہیں ان کی ریکارڈنگ سن لی جائے—اسلام کیا ہے اور ''میزان'' کی عبارتوں کا موازنہ کر لیا جائے تو الفاظ، دلائل اور حوالے تک یکساں ملیں گے یہ توارد ہے یا سرقہ یا استفادہ یا اتفاق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اس لیے اسلام کیا ہے؟ ۲۰۰۰ء کے دیباچے میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ دین کے مشکل اور پیچیدہ سوالات کے جواب میں—میں نے سب سے زیادہ استفادہ اپنے استاد جناب جاوید غامدی سے کیا ہے اس کتاب میں آپ دین کا جو واضح تصور دیکھیں گے اس میں سب سے زیادہ حصہ ان ہی کا ہے محمد رفیع مفتی، معز امجد، ساجد حمید، طالب محسن نے رہنمائی تنقید و تبصرے کا فریضہ انجام دیا۔[حرف اول ص۴۴، اسلام کیا ہے؟ ۲۰۰۰ء]—اس کے بعد پردہ، حجاب، گھر کے پردے، باہر کے پردے، اوڑھنی وغیرہ بلکہ احکام کو حجاب صرف ازواج مطہرات تک محدود کرنے کے فلسفۂ جدید کے بارے میں غامدی صاحب کا طائر خیال جہاں بے سمت پرواز کرتا رہا—اس موقف کے بدلتے ہوئے رنگ میزان ۲۰۰۸ء میں قانون معاشرت کے تحت دیکھے جا سکتے ہیں۔

....

☆اضافہ:۔

حج فرض ہے حج سنت ہے: حج ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں کم از کم ایک بار فرض ہے[۳۷۴، میزان ۲۰۰۸ء]اسی کتاب میں سنت کی فہرست میں عبادات کے تحت حج کو چوتھے نمبر پر رکھا گیا ہے۔[ص۱۴، میزان ۲۰۰۸ء]

روزہ فرض نہیں سنت ہے: غامدی صاحب سنت کی فہرست میں روزہ کو شامل کرتے ہیں[ص ۱۴، میزان ۲۰۰۸ء] پھر اسی میزان میں لکھتے ہیں قرآن کا ارشاد ہے کہ ایمان والوں پر روزہ فرض کیا گیا ہے[ص ۳۶۷، میزان ۲۰۰۸ء] جو شخص اس مہینے میں موجود ہے اس پر فرض ہے کہ روزے رکھے[ص ۳۶۹، میزان ۲۰۰۸ء] روزوں کے لیے رمضان کا مہینہ خاص کیا گیا ہے اس لیے جو شخص اس مہینے میں موجود ہے اس پر فرض ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے[غامدی، قانون عبادات، ص ۱۳۹، طبع اپریل، ۲۰۰۵ء] جب قرآن روزے کو فرض قرار دے رہا ہے غامدی صاحب بھی اس کو فرض مان رہے ہیں تو غامدی صاحب کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ روزہ کو فرض کے مقام سے اٹھا کر سنت کا مقام عطا فرمادیں۔

نماز فرض ہے نماز سنت ہے نماز رسوم و آداب ہے نماز تہوار ہے، غامدی صاحب کے ان نقطہ ہائے نظر کے لیے حوالے درج ذیل ہیں (ا) قانون عبادات کے تحت غامدی صاحب سورہ نساء کی آیت ۱۰۳ کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں بے شک نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے[ص ۲۶۳ ،میزان ۲۰۰۸ء]،نماز مسلمانوں پر شب و روز میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے[غامدی، قانون عبادات، ص ۶۳، طبع اول، ۲۰۰۵ء] ایک جانب وہ نص سے نماز کو فرض ثابت کررہے ہیں دوسری جانب سنتوں کی فہرست میں نماز کے فرض کو بھی شامل کرلیا گیا ہے[ص ۱۴، میزان ۲۰۰۸ء] زکوٰۃ کی فرضیت[غامدی، میزان ص ۱۳۷، طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء]

زکوٰۃ فرض ہے، زکوٰۃ سنت ہے: زکوٰۃ پہلے سے موجود ایک سنت تھی جسے قرآن نے زندہ کیا اور نبیؐ نے خدا کے حکم سے مسلمانوں میں جاری کردیا[غامدی، میزان، ص ۱۳۸، طبع دوم، ۲۰۰۲ء] سوال یہ ہے کہ جب اللہ نماز کو فرض قرار دے رہا ہے اور غامدی صاحب بھی زکوٰۃ کی فرضیت کا اعتراف کررہے ہیں تو غامدی صاحب خود اسے سنت کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟

تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس وقت جو سیاسی جماعتیں ہمارے اس ملک میں موجود ہیں ان میں سے بیشتر کے لیے اسلامی ریاست کے نظام میں فی الواقع کوئی گنجائش پیدا نہیں کی جاسکتی [جاوید غامدی، برہان ص ۹۸، ۱۹۹۲ء دار الاشراق لاہور]

اگر چہ اسلام کا نظام سیاست اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ ایک اعیانی نظام ہے لیکن اس میں سیاسی معاملات کو چلانے کا یہی [جمہوریت] طریقہ ہے امرھم شوریٰ بینھم —— اس کی رو سے مسلمانوں کا اجماع یا ان کی اکثریت کی رائے کسی حال میں رد نہیں کی جاسکتی قرآن وسنت کے ان ضوابط سے یہ بات صاف ثابت ہوتی ہے کہ جمہوریت کا اصل جوہر اسلام میں یقیناً موجود ہے [ص ۱۰۱، ۱۰۲، محولا بالا] قرآن وسنت کی تعبیر کے لیے دینی علوم کے ماہرین کی ایک ایسی مجلس قائم کی جائے۔ یہ مجالس حیات اجتماعی کے تمام معاملات میں صرف قرآن وسنت کا منشا متعین کرے قانون سازی کے لیے بنیادی اصول وضع کرے دین صرف وہی ہے جس کی سند قرآن مجید یا نبی کی حدیث وسنت میں موجود ہے دین کے ماخذ صرف یہ دو ہی ہیں [ص ۱۰۴، محولہ بالا]

ماخذ سنت کی تعداد مختلف ہیں: میزان حصہ اول طبع ۱۹۸۵ء میں سنتیں وہی تھیں جن پر پوری امت ایمان رکھتی تھی اس کتاب میں سنت کی تعریف وتشریح کے لیے ان کا انحصار امام شاطبی کی کتاب الموافقات پر ہے۔ داڑھی ختنہ سنت میں شامل ہے [غامدی صاحب کا خط بنام شیر محمد اختر، ماہنامہ اشراق جون ۱۹۹۱ء، ص ۳۲] مئی ۱۹۹۸ء میں سنت کی فہرست آئی تو اس میں چالیس سنتیں شامل تھیں داڑھی شامل نہیں تھی [ماہ نامہ اشراق، شمارہ مئی ۱۹۹۸ء، ص ۳۵]، میزان طبع اپریل ۲۰۰۲ء میں سنتوں کی تعداد صرف ۲۷ رہ گئی۔ [غامدی میزان ص ۱۰، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء] فروری ۲۰۰۵ء میں سنتوں کی تعداد صرف ۱۸ رہ گئی۔ [غامدی، اصول ومبادی، ص ۱۰، ۱۱، ص ۳۲، طبع فروری ۲۰۰۵ء] میزان ۲۰۰۸ء میں سنتوں کی تعداد ......رہ گئی [ص ۱۴، میزان ۲۰۰۹ء میں نومولود کے کان میں اذان کی سنت بھی خارج ہوگئی اور تعداد صرف ......رہ گئی۔

اضافہ ۲۴ر مئی ۲۰۱۲ء

اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ ایک باطل کو دوسرے باطل کے ذریعے رفع کرتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اشرار خانقاہوں، گرجہ، معابد اور مساجد کو جہاں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے مسمار کرڈالتے

[۴۰:۲۲] غامدی صاحب اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے خلاف امت مسلمہ کو پیغام دے رہے ہیں کہ وہ اشرار کی حمایت کریں اور اللہ کی مقررہ سنت کی خلاف عمل کریں۔ جبکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی لا سنت اللہ تبدیلا اسلامی حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ اپنی فوج کے ذریعے ایک باطل کا خاتمہ کرے اور دوسرے باطل کو پنپنے کے بھرپور مواقع مہیا کرے جبکہ قرآن واضح طور پر بتاتا ہے کہ ایک اسلامی حکومت کے صرف چار کام ہیں: صلوٰۃ وزکوٰۃ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے نظام کا قیام ۔مگر قرآن سے یہ ثابت کرنا کہ اسلامی ریاست کا کام منکر کو مٹنے سے بچانا اور منکر کو بچانے کے لیے دوسرے منکر کو ختم کرنے میں اپنی قوت جھونک دینا اور اس قرآنی فریضے کی ادائیگی میں خود کو فنا کر دینا ہے محض جدیدیت ہے۔

جہاد [قتال] اب ختم ہو چکا ہے مسلمانوں کے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم وعدوان کے خلاف جنگ ہے اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے اس کے سوا کسی مقصد کے لیے دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی [میزان، ص ۶۰۱، ۲۰۰۸ء]——ایک جانب فرماتے ہیں کہ قتال کی صرف ایک یہی صورت باقی ہے لیکن ص ۵۹۴ پر قتال کی ایک اور صورت حضرت والا نے بیان فرمائی ہے قتال اس صورت میں بھی قیامت تک جاری رہے گا یہ قتال حتی لا تکون فتنہ [الانفال ۸:۳۹] فتنے کے خاتمے کے لیے ہے جسے قرآن نے اشد من القتل کہا ہے اس کے معنی ہیں کسی شخص کو ظلم و جبر کے ساتھ اس کے مذہب سے برگشتہ [Persecution] کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہ قتل سے زیادہ سنگین جرم ہے ۔ اللہ نے انسانوں کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے فیصلے سے جو دین اور جو نقطۂ نظر چاہیں اختیار کریں۔ لہٰذا کوئی شخص یا گروہ اگر دوسروں کو بالجبر ان کا دین چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے تو یہ درحقیقت اس دنیا کے لیے اللہ کی پوری اسکیم کے خلاف اعلان جنگ ہے فتنہ کے خلاف جنگ کا یہ حکم قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوا ہے فتنے کی یہ صورت کب اور کس صورت میں زندہ ہو جائے——اس لیے قرآن کا یہ حکم قیامت کے لیے باقی ہے اللہ کی زمین پر اس طرح کا کوئی فتنہ جب سر اٹھائے مسلمانوں کی حکومت اگر اتنی قوت رکھتی ہو کہ وہ اس کا استیصال کر سکے تو اس پر لازم ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لیے اٹھے اور اللہ کی اس راہ میں جنگ کا اعلان کر دے [غامدی صاحب کے فلسفے کی اگر تسہیل، تشریح، توضیح تبیین تفسیر تقریر کی جائے تو وہ مختصراً یہ ہوگی——مثلاً اگر کوئی عیسائی ریاست ہندوؤں کو عیسائی بنا رہی ہو یا یہودی ریاست عیسائیوں کو

جبراً یہودی بنارہی ہو یا بدھ ریاست ہندوعیسائی یہودیوں کو جبراً بدھ بنارہی ہو یا کمیونسٹوں دہریوں شیطان کے پجاریوں کوکوئی جبراً ٹھیک کررہاہو کہ اپنا مذہب چھوڑ کر صرف عقلیت پسند بن جاؤ تو اسلامی ریاست کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ہر دشمن حق، مذہب باطل پر قائم فرد کے باطل الحق کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑی ہواور ہر شخص کو عیسائی، ہندو، یہودی، کمیونسٹ، دہریہ شیطان کا پجاری بننے کے مکمل مواقع مہیا کرے تاکہ خدا کی اس اسکیم پر عمل ہوسکے کہ ہر شخص کے پاس الحق ہے دنیا میں وہ اس کے مطابق عمل کرے اور الحق والی اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ ہر الباطل کوحق سمجھ کر اس باطل پرست قوم کو باطل پر قائم رہنے کے لیے تعاون مہیا کرے اوراس مقصد کے اس باطل دشمن باطل سے ٹکرا جائے یعنی اسلامی حکومت دو باطلوں کوٹکرا کر ختم ہونے کی خدائی حکمت کے خلاف اٹھ کھڑی ہو باطل سے لڑکر اپنی قوت کم کرے اوراپنی قوت سے ایک مٹنے والے باطل کوقوت مہیا کرے تاکہ اسلامی ریاست ہمیشہ کم زور ہوتی رہے] غامدی صاحب کا یہ فلسفہ فکر اسلامی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا عجیب و غریب فلسفہ ہے جس پر جتنا بھی تعجب کیا جائے وہ کم ہے] مسلمانوں کے لیے قرآن کی یہ ہدایت ابدی ہے اسے دنیا کا کوئی قانون کبھی ختم نہیں کرسکتا[میزان، ص۵۹۴۔۵۹۵، ۲۰۰۸ء] قانون جہاد کے تحت غامدی صاحب نے دو مختلف موقف بیان کیے ہیں معلوم نہیں کون سا موقف درست ہے۔

غامدی صاحب پچاس سال سے علماء مدارس پر تنقید کر رہے ہیں کہ وہ عصر حاضر سے عصری مسائل سے مغرب سے لاعلم ہیں ان کی اپنی دنیا ہے جو تین سو سال پہلے ختم ہو چکی ہے ان کو شکوہ ہے کہ علماء، علوم جدیدہ، فلسفے، مغرب کو نہیں جانتے مگر وہ خود اور ان کا مکتب فکر جو دبستان شبلی کا وارث ہے — فلسفے — مغرب اور عصر حاضر سے کتنا واقف ہے اسے جاننے کے لیے اس مکتب کے کل علمی کام کا طائرانہ جائزہ لیتے ہیں۔

غامدی صاحب کی کتابوں کی فہرست ان کی تحریر کے مطابق درج ذیل ہے:

''چند دن پہلے ''میزان'' پایۂ تکمیل کو پہنچی تو خیال ہوا کہ اس موقع پر یہ داستان سنا دی جائے۔ اسی تقریب سے اپنے کام کا نقشہ یہاں بیان کر رہا ہوں۔ یہ کتابیں ہیں جن میں سے کچھ لکھی جا چکی اور کچھ زیر تصنیف ہیں: [۱] البیان — [۲] میزان — [۳] برہان — [۴] مقامات — [۵] الاسلام میزان کا خلاصہ ہے — [۶] علم النبی — [۷] فقہ النبی — [۸] سیرۃ النبی — یہ تینوں کتابیں احادیث و آثار کی جمع و تدوین اور ان کے متون کی تنقیح کے لیے ترتیب دینا چاہتا ہوں — [۹] خیال و خامہ — ''برہان''، ''مقامات''، اور ''خیال و خامہ'' شائع ہو چکی ہیں ان میں مضامین اور منظومات کا اضافہ، البتہ ہوتا رہتا ہے۔ ''میزان''، امید ہے کہ اس سال کے آخر تک شائع ہو جائے گی۔ ''البیان'' میں سورۂ نساء تک پہنچا ہوں — اس سے فارغ ہو گیا تو باقی عمران شاء اللہ حدیث کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گا [ص ۲۷، ۲۸، ذوق و شوق در مقامات طبع اول، نومبر ۲۰۰۸ء، المورد ۵۱ کے ماڈل ٹاؤن لاہور] — قانون دعوت ۱۹۹۶ء کے آخر میں غامدی صاحب نے الاشراق عربی الفاتحہ [زیر طبع] کا اشتہار دیا ہے اب اس کا ذکر غائب ہے اس سے پہلے قانون معیشت ۱۹۹۷ء المورد لاہور کے آخری صفحے پر غامدی صاحب نے اپنی تصانیف کی فہرست میں الاشراق [عربی] الملک تا الناس [زیر طبع] کا اشتہار بھی شائع کیا تھا لیکن اس کا بھی ذکر نہیں ہے شاید یہاں بھی حضرت والا ارتقاء فرما گئے ہیں۔ ایک چیز عربی میں تصنیف ہو چکی تھی زیر طبع تھی اب اس کا نام مسودوں کی فہرست میں ہی شامل نہیں ہے — غامدی صاحب کے شاگردوں کی تصانیف کا جائزہ پیش خدمت ہے [۲] ڈاکٹر محمد فاروق خان: ۔[۱] اسلام کیا ہے؟ — [۲] اسلام اور عورت — [۳] جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب — [۴] حدود اور قصاص و دیت آرڈیننس کا تنقیدی جائزہ — [۵] امریکہ اور عالم اسلام — [۶] مسئلہ کشمیر — [۷] جہاد و قتال اور عالم اسلام — [۸] اکیسویں صدی اور پاکستان —

[۹] مرد اور عورت سماجی تعلق کے اسلامی آداب — [۱۰] اسلامی انقلاب کی جدو جہد غلطی ہائے مضامین — [1] Dialogue with the West, [2] Islam and Woman, [3] Jehad Vs Terrorism, [4] Kashmir Issue, Perspective, Current situation & its solution.

[۳] خورشید احمد ندیم: (۱) اسلام اور پاکستان، (۲) پرویز صاحب کا فہم قرآن مقدمہ، علم کی اسلامی تشکیل، بیسویں صدی کا فہم اسلام — ان کے ادارے ORD کے تحت کئی کتابوں کے تراجم جو Asia فاؤنڈیشن کی مالی سرپرستی سے شائع ہوئے کچھ ترجمے محترم خورشید صاحب نے کیے ہیں — ان کی دیگر تالیفات — (۳) اسلام کا تصور جرم وسزا دو جلدیں، (۴) اسلام سول سوسائٹی اور نیا عالمی تناظر، (۵) مسلم تحریک نسواں، (٦) خاندان اور فرد، (۷) مسلم غیر مسلم تعلقات اسلامی تناظر، (۸) بیسویں صدی کا فہم اسلام — خورشید صاحب کے ادارے ORE ادارہ برائے تعلیم وتحقیق اسلام آباد نے جدیدیت پسند مسلم مفکرین کے مضامین ومقالات کے تراجم کثرت سے شائع کیے ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کے معاشرتی رویوں معاشرتی اقدار کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنا ہے خصوصاً عورتوں کی مسجد میں امامت پر سواد اعظم کو آمادہ کرنا، خورشید صاحب اسلامی ظریاتی کونسل کے ترجمان ''اجتہاد'' کے بھی مدیر رہے اخبارات میں کالم نگاری بھی کرتے ہیں — [۴] معز امجد منہج انقلاب نبوی، کتاب الطلاق، رسول اللہ پر ایمان کے تقاضے — [۵] رفیع مفتی تصویر کا مسئلہ، رسول اللہ کے نکاح ''سوال جواب'' میزان پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات یہ کتاب میزان کی شرح سمجھی جاتی ہے، سوال جواب [میزان کی تشریح]، فہم دین [چند اہم مباحث] — [٦] ریحان یوسفی مغرب سے مشرق تک سفر نامہ، عروج وزوال کا قانون اور پاکستان — عمومی مسائل پر دس کتابچے — [۷] عامر گزدر — (۱) نماز، زکوۃ، وغیرہ پر کچھ کتابچے — [۸] عمار ناصر راشدی:۔ براہین مذہبی اور تنقیدی مضامین — کتاب کا نام مرزا قادیانی کی براہین احمدیہ سے مماثل ہے اس کے علاوہ ایک کتاب حدود پر شائع ہوئی ہے حدود وتعزیرات: اس کتاب کا دیباچہ والد محترم جناب زاہد الراشدی صاحب نے لکھا ہے چند کتابچے، الشریعہ اور اشراق میں عام موضوعات پر خامہ فرسائی فرماتے ہیں — (۱۱) سلیم شہزاد، مغرب سے متعلق کوئی اہم علمی تحقیقی کام حضرت نے پیش نہیں فرمایا — عموماً عورت، کافرکون، قتال، خروج — جہاد — جیسے موضوعات پر مغرب کو

خوش کرنے والے افکار پیش فرماتے ہیں ـــ [۹] طالب محسن :۔ دلیل راہ [پچھلے چند برسوں میں لکھی گئی تحریروں کا مجموعہ] حج اور اس کی اہمیت، سیاست کے اسلامی اصول، تقویٰ کی اہمیت ـــ [۱۰] ساجد حمید :۔نسخہ ہائے ناتمام [اشراق میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ]۔ بدگمانی کیا ہے اس سے کیسے بچیں، ہم پر مشکلیں کیوں آتی ہیں دبستان شبلی کو دعویٰ ہے کہ وہ جدید وقدیم کا جامع ہے لیکن اس کے علمی سرمایے میں جدید وقدیم کی جامعیت پر مبنی ایک تصنیف بھی نظر نہیں آتی یہ دبستان جن اساتذہ سے کسب فیض کا مدعی ہے مثلاً فراہی اور اصلاحی صاحبان جو انگریزی اور فلسفے سے بخوبی واقف تھے ان کی کتب بھی جدید مباحث وعلوم سائنس وسوشل سائنس جدید فلسفہ، جدیدیت، مابعد جدیدیت، فلسفہ سائنس، فلسفہ ٹکنالوجی، فلسفہ ٹیکنو سائنس، لبرل ازم، کیپٹل ازم، سائنٹزم پر کوئی تنقید پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ حمید الدین فراہی صاحب کی کوئی کتاب عہد جدید کے فلسفے سائنس وٹکنالوجی اور لبرل ازم وسرمایہ داری سے کوئی بحث نہیں کرتی امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی کتابوں اور مضامین میں کہیں کہیں مغرب پر تنقیدی اشارات لکھے ہیں مگر یہ اشارات مولانا مودودی کی مغرب پر تنقیدات کا ہی خوبصورت عکس ہی ں مولانا مودودی کے نقد میں کوئی خاص اضافہ نہیں اصلاحی صاحب کی کتاب فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں فلسفے پر کچھ مباحث مل جاتے ہیں مگر جدید اور پس جدید فلسفے [Modern & Post Modern Philosophy] پر ان کی آراء ناپید ہیں۔ خود شبلی کا حال بھی یہی تھا وہ خود جدید مغربی علوم اور فلسفے کے قتیل تھے ۔۔۔۔ آخر عمر میں الحمد للہ وہ اس سے تائب ہو گئے تھے انھوں نے معتزلی عقائد سے توبہ کر لی تھی ان کا توبہ نامہ انتقال سے ساٹھ دن پہلے طبع ہو کر تقسیم ہوا اور اب ''حیات شبلی'' مولفہ سلیمان ندوی میں شامل ہے مگر کتاب نایاب ہے اصلاحی صاحب کی کتاب ''اسلامی ریاست'' جس ریاست کا نقشہ پیش کرتی ہے وہ مغرب کا چربہ ہے اصلاحی صاحب مغرب اور اسلام کا جہاں جہاں تقابل کر کے اسلام کی رواداری عظمت مغرب پر ثابت کرتے ہیں وہ درست نہیں ـــ

....

جاوید غامدی قرآن وسنت کو ماخذ قانون تسلیم نہیں کرتے!

ماخذات دین کے بارے میں اشراق کا نقطۂ نظر

جناب جاوید غامدی کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآن وسنت کو دین کا ماخذ سمجھتے ہیں اور جو شخص ان دو ماخذات کو ماخذ دین تسلیم نہ کرے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ زبانی طور پر غامدی صاحب تمام مکاتب فکر کو مسلمان تسلیم کرتے ہیں لیکن عملاً اور علماً وہ تمام مکاتب فکر کو دائرہ اسلام سے باہر سمجھتے ہیں کیونکہ سنت کی جو تعریف وہ متعین کرتے ہیں اس تعریف کو عالم اسلام کا کوئی مکتب فکر تسلیم نہیں کرتا اسلامی علمیت میں پہلے قرآن ہے پھر سنت غامدی صاحب اس ترتیب کو نہیں مانتے قرآن کی آیات کی جو تاویلات وہ پیش کرتے ہیں عالم اسلام میں کوئی مکتب ان کا ہم خیال نہیں ہے لہٰذا غامدی فرقے کے سوا تمام مکاتب فکر دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتے ہیں کیونکہ تمام مکاتب فکر سنت کی اس تعریف کو نہیں مانتے جو غامدی صاحب قرآن سے ثابت کرتے ہیں ان کے لفظوں میں سنت قرآن پر مقدم ہے اور سنت کی وہ تعریف جو غامدی صاحب نے طے کردی وہی قطعی ہے اور حجت ہے سنت کا اس کے سوا کوئی دوسرا مطلب نہیں اس دعوے کی تحقیق کے لئے ۱۹۷۵ء سے ۲۰۰۵ء تک غامدی صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ وہ دین کا ماخذ نہ قرآن کو مانتے ہیں نہ سنت کو۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ ماخذ قانون کبھی تبدیل نہیں ہوسکتا ماخذ کے اصول وقواعد غیر مبدل ہوتے ہیں لیکن غامدی صاحب قرآن و سنت کے دونوں ماخذات کی تعریف مسلسل بدلتے رہتے ہیں مثلاً قرآن کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن کی آیت کا مفہوم اس کے سیاق وسباق میں صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ [برہان ص ۲۵۶ سن ۲۰۰۶ء] قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز گنجائش نہیں ہوتی [اصول ومبادی ص ۵۷ سن ۲۰۰۵ء] لیکن ۱۹۷۵ء سے ۲۰۰۸ء تک غامدی صاحب نے پردہ، حجاب، سزائے قتل، خواتین، طلاق، دعوت اتمام حجت، مرتدین کی سزا، جہاد، خروج، انقلاب، غلبہ دین، استخلاف فی الارض، حدود ، زکوٰۃ کی شرح، مشرکین، اہل کتاب، بنی اسماعیل کے حوالے سے قرآن کی آیات کے تین تین اور چار چار مختلف معنی بیان کئے اس کی تفصیلات غامدی صاحب کی تحریروں برہان سن ۲۰۰۶ء اصول ومبادی سن ۲۰۰۰ء، اصول ومبادی سن ۲۰۰۵ء قانون دعوت سن ۱۹۹۶، دین کا صحیح تصور سن ۱۹۹۷ء میزان حصہ اول سن

۱۹۸۵ ، میزان سن ۲۰۰۲ اور اشراق اعلام کے تمام مجلدات میں تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً غامدی صاحب کے فلسفے میں پہلے قرآن کی رو سے عورت صرف طلاق لیتی تھی مرد طلاق دیتا تھا وہ کہتے تھے کہ مرد قرآن کی رو سے عورت کو حق طلاق تفویض نہیں کرسکتا یہ قرآن کے نص کی خلاف ورزی ہے اب عورت مرد کو طلاق دے سکتی ہے پہلے سنت سے ''ولی عورت کی مرضی کے بغیر نکاح نہیں کرسکتا تھا'' اب ولی کے بغیر عورت جس سے چاہے نکاح کرے پہلے مسلمان مرد مشرک عورت اور مسلمان عورتیں کسی مشرک اور اہل کتاب سے نکاح نہیں کرسکتی تھیں اب مسلمان عورتیں کسی بھی مشرک اور اہل کتاب سے نکاح کرسکتی ہیں۔ پہلے حکمران کا مرد وجیہہ اہل علم ہونا ضروری تھا اور اس کی دلیل حضرت طالوت والی آیت سے لی گئی تھی اب عورت بھی حکمران ہوسکتی ہے لہٰذا مسجد کی امامت بھی کرسکتی ہے پہلے جمہوریت قرآن وسنت کی رو سے باطل نظام تھا جس کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہ تھی اسلام اعیانی حکومت کا علمبردار تھا جس کی تفصیل اشراق جون ۱۹۸۹ء میں دیکھی جاسکتی ہے اب ٹی وی پر فرماتے ہیں کہ جمہوریت کو دین کے باب ایمانیات میں داخل کردینا چاہیے یہ ایمان کا مسئلہ ہے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے ظاہر ہے یہ غلط دعویٰ ہے اور ایمانیات میں نئے ایمان کا اضافہ الحاد کے سوا کچھ نہیں۔ پہلے بیوی شوہر کی اطاعت کی پابند تھی شوہر کی اطاعت قرآن کی نص سے ثابت کی گئی تھی لیکن ارتقاء کے بعد اب نص بدل گئی پہلے قرآن پہلا ماخذ تھا اور سنت وحدیث دوسرا ماخذ اب سنت قرآن پر مقدم ہے وہ پہلے ماخذ ہے اس کے بعد قرآن ماخذ قانون ہے پہلے قرآن کی رو سے تمام عورتوں کے لئے حجاب فرض تھا اور گھر سے باہر ہر عورت کے لئے پردہ لازمی تھا اب یہ حجاب صرف ازواج مطہرات کے لئے اور عورت کا سر پر یا سینے پر اوڑھنی ڈالنا لازمی نہیں ہے پہلے عورتوں مردوں کے میل جول کے آداب کا نام ''قانون حجاب'' تھا اب عربیت کی رو سے حجاب ٹاٹ کا وہ پردہ ہے جو گھروں پر لٹکایا جاتا ہے لہٰذا قرآن اور شریعت کا قانون حجاب غامدی صاحب کی عربیت کی رو سے ''قانون ٹاٹ'' ہوگیا ہے۔ بے چارے غامدی صاحب کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ حجاب کا اصل مطلب ٹاٹ کا ٹکڑا ہے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۶ء تک وہ قانون حجاب اور پردے کی وکالت خواہ مخواہ کرتے رہے معلوم نہیں یہ کیسی عربی ہے جس کا فہم اس قدر تاخیر سے ہوا پہلے سنت ثابتہ، سنت متواترہ، سنت وحدیث، ماخذات دین تھے اور ان ماخذات کا وجوب قرآن کی آیات سے ثابت کیا گیا تھا اب یہ سنتیں ماخذ نہیں رہیں یہ عجیب ماخذ قانون ہے جو مستقل بدل رہا ہے ایک ہی آیت سے کبھی کچھ ثابت

ہو رہا ہے کبھی کچھ اور ثابت کیا جاتا رہا ہے [ان تمام مباحث کے حوالے ساحل کے آئندہ شماروں میں حوالوں کے ساتھ ملاحظہ کیجیئے جس سے غامدی صاحب کے فکری ارتقاء کا اندازہ ہوگا جو ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا ہو بہو چربہ ہے]۔ سنت کے بارے میں بھی غامدی صاحب مسلسل نقطۂ نظر بدلتے رہتے ہیں لہٰذا سنت بھی ماخذ قانون نہیں رہا۔ الاعلام، اشراق کے شماروں میں سنت کے بدلتے ہوئے مفاہیم ان کی سیمابی علمیت کو واضح کر دیں گے۔ ۱۹۷۹ء میں غامدی صاحب سنت کا وہی مفہوم لیتے تھے جو جمہور اہل سنت اخذ کرتے ہیں ۱۹۸۲ء میں لکھتے ہیں سنت دین کا دوسری قطعی ماخذ ہے رسول کی حیثیت سے آپ کا ہر قول وفعل بجائے خود قانونی سند وحجت کی حیثیت رکھتا ہے آپ کو یہ مرتبہ کسی امام وفقیہہ نے نہیں دیا ہے خود قرآن نے آپ کا یہی مقام بیان کیا ہے کوئی شخص جب تک صاف صاف قرآن کا انکار نہ کر دے اس کے لئے سنت کی قانونی حیثیت کو چیلنج کرنا ممکن نہیں ہے۔ [برہان، ص ۳۸، سن ۲۰۰۶ء] سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآن مجید خاموش ہے بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ [برہان ص ۴۱] سنت کو جو منصب قرآن مجید نے خود اپنے متعلق عطا فرمایا ہے وہ شارح کا منصب ہے یہی وہ کام ہے جس سے دین کی تشکیل ہوتی ہے اس حیثیت سے سنت کے جو احکام وقواعد ہمیں مختلف ذرائع سے معلوم ہوتے ہیں ان کی پیروی ہم پر لازم ہے اور وہ بھی اسی طرح قیامت تک کے لئے واجب الاطاعت ہیں جس طرح قرآن [برہان ص ۴۷] وحی خفی کے ذریعے سے اگر کوئی چیز پیغمبر کو ملتی ہے تو وہ قرآن کا حصہ نہیں بن جاتی پیغمبر کی حدیث اور سنت ہی کہلاتی ہے [برہان ص ۵۱]۔ سنت کا کوئی حکم کبھی قرآن کے خلاف نہیں ہوتا [برہان ص ۵۷] حضرت علی نے رجم سے پہلے قرآن مجید کے مطابق کوڑے لگوائے اور سنت کے مطابق رجم کیا ہے [برہان ص ۶۴] سنت صرف اس طریقے ہی کو نہیں کہتے جس کی ابتداء کوئی نبی کرے بلکہ نبی کی تصویب وتقریر کے نتیجے میں بھی سنت قائم ہوتی ہے۔ [برہان، ص ۳۰۷]

میزان حصہ اول سن ۱۹۸۵ء کے صفحات ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۹ پر سنت سے متعلق یہی تفصیلات مل جائیں گی، اشراق جون ۱۹۹۱ء کے مطابق اپنے استاد شیر محمد اختر کے نام خط میں غامدی صاحب لکھتے ہیں۔ ''داڑھی، ختنہ، اور اس طرح کی بے شمار دوسری چیزوں میں سنت کو مستقل بالذات شارع مان کر ہی دین میں شامل قرار دیتا ہوں۔ وحی غیر متلو کے وجود سے مجھے انکار نہیں قرآن یہاں خاموش ہے وہاں ہمیں کوئی حکم صرف سنت ہی کے ذریعے ملا ہے اس طرح کے معاملات میں سنت کو

مستقل بالذات شارع مانتا ہوں اوراس کی اس حیثیت کے انکار کو بالکل ضلالت سمجھتا ہوں[اشراق جون ۱۹۹۱ص ۲۱] جنوری ۱۹۹۴ء کے اشراق میں لکھتے ہیں دین تین صورتوں میں ملا ہے، ۱۔قرآن ،۲۔سنت ثابتہ،۳۔حدیث[اشراق، جنوری ،ص۹۴] مارچ ۱۹۹۴ء میں ''اصول دین'' کے نام سے اشراق کے ص ۲۶ تا ۳۶ پر محیط بحث کا حاصل یہ ہے۔

نبیؐ سے یہ دین ہمیں دوصورتوں میں ملا ہے [۱] سنت ثابتہ [۲] حدیث احادیث کے بارے میں صحیح طرزعمل یہ ہے کہ وہ قرآن مجید سنت ثابتہ اور عقل وفطرت کی اساس پر قائم ہوں اور کسی بھی پہلو سے ان کے منافی نہ ہوں اس صورت میں ان احادیث کی حجیت مسلم ہے ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔[اشراق، ۴/ مارچ ۱۹۹۴ء،ص ۲۶ تا ۳۶] مئی ۱۹۹۴ء کے اشراق میں ص۱۲ پر حدیث وسنت کا فرق ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔''حدیث وسنت کے اسی فرق کی وجہ سے اس امت کے اکابر نے ہمیشہ حدیث کو سنت متواترہ کے بعد تیسرا بڑا ماخذ مانا ہے اور اسے ہمیشہ سنت متواترہ سے الگ رکھا ہے ''۔لیکن میزان طبع دوم اپریل ۲۰۰۰ص ۶۵ پر ارشاد فرماتے ہیں ''سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں علم وعقیدہ تاریخ ،شان نزول اور اس کی طرح کی دوسری چیزوں کا سنت سے کوئی تعلق نہیں سنت معنی پٹے ہوئے راستے کے ہیں سنت کا لفظ ہی اس سے اِبا کرتا ہے کہ ایمانیات کی قسم کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے لہٰذا علمی نوعیت کی کوئی چیز بھی سنت نہیں ہے اس کا دائرہ کرنے کے کام ہیں'' قبل ازیں ہر اس معاملے میں جہاں قرآن خاموش ہے سنت ماخذ قانون تھی [برہان ص ۴۱] یعنی علم ،عقیدہ، تاریخ ،شانِ نزول علمی نوعیت کے مسائل سب سنت میں داخل تھے لیکن سولہ سال میں غامدی صاحب کی عربی اور علمیت کا ارتقاء ہوگیا اور سنت کی تعریف اسی قرآن اِسی عربی کی روشنی میں یکسر بدل گئی یہ عجیب عربی ہے جس میں سنت کا مطلب ۱۹۸۴ء میں کچھ اور تھا سن دو ہزار میں کچھ اور ہو گیا جس طرح حجاب کا مطلب پہلے پردہ تھا ارتقاء کے بعد ٹاٹ کا وہ ٹکڑا ہو گیا جو آڑ کے لئے گھر پر لٹکا یا جاتا ہے۔۱۹۹۷ء میں ایک تقریر میں سنت کی تعریف فرماتے ہیں''سنت سے مراد آپؐ کا وہ طریقہ یا راستہ ہے جسے آپؐ نے ملت ابراہیمی کے اتباع میں اپنے پیروکاروں میں دین کی حیثیت سے جاری کیا سنت تمام تر عملی چیزوں پر مشتمل ہے اصولی اور نظریاتی معاملات قرآن میں بیان ہوئے ہیں قرآن تھیوری ہے سنت پریکٹس ہے آپؐ نے دین کا جو عملی طریقہ سکھایا وہ بھی دین کا حصہ ہے اس کا اتباع لازم ہے جس عمل پر مکمل

اتفاق نہ ہو وہ سنت نہیں سنت میں وسعت بھی ہوسکتی ہے کیونکہ رسول اللہ نے ایک ہی معاملے میں مختلف طریقوں پر عمل کی اجازت دی مثلاً حجۃ الوداع کے موقع پر ایک جگہ آپؐ بیٹھ گئے حاضرین نے سوالات کیئے آپؐ نے حج ایک خاص ترتیب سے ادا کیا تھا لوگ پوچھتے کہ ہم نے اس تربیت کو ملحوظ نہیں رکھا آپ فرماتے جاتے کوئی ہرج نہیں گویا یہ سب افعال جو صحابہ نے انجام دیے سنت کے دائرے کے اندر تھے رسول اللہ نے خود اس کی اجازت دی سنت کی تفصیلات ڈاکٹر جواد کی کتاب المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، خصری بکر کی کتاب تاریخ الشریع الاسلامی میں دیکھی جاسکتی ہے قرآن وسنت دونوں ایک سر چشمہ قدرت یعنی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اس لئے ان میں کوئی اختلاف تضاد نہیں ہوسکتا[۱۹۹۶ اور ۱۹۹۷ء میں کراچی اور لاہور میں مختلف تقاریر اور سوالات و جوابات پر مشتمل کیسٹوں سے اقتباسات]مئی ۱۹۹۸ء میں پہلی مرتبہ اشراق کے ص ۳۵ پر غامدی صاحب نے سنت کی ایک اور تعریف اور چالیس سنتوں کی فہرست پیش کی ''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبیؐ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا۔ اس سے پہلے جنوری ۱۹۹۸ء میں لاہور میں ایک تقریر میں چالیس سنتوں کی فہرست میں داڑھی شامل تھی لیکن اس فہرست سے داڑھی حذف کردی گئی کراچی کی ایک نشست میں سوال ہوا تو جواب ملا داڑھی فطرت ہے اس لئے اسے سنت سے خارج کردیا گیا اسی فہرست میں نماز جنازہ کو سنت ابراہیمی کہا گیا جبکہ عربوں میں نماز جنازہ کا رواج نہ تھا حضرت خدیجہؓ کی تدفین نماز جنازہ کے بغیر ہوئی شہدائے احد کی نماز جنازہ رسول اللہؐ نے بہت بعد میں ادا کی غامدی صاحب کے تمام دعوے اسی قسم کے ہیں اور جہاں موقف سے منحرف ہوتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ارتقاء ہوگیا ہے۔[کراچی، لاہور کی تقاریر کے اقتباسات]۱۹۹۹ میں سنتوں کی جو فہرست جاری ہوئی اس میں داڑھی اور انگلیوں کا خلال کرنا بھی سنت میں شامل تھا ۲۰۰۱ء تک یہ سنت برقرار رہی لیکن بعد میں یہ سنت ترک ہوگئی۔ یعنی داڑھی رکھنا فرض تھا اور خلال کرنا سنت اب داڑھی رکھنا فرد کی مرضی پر منحصر ہے۔

سن دو ہزار میں اصول ومبادی کے نام سے دانش سراء نے ایک کتابچہ شائع کیا۔ جس کے دیباچے میں غامدی صاحب نے اس کتاب کو معارف اسلامی کی تشکیل جدید [Re-construction

[of Religion Thought] کی حیثیت سے پیش کیا اس میں سنت کی یہ نئی تعریف پیش کی گئی۔''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبیؐ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے اس کے بعد سنتوں کو چالیس کے ہندسے میں محصور کرکے بیان کیا گیا ہے [اصول ومبادی ص ۸ سن ۲۰۰۰] پھر لکھتے ہیں ''سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے دین لاریب انہی دو صورتوں میں ہے اس کے سوا کوئی چیز نہیں ہے۔ میزان طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء منظر پر آئی تو اس کے ص ۱۰ پر سنتوں کی نئی فہرست بھی آئی اس فہرست میں تیرہ سنتیں کم کردی گئیں اور سنتوں کی تعداد صرف ۲۷ رہ گئی وضو، تیمّم، حرمین شریفین کی حرمت، ہدّی، طلاق، اشہر حرم، نماز جمعہ نماز کے لئے مساجد کا اہتمام اس فہرست سے خارج ہوگیا۔ فروری ۲۰۰۵ء میں اصول ومبادی کی تازہ اشاعت آئی تو اس میں سنتوں کی تعداد ۲۷ ہی رہی اور سنتوں کو عبادات، معاشرت، خورونوش اور رسوم وآداب کے عنوانات دیئے گئے لیکن ایک نئی سنت کا اضافہ کردیا گیا ۲۸ سالوں میں غامدی صاحب نے سنت کی کم ازکم ۲۸ تعریفیں پیش کی ہیں سوال یہ ہے کہ یہ کیسا قرآن ہے جس سے ۲۸ قسم کی مختلف اور متضاد سنتیں ثابت ہورہی ہیں اس کے باوجود ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی آیات سے ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز گنجائش نہیں [اصول ومبادی ص ۷۵ سن ۲۰۰۵ء] اس کا دوسرا مطلب یہی ہے کہ نہ قرآن ماخذ قانون ہے نہ سنت منبع قانون کیونکہ دونوں مسلسل بدل رہے ہیں اور ماخذ ومنبع کبھی تبدیل نہیں ہوسکتے اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا اخذ کریں کہ قرآن وسنت ماخذ قانون نہیں ہیں نفس غامدی ہی ماخذ ہے اگر شیطان غامدی صاحب کی اقلیم نفس سے ابھی تک باہر نہیں نکل سکا ہے تو غامدی صاحب اوران کا حلقہ اسے دنیا سے باہر کیسے نکال سکتا ہے۔ غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق ''ہر وہ چیز جو دین کی حیثیت سے حضورؐ سے ثابت نہیں ہے اسے دین کا حصہ قرار دینا بدعت ہے قرآن کا فرمان ہے کہ دین مکمل ہوچکا ہے اور باہر کی کسی چیز کو اسلام کا حصہ قرار دینا النساء ۱۳۵، المائدہ ۸ آل عمران ۸۵ کی روشنی میں غیر معقول رویہ ہے غامدی صاحب کی اس تصریح سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بدعتی ہیں کیونکہ وہ ۲۸ سال سے سنت کے نام پر رسول اللہ سے مختلف چیزیں منسوب کررہے ہیں اور نہایت ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اسے ارتقاء قرار دے کر سنتوں کی تعداد کبھی

بڑھا دیتے ہیں کبھی گھٹا دیتے یں مثلاً ۱۹۹۹ میں نواقض ۔ وضو، سنت میں شامل تھا لیکن حیض و جنابت کا غسل اس فہرست میں نہیں تھا البتہ میت کا غسل سنتوں کی فہرست میں شامل تھا بعد میں حیض ونفاس بھی سنت کے دائرے میں آ گئے یہ دین کے ساتھ مذاق ہے۔ دین شریعت سنت کا دائرہ غامدی صاحب جب چاہتے ہیں گھٹا دیتے ہیں جب چاہتے ہیں وسیع کر دیتے ہیں۔ اصول ومبادی کے دیباچے میں غامدی صاحب اس کتاب کو اپنے جلیل القدر استاد امام امین احسن اصلاحی کے فیض تربیت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اس کتاب میں قرآن وسنت کا بحیثیت ماخذ قانون رد ہوتا ہے کیونکہ اس میں قرآن وسنت کی بعض نئ تعبیریں شامل کی گئیں جو غامدی صاحب کے ماضی کے موقف کے برعکس اور استاد امین احسن اصلاحی کے طے شدہ اصولوں سے عدم مطابقت رکھتی تھیں امین احسن اصلاحی واضح طور پر لکھتے ہیں کہ خیر القرون میں کسی مفتی، قاضی کے سامنے کوئی معاملہ لایا جاتا تو وہ سب سے پہلے کتاب اللہ سے رجوع کرتا جب اس میں کوئی واضح بات نہ ملتی تو پھر رسول کی سنت میں دیکھتا آخر میں اجتہاد سے کام لیتا سنت رسول اللہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کتاب اللہ سے بالکل الگ ہو یا اس کے خلاف ہو یا کتاب اللہ کی مرکزیت کو نقصان پہنچانے والی ہو سنت رسول الٰہی کتاب اللہ کی تشریح وتفسیر ہے کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرنے کی جو ہدایت کی گئی ہے تو یہ کتاب اللہ سے الگ کسی چیز کی طرح رجوع کرنے کی ہدایت نہیں کی گئی بلکہ کتاب اللہ ہی کی اس توضیح وتشریح کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی گئی ے جو صحیح طریقے سے نبیؐ سے ماثور ومنقول ہے ہمارے محقق علماء نے سنت کی یہی حقیقت سمجھی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے چنانچہ انہوں نے اپنے زمانے کے منکرین حدیث وسنت کو جو جوابات دیے ہیں اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے ص ۱۹، ۱۲۰ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل امین احسن اصلاحی، حوالہ ۱۹۹۱ء فاران فاونڈیشن] امین احسن اصلاحی نے سنت کی تعریف متعین کر کے جاوید غامدی صاحب کی تعریف سنت کو مسترد کر دیا لہٰذا غامدی صاحب کا یہ لکھنا کہ اصول مبادی امین احسن اصلاحی کے فیضان تربیت کا نتیجہ ہے غلط بات ہے۔

اصلاحی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ”جس طرح سنت کتاب الٰہی سے کوئی الگ چیز نہیں ہے اس طرح اجتہاد رائے بھی کتاب الٰہی اور سنت سے علیحدہ کوئی شئے نہیں ہے اجتہاد رائے سے مراد یہ ہے کہ جن پیش آنے والے معاملات کے بارے میں قرآن یا سنت میں کوئی واضح بات موجود نہ ہو ان پر قرآن وسنت کے ارشادات کی رہنمائی میں غور کر کے یہ طے کرنا کہ ان میں کتاب اللہ اور سنت رسول سے

لگتی ہوئی بات کیا ہوسکتی ہے شریعت نے اس کے لئے جو شرطیں رکھی ہیں ان کی رو سے اس کے اہل دین کی نہایت پختہ سمجھ، کتاب وسنت کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتے ہوں پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا عملی اور اخلاقی درجہ اتنا بلند ہو کہ ان کی نسبت یہ شک شبہ نہ کیا جاسکتا ہو کہ وہ اللہ کے دین کے معاملے میں اپنی خواہشوں کو دراندازی کا موقع دیں گے [ص ۲۳ اسلامی ریاست فقہی اخلاقیات کا حل] غامدی صاحب اجتہاد کو ماخذ قانون نہیں مانتے ان کے استاد امین احسن اصلاحی اسے ماخذ تسلیم کرتے ہیں غامدی صاحب اجماع کو ماخذ نہیں مانتے لیکن اصلاحی صاحب اسے بھی ماخذ مانتے ہیں اصلاحی صاحب لکھتے ہیں صدر اول میں اجتہاد رائے کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے کوئی معاملہ آتا تو اس کو امیر یا اس کے مامور کے سامنے پیش کرتے معاملہ پیچیدہ ہوتا تو امیر اس کے لئے ارباب اجتہاد وفقہ کی مجلس شوریٰ بلاتا اس معاملے کو ان کے سامنے رکھتا پھر اجتماعی طور پر جو رائے طے پاتی اس کا اعلان کردیا جاتا یہی چیز ہے جس کو اجماع کہتے ہیں اور جس کو دین میں حجت ہونے کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ تمام فیصلے خلفائے راشدین نے خیر القرون کے ارباب علم واجتہاد کے مشورے سے کئے اس طرح کے فیصلوں کو ایک مستقل شرعی حجت کا درجہ حاصل تھا [ص ۲۸، فقہی اختلافات کا حل] غامدی صاحب اس مستقل شرعی حجت کو بھی ماخذ قانون نہیں مانتے اصلاً غامدی صاحب کا ماخذ قانون ان کا نفس ہے اس کے شریر تقاضوں کے تحت غامدی صاحب گزشتہ بیس سال سے اپنا موقف مستقل تبدیل کررہے ہیں اگر وہ امین احسن اصلاحی کو امام مانتے تو کم از کم ان کے اصول کے مطابق ماخذات کو تو تسلیم کرتے لیکن ان کا واحد ماخذ ان کی خواہش نفس ہے جو ان کا الٰہ ہے۔ کیا ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ غامدی صاحب قرآن وسنت کو ماخذ تسلیم کرتے ہیں یہ کیسا ماخذ ہے جو مسلسل بدل رہا ہے غامدی صاحب کے شاگرد جواب دیں گے کہ یہ استاد محترم کا ارتقاء ہے یہ جواب درست ہے لیکن جواب کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اصل ماخذ قانون استاد محترم کا فہم دین ہے جیسے جیسے اس میں ارتقاء ہوتا ہے وہ بدلتا ہے اسی طرح ماخذ دین بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن ظاہر ہے یہ ماخذات غامدی صاحب کے خود ساختہ دین کے ہوسکتے ہیں دین اسلام کے نہیں ہوسکتے [جو احباب غامدی صاحب پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں وہ کتابوں کی نقل ہم سے طلب کرسکتے ہیں]۔ غامدی صاحب کا ارتقاء اپنی نوعیت کا منفرد جہل ہے۔ ۱۹۹۰۔۱۹۹۱ میں غامدی صاحب ایک تقریر میں جو کراچی ولاہور میں کی گئی فرماتے ہیں کہ تمام فلاسفہ یونان یا عصر حاضر موحدین ہیں وجود خدا کے قائل ہیں اسی سے

ان کے فلسفے میں وحدت کا عنصر پیدا ہوتا ہے [تقاریر کے کیسٹ] لیکن ''مقامات'' میں ارتقاء ہو گیا انہی موحد فلاسفہ اور خدا کے پرستار فلسفیوں کے بارے میں فرماتے ہیں ''اس کی بنا اس اصول پر رکھی گئی ہے کہ اس عالم کا عقدہ کسی مابعد الطبیعیاتی اساس کے بغیر بھی کھل سکتا ہے اور انسان کا مسئلہ خود اس کے بنانے والے کی رہنمائی کے بغیر بھی حل ہوسکتا ہے اسی اصول پر مغرب میں فلسفہ سائنس عمرانیات دوسرے علوم و فنون کا ارتقاء پچھلی دو صدیوں میں ہوا ہے اور جسے ابھی تک مغربی فکر میں اصل اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مغرب میں سب اہل فکر خدا کے منکر نہیں ہو گئے لیکن ان کی فکر کا بنیادی مقدمہ خدا کے انکار ہی پر استوار ہے [ص ۱۴۱،۱۴۲ مقامات جولائی ۲۰۰۶ء] جس شخص کے ارتقاء کا یہ عالم ہو کہ چند سالوں پہلے فلاسفہ موحد تھے اب حامل کفر ہو گئے اس شخص کی علمی حیثیت ہی نہیں ذہنی حالت بھی مشکوک ہے افسوس ہے کہ ایسے لوگ ٹی وی کے ذریعے عہد حاضر میں عالم مشہور کر دیے گئے ہیں۔

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے
اس حادثہ وقت کو کیا نام دیا جائے

اگر سُنت میں اختلاف ہو جائے تو وہ سُنت نہیں رہے گی

غامدی صاحب کے اصول کے تحت سنت ماخذ قانون نہیں رہا

غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق دین کے صرف دو ماخذ ہیں۔قرآن اور سُنت ......سُنت مقدم ہے قرآن موخر، سُنت ازل سے ہے جب کہ قرآن تو آخری کلام ہے۔ غامدی صاحب نے سنت کے لیے یہ اصول مقرر فرمایا کہ سُنت میں اختلاف ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ سُنت پر امّت کا اجماع ہے اور سُنت کا تواتر و تسلسل قرآن سے زیادہ مستحکم ہے کیونکہ سُنت قرآن کے مقابلے میں زیادہ بڑے اجماع سے منتقل ہو رہی ہے لہٰذا سُنت میں جیسے ہی اختلاف ہو جائے گا وہ چیز سُنت ثابتہ نہیں رہے گی۔ لیکن غامدی صاحب نے اس خود ساختہ اصول کی نفی فرماتے ہوئے اب تک سُنت کی تعریف و تعین کے ضمن میں کئی موقف بدلے ہیں۔ غامدی صاحب کے مطابق پہلے سنتیں صرف چالیس تھیں ان میں داڑھی بھی شامل تھی پھر داڑھی فطرت ہوگئی سنتیں ۳۹ رہ گئیں، پہلے عورتوں کا ختنہ بھی سُنت میں شامل تھا پھر صرف مردوں کا ختنہ سُنت کے طور پر باقی رہ گیا۔ پہلے تمام سنتیں لازمی تھیں بعد میں بعض سنتیں ضروری، بعض لازمی بعض غیر ضروری غیر لازمی ہوگئیں۔ پہلے کم از کم دو کمروں کا مکان اور امام کا صاحب نصاب ہونا بھی سُنت ثابتہ تھا لیکن ۲۰۰۵ء میں سنتوں کی نئی فہرست سے یہ دونوں سنتیں بھی خارج ہوگئیں۔ سنتوں کے اخذ و ترک کے خود ساختہ اصولوں کا انجام یہی ہے کہ اب ان اصولوں کے تحت سُنت بحیثیت ماخذ دین باقی نہیں رہی، نعوذ باللہ۔ لہٰذا غامدی صاحب کے طے شدہ اصول کے تحت ان کی بیان کردہ سنتیں اب سنتیں نہیں رہیں اور دین کا پہلا ماخذ سُنت جو قرآن پر مقدم ہے۔ غامدی صاحب کے فلسفے کے تحت نابود ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں جب سُنت ان کے وضع کردہ اصول دین کے تحت سُنت نہیں رہی تو دین کا پہلا ماخذ خود بخود کالعدم ہو گیا۔ صاف صاف بات کی جائے تو اصلاً غامدی صاحب کے نزدیک اب دین کا ایک ہی ماخذ ہے وہ قرآن مجید ہے۔ یہ بھی کب تک بحیثیت ماخذ باقی رہ سکے گا اس کے لیے غامدی صاحب کے ارتقاء تک انتظار فرمایے۔ ساحل]

قرآن دین کی آخری کتاب ہے اس سے پہلے دنیا میں دین موجود تھا اور لوگوں کو معلوم تھا۔ اب سوچیے کہ آخری کتاب جو آئے گی تو کیا وہ دنیا میں پہلے دن سے آئے ہوئے دین کو بیان کرنا شروع کر

دے گی۔ ظاہر ہے ایسا نہیں ہوسکتا۔ عقل عام کہتی ہے کہ جو دین محفوظ ہے اس کی تصدیق کردے گی اس کی تفصیل بیان نہیں کرے گی اور اگر دین میں کوئی نئی بات کہنی ہے تو وہ کہہ دے گی۔ مثلاً آج اگر اللہ تعالیٰ کی کوئی کتاب نازل ہو تو کیا وہ آپ کو یہ سکھائے گی کہ لوگو! نماز ایسے پڑھو عقل عام اس کا جواب نفی میں دے گی کیونکہ نماز تو پہلے سے دین کی حیثیت سے پڑھی جارہی ہے۔ البتہ اس نماز کے اندر کوئی غلطی ہوگئی ہے کوئی خرابی ہوگئی ہے تو بس اس کی تصحیح کردے گی۔ عقل عام یہی کہتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن مجید نے جو دین ہم کو دیا ہے وہ پہلی مرتبہ نہیں دیا بلکہ جو دین پہلے سے موجود تھا۔ قرآن اس دین کا پہلی بار دینے والا نہیں ہے اس کا مجدد ہے اس دین کو قرآن نے زندہ کیا ہے، اس دین میں کوئی خرابی تھی تو اس کی اصلاح کی ہے۔ مثال کے طور پر پانچ وقت نماز یہ بات قرآن اور تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ ہمیشہ سے دنیا میں ہے وہ سب لوگ نماز کو پڑھتے رہے جو اللہ کے دین کو ماننے والے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ سب نماز پڑھتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری، اپنے ایمان لانے کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعہ مسند احمد کی مشہور روایت ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب مکہ کے باہر آ کر انھوں نے پڑاؤ ڈالا تو میرے بھائی مکہ گئے اور پہلی بار ان کو معلوم ہوا کہ ایک شخصیت نے یہاں نبوت کا دعویٰ کردیا ہے۔ اس موقع پر حضرت ابوذر کا جملہ ہے کہ میں اس اطلاع سے تین سال پہلے سے نماز کا پابند ہوگیا تھا۔ تاریخ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیے رسول اللہؐ سے بہت پہلے حضورؐ کے دادا قصی دارالندوہ میں جمعہ کے خطیب تھے اور خطبہ جمعہ رسالت مآبؐ کی آمد سے پہلے دیا کرتے تھے۔ حج کے بارے میں تو گفتگو کی ضرورت ہی نہیں وہ حضور سے بھی صدیوں پہلے ہو رہا تھا لوگ حج کرتے تھے اور حج کے وہی مناسک ادا کیے جاتے تھے جو لوگ آج بھی ادا کر رہے ہیں۔ زکوٰۃ تورات میں بھی موجود ہے اور بنیا سرائیل کے یہاں بھی زکوٰۃ دی جاتی تھی۔ قرآن مجید نے آ کر صلوٰۃ و زکوٰۃ حج وصوم کو متعارف نہیں کرایا۔ قرآن میں ہے کہ روزے تم پر اسی طرح فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلوں پر...... اس کا مطلب یہ ہے کہ سارا دین پہلے سے موجود تھا۔ پیغمبروں کے ذریعے دین دنیا کو مل چکا تھا۔ قرآن نے اس دین پر عمل کی تلقین کی۔ اس میں کوئی غلطی پیدا ہوگئی تھی تو اس کی اصلاح کی اور کسی چیز میں کوئی تبدیلی کرنا تھی تو وہ کردی۔

جو کچھ ہو رہا تھا یہ پیغمبروں کا مسلمہ Establish طریقہ تھا جسے سُنت کہا جاتا ہے یعنی سُنت کچھ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ مسلمہ طریقہ جو پہلے سے جاری تھا اور جس طریقے سے رسول اللہؐ نے قرآن کی

ہدایت کے مطابق چھوٹی موٹی اصلاح کردی مثلاً قربانی پہلے سے جاری تھی، رسول اللہؐ سے پوچھا گیا کہ قربانی کیا ہے؟ فرمایا حضرت ابراہیمؑ کی سُنت ہے۔ عرب میں جو دین تھا وہ انھیں حضرت ابراہیم سے منسوب کرتے تھے۔ اس کے لیے عرب دین ابراہیمی کی اصطلاح استعمال کرتے تھے اس لیے قرآن میں سورہ نحل کی آیت ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبرؐ کی طرف وحی کی کہ اے پیغمبرؐ پیروی کرو ابراہیمؑ کے طریقے کی وہ ایک یکسو مسلمان تھا کسی مذہب شرک کا پیرو نہ تھا۔ [۱۶/۳۱]

اس آیت کے ذریعے رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا کہ جو دین ابراہیم کے زمانے سے مل رہا ہے آپ کو اس کی پیروی کرنا ہے۔ لہٰذا جس چیز کو سُنت کہا جاتا ہے وہ یوں نہیں ہے کہ پہلے قرآن آیا اور اس نے کہا کہ نماز پڑھیے پھر حضور نے بتانا شروع کیا کہ نماز ایسے پڑھی جائے گی۔ نماز پڑھی جارہی تھی، روزہ رکھا جارہا تھا، حج کیا جارہا تھا، زکوٰۃ دی جارہی تھی ان میں کچھ بدعتیں داخل ہوگئیں تھیں۔ قرآن نے اور پیغمبر نے ان کی اصلاح کی، ان کو درست کیا اور اسے جاری کردیا۔ لہٰذا سُنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی اکرمؐ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا لہٰذا یہ دونوں چیزیں مل کر وہ دین بن جاتی ہیں جو محمدؐ سے صادر ہوا۔

سُنت کیا ہے اس پر غور کریں تو سُنت مقدم ہوجاتی ہے قرآن موخر ہوجاتا ہے یعنی وہ طریقہ جو ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حضورؐ کے زمانے تک مسلمہ دین کی حیثیت رکھتا تھا وہ سُنت ہوگئی۔ وہ دراصل سُنت ابراہیمی ہے اور آپؐ کی تصویب سے ہم تک پہنچی۔

سُنت ہمیں کیسے ملی ہے؟ سُنت کے بارے میں یہ بات قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے سُنت بھی صحابہ اور ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے۔ سُنت قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی۔ بچہ آنکھ کھولتا ہے تو قرآن مجید سے واقف ہوجاتا ہے۔ اس طرح نماز اور حج سے واقف ہوجاتا ہے۔ اجماع کا مطلب ہے کہ پوری امت کا علم اس بات پر متفق ہوتا ہے یہ بات کہ سُنت بخاری اور مسلم سے لیں گے مناسب جواب نہیں۔ جس طرح قرآن امت کے اجماع سے لیا ہے سُنت بھی امت کے اجماع سے لیں گے دونوں بالکل یکساں حیثیت سے منتقل ہوئے ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ سُنت زیادہ بڑے اجماع سے منتقل ہورہی ہے۔ اس لیے کہ نماز پڑھنے والوں کی تعداد اور قرآن

کے حفاظ کی تعداد گن کر دیکھ لیجیے اس لیے سُنت کے معاملے میں کسی ادنیٰ تردد کی بھی ضرورت نہیں۔

قرآن کے بارے میں معلوم ہوگیا کہ یہ ۶۶۶۶ آیتوں کا مجموعہ ہے۔ سُنت کی تعریف کو نظر میں رکھ کر جب ہم امت کے علمی ذخیرے کا جائزہ لیتے ہیں تو جیسے قرآن بالکل محکم طریقے سے مل جاتا ہے ویسے ہی سُنت بھی محکم طور پر مل جاتی ہے یعنی سُنت کی فہرست لکھوائی جاسکتی ہے کہ یہ سُنت ہے۔ اس فہرست میں صرف چالیس سنتیں شامل ہیں جن پر صحابہ کا اجماع عملی ہے۔

سُنت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے بشرطیکہ آپ یہ مان لیں کہ سُنت وہ ہے جسے رسول اللہ نے دین کی حیثیت سے جاری کیا اور اس پر پوری امت کا اجماع ہوگیا۔ سُنت میں اختلاف کیسے ہوجائے گا؟ جیسے ہی اختلاف ہوجائے گا وہ چیز سُنت ثابت نہیں ہوگی، اجماع اس کی لازمی شرط ہے۔ جیسے قرآن میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا سُنت میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ [دانش سراء کراچی میں محاضرات ۹۸ء کی ریکارڈنگ سے ماخوذ]

سُنت کیا ہے؟: ۱۹۹۲ء میں غامدی صاحب کے خیالات

رسول کا ہر قول و فعل قانونی سند و حجّت ہے:

سُنت کا انکار۔ قرآن کا انکار ہے:

سُنت قرآن مجید کے بعد دین کا دوسرا قطعی ماخذ ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اصول ایک ناقابل انکار علمی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ہدایات قیامت تک کے لیے اسی طرح واجب الاطاعت ہیں، جس طرح خود قرآن واجب الاطاعت ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے بعد آپ کا کام ختم ہوگیا۔ رسول کی حیثیت سے آپ کا ہر قول و فعل بجائے خود قانونی سند و حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کو یہ مرتبہ کسی امام و فقیہ نے نہیں دیا ہے، خود قرآن نے آپ کا یہی مقام بیان کیا ہے۔ کوئی شخص جب تک صاف صاف قرآن کا انکار نہ کردے، اس کے لیے سُنت کی اس قانونی حیثیت کو چیلنج کرنا ممکن نہیں ہے۔ قرآن نے غیر مبہم الفاظ میں فرمایا ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے ہر امر و نہی کی بے چون و چرا تعمیل کی جانی چاہیے:

''اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اِذن سے اس کی اطاعت کی جائے''۔[النساء۴:۶۴]

قرآن کے خاموش مقامات کی شرح سُنت رسول اللہ ہے:

سُنت کے یہ اوامر ونواہی دو قسم کے معاملات سے متعلق ہو سکتے ہیں: ایک وہ جن میں قرآن مجید بالکل خاموش ہے اور اس نے صراحتۃً یا کنایۃً کوئی بات نہیں فرمائی ہے اور دوسرے وہ جن میں قرآن مجید نے نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم دیا ہے یا کوئی اصول بیان فرما دیا ہے۔ پہلی قسم کے معاملات میں اگر سُنت کے ذریعے سے کوئی حکم یا قاعدہ ہمیں پہنچے تو اس کے بارے میں باعتبار اصول کسی بحث ونزاع کا سوال نہیں ہے۔ اس طرح کے معاملات میں سُنت بجائے خود مرجع و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان معاملات میں ہمارا دائرۂ عمل بس یہ ہے کہ ہم ان کا مفہوم ومنشا متعین کریں اور اس کے بعد بغیر تردد کے ان پر عمل پیرا ہوں۔

نسخ وترمیم کے اس اختیار کی تردید کے بعد زیادہ سے زیادہ جو بات اس سلسلہ میں کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ سُنت قرآن کی تبیین کر سکتی ہے۔ قرآن مجید کی جو آیت اس کے حق میں بالعموم پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے:

''اور ہم نے تم پر بھی یہ ذکر اتارا ہے تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو واضح کر دو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے''۔[النحل۱۶:۴۴]

آیت کا مدعا یہ ہے کہ خالق کائنات نے اپنا یہ فرمان محض اس لئے پیغمبر کی وساطت سے نازل کیا ہے کہ وہ لوگوں کے لئے اس کی تبیین کرے۔ گویا ''تبیین'' یا ''بیان'' پیغمبر کی منصبی ذمہ داری بھی ہے اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر اس کا حق بھی جو اسے خود پروردگار عالم نے دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر مامور من اللہ 'مبین کتاب' ہے۔ پیغمبر اور قرآن کا یہی وہ تعلق ہے جسے فن اصول کی شہرۂ آفاق کتاب ''الموافقات'' کے مصنف امام شاطبیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

''سُنت یا قرآن کا بیان ہوگی یا اس پر اضافہ۔ پس اگر وہ بیان ہے تو اس کا مرتبہ اس چیز کے مقابلے میں ثانوی ہے جس کا وہ بیان ہے، اور اگر بیان نہیں ہے تو

اس کا اعتبار صرف اس صورت میں ہوگا، جبکہ وہ چیز جو اس میں مذکور ہے، قرآن مجید میں نہ پائی جائے‘‘۔ [۵/۴]

سُنت قرآن کے خاموش مقامات کے لیے ماخذ قانون کے حکم میں ہے:

شاطبی کے اس بیان سے واضح ہے کہ سُنت ہر اس معاملہ میں، جس میں قرآن مجید خاموش ہے، بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اگر کوئی چیز قرآن مجید میں مذکور ہے تو سُنت صرف اس کی ''تبیین'' کرسکتی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اس سے زیادہ کوئی اختیار سُنت کو حاصل نہیں ہے۔

قرآن مجید سے متعلق سُنت کے اس اختیار کی وضاحت کے بعد اب غور طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ''تبیین'' کے معنی کیا ہیں؟ اس کی جامع و مانع منطقی تعریف کیا ہے؟ اور اس تعریف کی رو سے کیا چیز 'تبیین'' قرار پاتی ہے اور کس چیز کو 'تبیین' قرار دینا ممکن نہیں ہے؟

سنت: 'تبیین' کا مفہوم محض شرح قرآن ہے

'تبیین' عربی زبان کا ایک معروف لفظ ہے۔ اس کے معنی محض 'بیان کردینے' کے بھی ہیں اور 'واضح کرنے' اور 'واضح ہونے' کے بھی۔ آیۂ زیر بحث میں چونکہ یہ اپنے مفعول یعنی 'ما نزل الیھم' کی طرف متعدی ہو کر استعمال ہوا ہے، اس وجہ سے یہاں اس کے معنی 'واضح کرنے' ہی کے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ جب کسی کلام کے لئے آئے گا تو اس کا مفہوم ٹھیک وہی ہوگا جس کے لئے ہم لفظ 'شرح' بولتے ہیں۔ قرآن مجید اور کلام عرب، دونوں میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ میں جہاں نبی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس مقام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود چونکہ اللہ کے اس حکم پر عمل کرنے سے گریزاں تھے، اس لیے انھوں نے 'ان تذبحوا بقرۃ' کے حکم کو، جس میں لفظ 'بقرۃ' کے نکرہ کی صورت میں آنے کے باعث یہ بات بالکل واضح تھی کہ انھیں کوئی سی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جب اپنے خبث باطن کی وجہ سے غیر واضح قرار دے دیا اور اللہ تعالیٰ سے اس کی شرح و وضاحت کے طالب ہوئے تو انھوں نے بار بار یہی لفظ استعمال کیا۔

سنت: تبیین کے تین اہم معانی:

قرآن مجید اور کلام عرب کے شواہد سے صاف واضح ہوتا ہے کہ 'تبیین' کا لفظ کسی معاملے کی

حقیقت کو کھول دینے، کسی کلام کے مدعا کو واضح کر دینے اور کسی چیز کے خفا کو دور کر کے اسے منصۂ شہود پر لانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ یہود نے جب کلام کے واضح مفہوم سے گریز کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ تو بس متکلم کا منشا معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بار بار یہی لفظ 'تبیین' استعمال کیا۔ اعشیٰ کا ممدوح چند اوصاف کا حامل تھا، لیکن جب مخالفوں نے انھیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اعشیٰ نے ان میں سے ایک ایک کو دلائل کے ساتھ نمایاں کر دیا اور وہ پردۂ خفا سے نکل کر عالم ظہور میں آ گئے تو اس نے اسے ''تبیین'' قرار دیا۔ دنیا کے خالق نے سال کو مہینوں اور مہینوں کو دنوں میں تقسیم کیا تو ان کی ایک ابتدا بھی وجود میں آئی اور ایک نصف بھی، لیکن دنوں کے الٹ پھیر کی وجہ سے جب اس ابتدا اور اس نصف کے غیاب میں چلے جانے کا اندیشہ ہوا تو چاند کے منازل سے اس کی 'تبیین' کر دی گئی۔ گویا 'تبیین' کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی، جسے باہر سے لا کر کسی بات، کسی معاملے یا کسی کلام کے سر پر لا د دیا جائے۔ وہ کسی بات کی وہ کنہ ہے جو ابتدا ہی سے اس میں موجود ہوتی ہے، آپ اسے کھول دیتے ہیں۔ وہ کسی کلام کا وہ مدعا ہے جو اس کلام کی پیدائش کے وقت ہی سے اس کے ساتھ ہوتا ہے، آپ اسے واضح کر دیتے ہیں۔ وہ کسی چیز کا وہ لازم ہے جو شروع ہی سے اس کے وجود کی حقیقت میں پوشیدہ ہوتا ہے، آپ اس کو منصۂ شہود پر لے آتے ہیں، 'تبیین' کی حقیقت اس سے بال برابر زیادہ ہے نہ کم۔ آیۂ نحل میں یہ لفظ کلام خداوندی کے لیے استعمال ہوا ہے، اس وجہ سے وہاں اس کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ متکلم کا وہ ارادہ جو ابتدا ہی سے اس کے کلام میں موجود ہے، اسے واضح کر دیا جائے۔

سُنت اصلاً اللہ کے منشاء کی شرح ہے:

'تبیین' کے اس لغوی مفہوم کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے اگر اس کی تعریف متعین کرنا پیش نظر ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں:

> ''تبیین کسی کلام کے متکلم کے اس مدعا کا اظہار ہے جسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے وہ اس کلام کو ابتداء وجود میں لایا تھا''۔

یہی مفہوم ہے جس کے لیے ہم اپنی زبان میں لفظ 'شرح' بولتے ہیں۔ شرح بس شرح ہے۔ ہر شخص جتنا جانتا ہے کہ اس لفظ کا اطلاق کسی ایسی ہی بات پر کیا جا سکتا ہے جس کے بارے میں آپ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ فی الواقع اس کلام کے متکلم کا منشا ہے جس کی طرف آپ وہ بات منسوب کر رہے

ہیں۔ آپ کسی کلام سے متعلق کچھ فرماتے ہیں اور پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کا یہ ارشاد اس کلام کی شرح ہے تو اسے محض آپ کے ارشاد کی بنا پر تسلیم نہیں کر لیا جائے گا۔ ہر عاقل آپ سے مطالبہ کرے گا کہ اپنے اس قول کی دلیل بیان فرمائیے۔ وہ آپ سے پوچھے گا کہ جو کچھ آپ متکلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں کیا اس کے الفاظ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے اس پر دلالت کرتے ہیں؟ کیا اس کے جملوں کی ترکیب کا نحوی تقاضا یہ ہے جو آپ بیان فرما رہے ہیں؟ کیا جملوں کے سیاق وسباق کی دلالت سے آپ نے یہ معنی اخذ کیے ہیں؟ کیا یہ متکلم کی عادت مستمرہ ہے کہ وہ اس طرح کے الفاظ جہاں استعمال کرتا ہے، اس سے وہی کچھ مراد لیتا ہے جو آپ نے فرمایا ہے؟ کیا عقل عام کا ناگزیر اقتضا ہے کہ آپ کے اس ارشاد ہی کو متکلم کا منشا قرار دیا جائے؟ آپ کسی کلام سے متعلق کسی بات کو 'شرح' یا 'تبیین' قرار دینا چاہتے ہیں تو اپنے قول کو ثابت کرنے کے لیے ان دلائل میں سے کوئی دلیل آپ کو لازماً پیش کرنی ہوگی۔ اس طرح کی کسی دلیل کے بغیر کوئی بات نہ 'شرح' قرار پا سکتی ہے نہ 'تبیین'۔ شرح وتبیین کے الفاظ اپنے معنی ہی کے اعتبار سے اس طرح کی کسی دلیل کے متقاضی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض اہل تحقیق نے 'تبین' یا 'بیان' کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> ''بیان وہ دلیل ہے جو صحیح استدلال کے ذریعے سے اس چیز کے علم کے حصول تک پہنچاتی ہے جس پر وہ دلالت کرتی ہے''۔ [کشف الاسرار، علاء الدین عبدالعزیز ۳/۱۰۵]

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ 'تبیین' تو بس متکلم کے اس فحویٰ کا اظہار ہے جو ابتدا ہی سے اس کے کلام میں موجود ہوتا ہے۔ کسی کلام کے وجود میں آنے کے بعد جو تغیر بھی اس کلام کی طرف منسوب کیا جائے گا، آپ اسے 'نسخ' کہیے یا 'تغیر وتبدل' اسے 'تبیین' یا 'بیان' یا 'شرح' بہر حال قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے اصول میں سے جن لوگوں کی نگاہ لفظ کی اس حقیقت پر رہی ہے، انھوں نے 'تبیین' کی تعریف میں یہ بات پوری طرح واضح کر دی ہے۔ امام بزدوی نے علم اصول پر اپنی کتاب میں شمس الائمہ کی تعریف نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''بیان کا اطلاق اس شے پر کیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے اس شے کا ابتدا ہی سے کلام میں موجود ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ رہا وہ تغیر جو کلام کے وجود میں آنے

کے بعد کیا جائے تو وہ نسخ ہے۔اسے بیان قرار نہیں دیا جا سکتا''۔

سُنت قرآن کی شارح محض ہے:

لفظ 'تبیین' کے معنی، اس کی تعریف اور اس کے حدود کی تعیین کے بعد اب یہ بات کسی پہلو سے مبہم نہیں رہی کہ سُنت کو جو منصب قرآن مجید نے خود اپنے متعلق عطا فرمایا ہے، وہ شارح کا منصب ہے۔شارح کی حیثیت سے سُنت قرآن مجید کے مضمرات کو کھولتی، اس کے عموم و خصوص کو بیان کرتی اور اس کے مقتضیات کو واضح کرتی ہے۔سُنت کا یہ کام کوئی معمولی نہیں ہے۔یہی وہ کام ہے جس کے نتیجے میں دین کی تشکیل ہوتی اور زندگی کے گونا گوں احوال کے ساتھ اس کا تعلق استوار ہوتا ہے۔اس حیثیت سے سُنت کے جو احکام و قواعد ہمیں مختلف ذرائع سے معلوم ہوتے ہیں، ان کی پیروی، جیسا کہ ہم نے اس بحث کے آغاز میں بیان کیا ہے، ہمارے لئے لازم ہے اور وہ بھی اسی طرح قیامت تک کے لیے واجب الاطاعت ہیں، جس طرح خود قرآن واجب الاطاعت ہے۔علمائے اصول میں جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کی نعمت سے نوازا ہے، انھوں نے سُنت کے معاملے میں یہی بات فرمائی ہے۔حدیث و سُنت کے صاحب البیت امام احمد بن حنبل سے متعلق روایت ہے:

''فضل بن زیادہ کہتے ہیں کہ احمد بن حنبل سے حدیث: 'ان السنة قاضية'' کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: میں یہ کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا کہ سُنت کتاب اللہ پر قاضی ہے۔سُنت تو کتاب اللہ کی شرح و تفسیر کرتی ہے۔فضل کہتے ہیں کہ میں نے ان کا یہ ارشاد بھی سنا کہ: سُنت قرآن مجید کی کسی بات کو منسوخ نہیں کرسکتی۔قرآن کو صرف قرآن منسوخ کرسکتا ہے''۔[جامع بیان العلم، ابن عبدالبر ۲/۲۳۴]

سُنت قرآن کی شرح و تفسیر ہے:

یہی بات ایک دوسرے اسلوب میں امام شاطبی نے ''الموافقات'' میں واضح کی ہے:

''سُنت کے کتاب پر قاضی ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسے کتاب پر مقدم ٹھیرایا جائے اور کتاب کو اس کے مقابلے میں چھوڑ دیا جائے، بلکہ جو کچھ سُنت میں بیان کیا جاتا ہے، وہ کتاب کی مراد ہوتا ہے۔گویا سُنت احکام کتاب کے

معانی کے لیے شرح وتفسیر کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی بات قرآن مجید کی آیت: ''**لتبین للناس**''میں واضح کی گئی ہے''۔[۷/۴]

اس کے بعد امام موصوف نے قطع ید کی سزا کے بارے میں بعض تشریحات مثلاً لفظ 'ید' کے معنی ،مال مسروق کی مقدار اور 'حرز' وغیرہ کے شرائط کا حوالہ دیتے ہوئے مزید وضاحت کی ہے:

''سُنت کی یہ تشریح درحقیقت آیت کا مفہوم و مدعا ہے۔ہم یاہ نہیں کہیں گے کہ سُنت نے یہ احکام قرآن کے علاوہ دیے ہیں۔جس طرح کہ امام مالک یا کوئی دوسرا مفسر کسی آیت یا حدیث کے معنی بیان کرتا ہے اور ہم اس کے معنی کے مطابق عمل کرتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے فلاں مفسر کے قول کے مطابق عمل کیا ہے۔اس کے بجائے ہم یہی کہیں گے کہ ہمارا عمل اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق ہے۔یہی معاملہ قرآن کی ان تمام آیات کا ہے جن کی 'تبیین' سُنت نے کی ہے۔لہٰذا سُنت کے کتاب اللہ پر قاضی ہونے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کتاب اللہ کی شارح ہے''۔[۸/۴]

سنّت کسے کہتے ہیں؟ ۲۰۰۲ء میں غامدی صاحب کا نیا مؤقف

اب رسول کا ہر قول و فعل حجّت نہیں رہا

سُنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن میں اس کا حکم آپ کے لئے اس طرح بیان ہوا ہے:

ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا، وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ. [النحل ۱۶ـ۱۲۳]

''پھر ہم نے تمھیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا''۔

اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے، وہ یہ ہے:

[۱] اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ [۲] ملاقات کے موقع پر السلام علیکم، اور اس کا جواب۔ [۳] چھینک آنے پر ''الحمدللہ'' اور اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ''۔ [۴] نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت۔ [۵] مونچھیں پست رکھنا۔ [۶] زیر ناف کے بال مونڈنا۔ [۷] بغل کے بال صاف کرنا۔ [۸] لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ [۹] بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ [۱۰] ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ [۱۱] استنجا۔ [۱۲] حیض و نفاس میں زن و شوہر کے تعلق سے اجتناب۔ [۱۳] حیض و نفاس کے بعد غسل۔ [۱۴] غسلِ جنابت۔ [۱۵] میت کا غسل۔ [۱۶] تجہیز و تکفین۔ [۱۷] تدفین۔ [۱۸] عید الفطر۔ [۱۹] عیدالاضحیٰ۔ [۲۰] اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تزکیہ۔ [۲۱] نکاح وطلاق اور ان کے متعلقات۔ [۲۲] زکوٰۃ اور اس کے متعلقات۔ [۲۳] نماز اور اس کے متعلقات۔ [۲۴] روزہ اور صدقۂ فطر۔ [۲۵] اعتکاف۔ [۲۶] قربانی۔ [۲۷] حج وعمرہ اور ان کے متعلقات۔

سُنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآنِ مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے، لٰہذا اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ [۲۰۰۲ء میزان]

دین لاریب، انھی دوصورتوں میں ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے، نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کے اخبارِ آحاد جنھیں بالعموم ''حدیث'' کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا ہرگز کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ [۲۰۰۶ء]

دین میں سُنت اور رسوم وآداب کا فرق: غامدی صاحب

۲۰۰۲ء میں غامدی صاحب کا ارتقاء یافتہ مؤقف

رسوم وآداب

انسان کی تہذیب نفس رہن سہن کے جن طریقوں اور تمدن کے جن مظاہر سے نمایاں ہوتی

ہے، انھیں ہم اصطلاح میں رسوم و آداب کہتے ہیں۔ انسانی معاشرت کا کوئی دوران رسوم و آداب سے خالی نہیں رہا۔ انھیں ہم ہر قبیلے، ہر قوم اور ہر تہذیب میں یکساں رائج اور ایک عمومی دستور کی حیثیت سے یکساں جاری رکھتے ہیں۔ اقوام و ملل کی پہچان ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ تر انھی سے قائم ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام جو دین لے کر آئے ہیں، وہ بھی اپنے ماننے والوں کو بعض رسوم و آداب کا پابند کرتا ہے۔ دین کا مقصد تزکیۂ نفس ہے، لہٰذا دین کے یہ رسوم و آداب بھی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر مقرر کئے گئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو یہ سب دین ابراہیمی کی روایت کے طور پر عرب میں رائج تھے۔ چند چیزوں کے سوا آپ نے ان میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ یہ قرآن سے مقدم ہیں اور ان کی حیثیت ایک سُنت کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر و تصویب کے بعد صحابہ کرام کے اجماع اور تواتر عملی سے امت کو منتقل ہوتی ہے۔ ان کا ماخذ اب امت کا اجماع ہے اور یہ سب اسی بنیاد پر پوری امت میں ہر جگہ دین تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے مقرر کردہ یہی رسوم و آداب ہم تفصیل کے ساتھ یہاں بیان کریں گے۔

[۱] اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔

ان میں سے پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اعتراف و اقرار اور ان میں برکت کی دعا کے لئے ہے اور دوسری چیز اس حقیقت کی ہمہ وقت یاد دہانی کے لئے جنت کی نعمتیں قیامت کے دن جن لوگوں کو ملیں گی، ان کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا۔ بندۂ مومن جب اس طرح کے مواقع پر دائیں کی رعایت کرتا ہے تو یہ گویا اس کی طرف سے ایک طرح کا علامتی اظہار ہوتا ہے کہ قیامت میں بھی وہ اصحاب الیمین ہی کے زمرے میں شامل ہونا چاہتا ہے۔

[۲] ملاقات کے موقع پر ''السلام علیکم'' اور اس کا جواب۔

[۳] چھینک آنے پر ''الحمد اللہ'' اور اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ''۔

[۴] نومولود کے کان میں اذان و اقامت

[۵] مونچھیں پست رکھنا۔ [۶] زیر ناف کے بال مونڈنا۔ [۷] بغل کے بال صاف کرنا۔ [۸] بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ [۹] لڑکوں کا ختنہ کرنا [یہ پانچوں آداب کی قبیل سے ہیں] [۱۰] ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی، [۱۱] استنجا [۱۲] حیض و نفاس کے بعد غسل [۱۳] غسل جنابت [۱۴] میت کا غسل

[۱۵] تجہیز و تکفین [۱۶] تدفین [۱۷] عید الفطر [۱۸] عید الاضحیٰ

ان میں جو اعمال سُنت کے طور پر جاری کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ صدقۂ فطر

۲۔ نماز اور خطبہ

۳۔ ایام تشریق میں ہر نماز کے بعد تکبیریں۔

سُنت کسے کہتے ہیں؟ ۲۰۰۲ء میں ایک نیا موٴقف

دین میں سُنت سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طریقہ یا راستہ ہے جسے آپ نے ملت ابراہیمی کے اتباع میں اپنے پیروکاروں میں دین کی حیثیت سے جاری کیا۔ اس میں آپ نے مختلف امور کی تجدید و اصلاح کی، کیونکہ مرور زمانہ سے اس میں مختلف بدعتیں اور تحریفات داخل ہو چکی تھیں۔ بہت سے دینی احکامات اپنی شکل اور مطلوبہ ہیئت میں باقی نہیں رہے تھے۔ آپ نے اس طرح کے تمام امور کو درست کیا اور انھیں دین کی حیثیت سے جاری کیا۔

تمام صحابہ سُنت پر کاربند نہ تھے:

سُنت اس امت کو صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر سے منتقل ہوئی یعنی تمام کے تمام صحابہ اس بات پر کاملاً متفق تھے کہ فلاں عمل سُنت ہے اور وہ سارے کے سارے یا ان کی ایک کثیر تعداد اس پر کاربند بھی تھی۔ لہٰذا یہ بات بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے۔ سُنت اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح یہ ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائے گی۔

سُنت صرف عملی ہے قرآن کی شرح نہیں:

سُنت، تمام تر، عملی چیزوں پر مشتمل ہے، جبکہ اصولی اور نظریاتی معاملات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔

خود قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ جس طرح اس کے ہر حکم پر عمل کرنا ہمارے لئے لازم ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کا جو عملی طریقہ سکھائیں، وہ بھی دین کا حصہ ہے اور اس کا اتباع کرنا

ہم پر لازم ہے۔ سورۂ جمعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقام اس طرح بیان ہوا ہے:

''اللہ وہی ہے جس نے ان امی عربوں کے اندر ایک رسول خود انھی میں سے اٹھایا جو انھیں اس اللہ کی آیات سناتا ہے۔ ان کی زندگیوں کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور اس رسول کی بعثت ان تمام اہل عالم کے لیے بھی ہے جو اس سے نہیں ملے''۔ [۶۲:۲،۳]

اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دین کا واحد ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ آپ ہی کی وساطت سے ہمیں قرآن ملا ہے اور آپ ہی سے ہمیں اس دین کا وہ عملی طریقہ ملا ہے جسے آپ نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ اس امت کو پہنچایا ہے۔ گویا آپ نے تھیوری [قرآن] اور پریکٹس [سنت] دونوں طریقوں سے ہماری زندگیوں کو پاک وصاف کرنے یعنی تزکیہ کرنے کا کام انجام دیا۔ قرآن مجید ہمیں اس امت کی متفقہ قولی شہادت سے ملا ہے اور سُنت ہمیں اس امت کی متفقہ عملی شہادت سے ملی ہے۔ یہی سارا دین ہے۔

سُنت کا قرآن کی شرح سے کوئی تعلق نہیں:

سُنت سے ہمیں جو دین ملا ہے وہ دراصل زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق عملی رہنمائی ہے۔ مثلاً معاشرت اور آداب کے ضمن میں [۱] اللہ کا نام لے کر کھانا اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا [۲] ملاقات کے موقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب، [۳] چھینک آنے پر الحمد للہ اور اس جواب میں یرحمک اللہ [۴] نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت، [۵] نکاح، [۶] نکاح کا خطبہ اور [۷] جانوروں کا تزکیہ کرنا۔

ذاتی صفائی کے ذیل میں [۸] مونچھیں پست رکھنا، [۹] زیر ناف بال مونڈنا [۱۰] بغل کے بال صاف کرنا، [۱۱] لڑکوں کا ختنہ کرنا، [۱۲] بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا، [۱۳] داڑھی اور انگلیوں کا خلال کرنا، [۱۴] ناک منہ اور دانتوں کی صفائی کرنا اور [۱۵] استنجا کرنا، سُنت میں شامل ہے۔ اسی طرح [۱۶] میت کو غسل دینا، [۱۷] اس کی تجہیز وتکفین اور [۱۸] تدفین کرنا بھی سُنت ہے۔

عبادات کے ضمن میں [۱۹] نواقض وضو [یعنی جن چیزوں سے وضو ٹوٹتا ہے] [۲۰] موزوں

پر مسح، [۲۱] اذان و اقامت، [۲۲] نماز کے لیے مساجد کا اہتمام، [۲۳] شب وروز کی پانچ فرض نمازیں، [۲۴] نماز جمعہ، [۲۵] نماز عیدین اور [۲۶] نماز جنازہ کا طریقہ ہمیں سُنت نے سکھایا ہے۔ اسی طرح [۲۷] روزہ، [۲۸] اعتکاف، [۲۹] عید الفطر، [۳۰] صدقہ عید الفطر کا طریقہ بھی سُنت کا عطا کردہ ہے۔ [۳۱] زکوۃ کی عملی صورت گری بھی سُنت کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح [۳۲] ہدی [قربانی کا جانور جو حاجی مکہ مکرمہ لے جاتے ہیں] [۳۳] طواف اشہر حرم [ذوالقعدہ، [۳۴] محرم اور رجب یعنی وہ مہینے جن میں خدا نے قتل وقتال حرام قرار دیا ہے] [۳۵] عمرہ، [۳۶] حج، [۳۷] عید الاضحیٰ، [۳۸] ذوالحجہ کی قربانی اور ایام تشریق [عید الاضحیٰ کے بعد کے تین دن] میں جماعت کی نمازوں کے بعد تکبیروں کا عملی طریقہ ہمیں سُنت نے سکھایا ہے۔

درج بالا سب چیزیں سُنت ہیں۔ ثبوت کے اعتبار سے ان میں اور قرآن مجید میں کوئی کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی دین ہے۔ ان سب امور پر امت کا اجماع ہے۔ [۲۰۰۲ء]

سُنت کیا ہے؟ ۲۰۰۴ء میں غامدی صاحب کا جدید مؤقف

دین اس دنیا میں انسان کے لیے اللہ پروردگار عالم کی ہدایت ہے۔ یہ انسان کو دو صورتوں میں ملا ہے جنہیں ہم ''دینِ فطرت کے حقائق' اور 'دین وحی' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دینِ فطرت کے حقائق سے مراد اللہ پروردگارِ عالم کی وہ ہدایت و رہنمائی ہے جسے اُس نے انسان کی فطرت میں ابتداء ہی سے ودیعت کیا ہے۔ اس میں وہ رہنمائی بھی شامل ہے جس کا تعلق انسان کے علم اور اس کے تصورات سے ہے۔ مثلاً ذاتِ خداوندی کا علم، توحید و معاد کے تصورات وغیرہ۔ اور وہ ہدایت بھی جس کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے مثلاً اسے اس کے جسمانی وجود کے بارے میں اس کے پروردگار نے طہارت اور غلاظت کا احساس دیا، کھانے اور پینے کے معاملے میں پاکیزہ اور ناپاک چیزوں کا شعور عطا کیا اور اسے اس کے اخلاقی وجود میں اچھے اور برے کا شعور بخشا اور ان میں امتیاز کی صلاحیت عطا کی ہے۔ غرض یہ کہ انسان ان تمام معاملات میں ابتدا ہی سے خیر و شر کا شعور رکھتا، صالح اور غیر صالح میں فرق کرتا اور پاکیزگی اور ناپاکی کا احساس رکھتا ہے۔

یہ دین فطرت کے حقائق ہیں جنہیں قرآنِ مجید معروف و منکر سے تعبیر کرتا ہے۔ مثلاً داڑھی یہ

سُنت نہیں فطرت ہے ہر مرد داڑھی رکھتا ہے اور اس کی فطرت عورت کی مشابہت سے فطری طور پر اِبا کرتی ہے۔ یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جن سے فطرت اِبا کرتی اور انہیں بُرا سمجھتی ہے۔ قرآن ان کی کوئی جامع و مانع فہرست نہیں پیش کرتا، بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ انسان ابتدا ہی سے معروف و منکر دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے، اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر کو چھوڑ دے۔ غرض یہ کہ انسان اپنے وجود میں روز اول سے ایک ایسی بینائی لے کر اس دنیا میں آیا ہے جو اس کے باطن میں ودیعت کی گئی ہے۔ وہ اصلاً ایک بینا مخلوق ہے۔ یہ واضح رہے کہ فطرت کے اِن حقائق کے لئے 'دین' کا لفظ یہاں اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اصطلاحی دین [دینِ وحی] کے ساتھ اس کی اس مماثلت کی بنا پر ہوا ہے کہ وہ بھی اس دنیا میں انسان کے لئے اس کے پروردگار کی ہدایت ہے اور فطرت کے حقائق کی حیثیت بھی انسان کے لئے یہی ہے۔

دین فطرت اور دین وحی کا ماخذ ایک ہے:

دینِ فطرت اور دینِ وحی دونوں کا ماخذ و مصدر اصلاً ایک ہی ہے اور وہ اللہ پروردگارِ عالم کی ذات ہے۔ دینِ فطرت انسان کے لئے اللہ پروردگارِ عالم کی ہدایت ہے اور دین وحی کی بھی یہی حقیقت ہے۔ دین فطرت ہر انسان کو روز اول سے اس کے پروردگار کی طرف سے براہِ راست حاصل ہوتا ہے، جبکہ دین وحی اسے صرف اس کے پیغمبروں ہی کی وساطت سے میسر ہوتا ہے۔

دینِ فطرت کی حیثیت انسان کے لئے بنیادی اور اولین ہدایت کی ہے۔ اور دینِ وحی اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی اضافی اور ثانوی ہدایت ہے۔ دوسرے لفظوں میں دینِ وحی کی بنیاد اصلاً دینِ فطرت کے حقائق پر قائم ہے۔

دین وحی کی آخری صورت......قرآن اور سُنت ہے چنانچہ اب رہتی دنیا تک دین کے مآخذ کی حیثیت انہی دو چیزوں کو حاصل رہے گی۔ قرآن کی تعریف پر کوئی اختلاف نہیں اصل مسئلہ سُنت کا ہے۔

سُنت کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ سُنت کیا ہے سُنت دراصل دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے اور جسے آپ کے صحابہؓ نے اپنے اجماع اور عملی تواتر کے ذریعے سے پوری حفاظت، پورے اہتمام اور قطعیت کے ساتھ دنیا کو منتقل کیا ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ثبوت کے اعتبار سے سُنت اور قرآنِ مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہؓ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔ دنیا میں تاریخی طور پر کسی چیز کے منتقل ہونے کا مستند ترین ذریعہ اجماع اور تواتر ہی ہیں، کسی چیز کے تاریخی استناد کو آخری درجے میں ثابت کرنے کے لئے اجماع و تواتر سے بڑھ کر کوئی چیز پیش نہیں کی جا سکتی۔ بلاشبہ صحابہ کرامؓ سے ہم تک تمام امت نے خدا کا یہ دین اپنے کامل اجماع اور تواتر سے منتقل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کی یہ ہدایت اب بھی ہم امت کے اجماع ہی سے اخذ کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دین کی نسبت اور اس کا استناد قطعیت کے درجہ میں ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ ثبوت علمِ یقین کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔

اعمالِ سنن اور اُن کا حکم:

سُنت کی حیثیت سے جو دین نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں ملا ہے وہ عبادات، معیشت، معاشرت، خورد و نوش اور رسوم و آداب سے متعلق ہیں۔ ان کا بیان اور دین میں ان کا حکم حسب ذیل ہے:

عبادات میں سنن: کچھ سنتیں لازمی نہیں ہیں: کچھ ضروری نہیں

[۱] شب و روز کی پانچ نمازیں اور ان کے متعلقات۔ ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے یہ نمازیں دین میں لازمی عبادات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ [۲] نمازِ جمعہ اور اس کے متعلقات۔ ہر جمعہ کے دن مردوں کے لئے دین میں یہ ہمیشہ ایک لازمی، اور عورتوں کے لئے ایک پسندیدہ عبادت کے طور پر جاری کی گئی ہے۔ [۳] عیدین کی نماز اور اس کے متعلقات۔ یہ عید الفطر اور عید الضحیٰ کے موقع پر مردوں کے لئے لازمی اور عورتوں کے لئے پسندیدہ عبادات ہیں۔ [۴] نماز جنازہ اور اس کے متعلقات۔ میت کے ورثا اور اقارب کے لئے اسے ادا کرنا ایک لازمی سُنت ہے۔ جبکہ دیگر افراد کے لئے اس کی حیثیت ایک پسندیدہ سُنت کی ہے۔ [۵] رمضان کے روزے اور ان کے متعلقات۔ ماہِ رمضان میں مسلمانوں کے لئے دین میں اسے ایک لازمی عبادت کی حیثیت سے جاری کیا گیا ہے۔ [۶] رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف

اور اس کے متعلقات ۔ یہ ایک پسندیدہ عبادت ہے۔ لازم اور واجب نہیں ہے۔[۷] بیت الحرام کا حج اور اس کے متعلقات۔ صاحبِ استطاعت پر یہ عبادت عمر بھر میں ایک مرتبہ دین میں لازم کی گئی ہے۔[۸] بیت الحرام کا عمرہ اور اس کے متعلقات ۔ دین میں یہ عبادت صاحب استطاعت کے لئے ایک پسندیدہ عبادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ لازم نہیں ہے۔[۹] عیدالاضحیٰ کی قربانی اور اس کے متعلقات۔ اس سُنت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبِ استطاعت مسلمانوں کے لئے ایک پسندیدہ عبادت کے طور پر دین میں جاری فرمایا ہے۔[۱۰] ایام تشریق [۱۱،۱۲ اور ۱۳ ذوالحجہ] میں ہر نماز کے بعد تکبیریں۔ یہ تکبیرات دین میں ایک لازمی سُنت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

معیشت میں سنن: [۱۱] زکوٰۃ اور اس کے متعلقات ۔ یہ اپنی شرائط کے ساتھ دین میں ایک لازمی انفاق ہے۔[۱۲] صدقۂ فطر۔ ہر صاحب استطاعت مسلمان مرد و عورت کے لئے رمضان کے اختتام پر نمازِ عید سے پہلے اس انفاق کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں ایک لازمی سُنت کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔[۱۳] مرد کے لئے نکاح کے موقع پر مہر کی ادائیگی۔ اس کی حیثیت بھی ایک لازمی سُنت کی ہے۔

معاشرت میں سنن: [۱۴] نکاح۔ ہر مسلمان مرد و عورت کے لیے یہ اپنی شرائط کے ساتھ ایک لازمی سُنت ہے۔[۱۵] طلاق

خور و نوش میں سنن: [۱۶] اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔ جانور ذبح کرنے والے کے لیے یہ عمل دین میں ایک لازمی سُنت کی حیثیت رکھتا ہے۔ تذکیہ کا لفظ بطورِ اصطلاح جس مفہوم کے لیے بولا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی تیز چیز سے جانور کو زخمی کر کے اس کا خون اس طرح بہا دیا جائے کہ اس کی موت خون بہہ جانے ہی کے باعث واقع ہو۔

رسوم و آداب میں سنن: [۱۷] اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ کھانے پینے کے موقع پر اس عمل کو دین میں ایک لازمی سُنت کی حیثیت سے جاری کیا گیا ہے۔[۱۸] ملاقات کے موقع پر ''السلام علیکم'' اور اس کا جواب۔ یہ سُنت بھی دین میں ایک لازمی عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔[۱۹] چھینک آنے پر ''الحمدللہ'' اور اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہنا۔ دین میں یہ عمل بھی ایک لازمی سُنت کے طور پر جاری کیا گیا ہے۔[۲۰] نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے والدین اور سرپرستوں کے لئے ایک پسندیدہ سُنت کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔[۲۱]

مونچھیں پست رکھنا۔ اس عمل کو مردوں کے لئے دین میں ایک لازمی سُنت کی حیثیت حاصل ہے۔[۲۲] زیر ناف کے بال مونڈنا۔ یہ بھی دین میں ایک واجب عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔[۲۳] بغل کے بال صاف کرنا اس کی حیثیت بھی ایک لازمی سُنت کی ہے۔[۲۴] لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ والدین اور سرپرستوں پر دینِ ابراہیمی کی یہ سُنت بھی لازم کی گئی ہے۔[۲۵] بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ یہ بھی دین میں ایک لازمی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔[۲۶] ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ سنن میں اس عمل کی حیثیت بھی ایک واجب کی ہے۔[۲۷] استنجا۔ بول و براز کے موقع پر اس عمل کو دین میں لازم کیا گیا ہے۔[۲۸] لڑکیوں کا ختنہ۔[۲۹] حیض و نفاس کے بعد غسل۔ عورتوں کے لیے اسے دین میں ایک لازمی سُنت کی حیثیت سے جاری کیا گیا ہے۔[۳۰] داڑھی رکھنا۔[۳۱] میت کا غسل۔ ورثا اور اقارب پر اس ذمہ داری کو ادا کرنا دین میں لازم کیا گیا ہے۔[۳۲] تجہیز و تکفین۔ ورثا اور اقربا کے لئے اس کے حکم کی حیثیت بھی میت کے غسل ہی کی طرح ہے۔[۳۳] تدفین۔ عزیز و اقارب کے لئے یہ بھی ایک لازمی سُنت ہے۔[۳۴] عید الفطر۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چند متعین سنن کے ساتھ مسلمانوں میں ایک لازمی تہوار کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔[۳۵] عید الاضحیٰ۔ اس کی حیثیت بھی دین میں عید الفطر ہی کی طرح ہے۔[۳۶] نکاح کے موقع پر خطبہ۔ یہ دین میں ایک پسندیدہ سُنت کی حیثیت رکھتا ہے۔ لازم اور واجب نہیں ہے۔

[۲۰۰۴ء]

سُنت کی تعریف ۱۹۹۶ء: میں جاوید احمد غامدی کے الفاظ میں

لغت کے لحاظ سے سُنت نام ہی عملی طریقے کا ہے۔ نظری نوعیت کی چیزیں اس میں زیر بحث نہیں آتیں۔ حدیث کے ذخیرے پر نظر ڈال کر دیکھا جائے کہ اس میں کیا چیز سُنت ہے؟ کیا تفہیم ہے؟ کیا تبیین ہے؟ کیا اسوہ حسنہ ہے اور کیا تاریخ ہے؟ میں نے دین کی یہی خدمت کی ہے کہ حدیث کے تمام ذخیرے کا ربع صدی مطالعہ کر کے چالیس سنتیں نکال لیں اور اس ذخیرہ حدیث کو عنوانات کے تحت تقسیم کر دیا۔

لاریب سُنت صرف چالیس ہیں اس کے سوا کچھ سُنت نہیں: [۱] اللہ کا نام لے کر دائیں ہاتھ سے کھانا [۲] السلام علیکم کہنا اور اس کا جواب [۳] چھینک آنے پر الحمدللہ جواباً یرحمک اللہ کہنا [۴] کان میں

اذان وقت ولادت [۵] نکاح [۶] خطبہ نکاح [۷] قربانی [۸] مونچھیں مونڈنا [۹] زیر ناف کے بال صاف کرنا [۱۰] بغلوں کے بال کی صفائی [۱۱] لڑکوں اور لڑکیوں کے ختنے [۱۲] بڑھے ناخن کاٹنا [۱۳] داڑھی رکھنا [۱۴] داڑھی اور انگلی میں خلال [۱۵] ناک منہ دانت کی صفائی [۱۶] استنجا [۱۷] غسل جنابت [۱۸] میت کا غسل [۱۹] تجہیز و تکفین [۲۰] تدفین [۲۱] نماز سے پہلے وضو [۲۲] تیمّم [۲۳] اذان اقامت [۲۴] نماز کے لیے اہتمام مساجد [۲۵] پنج وقتہ لازمی نمازیں [۲۶] نماز جمعہ [۲۷] چار شادیاں کرنا [۲۸] نماز جنازہ [۲۹] روزہ [۳۰] اعتکاف [۳۱] عیدین کی نمازیں [۳۲] نماز جنازہ [۳۳] صدقہ عید الفطر [۳۴] زکوٰۃ [۳۵] ہدی کا جانور [۳۶] کم از کم دو کمروں کا مکان [۳۷] امام کا صاحب نصاب ہونا [۳۸] طواف [۳۹] عمرہ وحج [۴۰] ایام تشریق کی تکبیریں [۴۱] مسواک اور خوشبو کا استعمال۔ ۱۹۸۰ء میں داڑھی قرآن سے ثابت تھی۔ [حضرت موسیٰؑ نے بھائی کی داڑھی کھینچی۔] ۱۹۹۴ء میں داڑھی سُنت ہو گئی۔ پھر فطرت ہو گئی اور سُنت سے نکل گئی۔ ۱۹۹۸ء میں صرف اسوہ حسنہ رہ گئی۔ رسولؐ نے اسے پسند فرمایا تھا۔ ۲۰۰۷ء میں داڑھی بس ایک شے ہے اس کے سوا کچھ نہیں، ساحل]

سُنت کیا ہے؟ ۲۰۰۵ء میں غامدی صاحب کا ایک اور نقطۂ نظر

دین اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اس نے پہلے انسان کی فطرت میں الہام فرمائی اور اس کے بعد اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسان کو دی ہے۔ اس سلسلہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ دین کا تنہا ماخذ اس زمین پر اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات والا صفات ہے۔ یہ صرف انھی کی ہستی ہے کہ جس سے قیامت تک بنی آدم کو ان کے پروردگار کی ہدایت میسر ہو سکتی ہے اور یہ صرف انھی کا مقام ہے کہ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے وہ جس چیز کو دین قرار دیں، وہی اب رہتی دنیا تک دین حق قرار پائے گا۔

هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الاُمِّیّنَ رَسُولًا مِّنهُم یَتلُوا عَلَیهِم اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیهِم وَ یُعَلِّمُهُمُ الکِتٰبَ وَالحِکمَةَ. [الجمعہ ۶۲:۲]

”وہی ذات ہے جس نے ان امیوں میں ایک رسول انھی میں سے اٹھایا ہے جو اس کی آیتیں ان پر تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور [اس کے لیے] انھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے“۔

یہی قانون وحکمت وہ دین حق ہے جسے ”اسلام“ نے دین سے تعبیر کیا جا ہے۔ اس کے ماخذ

کی تفصیل ہم اس طرح کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی وعملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے: ا۔قرآن مجید۔۲۔سنت۔

قرآن مجید کے بارے میں ہر مسلمان اس حقیقت سے واقف ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے، اور اپنے نزول کے بعد سے آج تک مسلمانوں کے پاس ان کی طرف سے بالا جماع اس صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ یہی وہ کتاب ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور جسے آپ کے صحابہ نے اپنے اجماع اور قولی تواتر کے ذریعے سے پوری حفاظت کے ساتھ بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے دنیا کو منتقل کیا ہے۔

سُنت قرآن کی شرح وتبیین کا نام نہیں:

سُنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔قرآن میں اس کا حکم آپ کے لیے اس طرح بیان ہوا ہے:

ثُمَّ اَوحَینآ اِلَیکَ اَنِ اتَّبع مِلَّۃَ اِبرٰھِیمَ حَنِیفًا ، وَ مَا کَانَ مِنَ المُشرِکِینَ۔[النحل۔۱۶:۱۲۳] ’’پھر ہم نے تمھیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا‘‘۔

سُنت دین ابراہیمی کی تجدیدی روایت:

اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے، وہ یہ ہے:

عبادات:[ا] نماز۔[۲] زکوٰۃ اور صدقۂ فطر۔[۳] روزہ واعتکاف۔[۴] حج وعمرہ۔[۵] قربانی اور ایام تشریق کی تکبیریں۔

معاشرت:[ا] نکاح وطلاق اور ان کے متعلقات۔[۲] حیض ونفاس میں زن وشو کے تعلق سے اجتناب۔

خورونوش:[ا] سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کئے گئے جانور کی حرمت۔[۲] اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔

رسوم وآداب:

ا۔اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔[۲] ملاقات کے موقع پر ’’السلام علیکم‘‘ اور

اس کا جواب۔ [۳] چھینک آنے پر "الحمداللہ" اوراس کے جواب میں "یرحمک اللہ"۔[۴] نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت۔ [۵] مونچھیں پست رکھنا۔ [۶] زیرناف کے بال کاٹنا۔ [۷] بغل کے بال صاف کرنا۔[۸] بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔[۹] لڑکوں کا ختنہ کرنا [لڑکیوں کا ختنہ منسوخ ہوگیا]۔ [۱۰] ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔[۱۱] استنجا۔ [۱۲] حیض و نفاس کے بعد غسل۔ [۱۳] غسل جنابت۔[۱۴] میت کا غسل۔[۱۵] تجہیز و تکفین۔[۱۶] تدفین۔[۱۷] عیدالفطر۔[۱۸] عید الاضحیٰ۔[عیدین رسوم ہوگئیں پہلے عبادات تھیں۔ پہلے سنتیں ۴۰ تھیں اب ۲۷ رہ گئیں، ساحل۔]

سُنت یہی ہے اوراس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے، لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔[۲۰۰۵ء]

[غامدی صاحب کا سنتوں کے بارے میں متضاد، متنوع اور رنگارنگ مؤقف ان کی کتابوں میزان ۱۹۸۴ء، میزان ۲۰۰۲ء، اصول ومبادی ۲۰۰۵ء، برہان، محاضرات ۱۹۹۸ء کراچی، تین سو مختلف خطبات، تقاریر، آڈیو وڈیو کیسٹ اور غامدی صاحب کی متفرق ومنتشر تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے۔ سُنت کی تعریف، توضیح اور سنتوں کے تعین میں غامدی صاحب نے گزشتہ ۱۵ برس کے دوران جو رنگ بدلے ہیں اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سُنت دین کا ماخذ نہیں ہے بلکہ چیستان ہے اور غامدی صاحب پندرہ سو برس کے دینی ادب کے مطالعے کے بعد بھی سُنت کا درست تعین کرنے سے قاصر اور عاجز ہیں، ساحل]